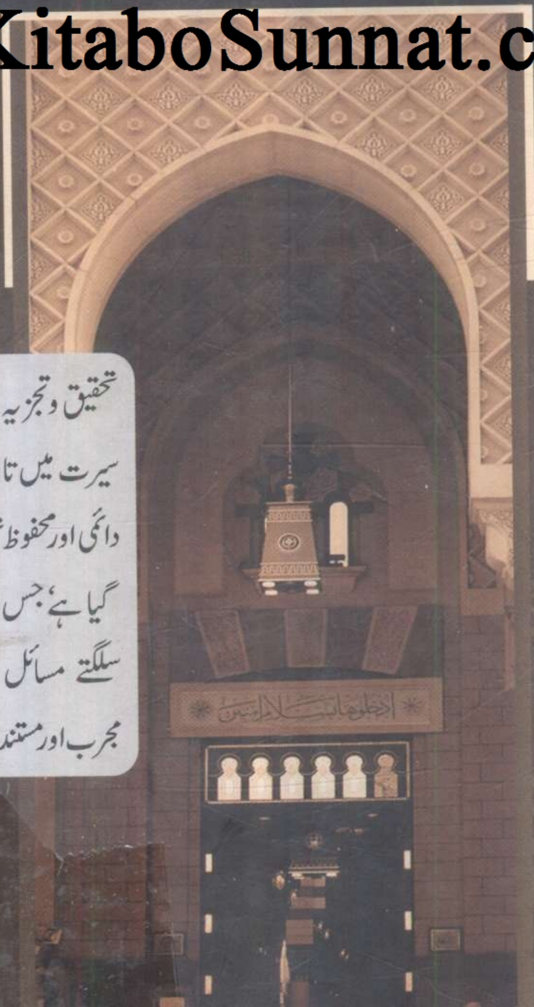
ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

اُسوۂ کامل محمد ﷺ



تحقیق و تجزیہ پر مشتمل اس کتاب
سیرت میں تاریخ انبیاء کے واحد'
دائمی اور محفوظ نمونۂ عمل کا احاطہ کیا
گیا ہے، جس میں عصرِ حاضر کے
سلگتے مسائل اور عالمی چیلنجز کا
مجرب اور مستند علاج ہے۔

نشریات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسوۂ کامل ﷺ

اسوۂ کامل ﷺ

صدارتی ایوارڈ یافتہ

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

نشریات
۴۰ اُردو بازار، لاہور۔فون: ۴۵۸۹۴۱۹۔۰۳۲۱

۲۹۷،۶۳ ظفر، عبدالروف، ڈاکٹر
ظف ر۔ا اسوۂ کامل ﷺ
لاہور : نشریات
۲۰۰۹ء ص ۷۸۸
سیرت۔منشورِ سیرت۔تعلیماتِ سیرت
ISBN 978-969-8983-49-9

نام کتاب : اسوۂ کامل ﷺ
مصنف : ڈاکٹر عبدالروف ظفر
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون 7320318 فیکس 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی بک
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

ترتیب

حرفِ اوّل

انسانی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں وحی جیسے مستند ذریعہ علم پر مشتمل ۳۱۵ کتابیں اور صحائف نازل کیے وہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب انبیائے کرام علیہم السلام بھی مبعوث فرمائے۔ ان کے چند نام ہی تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید میں ملتے ہیں مگر ان کے تفصیلی حالات اور ان کی جامع خدمات کا تذکرہ مفقود ہے۔ یہ اعزاز اور امتیاز تاریخ انبیاء میں صرف اور صرف ایک شخصیت کو حاصل ہے اور وہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جن کے حالات اور تعلیمات پورے استناد اور جامع تفصیلات کے ساتھ محفوظ اور موجود ہیں۔

حضرت محمد ﷺ خاتم المرسلین کی حیثیت سے تاریخ کے جس دور میں مبعوث ہوئے، وہ ساتویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس دور میں بازنطینی حکمرانوں اور کسرائے ایران جیسی قوتیں اور طاقتیں موجود تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب سے دور آخری نبوت و رسالت کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں حجاز کی سرزمین کو منتخب فرمایا۔ بعثتِ نبوی کے اعلان سے حجاز کی سرزمین کے مرکزی مقام مکہ میں ایک شدید کشمکش شروع ہوگئی۔ تیرہ سالوں کی دعوت اور محنت کے نتیجے میں اڑھائی تین سو صالح افراد کا ایک معاشرہ وجود میں آیا۔ حالات کی سنگینی اور نزاکت نے منتخب صحابہ ؓ کو اولاً حبشہ میں ہجرت پر مجبور کیا اور مستقلاً یثرب میں جو بعد میں مدینۃ النبی کہلایا، سکونت کے مواقع فراہم کیے۔ مدنی زندگی کے دس سال بھی ایک جان گسل آزمائش اور جدوجہد سے عبارت ہیں مگر نصرتِ الٰہی سے مدنی معاشرہ ایک ریاستی آہنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔ مدینۃ النبی کے چار مربع کلومیٹر میں قائم ہونے والی ریاست دس سال کے قلیل عرصے میں بارہ لاکھ مربع میل تک پھیل گئی۔ اسلام عہد نبوی ﷺ میں جزیرہ نمائے عرب سے ملحق ریاستوں اور ملکوں میں اپنا نفوذ پیدا کر رہا تھا۔

عہد نبوی کی تیئیس سالہ دعوتی کشمکش ایک داستانِ عزیمت ہے جس کا ایک ایک ورق انسانی سیرت کے جمال، جلال اور کمال کا آئینہ دار ہے۔ حیات صحابہ ؓ اگر ستاروں کی طرح روشن ہیں تو نبی مکرم ﷺ کی سیرت ان میں ماہِ تمام کی طرح منور ہے۔ یہی وہ خورشید جہاں تاب ﷺ ہے کہ جس کی حیات کا ایک ایک لمحہ اور سیرت کا ایک ایک پہلو پوری جامعیت اور ثقاہت کے ساتھ انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے محفوظ ہے۔ خالقِ کائنات نے جب قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا تو کیسے ممکن

تھا کہ قرآن ناطقؐ کے اسوۂ کامل کی حفاظت کے اسباب فراہم نہ کیے جاتے۔ آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ اور اسوۂ کامل پر تو ڈیڑھ لاکھ کے قریب صحابہ ؓ نے عمل کر کے تعامل کی دنیا میں سب سے بڑی مثال قائم کر دی، دوسری جانب محدّثین نے آپ ﷺ کے اقوال، اعمال، افعال، فضائل، شمائل اور دلائل کو کمال حزم واحتیاط کے ساتھ جمع کر دیا۔ اس ذخیرۂ سنت اور گنجینۂ حدیث کی جمع آوری علوم انسانی کی تاریخ کا ایک لازوال اور بے مثال کارنامہ ہے۔ تاریخ عالم میں ایسی دوسری کون سی شخصیت ہے کہ جس کی خاموشیوں کو بھی قانون کا درجہ حاصل ہو، اور انہیں بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہو۔ آپ ﷺ کی عادات شریفہ کا ایک ایک پہلو علمی اور عملی ہر دو اعتبار سے امت نے محفوظ کیا ہے۔ اس آخری نبوت ورسالت کے تشریعی پہلو پر توجہ کی جائے تو اس ذخیرۂ سنت کی حفاظت کی وجوہ اور اسباب واضح ہو جاتے ہیں۔

اس صاحب جمال ﷺ کی باکمال زندگی کے احوال اور آپ ﷺ کی دعوت کی تفصیلات کا سب سے مستند اور جامع تذکرہ تو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ ذخیرۂ سیرت میں بہت سی علمی اور تحقیقی کاوشیں صرف اسی ایک مرجعِ خاص سے ترتیب دی گئی ہیں، مگر احوالِ سیرت کے دوسرے مراجع اور منابع میں کتب حدیث، دستاویزاتِ سیرت (معاہدات، خطبات، مکاتیب، امان نامے، ہبہ نامے، مردم شماریاں، سرکاری ہدایات اور مراسلے، روایات حدیث کے صحیفے اور مجموعے)، کتبِ سِیَر ومغازی، کتبِ تاریخ، کتبِ تفاسیر، کتبِ شمائل ودلائلِ نبوی ﷺ، کتب خصائصِ نبوی، کتبِ آثار واخبار، کتبِ انساب، کتبِ جغرافیۂ عرب، کتبِ ثقافتِ عرب، کتب تاریخ الحرمین الشریفین، کتب اسماء الرجال، عربی ادبیات، اطلسِ سیرت، خرائطِ سیرت اور اماکنِ سیرت، حرمین کے سفرنامے اور کتبِ نعت وقصائد نبوی ﷺ بھی شامل ہیں۔ ان مراجع اور مصادر سے کام لیتے ہوئے مختلف سیرت نگاروں نے مغازی، سِیَر، شمائل، دلائل، معارج، مدارج، خصائص؛ مولود ناموں، معراج ناموں، حلیہ ناموں، نور ناموں، جنگ ناموں، وفات ناموں، درد ناموں اور موضوعاتی سیرت پر نظم ونثر میں جو کتب ورسائل لکھے ہیں، وہ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا کی سو سے زائد زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات یا مطبوعات کی شکل میں موجود ہیں۔

مغازی رسول ﷺ پر تحریری لوازمہ خود عہد صحابہ ؓ میں ترتیب دیا گیا۔ ''مغازی رسول اللہ ﷺ'' کے عنوان سے عروہؒ بن زبیر ؓ (م ۹۴ھ) نے جو کتاب ترتیب دی، وہ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں مغازی نگاری نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر

لی اور مختلف مقامات پر مغازی کے خصوصی حلقہ ہائے درس قائم ہوئے۔اس ابتدائی دور میں عروہؒ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابانؒ بن عثمان رضی اللہ عنہ، محمد بن اسحٰق، ابن ہشام، زھری، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی جیسے مغازی نگار اور مؤرخ سامنے آئے، جنہوں نے سیرت کی ابتدائی روایات کی جمع آوری میں بہت ذوق و شوق کا اظہار کیا۔ پیشِ نظر رہے کہ محمد بن اسحٰق بن یسار (۸۵۔۱۵۱ھ) نے جو مغازی مرتب کیے اس پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے بہت تحقیقی کام کیا ہے۔ان کی تدوین کے ساتھ یہ نسخہ ۱۹۷۶ء میں فاس (مراکش) سے شائع ہو چکا ہے۔اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر موصوف نے مستشرق وستفلد (wustenfeld) کی تصنیف ''مؤرخو العرب'' کے حوالے سے ان ستائیس مغازی نگاروں کے نام فراہم کیے ہیں جو ابن اسحٰق سے پہلے اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اس طویل فہرست میں ابان بن عثمان بن عفان، عاصم بن عمر بن قتادہ، شرحبیل بن سعد، ابوالاسود یتیم عروہ، سلیمان بن طرخان التیمی اور ولید بن کثیر المخزومی کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔

گزشتہ چودہ صدیوں میں سیرت کے عنوان سے جو ذخیرہ سامنے آیا ہے، اس کی تیس کے قریب فہارس اور کتابیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اس موضوع کی تازگی اور دلچسپی کا معیار کیا رہا ہے۔ راقم الحروف کے شخصی کتب خانے بیت الحکمت میں چھ ہزار کے قریب کتبِ سیرت دنیا کی پچیس زبانوں میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ دنیا میں وقیع ذخیرہ ہائے سیرت سے استفادہ کرتے ہوئے سیرتِ نبوی پر کتب و رسائل کی ایک جامع فہرست (UNION-CATALOGUE) تیار کی جائے۔ موجود فہارس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر میں سیرت نبوی پر پہلی کتاب ابو معشر نجیع بن عبدالرحمٰن السندھی المدنی (م ۱۷۰ھ) نے ''مغازی'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کا تذکرہ ابن ندیم کی ''الفہرست'' میں موجود ہے۔ اس کے بعد عربی اور فارسی کتب سیرت کے بہت سے نام ملتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں سیرت نبویؐ کا عہد خوش خصال انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا اور بیسویں صدی میں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا۔ راقم نے اس کی مناسب تفصیلات ''کتاب سرائے'' اور ''نشریات'' سے شائع ہونے والی تین کتابوں کے تفصیلی مقدمات میں فراہم کی ہیں۔ جن میں سے پہلی کتاب قاضی اطہر مبارک پوری کی ''تدوین سیر و مغازی''، دوسری خورشید ناظر کی ''بلغ العلیٰ بکماله'' اور تیسری ملاّ واحدی دہلوی کی ''حیاتِ سرورِ کائنات ﷺ'' ہے۔

برصغیر میں اردو سیرت نگاری کا آغاز تو میلادی ادب سے ہوا۔ سیکڑوں منظوم اور منثور کتابیں

اور کتابچے مولود نامے، معراج نامے، جنگ نامے، نور نامے، حلیہ نامے، شمائل نامے، وفات نامے، درد نامے، پیدائش نامے، اور پیغمبر نامے کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔ سیّد سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) نے اپنی گراں قدر تصنیف ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی تیسری جلد (ص ۲۶۴) میں لکھا ہے کہ میلاد کی ان مجالس کا رواج چوتھی صدی ہجری میں ہوا۔ اس کے بعد عربی، فارسی، ترکی، اردو، پنجابی، سندھی اور سرائیکی میں سیکڑوں مولود نامے لکھے جا چکے ہیں مگر ان میں پیش کی جانے والی روایات کی درایت ملحوظ رکھی جائے تو یہ تاریخی لحاظ سے بہت کمزور ہیں۔ میلاد کے جواز اور عدم جواز پر بھی سیکڑوں کتب لکھی گئی ہیں۔

اردو زبان کے ذخیرۂ سیرت میں بیسیوں کتابیں غیر مسلموں نے بھی تحریر کی ہیں، جن میں سے بعض کا مطالعہ عقیدت اور دل چسپی کا حامل ہے۔ اس سلسلے کی سب سے تازہ کاوش مشہور عاشقِ رسول اور محبِّ اقبال مصنف سُر جیت سنگھ لانبہ کی ''قرآنِ ناطق (محمد ﷺ)'' ہے جس پر مصنف کا نام درج نہ ہو تو کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا کہ یہ کسی غیر مسلم کی تصنیف ہے۔ ادارہ ''نشریات'' لاہور نے حال ہی میں اس کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو اردو زبان کے ذخیرۂ سیرت میں تین ہزار سے متجاوز نظم ونثر کی چھوٹی بڑی مطبوعات ملتی ہیں، مگر ان مصنفینِ سیرت میں محمد باقر آگاہ، شاہ رؤف احمد رافت، قاضی بدرالدولہ محمد صبغت اللہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی، سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، عنایت رسول چریاکوٹی، عبدالرؤف داناپوری، ابوالکلام آزاد، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مرزا حیرت دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریابادی، سیّد اولاد حیدر فوق بلگرامی، نور بخش توکلی، نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی، فضل کریم خاں درّانی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، سید نواب علی، چودھری افضل حق، سیّد ابوالحسن علی ندوی، پیر محمد کرم شاہ الازہری، شاہ محمد جعفر پھلواروی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، طالب الہاشمی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، نعیم صدیقی، عبدالعزیز عرفی، پروفیسر غلام ربانی عزیز، ڈاکٹر خالد علوی، سیّد اسعد گیلانی، بریگیڈیئر گلزار احمد، ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، اخلاق حسین قاسمی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مفتی احمد یار خاں، طالب حسین کرپالوی، مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، ملّا واحدی دہلوی، غلام احمد پرویز، محمد رفیق ذوگر، ڈاکٹر نثار احمد، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، مولانا عبدالمجید دہلوی، مولانا محمد بن ابراہیم جوناگڑھی، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی، ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی، خورشید ناظر اور

ڈاکٹر طاہر القادری کے نام ممتاز اور نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر، اردو سیرت نگاری کی صف میں نسبتاً ایک نیا نام ہے۔ آپ ایک مدت سے سیرت چیئر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بہت نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس جامعہ میں ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے مقالات کو دو جلدوں میں ایڈٹ کر چکے ہیں۔ ''علوم الحدیث۔ فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ'' کے عنوان سے ایک گراں قدر ضخیم کتاب ان کے علمی کارناموں میں امتیاز کا درجہ رکھتی ہے جس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جدید وقدیم درس گاہوں سے فیض یاب ہونے اور گلاسگو یونیورسٹی، انگلستان سے پی ایچ ڈی کرنے کے سبب تحقیق کے جدید لوازم سے بخوبی آگاہ ہیں۔ عربی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ سیرت کے حوالے سے ان کی متعدد کاوشیں طبع ہو چکی ہیں، مگر پیش نظر کتاب ''اسوۂ کامل ﷺ'' ان کے گراں قدر مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض معروف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین اپنی جگہ ایک مستقل کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر نگاہ ڈالیے تو احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے دور حاضر میں سیرت کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے سیرت کی عملی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان میں آپ ﷺ کی شخصی زندگی کے لطیف وقائع کے علاوہ آپ ﷺ کی دعوتی، معاشرتی، تعلیمی، معاشی، سیاسی، عسکری، عدالتی، اخلاقی، فلاحی اور سماجی تعلیمات کے حوالے سے بہت مفید معلومات اور تعلیمات ملتی ہیں۔ چند مضامین میں رواداری، ختم نبوت، تربیتِ اولاد، حبِ رسول، اسلامی ثقافت، فلاحِ انسانیت، عصری مسائل اور استحکام پاکستان جیسے موضوعات کا تعلیمات نبوی کی روشنی میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''عصر حاضر میں سیرت نبوی کے مطالعہ کی اہمیت اور اس کی روشنی میں جدید مسائل کا حل'' جیسے موضوع کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا اِرتقائی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور مستشرقین اور سیرت نگاری جیسے اہم موضوع پر مقالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ ایک مقالہ میں قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کے تعلق اور لزوم کو بہت علمی انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ پاکستان میں عدل کے اداروں کی سیرتِ نبوی کی روشنی میں تشکیل جیسے اہم اور نازک موضوع پر بھی ذمہ داری سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ عملی طور پر کمزور مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حبِ رسول کے تقاضے کیا ہیں۔ یوں ان موضوعاتِ سیرت کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں موجودہ مسلم معاشروں کے تمام افراد اور اداروں کو سیرت کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا لب ولہجہ علمی سے زیادہ عملی اور تاریخی سے زیادہ افادی ہے۔ فاضل مصنف کوئی

ادیب یا شاعر نہیں ہیں، اس لیے اس کتاب کا اسلوب نگارش ادبی سے زیادہ علمی اور تحقیقی ہے۔ ہر بات حوالے اور استناد کے ساتھ لکھی گئی ہے جس سے مضامین اور کتاب کی ثقاہت میں اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ سیرت النبی ﷺ پر بہت مفصل اور ضخیم کتب بھی لکھی گئی ہیں، جن کا مطالعہ چند افراد ہی کر سکتے ہیں۔ مگر ''اسوۂ کامل ﷺ'' جیسی کتاب سے کم وقت میں وقیع اور مستند معلومات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتابِ سیرت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ایک اسلامی معاشرے اور ریاست کے تمام افراد اور اداروں تک پیغامِ سیرت پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف اپنی اس کاوش میں بہت حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر لکھی گئی کتابیں عقیدت و ارادت کا پیرایہ تو رکھتی ہیں مگر ان میں بعض اوقات درایتِ سیرت کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ ''اسوۂ کامل ﷺ'' کے اس مجموعے کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں درج وقائع کو مستند حوالوں سے پیش کرنے کی سعی جمیل کی گئی ہے، جس کے باعث یہ تذکارِ جلیل سیرتِ نبوی ﷺ کے ذخائر میں ایک علمی اعتبار اور تاریخی استناد کا اعلیٰ نمونہ بن گیا ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کے متعدد اور متنوع موضوعات پر یہ گلدستۂ سیرت جو ''اسوۂ کامل ﷺ'' کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے، اس کی طباعت کی سعادت ادارہ ''نشریات'' کے عزیزِ گرامی محمد رفیع الدین حجازی نے حاصل کی ہے، جو اس سے قبل بھی سیرت کے موضوع پر انتہائی وقیع اور بلند پایہ کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ''اسوۂ کامل ﷺ'' اس ادارے کے ذوقِ طباعت کا تازہ شاہکار ہے جو ان شاء اللہ اردو خواں دنیا کے ہر طبقے میں سند قبولیت حاصل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس علمی کاوش کو عامۃ المسلمین کے لیے مفید اور نافع اور مصنف اور ناشر کی حسنات میں اضافے کا موجب بنائے۔

آمین یارب العالمین .

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

❁❁❁❁

عرضِ مصنّف

سیرت النبی ﷺ سے عقیدت و محبت حرزِ جان اور علامت ایمان ہے۔ اطاعت رسول ﷺ ذریعہ نجات اور اتباع اسوۂ رسول ﷺ طریق نجات ہے۔ سیرت نبوی ﷺ جیسے عالی مرتبہ موضوع پر قلم اٹھانا یا مقالہ پیش کرنا باعث سعادت ہے۔ لیکن یہ جسارت زبان و قلم ہر دو کے لیے پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ اگر عقیدت و محبت غلو کا شکار ہو جائے تو علامت نصاریٰ ٹھہرتی ہے جنھوں نے پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ بنا ڈالا اور اگر زبان و قلم کی ذرا سی لغزش ہو جائے تو حبوط اعمال کا سبب ٹھہرتی ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدحت سرائی کے انتہائی نازک اور حساس معاملہ ہونے کے باوجود ہر دور میں مسلمان اپنے ایمان و عقیدہ کے ساتھ اس دودھاری تلوار پر چلتے رہے ہیں اور تا قیامت چلتے رہیں گے کیونکہ آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کیے بغیر لذت ایمان سے محرومی کا قلق دل و دماغ کو بے قرار رکھتا ہے۔

ہر دور میں مسلمان نبی مکرم ﷺ کی ذاتِ قدسی سے بے پایاں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے چلے آئے ہیں اور ادب اسلامی میں سیرت نگاری کا فن کمیت و کیفیت کے لحاظ سے سرفہرست چلا آ رہا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب، ''سیرت نگاری اسلامی ادبیات کا ایک سدا بہار موضوع ہے۔ اس کے آغاز و ارتقا پر بھی بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں تیس سے متجاوز ایسی کتابیات سیرت اور فہارس شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک سو کے قریب زبانوں میں ایک لاکھ سے متجاوز نظم و نثر کی مختلف اصناف میں نمونہ ہائے سیرت ملتے ہیں۔ سیرت نبوی ﷺ کے متعدد مآخذ اور متنوع منابع، مراجع اور مصادر ہیں جن میں قرآن مجید کے علاوہ کتب احادیث، آثارِ نبوت، کتب سیر و مغازی، کتب تفاسیر، کتب شمائل و دلائل نبوۃ، کتب آثار و اخبار، کتب انساب و تاریخ، جغرافیہ و ثقافت عرب، تواریخ الحرمین الشریفین، اسماء الرجال، عربی ادبیات، حرمین کے سفرنامے، مجموعہ ہائے نعت رسول مقبول، اطلس و خرائط اور اماکن سیرت کی کتابیں شامل ہیں۔ ان منابع اور مراجع کی مدد سے اگر ہزاروں کتب شائع ہو چکی ہیں تو ابھی سیکڑوں مخطوطات کی شکل میں دنیا کے مختلف کتب خانوں، عجائب گھروں

اور شخصی کتب خانوں کی زینت ہیں" (نقوش سیرت، ص۲۹)۔

"سیرت نبوی ﷺ کے مصادر و مراجع" کے زیر عنوان راقم السطور نے بھی خدام سیرت میں جگہ پانے کی کوشش ہے۔ یہ معلوماتی کاوش جنوری ۱۹۹۴ء میں سیرت چیئر اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں قائم سیرت چیئر کی گراں قدر ذمہ داری ۱۹۹۱ء میں میرے سپرد ہوئی تو علاوہ دیگر کاوشوں کے مختلف کتب خانوں میں موجود مخطوطات سیرت کو بھی سامنے لانے کا پروگرام طے پایا اور "حمیدیة الزمان بافضلية الرسول الاعظم بنص القرآن لابن المنير دمشقی" کو تحقیق و تخریج سے شائع کیا گیا اسی طرح سیرت نبوی ابن ہشام کے خلاصہ "سیرة سيد العوالم لابن الفافا" بھی ۲۰۰۵ء میں تحقیق و تخریج سے شائع کی گئی ہے۔ ان دونوں مخطوطات کی تحقیق و تخریج کا فریضہ سرانجام دینے کی سعادت اس ناچیز کے حصہ میں آئی اور سیرت چیئر کے زیر اہتمام انھیں شائع کیا گیا۔ راقم الحروف کی علمی کاوشیں "معراج النبی ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کا علمی جائزہ" اور "الاسراء والمعراج حقائق واسرار" بھی سیرت چیئر کے زیر اہتمام ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئیں۔

محمد صدیق لاہوری کے "سلك الدرر لاكمل الرسل الاطهر" نامی بے نقط مخطوطہ سیرت پر تحقیقی کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ سیرت چیئر کی یہ کاوش ان شاء اللہ عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ جائے گی۔

سیرت نگاری کے میدان میں ایک گوشہ "مقالاتِ سیرت" بھی ہے۔ جس میں ارادت مندانِ سیرت کسی خاص موضوع پر علمی و تحقیقی کاوش کے بعد مقالہ تیار کرتے ہیں اور سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان مقالات میں تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کی چاشنی اور فنِ خطابت کی مہارت بھی در آتی ہے۔ مختلف موضوعات پر مختلف تقاریب کی مناسبت سے اہل قلم کے یہ وقیع مقالات بعد ازاں کتابی شکل میں شائع کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے۔

ہر مقالے کا عنوان جدید ہوتا ہے اور مختلف مقالات سپرد قلم کیے جانے کے مابین زمانی فاصلے بھی قلیل و طویل ہوتے ہیں۔ اس لیے "مقالات سیرت" اگرچہ مربوط اور مسلسل تصنیف کی حیثیت نہیں

رکھتے تاہم ہر مقالہ اپنے موضوع سے متعلق بھرپور معلومات کا حق ضرور ادا کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ سیرت النبیؐ کی روشنی میں عصرِ حاضر کے مسائل کا جائزہ، مقالات سیرت کا امتیاز ہوتا ہے۔ایک شخصیت کے مختلف موضوعات پر مقالہ جات یا مختلف شخصیتوں کے مختلف موضوعات پر مقالہ جات گلدستۂ سیرت میں رنگ برنگے پھولوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔عصرِ حاضر میں ''مقالات سیرت'' کا سلسلہ سیرت نبویؐ پر اظہار کے لیے مقبول عام ذریعے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔دنیا بھر میں مختلف اصحابِ علم و دانش اپنے ذوق کے مطابق اور اس دور کی ضروریات کے مطابق موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں ان پر تجزیاتی و تحقیقی مقالات سامعین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں جنھیں بعد میں اکثر کتابی شکل دے دی جاتی ہے۔

سیرت نبویؐ کی بیش قدر خدمت کے اس جدید انداز پر بھی سیرت چیئر، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور منفرد اور وقیع علمی خدمات انجام دینے کا اعزاز رکھتی ہے۔تا حال تین بین الاقوامی سیرت کانفرنسز کا انعقاد سیرت چیئر کے زیر اہتمام ہو چکا ہے۔پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۱-۱۳ فروری ۲۰۰۰ء کے ۳۹ مقالات بعنوان ''مقالات سیرت نبوی ﷺ'' دو جلدوں میں، ۲۰۰۵ء میں سیرت چیئر کے زیر اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی عنایت بے نہایت سے ان مقالات کی اندرون و بیرون ملک بے حد پذیرائی ہوئی ہے۔اہل علم کا ان مقالات کا دوبارہ اشاعت کا مطالبہ جناب وائس چانسلر ڈاکٹر بلال اے خان کی خدمت میں پیش کیا گیا اور انھوں نے سیرت النبی ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان مقالات کو دوبارہ طبع کرانے کی اجازت عنایت فرما دی ہے۔بہت جلد ان مقالات کا دوسرا ایڈیشن زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا (ان شاء اللہ العزیز)۔

دوسری بین الاقوامی سیرت کانفرنس بعنوان ''جدید تناظر میں مسلم امہ کے مسائل اور ذمہ داریاں۔حیات طیبہ ﷺ کی روشنی میں'' منعقدہ ۱۷-۱۹ فروری ۲۰۰۴ء اور تیسری بین الاقوامی سیرت کانفرنس بعنوان

''تدوین حدیث، چودہ صدیوں میں ہونے والے کام کا علمی و تحقیقی جائزہ''

''موجودہ دور میں حدیث و سیرت کی نشر و اشاعت کی ضرورت و اہمیت''

منعقدہ ۲۰-۲۲ اپریل ۲۰۰۷ء کے مقالات بھی منتظر اشاعت ہیں۔

اس خادمِ سیرت النبیؐ کو مختلف کانفرنسز اور سیمی نارز میں مختلف اوقات میں متنوع موضوعات پر مقالات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی ہے، میرے پیش کردہ مقالات سیرت النبی ﷺ کی طویل فہرست میں سے یہ مقالات شائقین سیرت کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔

ان مقالات میں سیرت النبی ﷺ کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور سیرت النبی ﷺ سے عصرِ حاضر کے مسائل کے لیے علمی وفکری اور عملی وتطبیقی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کو ترجیح دی گئی ہے۔

وائس چانسلر، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور کی متحرک شخصیت نے ذاتی دلچسپی اور شبانہ روز محنت کی بدولت یونیورسٹی کو ایک جنگل سے جدید علمی بستی اور ویرانۂ دشت کو خوبصورت مدینۃ العلم کے روپ میں ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ یونیورسٹی اساتذہ کو بھی مسلسل علمی وتحقیقی کاموں کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے اس رویے سے حوصلہ پاتے ہوئے راقم الحروف نے سیرت النبی ﷺ پر منتخب ذاتی مقالات کو مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

یہ تمام مقالات عصر حاضر کے جدید مسائل کے حل کے لیے سیرت النبی ﷺ سے روشنی کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ مقالات کی تیاری میں ممکنہ ماخذ ومصادر سے حتی الامکان استفادہ کی کوشش کی گئی ہے۔ عنوان مقالہ کے بھرپور احاطہ کی غرض سے تمام پہلوؤں کا باریک بینی اور دقت نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان مقالات میں سیرت نگاری کے آغاز وارتقاء کے ساتھ خصوصاً برصغیر میں سیرت نگاری کے لیے مساعی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مستشرقین اور سیرت سے متعلق لوازمے کے لیے ڈاکٹر نثار احمد صاحب اور دیگر احباب کی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان مقالات میں سے بعض بین الاقوامی اور بعض ملکی سطح کی کانفرنسوں میں سامعین کے سامنے پڑھے گئے جب کہ بعض مختلف علمی وتحقیقی مجلّات میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

مقالات کی جمع وترتیب میں کتب کی دستیابی میں ممکنہ تعاون پر اپنے طالب علموں کا بالعموم جبکہ ساجد اسد اللہ رندھاوا اور لیاقت علی (پی ایچ ڈی سٹوڈنٹس)، حافظ محمد شعیب آف بلتستان، حافظ سلطان محمود ریسرچ سکالر (سیرت چیئر) اور سعدیہ پروفیسر اسسٹنٹ کا خاص طور پر شکر گزار ہوں۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد اور پروفیسر ڈاکٹر خالد ظفر اللہ، پرنسپل گورنمنٹ کالج سمندری بھی اس علمی اور تحقیقی کام میں معاونت پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ مقالہ جات کی ترتیب اور علمی مواد کے سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی، پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز، پروفیسر ڈاکٹر سفیر اختر، پروفیسر ڈاکٹر اکرم چوہدری، ڈاکٹر حافظ سجاد تنزالوی اور پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت سے بھی مشاورت کا بھی سلسلہ جاری رہا۔

شعبہ علوم اسلامیہ کے تمام اساتذہ کرام اور بالخصوص پروفیسر ڈاکٹر شمس البصر، چیئر مین شعبہ علوم اسلامیہ نیز پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق خان، ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ کی وقیع مشاورت مجھے حاصل نہ ہوتی تو یہ مقالات بھرپور علمی و تحقیقی رنگ میں نہ رنگے جاتے۔

ان مقالہ جات کی کمپوزنگ میں دن رات محنت کرنے والے فضل احمد، سٹینو سیرت چیئر اور اسد حسین بلوچ شعبہ حدیث و سیرت کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر لازم ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر ڈاکٹر محمد جاوید اختر، وائس پرنسپل ایس ای کالج بہاولپور کی ہمہ وقتی معاونت کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔

اہل خانہ کی دن رات خدمت گزاری اور میرے لیے لکھنے پڑھنے کا ماحول میسر کرنا ہی ان مقالات کی تکمیل کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اہل خانہ اور والدہ صاحبہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے جن کی دعاؤں اور خدمات کی بدولت میری علمی و تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں۔ میرے بیٹے ڈاکٹر حافظ عبدالخالق، حماد ظفر، بیٹی حافظہ میمونہ تبسم اور بھائی ابوبکر اس کار خیر میں میرے معاون رہے، اللہ تعالیٰ انھیں سیرت نبویؐ کا عملی نمونہ بنائے۔ میرے ماموں پروفیسر میاں عبدالمجید اور مولانا محمد شریف حصاری نے بھی میری بہت زیادہ معاونت کی۔ والد (مرحوم) رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

اساتذہ کرام بالخصوص شیخ مکرم الدکتور محمد سعید الباذنجی الندوی آف حلب (شام) کی علمی سرپرستی ہر گھڑی میرے لیے باعث تقویت ہوتی ہے۔

عزیزم رفیع الدین حجازی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے ادارہ ''نشریات'' کے

زیر اہتمام بہت خوبصورت انداز میں ان مقالات کو شائع کیا۔

ربّ محمد ﷺ کے حضور دعا گو ہوں کہ مجھے سیرتِ محمدیؐ میں ایسا رنگ دے کہ آپ کی بارگاہ اقدس میں قبولیت کے شرف کا سزاوار ٹھہروں۔ بلکہ ان مقالات کے ہر قاری کو ایسا ہی کر دے تاکہ سیرتِ محمدیؐ کی روشن اور باعزت راہ پر چل کر ہم پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پا سکیں۔ آمین ثم آمین!

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

ڈائریکٹر، سیرت چیئر

اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

باب اوّل

سیرت نگاری

سیرت نگاری: آغاز و اِرتقا

سیرت کا لغوی معنی:

''سیرت'' عربی زبان کا لفظ ہے جسے عربی میں ''السیرة'' لکھا جاتا ہے۔ سیرت کا مادہ سیر بمعنی چال سے ہے۔ اس طرح اچھے چال چلن کو ''حسن السیرة'' بھی کہا جاتا ہے۔ ابن منظور نے اپنی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں لکھا ہے کہ ''السیر'' کے معنی چلنا پھرنا ہے۔ سیرۃ کا لفظ مسافت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور السیارة کے معنی قافلہ ہیں۔ اسی طرح السیرة کے معنی ہیئت کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ: ﴿ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى ﴾ (۱) (ہم اسے اسی ہیئت میں کر دیں گے، جیسی یہ پہلی تھی) پھر سیرۃ کے معنی پہلے لوگوں کے واقعات واحادیث بیان کرنا بھی ہے (۲)۔

القاموس المحیط میں علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں: ''السِیرة بالکسر: السنّة والطریقة والھیئة والمسیرةَ لسِیرة '' س کے زیر کے ساتھ سنت، طریقہ، ہیئت اور مسافت کے معنوں میں مستعمل ہے (۳)۔

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مصباح اللغات میں لکھتے ہیں: السیــرة، ســار کا اسم ہے۔ یہ عادت، طریقہ، طرز زندگی، ہیئت، سوانح عمری، لوگوں کے ساتھ سلوک کی کیفیت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے (۴)۔''

لوئس معلوف کی مشہور کتاب المنجد فی اللغة میں السیرۃ کی توضیح اس طرح کی گئی ہے:

''السیرة اسم من سار، السنة والطریقة والمذھب والھیئة. السیرة سار، یسیر کا اسم ہے بمعنی سنت، طریقہ، مذہب اور ہیئت۔ ''سیرة الرجل: صحیفة أعماله وکیفیة سلوکه بین الناس '' (کسی شخص کی سیرت کا مطلب ہے اس شخص کی سوانح حیات اور لوگوں کے ساتھ اس کے برتاؤ کا انداز)۔ یقال ھو حسن السیرة ومنه قولھم ''من طابت سریرته حمدت سیرته '' (۵) (کہا جاتا ہے کہ فلاں اچھے چال چلن کا حامل ہے اور اسی سے عرب کا قول ہے کہ جس کا باطن پاکیزہ ہوتا ہے اس کا کردار قابل ستائش ہوتا ہے)۔

الزبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے "سار الوالی فی رعیتہ سیرۃ حسنۃ"(٦) (حاکم نے رعایا کے ساتھ اچھے طریقہ کا برتاؤ کیا)۔

"اُردو انسائیکلو پیڈیا" میں سیرۃ کا مطلب، "سوانح عمری" لکھا گیا ہے(۷)۔

سیرت علم تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ جیسا کہ فیروز اللغات میں "علم تاریخ" بیان ہوا ہے(۸)۔

سیرت کا معنی نسیم اللغات میں "ذاتی جوہر" بھی بیان کیا گیا ہے(۹)۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں سیرت کا مفہوم طریقہ ومذہب، سنّت، ہیئت، حالت اور کردار تک محدود نہیں بلکہ اس سے مراد داخلی شخصیت، اہم کارنامے اور اکابر کے حالات زندگی بھی ہیں (۱۰)۔

پروفیسر عثمان خالد یورش نے لفظ سیرت کے معانی کی توضیح کے لیے قرآن مجید کی اس آیت کو پیش نظر رکھا ہے:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾(۱۱)(اے نبی! ﷺ لوگوں سے کہو کہ زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کیا کا انجام ہوا؟)

اور کہا ہے کہ "سیر" کا لفظ، غور سے مثبت وٹھوس حقائق کی تلاش میں چلنا، غور وخوض کرنا، عاقبت اندیشی سے کام لینا اور نیک افعال واعمال سے کردار کی تعمیر کرنا وغیرہ سے عبارت ہے۔ خود قرآن پاک نے "سیرو" کا لفظ نیک تحریک وعوامل سے مکمل کر دیا ہے۔ پس سیرت کسی نیک طینت اور پاک سرشت انسان کے قواعد وحرکات کا مکمل اور معیاری مجموعہ ہوتا ہے(۱۲)۔

عربی لغت "مصباح اللغات" میں لفظ سیرت کے لیے پہلے بیان کردہ سب تعریفوں کی نسبت زیادہ وسیع معانی درج کیے گئے ہیں:

۱۔ جانا، روانہ ہونا، چلنا۔ ۲۔ روش، طریقہ۔

۳۔ شکل وصورت۔ ۴۔ ہیئت۔

۵۔ حالت۔ ٦۔ کردار۔

۷۔ سنّت۔

۸۔ طرز زندگی، کام کاج کرنے کا چلن، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ

۹۔ عادت۔

۱۰۔ کہانی، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان وغیرہ (۱۳)۔

قرآن مجید میں السَّیر اور السِّیرۃ کے الفاظ انھی لغوی معانی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ طور میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (۱۴) (اور پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑیں گے)۔

اسی طرح دوسری جگہ سورۂ القصص میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَلَمَّا قَضَى مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا﴾ (۱۵) (پس جب موسیٰ اپنی مدت پوری کر چکے اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر چل دیے تو ان کو کوہِ طور کی طرف سے آگ (روشنی) دکھائی دی)۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ سیرۃ کا لفظ (۱) جانا، روانہ ہونا، چلنا (۲) روش، طریقہ (۳) طرز زندگی، زندگی کے نشیب و فراز (۴) عادت (۵) شکل وصورت اور ہیئت (۶) کردار (۷) قصے، کہانی، سابقہ واقعات (۸) اور ایسی سوانح جسے غور وخوض کے ساتھ لکھا اور بیان کیا جائے ان سب معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سیرت کا اصطلاحی مفہوم:

جہاں تک سیرت کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے اردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق سیرت کا لغوی مفہوم اگر چہ کسی نیک سرشت انسان کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے، لیکن اصطلاح میں اس سے مراد آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور اخلاق وعادات کا بیان ہے (۱۶)۔ اس لفظ کا اطلاق حضور سرورِ کائنات ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر پہلے بھی ہوتا رہا اور یہ اب بھی اس کا اصطلاحی مفہوم ہے۔

اصطلاح میں محمد علی الفاروقی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی اور اخلاق وعادات بیان کرنے کا نام سیرت ہے (۱۷)۔

مولانا ادریس کاندھلوی کے مطابق آنحضرت ﷺ کی اصل سیرت تو سارا ذخیرۂ احادیث ہے لیکن متقدمین کی اصطلاح میں فقط غزوات وسرایا کے حالات وواقعات کے مجموعہ کو سیرت کہتے ہیں (۱۸)۔

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ کے مطابق ایک طویل تاریخی عمل کے بعد لفظ سیرت ایک اصطلاح بن گیا، اب جس جگہ بھی لفظ سیرت استعمال ہوگا اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال ہیں۔لہٰذا سیرت رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال اور دیگر احوال کے مجموعے کا نام ہے(۱۹)۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق سیرت کا اطلاق آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی (سوانح) پر ہوتا رہا ہے اور اب بھی اس کا خصوصی مفہوم یہی ہے(۲۰)۔

فقہاء و محدثین کے ہاں لفظ سیرت و سیر مغازی اور جہاد کے معنوں میں مستعمل ہے چنانچہ امام مسلم کی الجامع الصحیح (م۲۶۱ھ) میں کتاب السیر والجہاد(۲۱) امام بخاری کی الجامع الصحیح میں کتاب المغازی والسیر کے عنوانات موجود ہیں(۲۲)۔فقہ میں بھی یہ لفظ انھی معنوں میں مستعمل ہے بلکہ اسی نام سے متعدد کتب ہیں تمام بڑی کتب فقہ میں کتاب الجہاد والسیر کے عنوانات ملیں گے اسی طرح مستقل کتب بھی لکھی گئی ہیں جیسے ابن اسحٰق اور واقدی کی کتب کو کتب سیر کے ساتھ کتب مغازی بھی انھی معنوں میں کہا جاتا ہے(۲۳)۔

محمد سرور کی رائے ہے سیرت کا لفظ جب مطلقاً بولا جاتا ہے تو شریعت میں اس سے مراد وہ کام ہے جس کو کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا یا جس سے روکا یا جسے جائز سمجھا(۲۴)۔

شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ کے مطابق:''آنچہ متعلق بوجود پیغمبر ما صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرامش و آں عظام است واز ابتدائے تولد آنجناب تا غایت وفات آن را سیرت گویند''(۲۵)(جو کچھ ہمارے پیغمبرؐ اور حضرات صحابہ ؓ کی عظمت اور ان کے وجود سے متعلق ہو جس میں آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات بیان کیے گئے ہوں وہ سیرت ہے)۔

مذکورہ بالا اصطلاحی تعریف دیگر تعریفوں سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔اس میں نبی اکرم ﷺ کی ذات و سیرت کے بیان کے ساتھ صحابہ ؓ کی ذات و سیرت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

لفظ سیرت اس وسیع معنی میں قدیم زمانہ سے مستعمل ہے اور اس نام سے دوسروں کے حالات میں کتابیں لکھی گئی ہیں، عوانہ بن حکم کلبی (م۱۴۷ھ) نے کتاب سیرۃ معاویہ و بنی امیہ، ابراہیم بن محمد فزاری (م۱۸۸ھ) نے کتابُ السِیَر فی الاخبار والاحداث، اور واقدی (م۲۰۷ھ) نے کتاب السیرۃ اور

کتاب سیرۃ ابی بکر و وفاتہ لکھی (۲۶)۔

قرآن مجید میں لفظ ''اُسوۃ'' سیرت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اُسوۃ کے معنی ہیں نمونہ۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۷) (تمھارے لیے اللہ کے رسول بہترین نمونہ ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم﴾ (۲۸) (تحقیق آپ کے۔ لیے ابراہیم میں بہترین نمونہ ہے)۔

حدیث میں لفظ سیرت کا مترادف لفظ '' سنت '' استعمال ہوا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''من رغب عن سنتي فليس منا'' (۲۹) (جس نے میرے طرز حیات کو چھوڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

سیرت نبوی ﷺ کے لیے ابتداء ''مغازی'' یعنی غزوات کا لفظ استعمال ہوتا تھا (غزوہ ایسی جنگ کو کہا جاتا ہے جس میں خود نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس شرکت کی ہو) (۳۰)۔

حافظ ابن حجر کی تحقیق اور تجزیہ کے مطابق ابتداء میں مغازی کی اصطلاح محدود مفہوم کی حامل تھی۔ مغازی عروۃ بن زبیر، مغازی ابان بن عثمان، مغازی محمد بن شہاب زہری، مغازی ابن اسحاق، مغازی موسیٰ بن عقبہ اور مغازی واقدی وغیرہ سیرت کی کتابیں ہیں۔ اوران میں مغازی کی طرح رسول اللہ ﷺ کے حالات بیان کیے گئے ہیں (۳۱)۔

سیرت کا لفظ صاحبِ سیرت کے پورے احوالِ زندگی پر بولا جاتا ہے، اور محدثین ومؤرخین نے ''کتاب السیرۃ'' کے نام سے رسول اللہ ﷺ کے حالات جمع کیے ہیں جن میں مغازی کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، البتہ فقہاء کے نزدیک یہ سیرت کا وسیع مفہوم نہیں ہے بلکہ جہاد اور غزوات میں رسول اللہ ﷺ نے کفار ومشرکین کے ساتھ جو معاملہ فرمایا ہے، وہ اس کو سیرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کی جمع سِیَر ہے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

''والسِیَر جمع سيرة، وأُطلق ذلك على أبواب الجهاد، لأنها متلقاة من أحوال النبي ﷺ في غزواته'' (۳۲) (سِیَر لفظ سیرۃ کی جمع ہے اور اس کا اطلاق جہاد کے ابواب پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ان حالات سے ماخوذ ہوتے ہیں جو غزوات میں پیش آئے)۔

ابتدا میں سیرت میں خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے غزوات کا ذکر کیا جاتا تھا۔اس لیے سیرت کے معانی میں خصوصیت سے آنحضرت ﷺ کے مغازی کا بیان اور بعدازاں آپ ﷺ کی زندگی کے حالات کا بیان شامل ہوگیا۔

شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ ''کئی صدیوں تک یہی طریقہ رہا؛ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں۔البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوااور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں۔ مثلاً ''مواھب اللدنیۃ'' میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے'' (۳۳)۔

ابتداء مغازی کا لفظ استعمال ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پچھلے زمانہ میں حکمرانوں کا بنیادی کارنامہ ان کی فتوحات ہوا کرتی تھیں۔لہٰذا کسی حکمران کی بڑائی یہی تھی کہ اس نے جنگیں کی ہوں۔یہی کسی شخص کے بڑا ہونے کا معیار مقرر تھا۔اسی رسم کے تحت پہلے پہل آپ ﷺ کے مغازی کی تدوین کا رواج ہوا۔

پس ابتدائی کتابوں میں آپ ﷺ کے غزوات کا تذکرہ زیادہ اور حیات طیبہ کا ذکر کم ہوتا تھا بعد میں چونکہ حیات طیبہ کا حصہ کثرت سے شامل ہوگیا اس لیے اس کا سابقہ صحیح نام ''سیرت'' استعمال ہونے لگا۔انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (The Encyclopeadia of Islam) کے مقالہ نگار جی لیوی ڈیلا ویڈا (G. Levi Della Vida) کی تحقیق کے مطابق حضور ﷺ کی سوانح عمری کے لیے ''سیرت'' کا استعمال سب سے پہلے ابن ہشام نے کیا ہے۔وہ اپنی کتاب کو ھذا کتاب سیرۃ رسول اللّٰہ کا نام دیتے ہیں (۳۴)۔

سیرت نگاری کا آغاز وارتقا:

بعض اوّلین سیرت نگاروں نے سیرت پر جو کتابیں لکھیں ان میں غزوات زیادہ ذکر کیے گئے ہیں، لیکن بعد میں یہ فن غزوات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا بلکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی تفصیل سے لکھا جانے لگا۔مثال کے طور پر ابن سعد (م ۲۳۰ھ) کی ''الطبقات الکبریٰ'' میں آنحضرت ﷺ کے دوسرے احوال بھی لکھے گئے ہیں (۳۵)۔

اوّلین علماء جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے شب وروز کو قید الفاظ میں ڈھالا۔ان میں سے نمایاں سیرت نگار درج ذیل ہیں:

۱۔ سہل بن ابی حثمہ (م ۴۱ھ)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ﷺ (م ۶۳ھ)

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ (م ۶۸ھ)

۴۔ براء بن عازب ﷺ (م ۷۴ھ)

۵۔ محمد بن سعد بن ابی وقاص قرشی زہری (م ۸۲)

۶۔ عروۃ بن الزبیر (م ۹۴ھ)

۷۔ سعید بن المسیب (م ۹۴ھ)

۸۔ عبیداللہ بن کعب (م ۹۷ھ)

۹۔ حضرت ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ)

۱۰۔ ابو محمد القاسم بن محمد بن ابی بکر (م ۱۰۷ھ)

۱۱۔ الشعبی (م ۱۰۹ھ)

۱۲۔ وہب بن منبہ (م ۱۱۰ھ)

۱۳۔ عاصم بن قتادہ (م ۱۲۰ھ)

۱۴۔ شرحبیل بن سعد (م ۱۲۳ھ)

۱۵۔ ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ)

۱۶۔ یزید بن رومان (م ۱۳۰ھ)

۱۷۔ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمر بن حزم (م ۱۳۵ھ)

۱۸۔ داؤد بن الحصین (م ۱۳۵ھ)

۱۹۔ ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (م ۱۳۷ھ)

۲۰۔ یعقوب بن عتبہ (م ۱۳۸ھ)

۲۱۔ موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ)

۲۲۔ السبیعی (م ۱۴۷ھ)

۲۳۔ محمد بن اسحٰق (م ۱۵۰ھ)

۲۴۔ معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ)

۲۵۔ ابومعشر السندی نجیح بن عبدالرحمٰن (م ۱۷۰ھ)

۲۶۔ معتمر بن سلیمان بن طرخان التیمی البصری (م ۱۸۷ھ)

۲۷۔ یحییٰ بن سعید الاموی (م ۱۹۴ھ)

۲۸۔ ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ)

۲۹۔ ابومحمد عبدالملک بن ہشام الحمیری (م ۲۱۸ھ)

۳۰۔ محمد بن سعد بصری بغدادی (م ۲۳۰ھ)

اوّلین سیرت نگار:

۱۔ عروۃ بن زبیر (م ۹۴ھ):

عروۃ بن زبیر بن العوام حدیث اور مغازی کے بہت بڑے عالم تھے۔(۳۶) انھوں نے بھی کتاب المغازی لکھی جو ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کی کوشش و تحقیق سے طبع ہوئی۔ یہ کتاب محمد سعید الرحمٰن علوی کے اردو ترجمہ کے ساتھ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ):

سیرت نگاری کے موضوع پر اوّلین مغازی لکھنے والوں میں ابان بن عثمان کا نام سرفہرست ہے۔(۳۷) ان کی جمع کردہ روایات میں آپ ﷺ کے غزوات کا ذکر ملتا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مجموعۂ مغازی تیار کیا تھا(۳۸)۔

۳۔ وھب بن منبہ (م ۱۱۰ھ):

مغازی نگاروں میں ایک اہم نام تابعی وہب بن منبہ کا ہے۔ جن کے نام سے منسوب ایک صحیفہ کا ذکر کتب حدیث میں ملتا ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ "مغازی میں سب سے پہلے عروۃ بن زبیر نے تصنیف کی، اس کے بعد اس فن کو وہب بن منبہ نے جمع کیا(۳۹)۔

۴۔ عاصم بن عمر بن قتادۃ انصاری مدنی (۱۲۰ھ):

آپ کا پورا سلسلہ نسب عاصم بن عمر بن قتادۃ بن النعمان انصاری اوسی ظفری ہے (۴۰)۔ مشہور تابعی ہیں، ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ وہ سیر و مغازی کے عالم ہیں (۴۱)۔ امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ عمر بن قتادۃ اخبار کے عالم اور مغازی کے علامہ ہیں۔

۵۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (م ۱۲۴ھ):

عظیم المرتبت تابعی ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری اوّلین سیرت نگاروں میں سے ہیں۔ حضور ﷺ کے ننھیال قبیلہ بنو زہرہ سے ان کا تعلق تھا ان کی اکثر کتب ضائع ہوگئیں، آپ نے المغازی کے نام سے سیرت و مغازی پر جامع کتاب لکھی جو مستند سمجھی جاتی ہے (۴۲)۔

۶۔ موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ):

موسیٰ بن عقبہ بن ابی عیاش الاسدی صحابی رسول ﷺ حضرت زبیر ؓ بن العوام کے قبیلہ کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) تھے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ انھوں نے کتاب المغازی لکھی۔ مسجد نبوی میں درس مغازی دیتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ امام زہری کے شاگرد تھے۔ ان کی کتاب المغازی کو مختلف کتب سے جمع کیا گیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی ثقہ ہے۔ (۴۳) ''مغازی موسیٰ بن عقبہ'' حسین مرادی کی تحقیق سے شائع ہوئی (۴۴)۔

۷۔ محمد بن اسحاق (م ۱۵۰ھ):

محمد بن اسحاق بن یسار بن خیار اکابر سیرت نگاروں میں سے ہیں۔ آپ نے کتاب المغازی کے نام سے سیرت و مغازی پر جامع کتاب لکھی۔ یہ کتاب المغازی اور کتاب المبتدا والمغازی جیسے ناموں سے مشہور ہے۔ آپ مغازی کے صاحب مناقب امام ہیں (۴۵)۔ ان کی یہ کتاب ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے ساتھ ترکی شائع ہوئی اسی طرح سہیل زکار کی تحقیق کے ساتھ بھی شائع ہوئی۔

۸۔ معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ):

آپ کا پورا سلسلہ نسب معمر بن راشد الازدی الحدانی ابوعروۃ بن ابی عمرو البصری ہے (۴۶)۔

آپ نہایت ثقہ، حافظ حدیث اور سیر و مغازی کے امام و مصنف ہیں۔ "**الفہرست**" میں ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے (۴۷)۔ ان کی کتاب **المغازی** کا اکثر حصہ عبدالرزاق صنعانی نے کتاب "**المصنف**" میں اپنی روایت سے بیان کر کے محفوظ کر دیا ہے (۴۸)۔

۹۔ ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی (م ۱۷۰ھ):

آپ کا سلسلہ نسب ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی المدنی ہے (۴۹)۔ آپ صاحب المغازی والاخبار تھے۔ خطیب بغدادی کے نزدیک آپ مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے، اور فتح الباری میں کئی مقامات پر ان کی روایات نقل کی گئی ہیں۔

۱۰۔ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ):

ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی مشہور سیرت نگار ہیں۔ ان کی کتاب المغازی سیرت کے بنیادی ماخذوں میں شمار ہوتی ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ (۵۰) انھوں نے مدینہ کے مشہور محدثین مالک بن انس، معمر بن راشد، ابو معشر سندی وغیرہ سے استفادہ کیا۔ "**الفہرست**" کے مطابق واقدی نے چھ سو صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے چھوڑے تھے۔ (۵۱)۔

۱۱۔ ابن ہشام (م ۲۱۸ھ):

ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری کی مشہور عالم کتاب "السیرۃ النبویۃ ﷺ" ہے (۵۲)۔ سیرت کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو محفوظ طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ابو محمد عبدالملک بن ہشام البصری نحوی، صاحب المغازی ہیں، انھوں نے ابن اسحاق کی کتاب السیرۃ کو بہترین انداز میں مرتب کیا اور اس کو ابن اسحاق کے شاگرد بکائی سے نقل کیا۔ اس کے انگریزی، جرمن اور اردو میں بھی تراجم ہو چکے ہیں (۵۳)۔

۱۲۔ محمد بن سعد بصری بغدادی (م ۲۳۰ھ):

آپ کا پورا سلسلہ ابو عبداللہ محمد بن منیع ہاشمی البصری ہے۔ آپ واقدی کے شاگرد ہیں اور کاتب الواقدی کہلاتے ہیں (۵۴)۔ آپ صاحب الطبقات ہیں۔ سیر و مغازی، تاریخ، حدیث و فقہ، اخبار و احداث کے ثقہ امام ہیں۔ طبقات ابن سعد کی ۹ جلدوں میں سے پہلی دو جلدیں "سیرت والمغازی"

کے بیان میں لکھی گئی ہیں (۵۵)۔

متاخرین کی کتب سیرت:

شرف المصطفیٰ ..... حافظ ابو سعید عبد الملک نیشاپوری (۴۰۶ھ) نے ۸ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے۔

جوامع السیرۃ .... امام ابن حزم (م ۴۵۶ھ)۔

الدرر فی اختصار المغازی و السیر .... امام ابو عمر یوسف بن عبد البر (م ۴۶۳ھ)۔

الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ .... قاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی (م ۵۴۴ھ)۔

الروض الانف شرح السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ..... امام ابو القاسم عبد الرحمٰن السہیلی (م ۵۸۱ھ)۔

الاکتفا فی مغازی المصطفیٰ .... ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی (م ۶۳۴ھ)۔

المختصر فی سیرۃ سید البشر المعروف سیرۃ دمیاطی ..... حافظ عبد المومن دمیاطی (م ۷۰۵ھ)

عیون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل و السیر .... ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ)۔

زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ..... شمس الدین امام ابن قیم جوزیۃ، ابو عبد اللہ محمد بن بکر (م ۷۵۱ھ)

السیرۃ النبویۃ .... حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)۔

بھجۃ المحافل .... یحییٰ بن ابی بکر العامری (م ۸۹۳ھ)۔

المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ .... احمد بن محمد الخطیب القسطلانی (م ۹۲۳ھ)۔

السیرۃ الشامیۃ .... محمد بن یوسف الشامی (م ۹۴۲ھ)

السیرۃ الحلبیۃ .... نور الدین علی بن برہان الدین الحلبی (م ۱۰۴۴ھ)۔

اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفیٰ و فضائل اھل بیت الطاھرین ..... ابو الوفا محمد بن علی الصبان (م ۱۲۰۶)۔

شرح المواھب اللدنیۃ .... محمد بن عبد الباقی الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ)۔

السیرۃ النبویۃ و الآثار المحمدیہ المعروف سیرت دحلانیۃ ..... سید احمد زینی دحلان (م ۱۳۰۴ھ)

سیرت النبی ﷺ کی اہمیت وضرورت:

امت مسلمہ کے افراد کے لیے سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ محض ایک عملی مشغلہ نہیں ہے۔ بلکہ دنیا وآخرت میں کامیابی وکامرانی کے لیے ایک دینی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کی رو سے سیرت کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت میں کامیابی رکھی ہے اور حکم دیا ہے کہ نبی ﷺ جس کام سے تمھیں روکیں اس سے رک جاؤ اور جس کام کے کرنے کا حکم دیں اس کی تعمیل کرو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (۵۶) (جو کچھ رسول ؐ تمھیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس کے لیے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی محبت وخوشنودی حاصل کرنے کے لیے نبی ﷺ سے محبت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (۵۷) (کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا)۔

زندگی گزارنے کا بہترین نمونہ نبی کریم ﷺ کا اسوہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ (۵۸) (تمھارے لیے اللہ کے رسول ؐ میں ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو)۔

اللہ تعالیٰ نے نبی ؐ کی اطاعت اپنی اطاعت قرار دی ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۵۹) (جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔

اعمال کی درستگی کے لیے اطاعتِ نبی ﷺ ضروری ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا أَعْمَالَكُمْ﴾ (۶۰) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرلو)۔

اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا حصول اطاعت نبی ﷺ میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (۶۱) (اور اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)۔

ہدایت کے حصول کا ذریعہ بھی اتباع رسول ﷺ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (۶۲) (اس رسول ؐ کی (سیرت) کی اتباع کرو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ)۔

﴿وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا﴾ (۶۳) (اگر تم اس رسول ؐ کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے)۔

پس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و محبت، راہِ نجات و ہدایت، فلاحِ عاقبت اور اعمال کی درستگی کے لیے نبی ﷺ کی پیروی کرنا لازمی ہے۔ جس کے لیے سیرت طیبہ کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔

حدیث کی رُو سے سیرت کی اہمیت:

رسول کریم ﷺ نے خود کتاب اور سنت (سیرت) کو ایک حکم میں رکھ کر امت مسلمہ کو ان پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''**اِنِّیُ ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بهما کتب اللّٰه وسنتي** '' (۶۴) (میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ جب تک تم انھیں تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے)۔

اس حدیث میں سنت سے مراد سیرت رسول ﷺ ہے۔ جس کے تمسک سے مسلمان کامیاب ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**من اطاعني فقد اطاع اللّٰه ومن عصاني فقد عصی اللّٰه** '' (۶۵) (جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی)۔

اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا: ''میری تمام امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ (صحابہ رضی اللہ عنہم نے) کہا کون انکار کرتا ہے؟ فرمایا جس نے اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا (۶۶)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین، اس کی اولاد، اور تمام لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں'' (۶۷)۔

قرآن مجید میں بارہا ادائیگی نماز کا حکم دیا گیا ہے مگر نماز کیسے ادا کی جائے یہ نہیں بتایا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے جواب دیا: ''**صلوا کما رایتموني**

أصلي "(۶۸) (جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح پڑھو)۔ دیگر عبادات میں بھی نبی ﷺ کی سیرت کو دیکھے بغیر عملی طور پر اُن کو ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

پس درج بالا قرآنی آیات اور ارشادات رسول ﷺ سیرت کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کا سرچشمہ سیرتِ رسولؐ ہے۔

صحابہ کرام ؓ اور سیرتِ طیبہ:

جب رسول کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو رسول کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، آپ ﷺ نے پوچھا اگر کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو؟ انھوں نے جواب دیا پھر سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر سنت رسول میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کا سینہ ٹھونکا اور فرمایا؟ "حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کی رائے کو اللہ کے رسولؐ کی مرضی کے موافق کر دیا (۶۹)۔

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ ؓ کو سر منڈوانے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا مگر انھوں نے ذرا تامل کیا، آپ ﷺ پر یہ چیز شاق گزری، اُم المؤمنین سیدہ اُمّ سلمہ کے مشورے پر آپ ﷺ نے خود پہلے سر منڈوایا اور احرام کھولا تب صحابہ کرام ؓ نے فوراً آپ ﷺ کے اتباع میں سر منڈوائے اور احرام کھول دیے (۷۰)۔

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا اور فرمایا کہ میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔ صحابہ ؓ جن کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں، سب نے اتار کر پھینک دیں (۷۱)۔

رسول کریم ﷺ نے خود بھی اپنے راستے یعنی سیرت کو موجب فلاح وہدایت قرار دیتے ہوئے فرمایا: "ان احسن الحدیث کتاب اللّٰہ، واحسن الھدی ھدی محمد ﷺ" (۷۲) (بے شک سب سے بہتر کلام اللہ کتاب ہے اور سب سے بہتر راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے)۔

فقہاءِ اُمت اور سیرت مطہرہ:

امت مسلمہ میں جس قدر فقہا گزرے ہیں ان میں سب نے اپنے فکر کی بنیاد قرآن مجید اور سیرت رسول ﷺ (اقوال واعمال) پر رکھی ہے۔ کسی نے بھی سیرت رسول سے ہٹ کر صرف قرآن مجید ہی کو اپنا مرجع و ماوٰی نہیں سمجھا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: ''ایاکم والقول فی دین اللّٰہ بالرأی وعلیکم باتباع السنة فمن خرج منها ضل ''(۷۳) (اللہ کے دین معاملہ میں رائے اور قیاس سے بچو اور سنت (سیرت) کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ جو سنت (سیرت) سے نکلا وہ گمراہ ہوا)۔

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: ''ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جاسکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے سوائے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے، آپ ﷺ کے قول کو ہر حال اپنانا ہی پڑے گا۔ جس نے رسول ﷺ کے قول (سیرت) کو رد کیا وہ ہلاکت وتباہی کے کنارے پر پہنچ گیا'' (۷۴)۔

ختم الرسل مولائے کل دانائے سُبل علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے ذہنی وفکری انقلاب کی حقیقت کے ادراک کے لیے اور اُس سے فیض یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپ ﷺ کی سیرتِ مطّہرہ سے استفادہ کریں۔ اسی طرح ہم کو آپ ﷺ کی شخصیت کا حقیقی عرفان حاصل ہوسکتا ہے اور ہم عرفانِ قرآن پاسکتے ہیں۔ اسی اہمیت کو قرآن نے منکشف کیا ہے اور اسی سے صحابۂ کرام ؓ، تابعین، تبعِ تابعین اور وابستگانِ مصطفیٰ ﷺ سرفراز ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اوّلاً سیرتِ طیبہ کی اہمیت کو سمجھیں اور اُن حالات وواقعات کا مطالعہ کریں جو سید المرسلین خاتم النّبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد رونما ہوئے تاکہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے ذہنی وفکری انقلاب کے نشان عیاں ہوتے چلے جائیں۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ ﷺ کے احوال زندگی کا عمیق مطالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے ضروری ہے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ مطالعہ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہمیں خالق کائنات نے اپنی کتاب میں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ ﴿ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ﴾ (۷۵) (اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے

سرتابی نہ کرو)۔ہمیں اپنے آپ کو انھی کے رنگ میں رنگنے اور انھی کی سیرت کے مطابق زندگی ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔لیکن ہم اس حکم کی تعمیل صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب کہ سیرت طیبہ سے واقفیت حاصل کرلیں،اسے بار بار پڑھیں،سنیں،دوسروں کو سنائیں،خود یاد رکھیں اور دوسروں کو یاد دلائیں۔

سیرت نبوی ﷺ کے مصادر و مراجع:

آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں کام کرنے والوں کے لیے راہنما اصول ہیں۔آنحضرت ﷺ کی سیرت جتنی جامع اور مستند ہے اتنی کسی اور انسان بلکہ کسی اور پیغمبر کی سیرت بھی جامع اور مستند نہیں ہے۔اس لیے کہ آپ ﷺ کی سیرت مقدسہ کے تمام مآخذ و مصادر اپنی ثقاہت اور استناد میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔آنحضرت ﷺ کی سیرت کے اہم مصادر و ماخذ درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن مجید ۲۔ حدیث نبوی

۳۔ کتب السیرۃ النبویہ والمغازی ۴۔ کتب دلائل النبوۃ

۵۔ کتب شمائل وفضائل نبویؐ ۶۔ تفاسیر قرآن مجید

۷۔ کتب تاریخ الحرمین الشریفین ۸۔ کتب تاریخ اسلام

۹۔ ادب وشاعری

۱۰۔ دستاویزات سیرت،معاہدات،خطبات،مکاتیب،وغیرہ

۱۱۔ کتب انساب ۱۲۔ کتب جغرافیہ عرب

۱۳۔ اسماء الرجال ۱۴۔ قصص الانبیاء والمرسلین

۱۵۔ علم الناسخ والمنسوخ ۱۶۔ کتب مذاہب مقدسہ

۱۷۔ علم لغت ۱۸۔ علم التقویم والتوقیت

۱۹۔ علم قرأت ولھجات عرب ۲۰۔ ادب جاہلی

۲۱۔ علم آثار قدیمہ ۲۲۔ علم آثار صحابہ وصحابیاتؓ

۲۳۔ حکمت وعلم نفسیات

۱۔ قرآن مجید:

سیرت نبوی ﷺ کا مستند ترین ماخذ کلام اللہ ہے۔یہ سیرت کا پہلا اور ابتدائی ماخذ ہے۔جسے

صحابہ ﷺ کی مقدس جماعت نے اس کے نزول کے ۲۳ برسوں میں مشاہدہ کیا اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو طبیعت ثانیہ بنالیا، آپ ﷺ کی سیرت کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں معلومات نہ ہوں اس لیے مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں: ''اگر دنیا میں تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہوجائیں اور صرف قرآن مجید باقی رہ جائے۔ تب بھی آنحضرت ﷺ کی شخصیت مقدسہ اور آپ ﷺ کی سیرت وحیات کے براہین وشواہد مٹ نہیں سکتے'' (۷۶)۔

اسی بارے میں مولانا مودودیؒ یوں فرماتے ہیں: ''اگر کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ دنیا سے مٹ جائے، جو ائمہ اسلام نے سالہا سال کی محنتوں سے مہیا کیا ہے۔ حدیث وسیر کا ایک ورق بھی دنیا میں نہ رہے۔ جس سے محمد ﷺ کی زندگی کا کچھ حال معلوم ہوسکتا ہو اور صرف کتاب اللہ (قرآن مجید) ہی باقی رہ جائے۔ تب بھی ہم اس کتاب سے ان تمام سوالات کا جواب حاصل کرسکتے ہیں جو اس کے لانے والے سے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوسکتے ہیں (۷۷)۔

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ کہ آنحضور ﷺ کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جسے قرآن نے بیان نہ کیا ہو۔

۲۔ کتب حدیث نبوی ﷺ:

آنحضرت ﷺ کی سیرت کا دوسرا اہم اور قابل اعتماد مصدر مستند اور صحیح احادیث ہیں۔ تاریخ عالم میں حدیث کی کتب جیسی ثقہ اور با اعتماد کتابیں اور کوئی نہیں ہیں۔ احادیث کو جن نفوس قدسیہ (صحابہ کرام ﷺ) نے آنحضرت ﷺ سے بیان فرمایا ہے۔ انھوں نے سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھ وقت گزارا، اور پھر دیانت داری سے ہم تک احادیث کو پہنچا دیا، احادیث نبوی ﷺ میں راویوں کا سلسلہ متصل ہے۔ جس کی شہادت غیر مسلم بھی دیتے ہیں (۷۸)۔

کتابت حدیث کی ابتداء خود آنحضرت ﷺ کے زریں دور سے ہوگئی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (ت ۶۵ھ) آنحضور ﷺ کی زندگی میں احادیث لکھتے تھے۔ (۷۹)۔ ان کے مجموعہ کا نام ''الصحیفه الصادقه'' ہے۔ جس کی مکمل روایات مسند احمد میں موجود ہیں (۸۰)۔ ان کے علاوہ دیگر صحابہ ﷺ کے صحائف بھی تھے۔ جن میں حضرت ابوہریرہ ﷺ کے شاگرد ہمام بن منبہ (ت ۱۰۱ھ)

کا صحیفہ بہت مشہور ہے، یہ شائع شدہ ہے(۸۱)۔اس کے بعد اور بھی کئی کتابوں کا ذکر موجود ہے۔لیکن مستند اور معروف صحاح ستہ ہیں۔

۳۔ کتب سیرت نبویہ و مغازی:

آپ ﷺ کی سیرت کے متعلق اصل مصدر و ماخذ کتب سیرت اور مغازی ہی ہیں۔آنحضور ﷺ کو صحابہ ؓ نے دیکھا، آپ ﷺ کے کلام مقدس کو سنا اور آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے رہے۔سفر و حضر میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔آپ ﷺ کے ساتھ جنگوں میں شریک رہے، آپ ﷺ کے ہر اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے تھے۔آپ ﷺ کے متعلق واقعات کو دیانتداری سے بیان فرماتے۔تابعین عظام بھی ان واقعات کو سن کر آگے سناتے اور پھر ان کو احاطۂ تحریر میں لے آتے۔آنحضرت ﷺ کی سیرت پر کام کرنے والے پہلے لوگوں میں درج ذیل معروف ہیں، ان کو عام طور پر تین طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا طبقہ:

۱۔ ابوعبداللہ عروۃ بن الزبیر بن العوام (م ۹۴ھ) (۸۲)

۲۔ حضرت ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ)

۳۔ وھب بن منبہ (م ۱۱۴ھ) (۸۳)

۴۔ شرحبیل بن سعد (م ۱۲۳ھ) (۸۴)

دوسرا طبقہ:

۱۔ عاصم بن قتادہ (م ۱۲۰ھ) (۸۵)

۲۔ محمد بن مسلم بن الشہاب الزھری (م ۱۲۴ھ) (۸۶)

۳۔ عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (م ۱۳۵ھ) (۸۷)

تیسرا طبقہ:

۱۔ موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) (۸۸)

۲۔ معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ) (۸۹)

۳۔ محمد بن اسحاق (م ۱۵۰ھ تا ۱۵۳ھ) (۹۰)

۴۔ ابو محمد زیادہ بن عبداللہ البکائی (م ۱۸۳ھ) (۹۱)

۵۔ ابو محمد عبدالملک بن ہشام الحمیری (م ۲۱۸ھ) (۹۲)

۶۔ محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ) (۹۳)

۷۔ محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ)

سیرت اور مغازی پر ابتدائی طبع شدہ کتب سیرت والمغازی میں ابن اسحاق، السیرۃ النبویۃ ابن ہشام، ابن سید الناس کی عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل اور ابن قیم کی زاد المعاد، القسطلانی کی المواھب اللدنیہ، امام محمد بن یوسف الصالحی الشامی کی سبل الھدیٰ والرشاد وغیرہ ہیں۔

۴۔ کتب دلائل النبوۃ:

یہ کتب، سیرت نبوی ﷺ کا ایک اہم ماخذ ہیں۔ ان میں آنحضرت ﷺ کے بچپن سے وفات تک کے معجزات اور روحانی واردات کا ذکر ہوتا ہے۔ اگرچہ شاہ ولی اللہ نے ان کتب کو نچلے طبقے میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض واقعات و معجزات کا ذکر کتب حدیث میں بھی ہوتا ہے۔ مختلف لوگوں نے اس فن پر بھی بیش بہا کتب لکھیں ہیں۔ ان میں سے درج ذیل بہت مشہور ہیں۔ البیہقی کی دلائل النبوۃ، الماوردی کی اعلام النبوۃ، فریابی کی دلائل النبوۃ اور ابو نعیم اصفہانی کی دلائل النبوۃ معروف کتب ہیں۔

۵۔ کتب شمائل نبوی:

کتب شمائل بھی سیرت نبوی ﷺ کے اہم مصادر میں سے ہیں۔ ان میں آنحضرت ﷺ کے اخلاق، عادات، فضائل، معمولات اور آنحضور ﷺ کے حلیہ مبارک کا ذکر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ باتیں احادیث اور سیرت کی کتب میں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن خاص اسی موضوع پر بھی کتب ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی کتب کا شمار شاہ ولی اللہ نے چوتھے طبقہ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس موضوع پر بھی کئی کتابیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے درج ذیل بہت مشہور ہیں۔ امام ترمذی کی الشمائل المحمدیہ، ابن حیان کی اخلاق النبی، قاضی عیاض کی الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ، اور امام

سیوطی کی خصائص کبریٰ وغیرہ۔

۶۔ کتب تفاسیر قرآن مجید:

قرآن مجید کی تفاسیر بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت کے مصادر میں سے اہم مصدر ہیں۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیات جو آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر روشنی ڈالتی ہیں، ان آیات کی تفسیر کو مدنظر رکھا جائے تو آنحضرت ﷺ کی سیرت کے کئی مخفی پہلو نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (۹۴) (ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا، تاکہ آپ لوگوں کے لیے جو ان کی طرف نازل ہوا ہے۔ بیان کریں) بعض کتب احادیث میں بھی کتب تفسیر موجود ہیں (۹۵)۔

تفاسیر قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر کن حالات میں وہ آیات اتریں؟ آپ ﷺ اس وقت کس مقام پر تھے؟ ان آیات کے مخاطب کون تھے؟ اسباب نزول کیا تھے؟ اس طرح یہ کتب نہ صرف قرآن مجید کی تفسیر ہیں بلکہ ان سے آنحضرت ﷺ کے احوال بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہی ان کو سیرت نبوی ﷺ کا اہم مصدر قرار دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ خود مفسرِ قرآن تھے۔ آنحضرت ﷺ پر آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآن نازل ہوا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمادیا وہ بالکل مستند ہے۔ خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس سلسلہ میں بہت معلومات ملتی ہیں (۹۶)۔

۷۔ کتب تاریخ الحرمین الشریفین:

اس قسم کی کتب کے مؤلفین مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ لکھتے ہیں کہ یہ شہر کس طرح آباد ہوئے۔ مکہ مکرمہ کی تاریخ میں حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ انھوں نے کس طرح مکہ مکرمہ کو آباد کیا۔ پھر اسی طرح خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کا اکثر حصہ مکہ مکرمہ میں گزرا اس کا ذکر کرتے ہیں اور تاریخ مدینہ میں بھی آنحضرت ﷺ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس موضوع پر ابو عبداللہ خاکھی کی تاریخ مکہ، عمر بن شبہ کی تاریخ مدینہ، ازرقی کی اخبار مکہ اور سمھودی کی وفاالوفا باخبار دارالمصطفیٰ ہیں۔

۸۔ کتب تاریخ اسلام:

ان کتابوں میں عام طور پر اسلام کی قبل از بعثت اور بعد از بعثت تاریخ ہوتی ہے۔ یہ مؤلف کے عہد تک ملتی ہیں۔ اس میں آنحضرت ﷺ سے متعلق بھی حالات درج کیے جاتے ہیں۔ مشہور کتب میں ''ابن سعد'' (م ۲۳۰ھ) کی ''طبقات ابن سعد''، خلیفہ ابن خیاط (م ۲۴۰ھ) کی تاریخ خلیفہ ابن خیاط، امام بخاری (م ۲۶۱ھ) کی تاریخ کبیر، تاریخ اوسط اور تاریخ صغیر، ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) کی المعارف، البلاذری (م ۲۷۹ھ) کی فتوح البلدان، تاریخ طبری (م ۳۱۰ھ) تاریخ الاسلام امام ذہبی وغیرہ شامل ہیں۔

۹۔ ادب اور شاعری:

حضرت محمد ﷺ جس قوم میں پیدا ہوئے، وہ ادب اور فصاحت و بلاغت میں معروف تھی اور شعروں سے ان کو محبت تھی۔ جاہلیت کے المعلقات السبعة بہت مشہور ہیں۔ وہ لوگ شعروں کو ہجو، فخر و مباہات اور غزل میں استعمال کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے۔ اچھے کلام کو پسند فرماتے تھے، خواہ وہ شعر ہوں۔ بلکہ آپ ﷺ کے کلام میں خود بڑا اثر تھا۔ لیکن آپ ﷺ ان لوگوں سے الگ تھلگ تھے۔ ابتدا میں آنحضرت ﷺ کی سیرت کے متعلق شاعری کی کتابیں نہ تھیں۔ بلکہ جذبات کے تحت بعض اشعار کہے گئے۔ ان سے آنحضرت ﷺ کی ذات اور اس معاشرے کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار تو زبان زدِ عام و خاص ہیں:

واحسن منك لم ترقط عين

واجمل منك لم تلد النساء

خلقت مبرا من كل عيب

كانك قد خلقت كما تشآء (۹۷)

(اور آپ ﷺ سے خوبرو تو کسی آنکھ نے دیکھا ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ جیسا حسین و جمیل تو کسی ماں نے جنا ہی نہیں۔ آپ ﷺ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں۔ گویا کہ آپ ﷺ کی تخلیق آپ ﷺ کی مرضی کے مطابق ہی ہوئی ہے)

۱۰۔ دستاویزات سیرت، معاہدات، خطبات، مکاتیب، وغیرہ:

سیرت کے مصادر میں وہ تمام معاہدات ومکتوبات، خطوط، آپ ﷺ کے فیصلے وفتاویٰ اور آپ ﷺ کی طبی ہدایات کو بھی شامل کرنا چاہیے، مذکورہ موضوعات سے سیرت نگار کو سیرت کے لیے بہت مواد میسر آتا ہے لہٰذا سیرت نگار کا ان سے استفادہ ضروری ہے۔ سیرت طیبہ ﷺ سے جدا کر کے کچھ پہلوؤں پر الگ حیثیت میں انھیں مدون کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ کے معاہدات ومکتوبات کا پہلو ہے، دوسرے آپ کے فیصلے وفتاویٰ ہیں۔ تیسرے طب کے حوالہ سے آپ ﷺ کی ہدایات ہیں۔ یہ موضوعات درج ذیل اقسام پر مشتمل ہیں:

① نئے معاہدے یا قدیم معاہدوں کی تجدید۔
② تبلیغی نقطۂ نظر سے لکھے ہوئے خطوط۔
③ سرکاری نمائندوں کو ارسال کیے گئے خطوط، احکامات اور ہدایات۔
④ اجراء دستاویزات ملکیت اراضی واجناس وغیرہ۔
⑤ مخصوص افراد کے لیے ہدایات۔
⑥ جوابی خطوط۔
⑦ مسلمانوں یا غیر مسلموں کی جانب سے آپ ؐ کو حکم بنانا اور اس کی روشنی میں فیصلوں کا اجراء عمل میں آنا۔
⑧ مسلمانوں کا آپ ؐ سے کوئی مسئلہ دریافت کرنا اور آپ ﷺ کا جواب عنایت فرمانا۔
⑨ آپ ﷺ کا بیماری میں خود اپنا علاج کرنا۔ بیماری کے لیے دوا تجویز کرنا (۹۸)۔

۱۱۔ کتب انساب:

کتب انساب سے مراد وہ کتابیں ہیں جن میں کسی شخص کے خاندان، قبیلہ، قوم یا نسل کے نسب، رشتہ اور خون کے تعلق سے بحث کی جاتی ہے، عربوں کے ہاں نسب بہت اہمیت رکھتا تھا، انسان تو انسان عرب اونٹ گھوڑوں اور دیگر حیوانات تک میں حسب ونسب کا خیال رکھتے تھے، اسی بنیاد پر انسانوں، قوموں، قبیلوں سے سلوک ومعاملات کرتے تھے، تاریخ کی اس نوع کو سمجھے بغیر اس معاشرہ کو جس میں

ہمارے پیغمبر ﷺ مبعوث ہوئے، سمجھنا ممکن ہی نہیں اور معاشرہ وتہذیب اور رواجات حسب ونسب کی اہمیت کو سمجھے بغیر نبی کریم ﷺ کی معاشرتی مشکلات کو سمجھنا اور آپ کس طرح ان مشکلات سے نبرد آزما ہوئے، معلوم کرنا ممکن ہی نہیں، گویا علم الانساب کے بغیر سیرت کو نہیں سمجھا جا سکتا(۹۹)۔اس موضوع پر اہم کتاب ''الانساب للسمعانی'' ہے۔

۱۲۔ کتب جغرافیہ عرب:

تاریخ ہی کی قسم کتب جغرافیہ اور اقالیم ہیں، جن میں مختلف ممالک اور علاقوں کی تقسیم، ان کے نام بحری اور بری راستوں کے متعلق راہنمائی ملتی ہے۔اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کون سا خطہ کہاں واقع ہے؟ اور اس کے گردونواح میں کون سے ممالک ہیں؟ کب کون سی ریاست کس ملک کے زیرنگیں رہی؟ ان کتب سے ہمیں جزیرۃ العرب کی اسلام سے پہلے کی پوزیشن اور عہد نبوی کے مدو جزر پھر فتوحات و بغاوتوں کے سلسلوں کو سمجھنے میں سہولت اور مدد حاصل ہوتی ہے۔علم جغرافیہ میں جدید اٹلس بھی شامل ہیں۔اس کے بغیر نبی کریم ﷺ کے ہجرت کے لیے منتخب شدہ راستہ کو سمجھنا یا غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھود کر مکہ کا دفاع کرنا یا غزوۂ بدرالکبریٰ کے موقع پر مسلمانوں کا دشمن کو گھیرنا اور ان کا راستہ بدل کر بچ نکلنا، یہ وہ مباحث ہیں جنھیں سیرت نگار انھی کتب کے ذریعہ سمجھ کر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ سیرت کے حوالہ سے بالعموم عرب کی سرزمین وجغرافیہ زیر بحث آتا ہے(۱۰۰)۔

جس طرح کتب تواریخ میں سیرت طیبہ کا تذکرہ ہے۔اسی طرح کتب جغرافیہ میں بھی ہے۔ جیسے بلاذری نے اپنی علم جغرافیہ کی معروف کتاب فتوح البلدان میں آپ ﷺ اور دیگر انبیاء کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۳۔ اسماء الرجال:

سیرتِ رسول ﷺ کا ایک اور اہم ماخذ کتب اسماء الرجال ہیں، جو محدثین اور مصنفین نے بڑی تحقیق اور محنت وکاوش کے بعد مرتب کیں۔رسول اکرم ﷺ کے حالاتِ زندگی چونکہ صحابہ ؓ نے روایت کیے اور اُن سے تابعین نے سنے اور نوٹ کیے اور ان سے آگے تبع تابعین نے سن کر محفوظ کیے، اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ بقولِ شبلی نعمانی ''یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟

سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟...... سیکڑوں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، اُن کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ اُن کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے۔ ان تحقیقات کے ذریعے سے "اسماء الرجال" (بائیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم ایک لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے" (۱۰۱)۔

یہ حالات جن کتابوں میں جمع کیے گئے انھیں "کتب اسماء الرجال" کہا جاتا ہے۔ یہ کتابیں اس لحاظ سے بڑی مفید ہیں۔ چند ایک خاص کتب میں طبقات ابن سعد، تواریخ امام بخاری، کتاب الجرح والتعدیل، استیعاب فی معرفۃ الاصحاب، الکمال فی معرفۃ الرجال، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال، میزان الاعتدال فی نقد الرجال اور تہذیب التہذیب شامل ہیں (۱۰۲)۔

۱۴۔ قصص الانبیاء والمرسلین:

اللہ رب العزت نے اپنی آخری کتاب میں پہلی اُمم اور ان کی تباہیوں کے قصے بیان کیے ہیں۔ قرآن کی واضح تعلیم ہے کہ ان سے عبرت و نصیحت کے نقطۂ نظر سے استفادہ کرو۔ ہمارے پیغمبرؐ پر جو حالات گزرے وہ پچھلوں پر بھی گزرے تھے۔ آپ ﷺ نے متعدد مواقع پر کئی اعمال میں خود کو پچھلے انبیاء کا مشابہ قرار دیا ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان قصص سے استفادہ کرنا چاہیے۔ قصص کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قصص القرآن ۲۔ قصص الحدیث

قرآن کریم نے جن قصوں کو بیان کیا ہے وہ بھی سیرت نگاری کی اصل ہیں اور حدیث میں جن قصوں کو بیان کیا گیا ہے وہ بھی سیرت نگاری کی اصل و ماخذ ہیں۔

قصص الانبیاء پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ آثار القرآن، شبیر احمد خاور، مکتبہ رشیدیہ، لاہور ۱۹۶۸ء، ۱۳۵/ص

۲۔ احسن القصص، محمد نور الدین، عباسی کتب خانہ، کراچی ۱۹۲۲ء، ص ۴۰۔

۳۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں، عبدالماجد دریابادی، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۸۔

۴۔ بصائر الانبیاء (قصص الانبیاء) محمد مہدی بھوپالی، انسٹیٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ص ۱۲۰۔

۵۔ عجائب القصص، حکیم محمد احسن اللہ خاں، نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۴۔

۶۔ قرآن کی کہانیاں، خواجہ حسن نظامی، نظام المشائخ، دہلی۔

۷۔ قصص القرآن، محمد احمد جار اللہ مصری (مترجم مولانا محمد زکریا مائل) ۱۹۵۵ء، ص ۵۰۰۔

۸۔ قصص القرآن، قیصری کانپوری، چلڈرن قرآن سوسائٹی، لاہور ۱۹۶۰ء۔

۹۔ قصص القرآن، ابوبکر عتیق، چاپخانہ گونہ، تہران، ۱۳۶۵ھ، ص ۵۳۴۔

۱۰۔ قصص القرآن، عبدالملک، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی۔

۱۱۔ قصص القرآن، حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۱۰۳)۔

۱۵۔ علم ناسخ ومنسوخ:

ناسخ سے مراد کسی سابقہ شرعی حکم کا ختم کرنا ہے۔ ناسخ ومنسوخ کا قرآن، حدیث اور سیرت سے یکساں تعلق ہے، حدیث کی طرح سیرت کا مصدر بھی نبیؐ کی ذات ہے۔ حدیث کے حوالہ سے اس موضوع پر جو کتب لکھی گئی ہیں اس میں بہت سے پہلوؤں کا تعلق سیرتِ طیبہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت نبی ﷺ کے مصادر میں علم الناسخ والمنسوخ بھی شامل ہے۔ سیرت نگار کے لیے اس علم کا جاننا بھی ضروری ہے۔

۱۶۔ کتب مذاہب مقدسہ:

سابق مذاہب کی کتب مقدسہ میں سیرتِ طیبہ کے بعض پہلوؤں کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اگرچہ یہ کتب اصلی نہیں بلکہ تحریف شدہ ہیں، پھر بھی اس میں سیرت سے متعلقہ بہت سا مواد محفوظ ہے۔ جس سے سیرت نگار استفادہ کر سکتا ہے۔ بہت سے سیرت نگاروں نے کتب مقدسہ سے استفادہ کر کے اپنی کتب سیرت مرتب کی ہیں۔ بقول محمد قتیل: آسمانی کتابیں اور صحیفے اب بھی پچاس ساٹھ کے قریب موجود ہیں۔ جن میں چار کتابیں قرآن عظیم، انجیل شریف، زبور پاک وتوریت مقدس کتب کہلاتی ہیں۔ اسی طرح کچھ صحیفے بھی ہیں۔ ان مقربین میں سب سے آخری تاجدار مدینہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہاں البتہ ظہور میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخری محمد عربی ہیں صلوٰۃ اللہ وسلامہ

عليه وعليهم اجمعين (۱۰۴)۔

۱۷۔ علم لغت عربی:

آنحضرت ﷺ کی مادری زبان عربی تھی، سیرت نگار کو نبی کریم ﷺ کی مادری زبان اور لغت فصحاء کا علم ہونا چاہیے۔ آپ ﷺ کے دور کے لسانی اختلافات اور زیر استعمال الفاظ کا بھی علم ہونا چاہیے کیونکہ ان علوم سے سیرت نگاری میں بہت مدد مل سکتی ہے اس لیے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والے جملوں کے پس منظر کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے لغت کا علم ہونا ضروری ہے۔ آپ ﷺ فصیح اللسان ہیں اس فصاحت کو لغوی علوم کے گہرے ادراک کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

علم لغت عربی پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے مشہور درج ذیل ہیں:

① لسان العرب.....ابن منظور۔

② القاموس الوافی.....شهاب الدين ابو عمرو۔

③ المعجم الوسيط.....دكتور ابراهيم ورفقائه۔

④ القاموس المحيط.....مجد الدين محمد بن يعقوب۔

⑤ تاج العروس.....الزبيدی۔

⑥ المحيط فی اللغة..... اسماعيل بن عباد۔

⑦ المصباح المنير.....احمد بن محمد بن علی مقری۔

⑧ كتاب التهذيب.....ابو منصور محمد بن احمد الازهری۔

⑨ مصباح اللغات.....مولانا عبدالحفيظ بلياوی (عربی سے اردو)۔

۱۸۔ علم التقویم والتوقیت:

کسی تاریخی واقعہ کے وقوع کو دن، مہینے اور سال کے تعین کے ساتھ بیان کو اس واقعہ کی توقیت کہا جاتا ہے۔ سیرت نگار کے لیے علم تقویم سے آگاہ ہونا ضروری ہے تا کہ وہ عیسوی و ہجری تاریخوں میں مطابقت و تحویل کر سکے۔ اکثر مسلم ممالک میں ہجری تقویم کی جگہ شمسی تقویم کا رواج ہے۔ حالانکہ ہجری تقویم اصل اور فطرت کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ بقیہ تمام تقویمیں ظن و تخمین کی بنیاد پر قائم

کی گئی ہیں۔اس فن پر مختلف حضرات نے کام کیا ہے۔ہجری اور شمسی کیلنڈر تیار کیے ہیں:

۱۔ عبدالقدوس ہاشمی کی تقویم تاریخی۔

۲۔ ضیاء الدین لاہوری کی جوہر تقویم، یہ بہت آسان اور جامع و مختصر ہے۔

۳۔ عبدالرحمٰن کیلانی کی الشمس والقمر بحسبان۔

۴۔ پروفیسر ظفر احمد کا مضمون توقیتی تضادات کا جائزہ۔(ششماہی ''السیرۃ عالمی'' زوار اکیڈمی کراچی سے کئی اقساط شائع ہو چکی ہیں)۔

۵۔ بوہری تقویم، یہ عہد فاطمی میں فاطمیوں نے تیار کرائی، بوہری آج بھی اس کے مطابق چلتے ہیں(۱۰۵)۔

۱۹۔ علم قرأت ولہجات عرب:

عرب میں مختلف قبائل بستے تھے لیکن ان سب کی زبان عربی تھی اور عربی بولنے کے لیے اپنا اپنا لہجہ استعمال کرتے تھے۔ابتدائے اسلام میں انھیں اپنے اپنے لہجہ میں قرآن کریم کی تلاوت کی اجازت تھی، لیکن بعد میں قرآن کریم لکھنے کے لیے معیاری قواعد ولہجہ لغت قریش مقرر کیا گیا، اس لیے کہ آپ ﷺ کا تعلق اسی سے تھا جب کہ اس کے ساتھ کئی دیگر لہجوں میں تلاوت کی اجازت بھی دے دی گئی۔صحابہ ؓ اور تابعینؒ کی بڑی تعداد نے علم قرأت حاصل کیا۔جن میں درج ذیل زیادہ مشہور ہیں:

سعید بن المسیب، عروہؒ، سالمؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، سلیمان عطاؒ، معاذ بن الحارثؒ القاری، عبدالرحمانؒ بن ہرمز الاعربی، ابن شہابؒ زہری، مسلم بن جندبؒ، زید بن اسلمؒ، مکہ میں عبید بن عمرؒ، عطا بن ابی رباحؒ، طاؤسؒ(۱۰۶)۔

۲۰۔ علم ادب جاہلیہ:

قبل از اسلام کا زمانہ دور جاہلیت کہلاتا ہے۔بعض کہتے ہیں کہ جاہلیت کا زمانہ ''فترت'' کا زمانہ ہے۔یعنی وہ زمانہ جو دو رسولوں کے درمیان تھا۔کبھی اس کا اطلاق مطلق زمانۂ کفر پر ہوتا ہے، کبھی فتح مکہ سے پہلے کے زمانے پر اور کبھی اس زمانے پر جو ولادت نبوی ﷺ اور بعثت کے درمیان ہے(۱۰۷)۔

آپ ﷺ نے اپنا بچپن عربوں کے رواج کے مطابق دیہات میں گزارا جہاں اصل عربی کا

رواج تھا۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو مثالیں، استعارے اور محاورات استعمال ہوتے تھے انھیں ادب جاہلیہ کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ادب کے ذریعے عہد نبوی ﷺ کے حالات و واقعات، پس منظر، عہد نبوی کی مشکلات، عربوں کی ثقافت کو سمجھ کر قرآن کریم اور سیرت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی مصادر میں شامل ہے۔

۲۱۔ علمِ آثارِ قدیمہ:

آثار قدیمہ سے مراد آپ ﷺ کی آمد سے پہلے گزرنے والی قوموں کے نشانات ہیں جنھیں قرآن مجید میں اُمت محمدیہؐ کی عبرت کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کا وہ حصہ جس میں آپ ﷺ کی خیبر میں آمد، قلعہ کے فتح ہونے، ایک موقع پر دوران سفر آپؐ کا ایک وادی سے تیزی سے گزرنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتانا یہاں وہ قوم تھی جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے تھوڑی دیر بھی اس جگہ ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا، یہ جگہ کون سی تھی؟ یہاں کون سی قوموں کے آثار موجود تھے؟ یہ علم ہمیں علم آثارِ قدیمہ سے حاصل ہوتا ہے (۱۰۸)۔

۲۲۔ علمِ آثارِ صحابہ وصحابیاتؓ:

آنحضرت ﷺ سے منقول عمل اثر نبوی ﷺ کہلاتا ہے اور جو اعمال صحابہ رضی اللہ عنہم یا صحابیاتؓ سے منقول ہوں انھیں آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں۔ سیرت طیبہ پر لکھنے والوں میں محدث بھی ہیں اور فقیہہ بھی، مؤرخ بھی ہیں اور سیرت نگار بھی، مدبر بھی ہیں اور قانون دان بھی، ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی، اپنے بھی ہیں اور بیگانے بھی، اپنوں نے جس صحت، جامعیت، دقت نظر اور شفقت سے رسول مبین ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کے عہد پر قلم اُٹھایا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ایک سیرت نگار کے لیے اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم و آثار صحابہ رضی اللہ عنہم وصحابیاتؓ کا سمجھنا از حد ضروری ہے۔ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذخیرہ کتب احادیث میں محفوظ ہے۔

جن صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار بکثرت منقول ہیں ان میں خلفاء اربعہ، ازواج مطہراتؓ بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نام زیادہ نمایاں ہیں (۱۰۹)۔

۲۳۔ حکمت وعلم نفسیات:

مفسرین ومحدثین نے حکمت وعلم نفسیات سے متعلق بحث کی ہے کہ اس کے معنی ہیں وقت، حالات اور مخاطب کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی بات کہنا، مقاصد بعثت نبوی ﷺ میں سے ایک مقصد قرآن کے مطابق حکمت کی تعلیم دینا تھا: ﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (۱۱۰) (لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ حکمت اور (مائل کرنے والے) اچھے الفاظ کے ذریعہ اور مباحثہ بھی (طنزیہ نہیں) ہمدردی سے بھرپور مخاطب کی سطح وماحول کے مطابق ہو)۔ لہٰذا یہ بات حکمت اور علم نفسیات کے زمرے میں آتی ہے کہ بات موقع محل کے مطابق اور سامعین کے مزاج اور طبیعت کو سمجھتے ہوئے کی جائے اور یہی طریقہ نبوی ﷺ کا خلاصہ ہے۔

لہٰذا سیرت نگاری کے لیے ضروری ہے وہ سیرت طیبہ ﷺ کا علم نفسیات کی روشنی میں بھی جائزہ لے، دوست ودشمن نے کس پیرایہ میں کیا بات کہی ہے۔ آپ ﷺ نے کسی بات کا حکم دیا یا کوئی کام کیا تو اس کی نفسیاتی وجوہات کیا تھیں۔ عقل ونقل کے اس امتزاج سے سیرت کے پیغام کو سیرت نگار مؤثر، جاذب نظر اور عہد حاضر کی مناسبت سے ڈھال کر دوہرے اجر کا مستحق ہوسکتا ہے (۱۱۱)۔

مذکورہ بالا مراجع کے علاوہ پروفیسر عبدالجبار شاکر نے درج ذیل علوم وفنون کو بھی ان میں شامل کیا ہے:

۱۔ حرمین کے سفرنامے۔

۲۔ کتبِ نعت رسول مقبول ﷺ (۱۱۲)۔

۳۔ اطلس وخرائط اور اماکنِ سیرت کی تصاویر (۱۱۳)۔

پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی نے اپنی کتاب اصولِ سیرت نگاری تعارف، مآخذ ومصادر میں پچیس مصادر بیان کیے ہیں۔ مذکورہ بالا مراجع کے علاوہ انھوں نے درج ذیل مراجع بیان کیے ہیں:

۱۔ علم اصول حدیث

۲۔ اسلامی معلوماتِ عامہ

۳۔ مخضرمی اور اسلامی ادب (۱۱۴)۔

سیرت کا حدیث اور تاریخ سے تعلق:

سیرت النبی ﷺ بعض خصوصیات کے لحاظ سے حدیث بھی ہے اور تاریخ بھی اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان میں فرق بھی ہے۔لہٰذا سیرت کے مقام کے تعین کے لیے ان کے مابین فرق کو سمجھنا اور جاننا از حد ضروری ہے۔علوم اسلامی میں فن حدیث و سیرت میں باہمی گہری مماثلت اور تعلق پایا جاتا ہے۔سیرت نگاری کا فن دراصل علوم الحدیث ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

سیرت اور حدیث میں مماثلت:

سیرت وحدیث میں تین اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔

۱۔ اصحاب حدیث (محدثین) تین امور کو جمع کرتے ہیں۔پہلی یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا، دوسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کام کیا،تیسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا آپ ﷺ کے زمانہ میں کیا کیا گیا۔اصحاب سیرت (سیرت نگار) بھی انھی تینوں امور کو جمع کرتے ہیں۔اس اعتبار سے دونوں کا کام ایک جیسا ہے۔

۲۔ محدثین نے حدیث رسول اللہ ﷺ کی صحت واستناد کے لیے قواعد وضوابط مرتب کیے ہیں لہٰذا بغیر کسی سند کے حدیث قبول نہیں کی جاتی۔اصحاب سیر بھی بغیر سند کے یا جھوٹے شخص کی روایت کو قبول نہیں کرتے ہیں۔

۳۔ اصحاب سیر اور اصحاب حدیث حقیقت کے اعتبار سے دو الگ جماعتیں نہیں ہیں۔بلکہ جتنے محدثین ہیں، وہ سیرت نگار بھی ہیں۔جو سیرت نگار ہیں، وہ محدث بھی ہیں مگر دونوں کے مقاصد واہداف الگ الگ ہیں،لہٰذا وجوہ ترجیح تبدیل ہو جاتی ہیں (۱۱۵)۔

سیرت وحدیث میں فرق:

سیرت وحدیث میں درج ذیل آٹھ اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے:

۱۔ سیرت میں واقعات کے ربط و ترتیب کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن حدیث میں آپ ﷺ کے حالات موجود ہونے کے باوجود سیرت کی طرح ترتیب لازم نہیں، بلکہ جہاں جس پہلو کی ضرورت ہوتی

ہے محدث بیان کر دیتا ہے(۱۱۶)۔اس کی وضاحت میں ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری لکھتے ہیں:

''محدثین کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور رسولؐ کی ذات سے بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کی ذات کو جاننا ہے۔احکام پر ان کے یہاں بحث ضمناً ہوتی ہے(۱۱۷)۔

۲۔ سیرت کا مستند ترین مواد کتب احادیث ہی میں ہے،اگرچہ بعض اوقات سیرت نگاروں نے سیرت کی روایات بیان کرنے میں محدثین کی طرح مکمل احتیاط نہیں برتی،یہی وجہ ہے حدیث کی روایات کا درجہ سیرت کی روایات سے بلند ہے(۱۱۸)۔

۳۔ محدثین ساری توجہ اس نکتہ پر صرف کرتے ہیں کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہے یا نہیں،جبکہ سیرت نگار اس نکتہ پر توجہ دینے کے ساتھ یہ بھی جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے کب کہا؟یا کس وقت یہ کام کیا یا آپ ﷺ کے سامنے کیا گیا،دوسرے یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کا سبب کیا تھا(۱۱۹)۔

۴۔ سیرت نگار حضور ﷺ کے اقوال،افعال،واقعات کو مربوط و مسلسل بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں جبکہ محدثین صرف روایت کی صحت پر توجہ دیتے ہیں(۱۲۰)۔

۵۔ وجوہ ترجیح کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے محدثین و سیرت نگار دو الگ جماعتیں بن گئے ہیں اور دونوں کے معیار تحقیق میں فرق آ گیا۔محدثین رواۃ کی ثقاہت،تقویٰ اور دیانت کی کمی زیادتی کی بنا پر مقبول رواۃ کی روایتوں میں اختلاف کی صورت میں ترجیح دیتے ہیں۔سیرت نگار حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر دو میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دیتے ہیں(۱۲۱)۔

۶۔ ندیم الواجدی لکھتے ہیں،سیرت میں درجہ صحت سے کم درجہ کی روایات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔حدیث میں اس کی گنجائش نہیں ہے(۱۲۲)۔

۷۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں حدیث آٹھ علوم کے مجموعہ کا نام ہے اور سیرت اس کا ایک جزء ہے(۱۲۳)۔

۸۔ حدیث کی کتابیں فقہی ابواب کی ترتیب پر بھی تقسیم ہوتی ہیں اور سیرت کی کتابیں سنین یا واقعات کی ترتیب پر مرتب ہوتی ہیں(۱۲۴)۔

سیرت اور تاریخ:

سیرت تاریخ کی ایک نوع ہونے کے باوجود فن تاریخ سے الگ اور ممتاز صنف ہے۔ تاریخ کی چند تعریفیں کی جاتی ہیں، مشہور ماہر تاریخ کافیجی (م۸۷۹ھ) نے اپنی کتاب ''المختصر فی علم التاریخ'' میں یہ تعریف کی ہے کہ تاریخ زمانے کے حالات، اور ان حالات کے متعلقات کی یقینی تلاش کا نام ہے (۱۲۵)۔ السخاوی الحافظ المؤرخ (م۹۰۲ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ'' میں کہا ہے کہ زمانے کے واقعات کی مؤقت جستجو کا نام تاریخ ہے۔ دورِ وسطیٰ کے مغربی مفکرین کہتے ہیں کہ تاریخ زندہ مطالعہ کا نام ہے (۱۲۶)۔

سیرت اور تاریخ میں فرق:

۱۔ تاریخ کا موضوع انسان اور زمانہ ہے (۱۲۷)۔ اس کے بالمقابل سیرت کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کا بابرکت عہد ہے۔

۲۔ تاریخ کا موضوع عموماً ملک اور زمانہ ہوتا ہے جن میں ضمناً شخصیات زیر بحث آتی ہیں۔ جبکہ سیرت میں ایک مخصوص شخصیت یعنی نبی کریم ﷺ کو موضوع بنا کر ضمناً ملک و زمانہ اور اس کے دیگر حالات وواقعات کو اُجاگر کیا جاتا ہے (۱۲۸)۔

۳۔ سیرت کے مآخذ جس قدر مستند اور قابلِ اعتبار ہیں تاریخ کو ان کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں ہے۔ تاریخ کا مدار صحت مند مآخذ کے بجائے قیاس پر زیادہ ہوتا ہے لیکن سیرت میں قیاس کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ روایات جس طرح پہنچیں انھیں من وعن ذکر کردینا سیرت نگار کا پہلا فرض ہے۔ ان روایات میں جس قدر چھان پھٹک اور کاوش سے کام لیا جاتا ہے وہ الگ قابل غور بات ہے (۱۲۹)۔

۴۔ ہمارے سامنے جن مؤرخوں کے ذریعے تاریخیں پہنچی ہیں خود ان مؤرخوں کا اس زمانہ سے جس زمانہ کی انھوں نے تاریخ لکھی ہے کوئی تعلق نہیں ہے اگر ہے بھی تو اس درجہ کا نہیں ہے جس درجہ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے تھا۔ بلکہ اکثر مؤرخین تو تاریخ کے خود بھی عینی شاہد نہیں ہیں۔ جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس تاریخ کے جسے ہم سیرت کہتے ہیں عینی شاہد ہیں۔ لہٰذا عام تاریخ کا سیرت سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے (۱۳۰)۔

اسلامی علوم میں فن سیرت نگاری، فن حدیث اور فن تاریخ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا فن سیرت نگاری کی بدولت حاصل کیا اور سیرت کا فن، حدیث کا مرہون منت ہے۔ پروفیسر غلام احمد حریریؒ لکھتے ہیں کہ ''اسلام سے پہلے نہ تو یہ طریقہ عربوں میں رائج تھا، اور نہ دیگر متمدن اقوام میں۔ ایران اور یونان میں کتابت کے ذریعے تاریخ کو محفوظ کرنے کا رواج تھا۔ لیکن وہ مستند واقعات سے عبارت نہ تھی بلکہ وہ خرافات اور ہر قسم کی خیال آرائی پر مشتمل تھی۔ ''خبر مع سند'' کے طریقے کو دین اور شریعت کی خاطر مسلمانوں نے سب سے پہلے حدیث کے لیے استعمال کیا چنانچہ اس کا بھی معیار وہی رکھا، جو شریعت میں قابل اعتماد ہو۔ اس معیار کو بروئے کار لانے کے لیے کئی اور علوم وجود میں آئے جن میں تاریخ اور اسماء الرجال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حدیث و تاریخ کے ارتباط پر نظر رکھتے ہوئے توقع اس بات کی ہو سکتی تھی کہ تاریخ بھی وہی قالب اختیار کرے، جو حدیث کا قرار پا چکا تھا؛ چنانچہ تاریخ بھی ''خبر مع سند'' کی شکل میں جمع ہونا شروع ہوئی۔ اس طرح حدیث و سیرت اور تاریخ کے فنون ایک دوسرے سے الگ ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے باہم مربوط و مماثل بھی ہیں'' (۱۳۱)۔

سیرت نگاری اور اصول روایت و درایت:

سیرت ایک جداگانہ فن ہے۔ فن حدیث کی طرح روایت و درایت کے اصولوں کی پابندی اس فن کے لیے بھی ضروری ہے۔ لیکن قدیم سیرت نگاروں نے ان اصولوں کی پوری طرح پابندی نہیں کی ہے۔ جس کی وجہ سے حدیث کی روایت کی نسبت روایت سیرت کم درجہ رکھتی ہے۔ اور بہت سی کمزور روایات سیرتی ادب میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جدید سیرت نگاروں نے اصول روایت و درایت وضع کیے ہیں تا کہ وہی روایات حدیث قبول کی جائیں جو معیار تحقیق پر پورا اُترتی ہوں۔ خبر کی تحقیق کا اصول قرآن مجید میں خالق کائنات نے قائم کیا ہے۔ سورۂ حجرات میں حکم باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾ (۱۳۲) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر

اپنے کیے پر پشیمان ہو)۔

علامہ شبلی نعمانی نے قبول روایت کے سلسلے میں صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم نے جو طرز عمل پیش کیا اور علمائے نقد وحدیث نے جن قواعد واصول کی پابندی کی ہے اس سے درج ذیل اصول اخذ کیے ہیں:

۱۔ سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

۲۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے رواۃ واسناد کی تنقید لازم ہے۔

۳۔ سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اس لیے بصورتِ اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

۴۔ بصورتِ اختلاف روایاتِ احادیث، رواۃ ارباب حدیث وفقہ کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

۵۔ سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علّت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

۶۔ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

۷۔ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے وفہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

۸۔ اسبابِ خارجی کا کس قدر اثر ہے۔

۹۔ جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلّمہ، اور قرائنِ حال کے خلاف ہوگی، لائقِ حجت نہ ہوگی۔

۱۰۔ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی۔

۱۱۔ روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے (۱۳۳)۔

بعض محدثین نے شبلی نعمانی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ جیسا کہ ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، اپنی مشہور زمانہ کتاب اصح السیر میں عقل پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''درایت کے معنی عقل نہیں ہے۔ علم اور تجربہ کے بعد جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اس کو درایت کہتے ہیں'' (۱۳۴)۔

جبکہ مولانا شبلی نے عقل اور درایت کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مولانا دانا پوری کہتے

ہیں کہ ہر کسی کی عقل اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے معیار درایت پرکھنے کا اختیار دیا جائے بلکہ اکثر عقل کے برعکس بھی چیزوں کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ عقل جن کا ادراک نہیں کرسکتی جیسے جنت، دوزخ، جزا، سزا، حشر، نشر، عذاب قبر؛ ان چیزوں میں عقل کو دخل حاصل نہیں ہے۔ وہ مولانا شبلی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مولانا سے تسامح یہ ہوا ہے کہ وہ درایت اور عقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ دوم درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور کسی محدث کا یہ مسلک نہیں ہے بلکہ صریح البطلان ہے'' (۱۳۵)۔

ایسا شخص جسے رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے پوری واقفیت ہو۔ آنحضرت ﷺ کے دور کے واقعات و حالات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ صحیح روایات اس کی نظر میں ہوں۔ یعنی سیرت مطہرہ کے ہر جزو کے بارے میں علم رکھتا ہو۔ تو اس شخص میں ایک خاص معرفت اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ بغیر سند کے بھی پہچان سکتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہے یا نہیں ہے۔ اس خاص وصف کو درایت کہا جائے گا۔ اس کے بارے میں مولانا داناپوری نے ملا علی قاری کے حوالے سے لکھا کہ ''ابن قیم جوزی سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث موضوع کو کسی قاعدہ سے جان لیں بغیر سند دیکھے ہوئے۔ کہا یہ بڑے مرتبہ کا سوال ہے۔ یہ وہ شخص جانتا ہے جو سنن پر حاوی ہو اور جس کے خون اور گوشت میں وہ مخلوط ہوگئی ہوں اور اس میں اس کو ملکہ حاصل ہو گیا ہو، سنن اور آثار کے پہچاننے میں، رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ کو پہچاننے میں، اور حضور ﷺ کی ہدایت کو پہچاننے میں، جس کا حضور ﷺ حکم دیتے تھے، جس سے منع کرتے تھے، جس بات کی خبر دیتے تھے، جس کی طرف دعوت دیتے تھے، جس بات کو پسند کرتے تھے، جس کو بُرا سمجھتے تھے، جس کی اُمت کو تعلیم دیتے تھے، سب کے جاننے میں اُس کو شدید خصوصیت حاصل ہوگئی ہو۔ گویا وہ حضور ﷺ کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ملا ہوا موجود ہے۔ اس طرح کا آدمی حضور ﷺ کے احوال، ہدایت، کلام اور اقوال و افعال کو جانتا ہے'' (۱۳۶)۔

یہ بات قرین فہم ہے کہ مذکورہ بالا خوبی کا حامل شخص ہی درایت سے روایت میں تمیز کرسکتا ہے نہ کہ عام عقل والا کوئی شخص فیصلہ کرے۔ اس طرح عقل سے باہر چیزوں کا اگر انکار کیا جائے تو بہت زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا اسناد پر درایت کو ترجیح نہ ہے۔ عقل اور درایت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور جو چیزیں عقلاً محال ہیں ان کا وقوع ہونا بھی ممکن ہے جس کے ثبوت میں تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔

برصغیر میں سیرت نگاری:

عرب و ہند کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ قصص الانبیاء کی اہم کتب کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے دنیا میں بھیجے گئے تو وہ ارض ہند کے جنوبی علاقہ سری لنکا میں اُتارے گئے (۱۳۷)۔ جبکہ حضرت حوا علیہا السلام کو سعودی عرب میں جدہ میں اُتاری گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی ملاقات میدان عرفات میں ہوئی جو کہ مکہ کے قریب ایک میدان ہے (۱۳۸)۔

عرب تاجر عموماً جنوبی ہند کی بندرگاہوں میں مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ اس طرح قبل از اسلام دونوں خطوں کے عوام ایک دوسرے سے متعارف تھے (۱۳۹)۔ اہل ہندوستان کو ظہورِ اسلام کی خبر اسی وقت ہی پہنچ گئی تھی جب اس عالمگیر دین کا دروازہ اہل مکہ پر کھلا (۱۴۰) اوراقِ تاریخ اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ قافلے جو عرب و ہند کے درمیان بغرض تجارت رواں دواں تھے پہلے پہل اسلام نے انھی کے ذریعے ہندوستان کی سرحد پار کی (۱۴۱)۔ اہل عرب کے تجارتی قافلے مالابار، لنکا، مالدیپ، انڈونیشیا اور چین کے علاقوں میں آتے جاتے تھے۔ اس وقت ایک مشہور واقعہ معجزہ شق القمر سے متاثر ہو کر مالابار کے راجہ زموزا کا اسلام قبول کر لینا ہے۔ پھر عہد فاروقی میں لنکا کے راجہ نے بھی اسلام قبول کر لیا (۱۴۲)۔

ان ابتدائی صدیوں میں عرب سے آنے والے مشہور محدثین میں موسیٰ بن یعقوب الثقفی (۱۴۳) یزید بن ابی کبشہ دمشقی (۱۴۴)۔ ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری (۱۴۵)۔ ابوحفص ربیع بن صبیح (۱۴۶) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ تمام محدثین آنحضرت ﷺ کی احادیث کو جاننے والے تھے اور آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ سے واقف تھے۔

سیرت سرورِ دو عالم ﷺ کا یہ اعجاز ہے کہ ہر زمانے میں، ہر زبان میں اور سیرت کے ہر پہلو پر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ آپ کی سیرت مطہرہ کا بیان جو قرآنِ کریم سے شروع ہوا، اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

نہ صرف عرب میں بلکہ سیرت نگاری کا باقاعدہ ارتقا عجم اور پھر خصوصی طور پر برصغیر پاک و ہند میں ہوا۔ بہت سارے اہل علم نے اس پر قلم اٹھایا۔ اور پھر باقاعدہ طور پر اکثر نے کسی مخصوص زبان کے حوالے سے سیرت طیبہ کے موضوع پر اپنے نتائج کو غور و فکر کی صورت میں پیش کیا ہے اور پھر وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ اس پر برصغیر میں بہت سا کام ہوا ہے اور بے شمار وقیع تصانیف بھی سامنے آئیں۔بعض نے ایک خاص عہد اور ایک خاص خطے کے سرمایہ سیرت کا جائزہ لیا ہے۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے پہلے مسلمان برصغیر کے ساحلی علاقوں میں آتے رہتے تھے۔خلافتِ عمرؓ میں جب حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر کیا گیا تو اس نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی عاص کو تھانہ (نزد ممبئی) پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا (۱۴۷)۔

برصغیر میں خلفائے راشدین کے زمانے میں ہی اسلام آ گیا تھا۔حضرت عمرِ فاروق ؓ کے زمانے میں مغربی ہندوستان میں ممبئی اور تھانہ میں مسلمانوں کی آبادیاں وجود میں آ چکی تھیں۔عام طور پر یہ تابعین تھے جو ہندوستان میں آئے اور جن کی آبادیاں برصغیر میں قائم ہوئیں۔انھی تابعین کے ذریعے برصغیر میں اسلام باقاعدہ طور پر داخل ہوا (۱۴۸)۔

پھر جب سندھ فتح ہوا تو اس میں مسلم معاشرہ کی ایک باقاعدہ معاشرت قائم ہوئی۔مذہبی ضروریات کے لیے مساجد کی تعمیر شروع ہوئی اور پھر ان مساجد میں ائمہ اور قاضیوں کا تقرر ہوا۔پھر مکاتب و مدارس کی بنیاد رکھی گئی۔حساب کتاب کے سیکھنے، پڑھنے لکھنے کے ساتھ قرآن مجید کے حفظ اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں سیرت طیبہ کو سامنے رکھا گیا اور اس کو مرکزی اہمیت دی گئی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسلم معاشرہ کی مستحکم بنیادیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری کی تحقیق کے مطابق جو آزاد، خود مختار، امارتیں وجود میں آئیں۔ان میں امارتِ ماہانیہ (از ۱۹۸ھ تا ۲۲۷ھ)، منصورہ کی امارت ہباریہ (از حدود ۲۴۷ھ تا ۴۱۶ھ) طوران کی عمارتیں متغلبہ (از حدود ۳۴۰ھ تا ۴۷۱ھ) امارتِ سامیہ (از ۲۸۰ تا حدود ۳۶۰-۳۷۰ھ)۔مکران کی امارتِ معدانیہ (از ۲۴۰ھ تا ۴۷۱ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔پھر ایسا دور آتا ہے جو کہ خلافتِ اسلامیہ کی کمزوریوں کے باوجود اسلامی تہذیب کا دورِ عروج تھا۔میری مراد تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا زمانہ ہے۔خود مختار امارتیں وجود میں آ رہی تھیں اور آپس کے باہمی نزاعات نے ان کے درمیان اتحاد کو ریزہ ریزہ کر دیا۔تاہم عالمِ اسلام کے ایک بہت بڑے حصے میں ان امارتوں کی وابستگی نے ادارتی یک رنگی

پیدا کر دی اور اسی زمانے میں ہندوستان کے شہر کچھ، خضدار، منصورہ، دیبل علم کے بڑے مراکز تھے اور پھر دیبل اور منصورہ تو کوفہ اور بصرہ کی ہمسری کر رہے تھے (۱۴۹)۔

ابتدائی چار صدیوں میں ہندوستان میں لوگوں کا رجحان صرف حدیث نبویؐ کی طرف تھا کیونکہ جب اسلام ہندوستان میں داخل ہوا تو قرآن وحدیث کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔لوگ علماء اور محدثین کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ابوالقاسم مقدسی جس نے سلطان محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ۳۷۵ھ/ ۹۸۵ء میں سندھ کو دیکھا۔ وہ اس خطہ کے متعلق لکھتا ہے: ''ان میں سے اکثر لوگ حدیث کی طرف رجحان رکھنے والے ہیں'' (۱۵۰)۔

ہندوستانی طلبا خاص کر سندھ سے تعلق رکھنے والے طلبا عالمِ اسلام کے دیگر شہروں میں استفادہ کے لیے جاتے تھے اور ہندوستان کے بے شمار سندھی علماء نے عراق، شام، خراسان، مصر اور اندلس میں بھی نام پیدا کیا۔اور اس کے ساتھ ہندوستان میں رہ کر مقامی سطح پر بھی علماء کرام نے حدیث وسیرت پر بڑا کام کیا۔

ڈاکٹر انور محمود خالد نے اردو نثر میں ''سیرت رسول'' لکھی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ہندوستانی سیرت نگاروں کی سیرت النبیؐ پر تصنیفی وتالیفی کاوشوں کا نہایت مبسوط اور تحقیقی لوازمہ مہیا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق نے اپنی کتاب میں ان تمام علماء کا تفصیلی ذکر کیا ہے جنھوں نے اسلامی علوم بالخصوص علم حدیث ومغازی وسیر کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔موسیٰ بن یعقوب الثقفی، یزید ابن ابی کبشہ الدمشقی (م ۹۷ھ) المفضل بن المہلب بن ابی صفرہ (م ۱۰۲ھ) ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ البصری معروف بہ نزیل ہند (م ۱۵۵ھ) کا بطور خاص تعارف کروانے کے بعد محدثین دیبل، منصورہ اور خضدار کا الگ الگ ذکر کیا ہے (۱۵۱)۔

البتہ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی میں جب سندھ پر مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوگئی، تو پھر اشاعت حدیث ومغازی وسیر کا کام پوری توجہ سے سرانجام دیا جانے لگا۔اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مشہور تابعی حضرت ربیع بن صبیح السعدی البصری (م ۱۶۰ھ) کا ہے جو (۹۳ھ/ ۷۱۱ء) میں ہندوستان میں تشریف لائے اور جنھوں نے احادیث کے منتشر اوراق جمع کیے۔صاحب ''کشف الظنون'' کے بیان کے مطابق یہ تابعی بزرگ، ہند میں علم حدیث کے ان اولین علمبرداروں میں سے ہیں، جنھوں نے

دوسری صدی ہجری میں جمع وتدوین حدیث کا کارنامہ سرانجام دیا(۱۵۲)۔''ماثر الکرام'' کے مصنف غلام علی آزاد بلگرامی بھی بحوالہ کشف الظنون کہتے ہیں کہ ربیع بن صبیح تابعی نے سب سے پہلے اسلام پر کتاب تصنیف کی۔سندھ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ حضرت ربیع کا مدفن ہے(۱۵۳)۔

دوسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث وسیر میں ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی، مدنی (م ۱۷۰ھ) جو کہ بہت بڑے سیرت نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی''کتاب المغازی'' کا ذکر بھی ملتا ہے جو کہ ناپید ہو چکی ہے لیکن اس کے اجزا واقدی اور ابن سعد نے اپنی کتاب میں جمع کیے ہیں۔اسی طرح تیسری صدی ہجری میں ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی (م ۳۲۲ھ) نے''مکاتیب البنی'' لکھی جو کہ مطبوع ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں خدمت حدیث میں ایک نام نومسلم رجاء السندھی (م ۲۲۱ھ) کا آتا ہے جن کو بعض اہل علم نے رکن من ارکان الحدیث لکھا ہے(۱۵۴)۔ان کے بیٹے بھی ان کی طرح نامور محدث تھے اور بغداد میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔

اگلی چند صدیوں میں برصغیر پاک وہند میں علم الحدیث کے فروغ کے لیے کچھ قابل ذکر کام نہیں ہوا، حالانکہ تیسری صدی ہجری کے نصف آخر تک ملتان اور منصورہ میں مسلمانوں کی دو خود مختار ریاستیں موجود تھیں۔چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں ان ریاستوں پر اسماعیلیوں کا قبضہ ہو گیا۔جن کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے علم حدیث کی اشاعت میں رکاوٹ پڑی۔بالآخر سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء تا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) نے ہندوستان پر پے درپے حملے کر کے ملتان اور سندھ کے اسماعیلی امیروں کی حکومت ختم کی، ہندو راجاؤں کو باج گزار بنایا اور پنجاب کا علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا(۱۵۵)۔

آٹھویں صدی ہجری کے مؤرخ ضیاالدین برنی نے (م ۷۸۵ھ) سیرت کے موضوع پر کتاب''ثناء محمدی'' یا''نعت محمد'' (فارسی) لکھی۔اس میں خصائص نبی، معجزات اور معراج وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔اسی دور میں میر سید علی ہمدانی سے دو صفحات پر مشتمل''حلیہ مبارک'' (عربی مع فارسی ترجمہ) اور اس کی اسناد (فارسی) ملحق ہیں(۱۵۶)۔

آٹھویں صدی ہجری میں شیخ رکن الدین دبیر کاشانی نے اپنے مرشد حضرت برہان الدین غریب (م ۷۳۸ھ) کے ایماء پر تصوف کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس فن کے اُصول و مبادی اور آداب پر ایک کتاب ''شمائل الاتقیاء'' (فارسی) تالیف کی۔ اس کے چار ابواب (اقسام) میں سے تیسرا باب (قسم) ''در صفات و ذات الٰہی و متعلقات آن و فضائل خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ'' ہے (۱۵۷)۔

شیخ احمد بن محمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ) کے ''قصیدہ والیہ'' کی تذکرہ نگاروں اور عربی ادب کے جوہر شناسوں نے بہت تعریف کی ہے (۱۵۸)۔

فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۲ھ-۷۹۰) میں حجاز سے نبی اکرم ﷺ سے منسوب تین تبرکات کلید کعبہ، موئے رسول اور قدم رسول دہلی لائے گئے تھے (۱۵۹)۔

جونپور کی شرقی سلطنت کے ساتھ شاہان گجرات بھی اصحاب علم و فضل تھے۔ گجرات میں ابوبکر بن محمد بہروچی (م ۹۱۵ھ) نے ۹۱۰ھ میں محمود شاہ اوّل (م ۹۱۷ھ) کے لیے قاضی عیاض اندلسی کی ''الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ'' کو ''عین الوفا'' کے نام سے فارسی میں منتقل کیا (۱۶۰)۔

محی الدین عبدالقادر عیدروس سے سیرۃ النبیؐ پر چار مختلف کتابیں یادگار ہیں۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ اور عشرہ مبشرہ کے احوال میں ''الحدائق الحضرۃ فی سیرۃ و اصحابہ العشرۃ'' اور سیرۃ النبی پر مختصراً ''اتحاف الحضرۃ العزیزہ لعیون السیرۃ الوجیزۃ'' لکھی ہے۔ میلاد النبی پر ''المنتخب المصطفیٰ من اخبار المولد المصطفیٰ'' اور معراج نبی پر ''المنہاج الی معرفۃ المعراج'' ان کی کاوشیں ہیں۔ ایک کتاب اصحاب بدر کے بارے میں ''النموذج اللطیف فی اھل بدر الشریف'' بھی ان سے یادگار ہے۔ محی الدین عبدالقادر عیدروس نے سیرت نگاری میں روایات کی چھان پھٹک سے کام لیا ہے۔ ان کی سیرت نگاری متصوفانہ رجحانات سے بھی پاک ہے۔

برہان پور کے سندھی نژاد عالم شیخ طاہر بن یوسف (م ۱۰۰۴ھ) نے ''المواھب اللدنیہ'' کا انتخاب تیار کیا تھا (۱۶۱)۔

مقامی علماء کے ہاں بھی ان سے اخذ و استفادہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شیخ محمد بن احمد فاکہی (م ۹۹۲ھ) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ابن سید الناس اندلسی کی ''نور العیون فی تلخیص

سیرۃ الامین والمامون ''حفظ کر رکھی تھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظ وتذکیر میں واقعات سیرت کو کیا مقام حاصل تھا۔

سکندر لودھی کے دربار سے وابستہ ایک عالم شیخ عبدالوہاب بخاری (م۹۳۲ھ) تھے۔انھوں نے ''شمائل النبی'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور چند نعتیہ قصائد کہے۔

شیخ عبدالوہاب بخاری کے ایک معاصر،مگر دہلی سے دور مالا بار کے متوطن شیخ زین الدین (م۹۲۸ھ) تھے،ان سے ''قصص الانبیاء'' پر ایک کتاب کے ساتھ سیرۃ نبوی پر بھی ایک تالیف ملتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے علاوہ دیگر مغل حکمرانوں کا دینی و مذہبی امور کی طرف رجحان کم تھا۔اس دور میں غیر مذہبی علمی سرگرمیوں میں خوب اضافہ ہوا۔تذکرہ نگاری،شاعری اور تاریخ نویسی کو خوب فروغ ملا۔اس عرصے میں عمومی تاریخ یا بالخصوص برصغیر کی تاریخ پر جو کتابیں تالیف کی گئی،ان میں اکثر مؤرخین نے آغازِ آفرینش سے اپنے عہد تک اجمالاً تاریخ انبیاء اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔جن میں ۹۸۵ھ میں ملا زمان ہمایوں کی ''تاریخ ہمایونی''،۱۰۰۰ھ میں،محمد شریف وقوعی نیشا پوری کی ''مجامع الاخبار''،۱۰۰۴ھ میں،عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التوریخ''،۱۰۲۱ھ میں حسن بیگ خاکی شیرازی کی ''احسن تاریخ''،۱۰۳۶ھ میں،محمد امین بلخی کی ''انفع الاخبار''،۱۰۵۰ھ میں،مرزا محمد جلال الدین طباطبائی یزدی کی ''شاہ جہاں نامہ''،۱۰۵۶ھ میں محمد یوسف اتکی کی ''منتخب التواریخ'' اور متعدد دوسری کتابیں شامل ہیں(۱۶۲)۔

اکبری عہد (۹۶۳ھ-۱۰۱۴ھ) مذہبی آزاد خیالی اور فرقہ وارانہ تنوع کے لیے معروف ہے۔مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری (م۹۹۰ھ) اور صدر الصدور عبدالنبی گنگوہی (م۹۹۲ھ) کی تالیفات میں ''شرح شمائل النبی'' اور ''عصمۃ الانبیاء'' کا ذکر تو اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔عبدالنبی گنگوہی کی تالیفات میں ''وظائف الیوم واللیلۃ النبویہ'' اور ''سنن الھدیٰ فی متابعۃ المصطفیٰ'' کے عنوانات ملتے ہیں(۱۶۳)۔

اکبر کے عہد میں ''شمائل'' کی جانب مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے ساتھ جن دوسرے اہل علم نے توجہ مبذول کی،ان میں مصلح الدین لاری (م۹۷۹ھ)،حاجی محمد کشمیری (م۱۰۰۶ھ) اور محمد

حسین حافظ بن باقر ہروی کے نام ملتے ہیں۔اور حاجی محمد کشمیری نے ''ترجمہ'' پر اکتفاء کیا ہے۔محمد حسین حافظ باقر ہروی نے شمائل ترمذی کو فارسی میں ''نشر الشمائل'' کے نام سے منتقل کیا اور شاہزادہ سلیم کے نام معنون کیا، یعنی یہ نورالدین جہانگیر کے تخت نشین ہونے (۱۰۱۴ھ) سے پہلے کی کاوش ہے، بعدازاں محمد حسین نے ''شمائل'' کو دوبارہ ''نظم الشمائل'' کے نام شعری جامہ پہنایا (۱۶۴)۔

عہد اکبری کی ایک تالیف ''مغازی النبی'' ہے جو شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) کی مشق سخن کا نتیجہ ہے۔

اکبر کے دور ہی میں شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری (م ۱۰۱۵ھ) نے قصیدہ بردہ کی شرح مکمل کی تھی۔اسی دور کے مشہور عالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) ہیں۔شیخ موصوف کی تالیفات میں سے جذب القلوب الی دیار المحبوبؐ، طریق القویم فی شرح صراط مستقیم (شرح سفر العادۃ) ''مدارج النبوۃ و درجاۃ الفتوۃ'' اور ''مطلع الانوار البھیہ فی حلیۃ النبویہ''......سیرت نبوی سے متعلق ہیں۔ ''جذب القلوب الی دیار المحبوبؐ'' (تالیف ۹۹۸ھ) گو مدینہ منورہ کی تاریخ ہے، مگر مدینۃ النبی اور النبی المکرم کا ذکر لازم وملزوم ہے۔''طریق القویم'' میں متن ''سفر السعادۃ'' کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے نماز، روزہ، حج اور اذکار کے ساتھ ان کے احوال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''مدارج النبوۃ'' نبی اکرم ﷺ کی مکمل حیات طیبہ ہے۔بقول خلیق احمد نظامی ''رسول پاک کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔یہ کتاب شیخ محدث کا نہایت اعلیٰ علمی اور ادبی شاہکار ہے۔ ہندوستان میں اس سے پہلے کسی ہندی مسلمان نے رسول پاک ﷺ کی اتنی جامع، مفصل اور مکمل سوانح حیات مرتب نہیں کی تھی'' (۱۶۵)۔

شیخ العالم اکبرآبادی نے معراج نبی ﷺ پر ''نادر المعراج وبحر الاسرا'' کے نام سے ۱۰۴۴ھ میں قلم اُٹھایا (۱۶۶)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند نورالحق (م ۱۰۷۳ھ) کی تالیفات میں بھی ''شرح شمائل النبی'' (فارسی) کا ذکر ملتا ہے (۱۶۷)۔

شیخ محدث دہلوی کے مریدوں میں سے محمد صفی اللہ بن ہبۃ اللہ ترک دہلوی بخارائی نے ۱۰۹۱ھ

میں ''اشرف الوسائل فی شرح الشمائل'' کے نام سے شرح لکھی جو عالمگیر کے نام معنون ہے (۱۶۸)

گیارہویں صدی کے آخر میں مبارک بن کبیر بن محمد انصاری ملتانی نے بھی ایک ''شرح شمائل'' قلمبند کی (۱۶۹)۔ بارہویں صدی کے آغاز میں نظام الدین محمد بن رستم بن عبداللہ خجندی امن آبادی (ایمن آبادی) نے ''شرح شمائل النبی ﷺ'' (فارسی، تالیف ۱۱۰۸ھ/ باغ محمدیؐ) لکھی (۱۷۰)۔ عبدالہادی بن محمد معصوم کی شرح شمائل النبیؐ (فارسی) ''اخلاق المصطفیٰ ﷺ'' کا انتساب بھی عالمگیر کے نام کیا گیا ہے (۱۷۱)۔ اورنگ زیب عالمگیر کے معاصرین میں سے لطف اللہ مہندس نے ''قصیدہ بانت سعاد'' اور ''قصیدہ بردہ'' کے فارسی ترجمے کیے ہیں (۱۷۲)۔

برصغیر پاک و ہند میں سیرت نگاری کا بڑا کام میلادناموں کی شکل میں ہوا۔ میلادناموں کے موضوعات محدود تھے ان کا زیادہ تر تعلق ولادت نبوی ﷺ اور شمائل نبوی ﷺ سے تھا جبکہ واقعات سیرت نبوی ﷺ بہت کم بیان کیے گئے تھے۔ جو واقعات بیان کیے بھی گئے وہ بھی موضوع اور ضعیف روایات پر مبنی ہیں۔ اس دور میں شاہ احمد فاروقی مجددیؒ جو کہ شاہ عبدالغنی محدث دہلوی کے بھائی تھے، نے ایک کتاب ''سعید البیان فی مولد سید الانس والجان'' لکھی۔ یہ بھی مولودناموں کی طرز پر لکھی گئی ہے لیکن قدیم نثر کا نمونہ ہے۔ جسے معروف محقق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اپنے مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں نثر میں سیرت نگاری کا رواج عام ہو گیا۔ برعکس روایت سابق منظوم سیرت نگاری میں معراج نامے، وفات نامے، شمائل نامے، نورنامے وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ نثر میں سیرت رسول ﷺ پر لکھی جانے والی کتب چار باغ احمد، ریاض السیر، ممتاز السیر، اور فوائد بدریہ وغیرہ ہیں۔ اسی طرح اس دور کی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف معراج العاشقین ہے۔ جس میں نثر میں سیرت رسول کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اسی عہد میں مولانا عنایت احمد کاکوروی (م ۱۲۸۹ھ) کی کتاب ''تواریخ حبیب اللہ'' اردو نثر میں سیرت پر جامع کتاب ہے۔ جسے ہر دور میں قبولیت عامہ کا شرف حاصل رہا ہے

جدید سیرت نگاری کا آغاز سرسید احمد خان کے دور سے ہوا۔ جب انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب "Life of Muhammad" کے جواب میں ''الخطبات الاحمدیہ فی العرب

والسیرت المحمدیہ ''لکھی۔ جس کا مختصر نام ''خطبات احمدیہ'' ہے۔ اس میں انھوں نے سیرت رسولؐ پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس دور میں سید امیر علی نے بھی ولیم میور کی کتاب "Life of Muhammad" کے جواب میں کتاب تالیف کی۔ جس کے پہلے حصے میں سیرت کا بیان تھا اور دوسرے حصے میں حضور ﷺ کے کارہائے نمایاں لکھے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں اس کا پہلا نام: "A critical apprisal of the Life and Achivements of Muhammad" تبدیل کر کے دوبارہ اسے "Spirit of Islam" یعنی ''روحِ اسلام'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ سید امیر علی چونکہ انگریزی تعلیم یافتہ تھے، اور جدت پسند تھے اس لیے ان کی آراء سے کلی اتفاق ممکن نہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ: ''یہ کتاب آج سے سو، سوا سو سال پہلے کے ماحول میں لکھی گئی تھی۔ بلکہ سوا سو سال سے بھی زیادہ پہلے، ۱۸۷۳ء میں پہلی بار چھپی تھی۔ اس زمانہ کے لحاظ سے جو خیالات مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے یہ کتاب ان خیالات کا اظہار ہے۔ بعض چیزیں صحیح ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ہیں۔ بعض بیانات قابل غور اور محل نظر ہیں (۱۷۳)۔ اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی کا دور آتا ہے، ان کی کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' ایک ایسی مشہور زمانہ کتاب ہے کہ اگر کوئی صرف سیرۃ النبی کہے تو فوراً علامہ شبلی نعمانی کی کتاب کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہایت بلند پایہ کتاب ہے۔ اسی دور میں سیرت نگاری پر ایک اور بلند پایہ کتاب ''رحمۃ للعالمین'' قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی ہے۔ جو کہ واقعات کی ترتیب، صحت روایات اور اعلیٰ معیار تحقیق کی بناء پر آج تک اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تھی، اب ایک جلد میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح مولانا اشرف تھانوی کی ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب ''اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی ''الرحیق المختوم'' سیرتی ادب میں نمایاں اضافہ ہے۔

اسی طرح علاقائی زبانوں میں سیرت النبی ﷺ پر کافی لکھا گیا ہے۔ سندھی زبان ایک قدیم زبان ہے۔ سندھی میں موجودہ دور کی سیرت النبی ﷺ حکیم فتح محمد سیوحانی کی ''حیات النبی ﷺ'' ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی کتب احادیث کے تراجم سندھی زبان میں کیے گئے ہیں۔ پنجابی زبان میں منظوم سیرت میں ''گلزار محمدیؐ'' ملک غلام سرور کی تصنیف ہے۔ ان کی دوسری کتب کا نام ''شاہنامہ اسلام''

ہے۔دائم اقبال کی ''کمبل پوش'' اور محمد علی فائق کی ''سرائے حبیب'' مشہور تصانیف ہیں۔ پنجابی نثر میں سیرت النبی ﷺ کی اوّلین کتاب حافظ برخوردار رانجا کی ''بوھل نماز'' ہے اس کے علاوہ ان کی کئی دیگر کتب کے نام بھی ملتے ہیں۔مثلاً ''ترجمہ قصیدہ بانت سعاد''، ترجمہ قصیدہ بردہ شریف''، شرح درود مستغاث'' اور'' حکایت پاک رسولؐ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۱۷۴)۔

پشتو زبان پختون یا پشتون باشندوں کی زبان ہے جو افغانستان اور پاکستان کے درمیان سرحد کے دونوں طرف بستے ہیں۔پشتو زبان میں سیرت نگاری کے بے شمار (جرائد اور اخبار مثلاً، لیکوال، خیلواک، ایلم، خیار، ہدایت، رہبر سرحد، شہباز، الفلاح، انجام، بانگ حرم، انصاف، جمہوریت وغیرہ میں پشتو) نمونے دیکھے جا سکتے ہیں (۱۷۵)۔

بلوچی و براہوی زبان میں انعام الحق کوثر کی ''سرور کونینؐ کی مہک بلوچستان میں'' اور'' ذکر رسولؐ بلوچی و براہوی ادب کے آئینے میں'' (۱۷۶) لکھی گئی ہیں۔اس کے علاوہ تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی سیرت النبی ﷺ پر لکھے جا رہے ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیرتی ادب کا پہلا دور برصغیر پاک وہند میں میلاد ناموں سے شروع ہوا جو کہ سرسید احمد خان کے دور تک ہے۔سرسید احمد خان کے دور سے دوسرا دور قیام پاکستان تک ہے اور قیام پاکستان کے بعد تیسرے دور میں سیرتی ادب نے نئی جہت اپنائی۔اور وہ یہ کہ سیرت النبیؐ کے مختلف پہلوؤں پر کتب مرتب ہونا شروع ہوئیں اور آج تک سیکڑوں کتب سیرت لکھی جا چکی ہیں۔جیسے رسول اکرم ﷺ بحیثیت سپاہ سالار، بحیثیت ماہر تعلیم، بحیثیت شوہر، بحیثیت قانون دان اور بحیثیت حکمران وغیرہ۔برصغیر میں سیرت النبی ﷺ پر جس قدر کام ہوا، اس کا شمار مشکل ہے۔البتہ ڈاکٹر عبدالصمد کی تحقیق ہے کہ ایک سرسری اندازے کے مطابق ۱۹۶۱ء تک اردو زبان میں سیرت النبی ﷺ پر ۴۰۵ کتابیں، میلاد النبی ﷺ پر ۲۳۴ کتابیں، مبشرات پر ۱۸ کتابیں، رسول اکرم ﷺ کے نسب مبارک پر ۶ کتابیں، شمائل پر ۳۰ کتابیں، خصائص وفضائل پر ۱۴ کتابیں، اخلاق نبوی ﷺ پر ۱۶ کتابیں، معجزات پر ۴۴ کتابیں، اور صلوۃ وسلام سے متعلق ۱۳ کتابیں شائع ہوئیں۔(۱۷۷)۔

آخری دو صدیوں میں عربی زبان میں لکھی گئی کتب سیرۃ میں درج ذیل کتب نمایاں اہمیت کی

حامل ہیں:

السیرة النبویة الصحیحه......ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری (۲ جلد) (یہ کتاب سیرت رحمت عالمؐ کے نام سے ترجمہ ہو کر ایک جلد میں ادارہ نشریات، لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔)

مختصر سیرة النبی ﷺ......محمد بن عبدالوہاب

جوامع السیره......ابن حزم

الجامع الصحیح للسیرة النبویة......سعد المرصفی

صحیح السیرة النبویة......ابراہیم العلی

السیرة النبویة العطره فی الآیات القرآنیه المسطره......محمد ابراہیم شقر

السیرة النبویة......ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد

الرحیق المختوم......صفی الرحمٰن مبارکپوری

صحیح السیرة النبویة...... علامہ محمد ناصر الدین البانی

السیرة النبویة العطره فی الصحیحین وعند ابن اسحق......ڈاکٹر سلمان بن حمد العوده

سیرت نگاری کا سلسلہ جاری ہے اور ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عربی کے بعد جتنا کام اردو زبان میں سیرت النبی ﷺ پر ہوا وہ دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہوا۔ برصغیر پاک و ہند میں اردو میں لکھی گئی اہم کتب سیرت جنھوں نے علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے سیرتی ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا اور بہت زیادہ شہرت حاصل کی درج ذیل ہیں۔

سیرة المصطفیٰ ... مولانا محمد ادریس کاندھلوی

الخطبات الاحمدیہ ﷺ......سرسید احمد خان

سیرة النبی......شبلی نعمانی / سلیمان ندوی

رحمۃ للعالمینؐ......قاضی محمد سلیمان منصور پوری

نشر الطیب......مولانا اشرف علی تھانوی

تواریخ حبیب الٰہ......مفتی عنایت احمد کاکوروی

سیرت سرورِ عالمؐ......سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

محسن انسانیتؐ......نعیم صدیقی

اصح السیر ......حکیم عبدالرؤف داناپوری

الرحیق المختوم......مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

رسول رحمتؐ......ابوالکلام آزاد

جمال مصطفیٰؐ......محمد صادق سیالکوٹی

تیرھویں چودھویں صدی میں سیرت نبوی کا وقیع ذخیرہ اردو زبان میں ملتا ہے۔فن سیرت نگاری کے موضوع پر کئی اہم کتب تحریر کی گئیں (۱۷۸)۔

سیرت نگاری کے اس مختصر جائزے سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

سندھ اور گردونواح پر عرب دور اقتدار میں علم حدیث کے ساتھ سیرت نگاری سے دلچسپی پیدا ہوئی، مگر پروان نہ چڑھ سکی۔اس دور میں سیرت نگاری پر کوئی وقیع کتب نہ لکھی جا سکی۔

مؤرخین نے تبرکاً نبی ﷺ کے واقعات زندگی اپنی کتابوں میں سرسری معلومات کے ساتھ لکھے۔

سیرت پر بعض متداوّل کتابوں مثلاً ''الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ'' (قاضی عیاض) ''المواھب اللدنیہ'' (قسطلانی) اور عمومی تاریخی کتابوں کے (مثلاً ''روضۃ الصفاء'') سیرت سے متعلق حصوں کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا۔

دسویں صدی کے آخری ربع اور گیارہویں صدی کے پہلے ربع میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''مدارج النبوۃ'' اور دیگر کتب سیرت وجود میں آئیں۔برصغیر کی مقامی علاقائی زبانوں میں بھی سیرت النبی ﷺ کے کام پر توجہ دی گئی۔

''شمائل'' پر خوب لکھا گیا اور بالخصوص ''شمائل ترمذی'' کے تراجم و شروح کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا، جو بارہویں صدی ہجری کے آغاز تک جاری رہا۔ان کے ساتھ نعتیہ قصائد...... ''قصیدہ بردہ'' و ''قصیدہ بانت سعاد''...... کی شروح کے ساتھ معراج النبی، مولد النبی اور مغازی النبی کے موضوعات پر سیرت نگاروں کی توجہ مرکوز رہی۔تاہم سیرت پر مقامی ضرورت اور طلب کے مطابق فارسی میں نسبتاً زیادہ کام ہوا اور یہی زیادہ متداول رہا ہے۔

سیرت النبی ﷺ پر مستشرقین کی لکھی گئی کتب میں کیے گئے اعتراضات کے ردّ پر جوابی کتب تحریر کی گئیں۔

حوالہ جات

۱۔ طٰہٰ:۲۱۔

۲۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب (دار صادر بیروت ۱۹۵۶ء) ۴/ ۳۸۹-۳۹۰۔

۳۔ الفیروز آبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط (دار المعرفۃ، بیروت) ۲/ ۵۴۔

۴۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات (مقبول اکیڈمی لاہور) ص ۴۱۱۔

۵۔ لوئس معلوف، المنجد فی اللغۃ، (المطبعۃ الکاثولیکیہ، بیروت، ۱۹۳۷ء) ص ۳۷۸۔

۶۔ الزبیدی، سید محمد مرتضیٰ، تاج العروس (دار الفکر بیروت ۲۰۰۵ء) ۳/ ۲۸۷۔

۷۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز لاہور) ص ۶۲۲۔

۸۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات (فیروز سنز، لاہور ۱۹۶۵ء) ص ۷۸۵۔

۹۔ سید قائم رضا، نسیم امروہی و مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، جدید نسیم اللغات اردو (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۹۶) ص ۶۰۰۔

۱۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، فن سیرت نگاری پر ایک نظر (فکر و نظر شمارہ، اپریل ۱۹۷۶ء) ص ۸۲۶۔

۱۱۔ الانعام:۱۱۔

۱۲۔ انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ (اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۹ء) ص ۳۔

۱۳۔ مصباح اللغات، ص ۴۱۰-۴۱۱۔

۱۴۔ الطور:۱۰۔

۱۵۔ القصص:۲۹۔

۱۶۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز اردو بازار لاہور) ص ۹۴۴۔

۱۷۔ فاروقی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) ص ۶۶۳۔

۱۸۔ کاندھلوی، مولانا محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ (مکتبہ عثمانیہ لاہور ۱۹۸۵ء) ۱/ ۳۔

۱۹۔ پروفیسر غلام رسول چیمہ، سیرت سید البشر (علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۰۴) ص ۱۳-۱۴۔

۲۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۰) ۱۴/ ۷۴۔

۲۱۔ مسلم، ابوالحسین بن الحجاج القشیری، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی) ۲/ ۱۳۰-۱۸۹۔

۲۲۔ بخاری، الجامع الصحیح مع فتح الباری (دار الفکر بیروت ۱۹۹۲ء) ۸/ ۳۔

۲۳۔ ندیم الواجدی، مضمون سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو، نقوش رسول نمبر (ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۸۲ء) ۱/ ۵۲۔

۲۴۔ محمد سرور بن زین العابدین، دراسات فی السیرۃ النبویہ (دار الارقم ۱۹۸۶ء) ص ۷۲۔

۲۵۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، عجالہ نافعہ، مترجم وشارح ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی (نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی ۱۹۶۴ء) ص ۴۸۔

۲۶۔ ابن ندیم، الفہرست (ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور) ص ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۴۔

۲۷۔ الاحزاب: ۲۱۔

۲۸۔ الممتحنہ: ۴۔

۲۹۔ الخطیب التبریزی، ابوعبداللہ محمد، مشکوٰۃ المصابیح (دارالفکر بیروت، ۱۹۹۱) ۱/۵۶، حدیث نمبر ۴۵۔

۳۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۴/۴۷۔

۳۱۔ ابن حجر العسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری (المکتبۃ السّلفیہ، القاہرہ) ۷/۲۷۹۔

۳۲۔ ایضا، ۶/۳۔

۳۳۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ (الفیصل ناشران وتاجران لاہور، ۱۹۹۱) ۱/۸ (مقدمہ، حاشیہ)۔

34. G.Levi Delle Vida, The Encyclopaedia of Islam (Leiden) 4\439.

۳۵۔ ندیم الواجدی، سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو، نقوش رسول نمبر، ۱/۵۲۔

۳۶۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب (دارالفکر بیروت، ۱۹۸۴) ۷/۱۸۲۔

۳۷۔ جوزف ہورووٹس، سیرت نبوی کی اوّلین کتابیں اور ان کے مؤلفین، ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، نقوش رسول نمبر (ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۸۲ء) ۱/۲۳۷۔

۳۸۔ عرفی، عبدالعزیز، سیرت نگاری (گیلانی پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۰ء) ص ۵۶۔

۳۹۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون (مکتبہ اسلامیہ، تہران ۱۹۶۷ء) ۶/۱۷۴۷۔

۴۰۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۵/۵۳۔

۴۱۔ ابن قتیبہ، المعارف (دارالکتب علمیہ، بیروت ۱۹۸۸ء) ص ۲۶۴۔

۴۲۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۹/۴۵۰۔

۴۳۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ (دارالمعارف العثمانیہ، حیدرآباد ہند ۱۹۵۹ء) ۱/۱۴۸۔

۴۴۔ موسیٰ بن عقبہ، المغازی النبویہ، دراسات جمع وتحقیق حسین مرادی (کتب خانہ ملی ایران ۲۰۰۳ء)۔

۴۵۔ ذہبی، محمد بن احمد بن عثمان، سیر اعلام النبلاء (مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۰ء) ۷/۳۴۔

۴۶۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۱۰/۲۴۳۔

۴۷۔ ابن ندیم، الفہرست، ص ۱۰۶۔

۴۸۔ عبدالرزاق بن ہمام، المصنف (داراحیاء التراث العربیہ بیروت ۱۹۹۰ء) ۵/۳۱۳-۵۰۱۔

۴۹۔ الذہبی، العبر فی خبر من غبر (دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۰ء) ۱/۱۹۹۔
۵۰۔ الواقدی، محمد بن عمر، کتاب المغازی، (تحقیق ڈاکٹر مارسڈن جونس، موسسہ الاعلمی، بیروت ۱۹۶۶ء) یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔
۵۱۔ ابن ندیم، الفہرست، ص ۹۸۔
۵۲۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون (دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴) ۲/۱۰۱۲۔
۵۳۔ شیخ عنایت اللہ، رسول اکرم کے سیرت نگار (نقوش رسولؐ نمبر شمارہ ۱۳۰ دسمبر ۱۹۸۲) ص ۱۳۷۔
۵۴۔ جوزف ہورووتس، سیرت نبویؐ کی اوّلین کتابیں اور ان کے مؤلفین (نقوش رسولؐ نمبر) ۱/۸۳۷۔
۵۵۔ ابن ندیم، الفہرست، ص ۱۵۱۔
۵۶۔ الحشر: ۷۔
۵۷۔ آل عمران: ۳۱۔
۵۸۔ الاحزاب: ۲۱۔
۵۹۔ النساء: ۸۰۔
۶۰۔ محمد: ۳۳۔
۶۱۔ آل عمران: ۱۳۲۔
۶۲۔ الاعراف: ۱۵۸۔
۶۳۔ النور: ۵۴۔
۶۴۔ حاکم، المستدرک، ۱/۹۳۔
۶۵۔ الخطیب التبریزی، مشکاۃ المصابیح، حدیث نمبر ۳۶۶۱، ۲/۳۳۳۔
۶۶۔ بخاری، الجامع الصحیح (دارالسلام الریاض ۱۹۹۹) ص ۱۲۵۲، حدیث نمبر ۷۲۸۰۔
۶۷۔ ایضاً ص ۶، حدیث نمبر: ۱۵۔
۶۸۔ ایضاً ص ۱۰۴، حدیث نمبر: ۶۳۱۔
۶۹۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، السیرۃ النبویۃ (اردو مکتبہ قدوسیہ، لاہور طبع اول ۱۹۹۶ء) ۳/۲۱۔
۷۰۔ مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم (المکتبۃ السلفیہ لاہور، ۱۹۹۴ء) ص ۵۵۸۔
۷۱۔ زکریا، محمد، کاندھلوی، شرح شمائل ترمذی (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور) ص ۱۰۵۔
۷۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۲۵۲، حدیث نمبر: ۷۲۷۷۔
۷۳۔ قاسمی، جمال الدین، قواعد التحدیث (دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۷۹ء) ص ۲۳۔

۷۴۔ ابن الجوزی، کتاب المناقب، ص۱۸۲، غلام رسول چیمہ، بحوالہ سیرت سید البشر، ص۱۷۔

۷۵۔ الانفال: ۲۰۔

۷۶۔ آزاد، ابوالکلام، رسول رحمت، (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) ۱۹۔

۷۷۔ مودودی، ابوالاعلی، سیرت سرورِ عالم (ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۹۴ء طبع ششم) ۱۳/۲۔

78. Robson James, Ibn Ishaq's use of Isnad, Bulletin of John Rylands Library,Manehester U.K 1956A.D 38/449-465.

۷۹۔ ابوداؤد، السنن مع عون المعبود (نشر السنہ، ملتان) ۳۵۶/۳، الدارمی، السنن، ۱۲۵/۱۔

۸۰۔ احمد، المسند (دار الفکر، قاہرہ) ۱۵۸/۲-۲۶۶۔

۸۱۔ صحیفہ ھمام بن منبہ (الصحیفہ الصحیحہ تحقیق علی حسن علی، عبدالحمید، المکتب الاسلامی، بیروت، اس کا انگلش میں ترجمہ پروفیسر محمد رحیم الدین نے کیا جو حیدر آباد سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ علی حسن نے اس میں ۱۳۸ احادیث کا ذکر کیا۔ اس صحیفہ کی ابتدائی دریافت کا سہرا ڈاکٹر حمید اللہ کے سر ہے۔

۸۲۔ ذہبی، ابوعبداللہ محمد، العبر فی خبر من غبر، ص۸۲۔

۸۳۔ ایضاً، ص۱۰۹۔

۸۴۔ انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ، ص۹۹۔

۸۵۔ ایضاً، ص۹۸۔

۸۶۔ ایضاً، ص۱۰۰۔

۸۷۔ ذہبی، العبر فی خبر من غبر، ص۱۴۰۔

۸۸۔ ایضاً، ص۱۴۸۔

۸۹۔ الواقدی، محمد بن عمر، کتاب المغازی، (عالم الکتب بیروت) ۲۷/۱ (مقدمہ)۔

۹۰۔ کشف الظنون، ۱۰۱۲/۲، الفہرست ۱۰۵۔

۹۱۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان (منشورات الشریف الرضی، قم) ۳۳۸/۲-۳۳۹۔

۹۲۔ ذہبی، العبر، ۲۹۵/۱

۹۳۔ الواقدی، محمد بن عمر، کتاب المغازی، اس میں آنحضرت ﷺ کے مغازی کی پوری تفصیل ہے۔

۹۴۔ النحل: ۴۴۔

۹۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۶۴۲/۲-۷۴۴۔

۹۶۔ الطبری، محمد بن جریر، جامع البیان (مصطفی الحلبی البابی، مصر ۱۹۶۸) ۱/۳۶۔

۹۷۔ حسان بن ثابت، دیوان حسان بن ثابت (داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۷۴ء) ص ۱۸۔

۹۸۔ پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی، اصول سیرت نگاری (مکتبہ یادگار علامہ شبیر احمد عثانی، کراچی ۲۰۰۳) ص ۱۴۶۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۲۷۵۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۲۶۱-۲۶۴۔

۱۰۱۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۴۰-۴۱ (مقدمہ)۔

۱۰۲۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسولؐ (اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۹) ص ۱۶۷ تا ۱۷۲۔

۱۰۳۔ اصول سیرت نگاری، ص ۱۷۰۔

۱۰۴۔ قتیل داناپوری، سید محمد قاسم نورانی، مقالہ تذکرہ آسمانی صحائف میں (سیدنا محمد عربی ﷺ نمبر، برکاتی پبلشرز، کراچی ۱۹۸۷ء) ص ۶۳۹۔

۱۰۵۔ اصول سیرت نگاری، ص ۴۰۴۔

۱۰۶۔ اصول سیرت نگاری، ص ۳۹۰۔

۱۰۷۔ آلوسی، محمود شکری، بلوغ الارب (اردو ترجمہ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۲۷ء) ۱/۲۹۔

۱۰۸۔ اصول سیرت نگاری، ص ۳۹۸۔

۱۰۹۔ ابوالنور الحدیدی، الدکتور، التفسیر بالماثور ومناهج المفسرین (بحوث المرکز للتعلیم الاسلامی، مکہ المکرّمہ ۱۹۸۲ء) ص ۴۷۔

۱۱۰۔ النحل: ۱۲۵۔

۱۱۱۔ اصول سیرت نگاری، ص ۳۲۷۔

۱۱۲۔ مبارکپوری، مولانا قاضی اطہر، تدوین سیر و مغازی، (دارالنوادر الحمد مارکیٹ لاہور، ۲۰۰۵ء) مقدمہ۔

۱۱۳۔ اٹلس سیرت نبوی، مکتبہ دارالسلام نے الریاض سے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع کی ہے۔

۱۱۴۔ اصول سیرت نگاری، ص ۵-۱۷۔

۱۱۵۔ داناپوری، ابوالبرکات عبدالرؤف، اصح السیر (مجلس نشریات اسلام، کراچی) ص ۸-۹۔

۱۱۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱-۱۴/۱۷۵۔

۱۱۷۔ اصح السیر، ص ۸۔

۱۱۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۴، حصہ اوّل، ص ۱۷۵۔

۱۱۹۔ اصح السیر، ص ۸۔

۱۲۰۔ ایضاً۔

۱۲۱۔ ایضاً،ص۹۔

۱۲۲۔ ندیم الواجدی، سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو (نقوش رسولؐ نمبر، ش،۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۲ء) ۱/ ۵۳۔

۱۲۳۔ کاندھلوی، مولانا محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰؐ (مکتبہ عثمانیہ اقبال ٹاؤن لاہور) ۱/ ۳۔

۱۲۴۔ اصح السیر، ص۱۶۔

۱۲۵۔ سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو، ۱/ ۵۷۔

۱۲۶۔ ایضاً، ۱/ ۵۷۔

۱۲۷۔ السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ (اردو) (مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۶ء) ص ۳۰۔

۱۲۸۔ اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص ۲۶۔

۱۲۹۔ سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو، نقوش رسولؐ نمبر، ۱/ ۵۷۔

۱۳۰۔ گیلانی، مولانا مناظر احسن، تدوین حدیث، ص ۱۱۔

۱۳۱۔ حریری، پروفیسر غلام احمد، سیرت نگاری، (غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ مقالہ مخزونہ انور محمود خالد) ص ۴۔

۱۳۲۔ الحجرات:۶۔

۱۳۳۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/ ۴۰۔

۱۳۴۔ اصح السیر، ص ۲۰۔

۱۳۵۔ ایضاً۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۳۷۔ الطبری

۱۳۸۔ صدیقی، ڈاکٹر زبید احمد، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۷ء) ص ۳۱۔

۱۳۹۔ سیف، قاضی محمد اسلم، تحریک اہل حدیث: تاریخ کے آئینے میں (جامعہ تعلیم الاسلام، ماموں کانجن، فیصل آباد) ص ۱۲۷۔

۱۴۰۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان (القاہرہ ۱۹۸۷ء) ص ۸۴۔

۱۴۱۔ ندوی، سید سلیمان، عربوں کی جہاز رانی (اسلامک کلچر حیدر آباد دکن) ص ۵۲-۵۳۔

۱۴۲۔ بزرگ بن شہریار ناخدا، رام ھرمزی، کتاب عجائب الہند (طبع ۱۸۸۲ء) بحوالہ علوم الحدیث، عبدالرؤف ظفر، (نشریات لاہور ۲۰۰۶ء) ص ۶۷۰۔

۱۴۳۔ حسنی، عبدالحئی، نزہۃ الخواطر (دائرۃ المعارف، حیدر آباد، بھارت) ۱/ ۳۵۔

۱۴۴۔ الجہود المخلصہ ،ص۱۴۔

۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۸۔

۱۴۶۔ ایضاً،ص۲۴۔

۱۴۷۔ اطہر مبارک پوری، قاضی، فاتحین ہند حضرات عثمان وحکم اور مغیرہ بنو ابوالعاصی ثقفی رضی اللہ عنہ، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹ء) ص:۲۷-۹۰۔

۱۴۸۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، محاضرات حدیث (الفیصل ناشران کتب لاہور ۲۰۰۴ء) ص۴۱۳۔

۱۴۹۔ مبارکپوری، قاضی اطہر، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (مکتبہ عارفین کراچی) ص۱۸۔

۱۵۰۔ فریوائی، عبدالرحمٰن بن عبدالجبار، الجہود المخلصہ فی خدمۃ السنہ المطہرۃ (الجامعہ السلفیہ بنارس ہند، ۱۴۰۶ھ) ص۲۱-۲۲، بحوالہ احسن القاسم۔

۱۵۱۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق، علم حدیث میں پاک وہند کا حصہ، ترجمہ شاہد حسن رزاقی (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۷ء) ص۴۷-۶۱۔

۱۵۲۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، (دارالفکر بیروت ۱۹۹۴ء) ص۸۰-۸۱۔

۱۵۳۔ بلگرامی، میر غلام علی آزاد، مآثر الکرام ص۸۔

۱۵۴۔ نوشہروی، ابویحیٰی امام خان، ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات (مرکز جمعیۃ الطلبہ اہل حدیث لائل پور ۱۳۹۱) ص۱۱۔

۱۵۵۔ اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص۱۹۶۔

۱۵۶۔ ''حلیہ مبارک'' کے متن کے لیے دیکھیے :سیدہ اشرف ظفر، امیر کبیر سید علی مہران الہور، ندوۃ المصنفین (دارالمصنفین، حیدرآباد، ہند) ۱۹۷۲ء۔

۱۵۷۔ ڈاکٹر سفیر اختر، مقالات سیرت کانفرنس ۲۰۰۰ء، برصغیر میں سیرت نگاری (سیرت چیئر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور طبع ۲۰۰۵ء) ص۴۹۹۔

۱۵۸۔ دہلوی، شیخ عبدالحق محدث (مطبع مجتبائی اخبار الاخیار، دہلی، ۱۳۳۲ھ) ص۱۵۰-۱۵۱، رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند (مترجم محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء) ص۳۲۳۔

۱۵۹۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص۴۲۳-۴۳۴۔

۱۶۰۔ یو۔ایف آرگل فارسی بر مبنای تالیف استوری (مؤسسہ مطالعات فرہنگی تہران، ۱۳۶۲ھ) ۲/ ۶۸۷-۶۹۷۔

۱۶۱۔ محمد غوثی شطاری مانڈی، اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار (مترجمہ فضل احمد جیوری، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور ۱۳۹۵ھ) ص۴۳۲، سید محمد مطیع اللہ راشد، برہان پور کے سندھی اولیاء، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، ۱۹۸۸ء) ص۸۔

۱۶۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے، آفتاب اصغر، تاریخ نویسی فارسی ہندو پاکستان، تیموریان بزرگ از بابر تا اورنگ زیب (خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران، لاہور، ۱۳۶۴ھ) ش۔

۱۶۳۔ ڈاکٹر محمد اسحاق، علم حدیث میں پاک و ہند کا حصہ، ص ۱۳۱۔

۱۶۴۔ پاکستان میں خطی نسخوں کے لیے دیکھیے، احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان (مرکز تحقیقات فارسی ایران، اسلام آباد، پاکستان ۱۹۸۶ء) ۱۰/۱۹۴-۱۹۵۔

۱۶۵۔ خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مکتبہ رحمانیہ لاہور (س۔ن)) ص ۱۹۳۔

۱۶۶۔ مطبوعہ لکھنؤ منشی نول کشور (چاپ دوم، ۱۳۳۳ھ) مطبع خورشید عالم لاہور، ۱۳۷۵ھ۔

۱۶۷۔ حیات شیخ عبدالحق محدث، ص ۲۵۰۔

۱۶۸۔ احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان، ۱۰/ ۱۹۸۔

۱۶۹۔ ایضاً، ۱۰/ ۲۰۰-۲۰۱۔

۱۷۰۔ ایضاً، ۱۰/ ۱۹۹-۲۰۰۔

۱۷۱۔ ایضاً، ۱۰/ ۱۹۹۔

۱۷۲۔ لطف اللہ مہندس کا قصیدۃ بانت سعادۃ، قصیدۃ بردہ مترجم (مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج لاہور، ۱۹۶۳ء) ص ۴۶۔

۱۷۳۔ غازی ڈاکٹر محمود احمد، محاضرات سیرت (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۴ء) ص ۶۳۴۔

۱۷۴۔ ہاشمی، حمید اللہ شاہ، پنجابی زبان وادب (انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۸۶ء، بار اوّل) ص ۳۱۵۔

۱۷۵۔ سعید اللہ قاضی، مضمون: پشتو میں سیرت کی کتابیں، ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک، جون ۱۹۷۸ء) ص ۳۷-۴۵ جولائی ۱۹۷۸ء، ص ۳۵-۴۲، ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۴۳-۴۸، اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص ۱۳-۲۳۔

۱۷۶۔ فکر و نظر اسلام آباد، جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۹۷-۱۰۸۔

۱۷۷۔ عبدالصمد، ڈاکٹر، سیرت نبوی ﷺ اور سیرت نگاری کا خصوصی مطالعہ (یونیورسل پبلشرز، اردو بازار، کراچی ۲۰۰۱ء) ص ۳۶۲۔

۱۷۸۔ مقدمہ "سیرت النبی" (ج ۱) از علامہ شبلی نعمانی، مقدمہ اصح السیر از مولانا عبدالرؤف دانا پوری، سیرت نگاری از عبدالعزیز عرفی، اصول سیرت نگاری از پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی، اردو نثر میں سیرتِ رسولؐ از ڈاکٹر انور محمود خالد، تدوین سیر و مغازی از قاضی اطہر مبارکپوری۔

❁❁❁❁

عصرِ حاضر میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت، جدید مسائل اور ان کا حل

عالمِ اسلام کو وحدت کی لڑی میں پرونے کے لیے دنیا کے ہر خطے میں موجود مسلمانوں کے پاس ایک ہی جیسا قابلِ عمل نمونہ ہونا چاہیے، اور یہ امت مسلمہ کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پاس وہ گوہرِ نایاب تذکرہ پیغمبر اسلامؐ کی شکل میں محفوظ ہے اور اس باب میں کئی وجوہ کی بنا پر امت مسلمہ کو دیگر مذاہب کے پیروکاروں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ ان کے ہاں یا تو اس بانی مذہب کے ذاتی اقوال محفوظ ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو ناقص اور غیر مستند ذرائع سے اکٹھے کیے گئے ہیں جبکہ مسلمانوں کے پاس اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ قابلِ فخر انداز میں محفوظ ہے۔

آپؐ کی سیرتِ مقدسہ قرآن مجید کی عملی تفسیر اور احکام الٰہیہ کا عملی نمونہ ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول انسان کی عملی سیرت کا نام خلق (اخلاق) ہے اور قرآن مجید نے آپ ﷺ کو صاحبِ خلق عظیم قرار دیا۔(۱) مسلمانوں کے لیے آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ خالقِ کائنات خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ان کی اطاعت کریں۔ اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ: ﴿فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (یعنی دنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی)۔

دیکھنا یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں آنحضرت ﷺ کی سیرت اور طرزِ زندگی میں ہمارے لیے کیا سبق ہیں۔ سیرت نبوی ﷺ کی پہلی خصوصیت دائمی ہونا ہے۔ کسی انسانی سیرت کے دائمی نمونہ عمل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے صحیفہ حیات کے تمام حصے سچائی اور صداقت پر مبنی ہوں۔ اگر اقوامِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور شارعین ادیان اور بانیان مذاہب کی سوانح اور سیرتوں کے معیار کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ سیرت نبوی ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی زندگی کے واقعات اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کے بارے میں صحیح اور درست معلومات مہیا نہیں ہیں۔ علماء یہود نے ان میں تحریف وترمیم کر دی۔ عرصہ دراز کے بعد انھیں لکھا گیا تھا اور مصنف بھی نامعلوم ہیں۔ صرف یہی بات موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کی صحت وصداقت میں شبہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہی کیفیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کی ہے۔ مسیحی کلیسا کے نزدیک سرکاری طور پر جس مجموعے کو انجیل کہا گیا اور تسلیم کیا گیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صدیوں بعد آخری دور میں ترتیب دیا گیا۔ اناجیل کی اپنی صحت مشکوک ہے کیونکہ جب ان اناجیل کو مستند مانا گیا اس وقت مختلف مصنفوں کے سیکڑوں اناجیل کے نسخے مسیحیوں کے درمیان متداول تھے، ان میں سے بغیر کسی معیاری اصول کے ان اناجیل کو چن لیا گیا جن کی پشت پر کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔

بدھ اور کنفیوشس کے حالات میں کاہنوں کی من گھڑت کہانیاں ملتی ہیں۔ صحیح ترین سیرت، مدلل، علمی و تحقیقی، تواتر کی حد تک درست اور صداقت کے معیار پر مبنی صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہی ہے اور اس دعویٰ میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دنیا کی تمام قومی اور علاقائی زبانوں میں حضرت محمد ﷺ کی سیرت پر اتنی کتب لکھی جا چکی ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر مارگولیتھ (Margoliouth) نے ''محمدؐ اور ظہورِ اسلام'' کے نام سے نبی اکرم ﷺ کے حالات پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تو اس کی ابتداء ان الفاظ سے کی:

The biographers of Prophet Mohammad form a long series which is impossible to end but in which it would be honourable to find a place(2)

سیرت نبوی ﷺ کی دوسری خصوصیت آپ ﷺ کی زندگی کے تمام واقعات کا پورے تسلسل کے ساتھ معلوم ہونا ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جو پردۂ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں گم ہو۔ لیلها کنهارها کہ آپ ﷺ کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں کسی پر گمنامی کا کا پردہ نہیں پڑا۔ آپ ﷺ کے والد عبداللہ اور والدہ آمنہ کی شادی سے لے کر آپ ﷺ کی زندگی کے آخری لمحہ تک سب حالات و واقعات معروف اور معلوم ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن، شباب اور نبوت سے قبل کی زندگی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ نبوت کے بعد حالات زندگی ہیں ان سے آپ علیہ السلام کی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات بھی ہم سے اوجھل ہیں۔ جن کے متعلق

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں ہے کہ صرف پچاس دنوں کے برابر زندگی کے حالات معلوم ہیں۔(۲/۱)

اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے جب قریش مکہ کو دعوت حق دی تو یہ فرمایا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّن قَبْلِهِ أَفَلا تَعْقِلُونَ﴾ (۳) (میں نے تمھارے درمیان اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ گزارا ہے کیا تم عقل نہیں رکھتے)۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ایک کھلی اور روشن کتاب ہے۔ جس کا ہر باب روز روشن کی طرح واضح ہے۔ مغربی مفکر فلپ ہٹی نے سیرت طیبہ کی اس خصوصیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

Mohammad was born with the full light of history(4).

''حضرت محمد ﷺ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے۔''

سیرت نبوی ﷺ کی تیسری خصوصیت آپ ﷺ کی سیرت کی کاملیت ہے کیونکہ کوئی زندگی خواہ کس قدر تاریخی ہو جب تک کامل نہ ہو نمونہ نہیں بن سکتی۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۵) (رسول اللہ ﷺ کی سیرت تمھارے لیے ایک مکمل نمونہ ہے) آپ ﷺ کی سیرت میں کوئی ایسا پہلو نہیں جس کی تکمیل باقی ہو: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيناً﴾ (۶) (آج میں نے آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کے دین کو مکمل کر دیا اور آپ ﷺ پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دی اور آپ ﷺ کے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں پر محیط ہے یعنی آپ ﷺ کی حیات طیبہ جامع زندگی کا نمونہ ہے۔ جس میں وہ تمام قواعد اور اصول پائے جاتے ہیں جن سے قوموں کی فلاح اور ترقی وابستہ ہے۔ اس میں انفرادی، اجتماعی، گھریلو اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق رہنمائی موجود ہے، جو دوسرے انسانوں کی سیرتوں میں نظر نہیں آتی، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک قومی لیڈر کی زندگی ہے جس کا مقصد اپنی قوم کو غلامی کے اس طوق سے نجات دلانا تھا جو مصریوں نے ان کے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ جبکہ بقیہ امور زندگی کے متعلق کوئی رہنمائی آپ ﷺ کی سیرت میں میسر نہیں ہے۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام ایک عابد، زاہد، داعی کی نمائندگی تو کرتے ہیں مگر دیگر امور زندگی سے بالکل بے نیاز ہیں۔ اس صورت میں سیرت نبوی ﷺ ہی ایک ایسی جامع حیات طیبہ ہے جو انسانی زندگی کے

تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ جس میں ہر نوع، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے رہنمائی کی مثالیں موجود ہیں۔

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (۷) (بے شک اللہ کے ہاں اسلام ہی دین ہے)۔

سیرت نبوی ﷺ کی چوتھی خصوصیت عالمگیریت ہے۔

سیرت محمدیہ ﷺ تمام بنی نوع انسان کے لیے رہنمائی مہیا کرتی ہے جس میں نہ تو رنگ ونسل کی کوئی قید ہے اور نہ ہی علاقہ اور زبان کی۔ جب ہم دوسرے انبیاء کی سیرتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمات کسی خاص قبیلے یا علاقے کے لیے تھیں اور صرف اسی دور کے لیے تھیں۔ جس میں وہ نبی تھے لیکن نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ آنے والے تمام ادوار اور جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً﴾ (۸) (فرما دیجیے کہ اے لوگو! بے شک میں آپ سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں)۔

حضرت محمد ﷺ سے پہلے انبیاءؑ کسی خاص علاقے یا قوم کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔ ان کی تعلیمات صرف انھیں لوگوں کے لیے نمونہ تھیں۔ رسول اللہ کی سیرت عمومی اور عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً﴾ (۹) (ہم نے آپ ﷺ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا)۔

اسی بات کا اظہار نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتا ہے: "بعثت الی کل احمر واسود" (۱۰) (میں ہر ایک سرخ اور سیاہ کی طرف بھیجا گیا ہوں)۔

ایک اور جگہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وکان النبی یبعث الی قومه وبعثت الی الناس عامة" (۱۱) (کسی نبی کو اس کی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں)۔

سید سلیمان ندوی دلائل دے کر کہتے ہیں: "عالمگیر اور دائمی نمونہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے" (۱۲) آپ ﷺ کی سیرت کی اس خصوصیت کا ذکر قرآن کریم نے سورۂ احزاب میں اس

طرح فرمایا ہے: ﴿یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِیْراً وَدَاعِیاً إِلَی اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً﴾ (۱۳) (اے نبی ﷺ ہم نے آپ ﷺ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف داعی اور سراج منیر بنا کر بھیجا)۔

مطالعۂ سیرت نبویؐ کی اہمیت:

حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی جملہ اوصاف حمیدہ کا مجموعہ ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت صادق و امین تاجر، اولوالعزم مبلغ و داعی، اعلیٰ ترین معلم انسانیت، بے مثال مربیّ و مزکی، عظیم سپہ سالار، مدبر و منتظم، بے مثال قانون ساز، عدیم النظیر منصف و قاضی، قابل تقلید سربراہ خاندان، اعلیٰ اخلاق کے مالک اور رسول رحمت جیسی صفات کا مجموعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ہمہ گیر سیرت کے مطالعہ کی اہمیت کے پیشِ نظر نہایت ہی اختصار کے ساتھ ان اوصاف حمیدہ کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ ﷺ کو اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ کا اخلاق قرآن کی تفسیر ہے، وہ کون سا شعبۂ زندگی ہے جس کے لیے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی میسر نہیں آتی؟

مسلمانوں کو آپ کی سیرت کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے کہ آپ ﷺ ایک انسانِ کامل کی حیثیت سے پوری دنیا کی رہنمائی کے لیے آئے، جو حکم کسی دوسرے کو دیا سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا اور کوئی ایسا حکم امت کو نہیں دیا امت جس کے کرنے سے قاصر رہی ہو۔ اللہ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (۱۴) (جو کچھ رسول ﷺ تمھیں دے اس پر عمل پیرا ہو جاؤ اور جس چیز سے وہ تمھیں روکے رُک جاؤ)۔

اس لیے کہ رسول ﷺ اپنے طور پر نہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں نہ اس سے روکتے ہیں وہ تو پیغام خداوندی کو پہنچاتے ہیں جیسا کہ سورۂ نجم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ (۱۵) (وہ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے وہ تو وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے)۔

اس لیے مسلمان کے لیے ضروری ٹھہرا کہ وہ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعے کے بعد اس

استعمال کیا گیا۔ یہ تمام حربی تدابیر میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جدید سے جدید جنگی تکنیک اختیار کرنے کا سبق دیتی ہیں۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ﴾ (۱۹) (ہلکے اور بوجھل نکلو اور اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو)۔ نبی اکرم ﷺ اس ارشادِ خداوندی کی زندہ تعبیر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''انا کنا اذا حمی الباس واحمرت الحدق واتقینا برسول اللہ فما یکون احدًا اقربنا الی العدو منه'' (۲۰) (جب گھمسان کا رَن پڑتا اور لڑنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے اور سب سے آگے دشمن کی جانب نبی ﷺ ہی ہوتے تھے)۔

آپ ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے ایک فاتح کو بھی سبق ملتا ہے کہ جب وہ دشمن پر غالب آ جائے تو مغلوب دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا: ''لا تثریب علیکم الیوم'' (۲۱) (آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں)۔

ایک تاجر یا دکاندار کو آپ ﷺ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے یہ درس ملے گا کہ تجارت نہ صرف حصول روزگار کا ذریعہ ہے بلکہ دین اور دنیا کی کامیابی اور بھلائی کا راز بھی اس میں پوشیدہ ہے۔ پھر نہ تو وہ اس میں ملاوٹ کرے گا اور نہ ناپ تول میں کمی کرے گا، نہ سودا فروخت کرتے وقت اس کے عیب چھپائے گا اور نہ ہی ذخیرہ اندوزی کرے گا تاکہ اس طرح وہ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (۲۲) (ماپ اور تول انصاف سے پورے پورے دو)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من غشّ فلیس منّا'' (۲۳) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لایحتکرُ إلا خاطیء'' (۲۴) (گناہ گار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے)۔

آپ ﷺ نے جھوٹی قسمیں کھا کر مال فروخت کرنے سے بھی منع فرمایا: ''عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لا یکلمهم اللہ یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم. قلت: من هم یا رسول اللہ؟ فقد خابوا و خسروا قال: المسبل إزاره

استعمال کیا گیا۔ یہ تمام حربی تدابیر میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جدید سے جدید جنگی تکنیک اختیار کرنے کا سبق دیتی ہیں۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿انفِرُوا خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ﴾ (۱۹) (ہلکے اور بوجھل نکلو اور اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو)۔ نبی اکرم ﷺ اس ارشادِ خداوندی کی زندہ تعبیر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''انا کنا اذا حمی الباس واحمرت الحدق واتقینا برسول اللہ فما یکون احدًا اقربنا الی العدو منه'' (۲۰) (جب گھمسان کا رن پڑتا اور لڑنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے اور سب سے آگے دشمن کی جانب نبی ﷺ ہی ہوتے تھے)۔

آپ ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے ایک فاتح کو بھی سبق ملتا ہے کہ جب وہ دشمن پر غالب آ جائے تو مغلوب دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا: ''لا تثریب علیکم الیوم'' (۲۱) (آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں)۔

ایک تاجر یا دکاندار کو آپ ﷺ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے یہ درس ملے گا کہ تجارت نہ صرف حصول روزگار کا ذریعہ ہے بلکہ دین اور دنیا کی کامیابی اور بھلائی کا راز بھی اس میں پوشیدہ ہے۔ پھر نہ تو وہ اس میں ملاوٹ کرے گا اور نہ ناپ تول میں کمی کرے گا، نہ سودا فروخت کرتے وقت اس کے عیب چھپائے گا اور نہ ہی ذخیرہ اندوزی کرے گا تاکہ اس طرح وہ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ (۲۲) (ماپ اور تول انصاف سے پورے پورے دو)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من غشّ فلیس منّا'' (۲۳) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لایحتکرُ إلا خاطیء'' (۲۴) (گناہ گار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے)۔

آپ ﷺ نے جھوٹی قسمیں کھا کر مال فروخت کرنے سے بھی منع فرمایا: ''عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم. قلت: من هم یا رسول الله؟ فقد خابوا و خسروا قال: المسبل إزاره

والمنان، والمنفق سلعتہ بالحلف الکاذب" (۲۵) (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ نقصان میں رہے، اللہ کے رسول ﷺ کون ہیں وہ؟ فرمایا: (ٹخنوں سے نیچے) چادر لٹکانے والا، احسان جتانے والا اور جھوٹی قسم سے مال فروخت کرنے والا)۔

رسول اللہ ﷺ خود تجارت میں کبھی دھوکہ نہ کرتے تھے۔ دیانت داری سے کام لیتے۔ جس کی گواہی حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ نے دی۔ اسی وجہ سے حضرت خدیجہؓ نے شادی کا پیغام بھیجا۔

ایک شوہر اور باپ جب سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنی زندگی کو عدل وانصاف اور مساوات سے گزارنے کا درس ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے عورتوں کی عزت ووقار میں جس قدر اضافہ فرمایا اس سے قبل کی عورت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

حضور ﷺ کے ارشادات کے مطابق انسان کے اخلاق وکردار اس کے اہل خانہ کے ساتھ سلوک سے ظاہر ہوتے ہیں۔

"عن عائشہؓ قالت قال رسول اللہ ﷺ: خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی" (۲۶) (حضرت عائشہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ میں آپ سب میں سے اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہوں)۔

رسول اللہ ﷺ سب بیویوں کے ساتھ انصاف سے کام لیتے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً﴾ (۲۷) (اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)۔ جس سے ایک باپ اپنے فرائض کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

ایک حکمران یا سربراہ ادارہ کی حیثیت سے جب آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ سے تعمیر کردار کا سبق ملتا ہے۔ عدل کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۲۸) (اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے)۔

سیرت طیبہ پر عمل کرنے سے عدل جیسی صفت پیدا ہوتی ہے۔ اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِلَّا الْمُوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (۲۹) (کہہ دیجیے میں آپ سے اجر کا تقاضا نہیں کرتا سوائے قرابت داری کی محبت کے)۔

جواب دہی کے احساس کے پیشِ نظر حکمران وقت من مانی نہیں کرتا بلکہ مخلوق کی فلاح چاہتا ہے اور فرائض نیابت ادا کرتا ہے کیونکہ حقیقی ملکیت صرف اللہ کی ہے، ارشادِ خداوندی ہے: ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳۰) (اللہ ہی کے لیے آسمان وزمین کی بادشاہت ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من جعل قاضيًا بين الناس فقد ذبح بغير سكين.'' (۳۱) (جس کو لوگوں کے درمیان جج بنایا گیا وہ چھری کے بغیر ذبح ہو گیا) یعنی اس پر بہت بڑی ذمہ داری پڑ گئی جس میں اس کو ہر حال میں انصاف کرنا ہوگا۔

عصر جدید کے مسائل اور ان کا حل:

آج کا انسان بے شمار مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ یہ مسائل معاشی بھی ہیں، سیاسی بھی اور اخلاقی بھی۔ کہیں انفرادی مسائل ہیں تو کہیں اجتماعی، قومی بھی اور بین الاقوامی بھی۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور کا انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور چاند پر اپنا قدم جمانے کے باوجود گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ معاشی اور معاشرتی مسائل میں بڑھتی ہوئی آبادی، ناخواندگی اور جہالت، بیروزگاری، بیماری، مہنگائی، معاشی بدحالی اور ناہمواریاں قابل ذکر ہیں۔ طبقاتی کشمکش، نسلی امتیاز، آزادیٔ نسواں کا مسئلہ، عائلی نظام میں شکست و ریخت کا عمل، منشیات کا استعمال، شراب نوشی، لاقانونیت، ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کا جنون، مذہب سے دوری و معاشرتی بے راہ روی، الحاد و دہریت، اقتصادی بدحالی اور بدامنی، بین الاقوامی بدنظمی، بے حیائی اور مغرب کی اندھی تقلید قابل توجہ مسائل ہیں۔ عصرِ جدید کے ان تمام مسائل کا حل سیرت طیبہ ﷺ میں موجود ہے۔ آپ ﷺ کی پاکیزہ سیرت ایک مکمل دستور حیات ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۳۲) (تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے)۔

رسولِ اکرم ﷺ کے فراہم کردہ اس دستور حیات میں عصر حاضر کی خرابیوں کی اصلاح اور

مسائل کے حل کی صلاحیت بتمام وکمال موجود ہے۔

آبادی میں اضافہ:

جدید دور کا سب سے اہم مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی ہے جو پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کی سماجی، اقتصادی اورعوامی فلاح و بہبود میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے۔ تیسری دنیا میں اب اس اضافہ کی شرح تین فیصد سالانہ ہے جس کی وجہ سے ہر سال تقریباً ۷۵ملین افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ روزگار اور بہتر معیار زندگی کے لیے شہروں کی طرف نقل مکانی کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ۲۰۳۰ء تک شہری اور دیہی آبادی میں تناسب بالکل بدل جائے گا۔

سیرت طیبہ میں جب ہم بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ کے حل کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد کو اس اندیشہ سے قتل نہ کیا جائے کہ وہ رزق میں حصہ دار ہو جائیں گے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (۳۳) (اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم ان کو بھی اور آپ کو رزق دیتے ہیں۔ ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے)۔

اسلام آبادی میں اضافہ کے مسئلے کا حقیقی حل پیداوار میں اضافہ کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔

ارشادربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ﴾ (۳۴) (ہم نے تم کو زمین میں قدرت دی اور اس میں تمھارے وسائل معیشت بنائے)۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں''۔ (۳۵)

مخلوق انسانی رحمت ہے، اگر انھیں صحیح سمت لگایا جائے اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو اضافہ آبادی مسئلہ نہیں بلکہ یہ افرادی قوت کے طور پر انسانی ترقی کے لیے نفع بخش ہو سکتا ہے۔ زمین انسان کا مسکن ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۳۶) (آپ کے لیے زمین میں ٹھہرنا ہے اور کچھ وقت کے لیے فائدہ اٹھانا ہے)۔

اور رزق مہیا کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ

مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۷) (ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کو تقسیم کر لیا)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لیس لابن آدم حق سوی هذه الخصال بیت یسکنه وثوب یواری به عورته وجلف الخبز والماء" (۳۸) (ابن آدم کے لیے ان چیزوں کے علاوہ کوئی اور حق نہیں؛ ایک گھر جس میں وہ رہائش پذیر ہو یا پھر کپڑا جس سے وہ اپنا ستر چھپائے، گندم کی روٹی اور پانی)۔

ان آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالے سے انسانی آبادی میں اضافہ اس وقت باعث تشویش ہوگا جب لوگ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تقدیر کے منتظر ہوں گے وگرنہ وسائل بہت زیادہ موجود ہیں۔ ان کو عقل سے کام لے کر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ قانون فطرت ہے، لیس للانسان الاماسعی (انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی یہ کوشش کرتا ہے)۔

ناخواندگی اور جہالت:

جہالت کا خاتمہ اور تعلیم کا فروغ عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے کیونکہ عالم اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان اور تعلیم کی دنیا میں اقوام عالم سے بہت پیچھے ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں ہم ناخواندگی کی تاریکیوں کو علم کی روشنی میں کیسے تبدیل کریں تاکہ ہم بھی مغربی اقوام کی طرح ترقی کی منازل طے کر سکیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فروغ تعلیم کے متعلق ارشاد فرمایا:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (۳۹) (علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

نبی اکرم ﷺ کا طلب علم کا انداز قرآن نے یوں بیان کیا ہے: ﴿قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْماً﴾ (۴۰) (کہہ دیجیے! اے میرے رب مجھے زیادہ علم عنایت فرما)۔

اہلِ علم کو اللہ کے ہاں زیادہ عزت دے کر اہل علم کی برتری کا اظہار قرآن میں اس طرح فرمایا ہے: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۴۱) (کہہ دیجیے! کیا اہل علم اور ناخواندہ برابر ہو سکتے ہیں)۔

علم سے ہی اللہ کے قانون اور ضابطے کی صحیح پہچان ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (۴۲) (اللہ سے اس کے بندے علماء ہی ڈرتے ہیں)۔

حدیث نبوی ﷺ ہے: "خیر کم من تعلم القرآن وعلمه" (۴۳) (آپ میں بہتر وہ

ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "انما بعثت معلما" (۴۴) (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا)۔ مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے گھر میں پھر دار ارقم اور شعب ابی طالب میں یہ سلسلہ قائم رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا گھر بھی علمی مرکز تھا۔ مدینہ کے لیے بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد حضرت مصعب ؓ بن عمیر کو معلم بنا کر روانہ فرمایا کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم دیں (۴۵)۔ مدینہ میں مسجد نبوی کے اندر صفہ کی درسگاہ تھی۔ اس طرح دیگر مساجد میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری تھا جن میں سے مسجد قبا کا ابن عبدالبر نے ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"**حدثنی عشر من اصحاب رسول اللہ ﷺ قالوا کنا نتدارس العلم فی مسجد قبا اذ خرج علینا رسول اللہ فقال: تعلموا ما شئتم ان تعلموا فلن یاجرکم اللہ حتی تعملوا**" (۴۶) (نبی ﷺ کے دسیوں صحابہ ؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لوگ مسجد قبا میں علم دین سیکھتے، پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اس حال میں کہ نبی ﷺ ہمارے پاس آئے اور فرمایا کہ جو چاہو تم لوگ پڑھو جب تک عمل نہیں کرو گے اللہ اجر و ثواب نہیں دے گا)۔

مسجد نبویؐ کا وہ ستون جس سے حضرت ابولبابہ ؓ نے غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو باندھ لیا تھا یہاں تک کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ نبی ﷺ اس کے پاس اکثر نوافل پڑھا کرتے تھے اور یہیں صبح کی نماز کے بعد تعلیمی مجالس قائم فرماتے تھے۔ آپؐ ان کو قرآن، حدیث، فقہ اور دین کی تعلیم دیتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر ادا فرما لیتے تو ہم لوگ آپ ﷺ کے پاس بیٹھ جاتے اور ہم میں سے کوئی آپ ﷺ سے قرآن کے بارے میں سوال کرتا، کوئی فرائض کے بارے میں دریافت کرتا اور کوئی خواب کی تعبیر معلوم کرتا تھا۔ (۴۷)

عہد نبوی ﷺ میں گھر گھر قرآن حکیم کی تعلیم کا رواج عام ہو گیا۔ گھریلو مکاتب جاری ہو گئے۔ صحابہ کرام ؓ، ان کے بچے، ان کے پوتے اور بیویاں تک قرآن کی تعلیم سے استفادہ کرنے والوں میں سے ہو گئیں۔ (حضرت ابوالدرداء ؓ سے ایک دفعہ نبی ﷺ نے مستقبل میں علم دین کے اٹھ جانے کی بات کی تو حضرت زیاد بن لبید انصاری بیاضی ؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا "**کیف یختلس منا**

وقد قرأنا القرآن فو الله لنقرأنه نساء نا وأبناء نا" (۴۸) (علم ہم سے کیسے اٹھالیا جائے گا حالانکہ ہم نے قرآن پڑھ لیا ہے۔ خدا کی قسم، ہم اپنی عورتوں کو پڑھائیں گے اور اپنے بیٹوں کو پڑھائیں گے)۔ اس سے مدینہ میں قرآن اور دینی تعلیم کے لیے گھریلو مدارس کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نبی ﷺ نے تعلیم و تعلم کا اہتمام اگرچہ مکہ میں بھی کیا تھا لیکن مدینہ پہنچ کر تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں اس کے باوجود عربی لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس زمانہ میں عربی رسم الخط اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ اسی وجہ سے اس کا سیکھنا بے حد مشکل تھا۔ جنگ بدر میں جب قریش کے ستر سرکردہ افراد گرفتار ہو کر آئے تو پتہ چلا کہ ان میں سے چند ایسے قیدی بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ نبی ﷺ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کے لیے شرط مقرر کی کہ اگر ان میں سے ہر قیدی مدینہ منورہ کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا اور یہ یہی خدمت ہی ان کی رہائی کا سبب بن جائے گی۔ (۴۹)

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام:

عصرِ جدید کا ایک اہم مسئلہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ یہ طبقات سیاست اور ملکی وسائل پر قابض ہیں۔ غریب محنت کش اور مزدور پیٹ بھر کر روٹی کے لیے بھی محتاج ہے۔ اس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام نے دنیا کے تمام لوگوں کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے جس فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس میں سرمایہ داری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (۵۰) (ان کے اموال سے زکوٰۃ لیں)۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو حکم ہے کہ امراء سے جبراً زکوٰۃ وصول کریں۔

رسول اکرم ﷺ نے کسب حلال کا حکم دیا۔ سود کی ممانعت فرمائی۔ جوئے اور سٹے کو حرام قرار دیا۔ ذخیرہ اندوزی، ناپ تول میں کمی، ناجائز منافع خوری کی کوئی گنجائش نہ دی۔ قرآنِ حکیم نے رزق حلال کمانے کی ترغیب یوں دی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ (۵۱) (اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ ہے اس سے کھاؤ اور شیطان کے نشانات کے پیچھے نہ چلو وہ تمھارا واضح دشمن ہے)۔ اور وہ تمام راستے

اسلام نے بند کر دیے ہیں جو ناجائز ذرائع آمدن کا سبب ہیں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۲) (اے ایمان والو کئی گناہ کر کے سود نہ کھاؤ، اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (۵۳) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضا مندی سے)۔ زکوٰۃ کا فلسفہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ''توخذ من اغنیائھم وترد الی فقراء ھم'' (۵۴) (زکوٰۃ ان کے امراء سے لی جائے اور ان کے ہی فقراء میں لوٹائی جائے) رسول اللہؐ از خود کبھی کسی سائل کو خالی نہ لوٹاتے۔ حضرت بلال ؓ کو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے آزاد کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ربحت تجارۃ ابی بکر'' (۵۵) (ابوبکر ؓ کی تجارت فائدہ مند ثابت ہوئی) اسلام میں سرمایہ داری کی اس لحاظ سے گنجائش نہیں ہے کہ مالدار اور محروم دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی تلقین کی گئی ہے۔ مسند احمد میں حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ اہل مجلس میں دولت مندی اور دنیاوی خوشحالی کا کچھ تذکرہ کرنے لگے (کہ یہ چیز اچھی ہے یا بُری اور دین اور آخرت کے لیے مضر ہے یا مفید) تو آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے (اور اس کے احکام کی پابندی کرے) اس کے لیے مالداری میں کوئی مضائقہ نہیں اور کوئی حرج نہیں اور صحت مندی صاحبِ تقوٰی کے لیے دولت مندی سے بھی بہتر ہے اور خوش دِلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے (جس پر شکر واجب ہے) (۵۶) اسلام میں امیر اور غریب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔

غربت:

عصرِ جدید کا ایک سنگین مسئلہ غربت بھی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک نے تجارتی اور اقتصادی میدان میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے پسماندہ ممالک اقتصادی طور پر کمزور ہو گئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک نہ تو پسماندہ ممالک کی اشیاء خریدتے ہیں اور نہ ہی دلی طور پر ان کی معاشی ترقی اور اقتصادی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ وسودی نظام کی پابندیوں

سے ان کی معاشی حالت مزید خراب ہوتی جارہی ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک آپس میں ہی تجارت کوفروغ دیتے ہیں۔ سیرت نبوی ﷺ میں اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی۔ زکوٰۃ وصدقات کے نظام کے ذریعے سے غربت کا خاتمہ کیا گیا اور معاشی طور پر ایک دوسرے کی مدد کو رواداری اوراخوت کا نام دیا۔ اللہ نے امراء سے زکوٰۃ وصول کرنے کا نبی ﷺ کو حکم دیا ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾ (۵۷) (اے نبی ﷺ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیجیے جس کہ ذریعے سے آپ ان کو پاک صاف کردیں)۔

سود کو اللہ نے اپنے اور رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا کیونکہ غربت کی ایک وجہ سودی لین دین بھی ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۵۸) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الربا سبعون حوبًا أيسرها أن ينكح الرجل أمّه'' (۵۹) (سود کی ستر (۷۰) سے زیادہ قسمیں ہیں کم ترین یہ ہے کہ انسان اپنی ماں سے نکاح کرے) رسول اللہ ﷺ نے جب سود کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی فرمادیا: میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس کا سود معاف کرتا ہوں (۶۰)۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اقسم المال بين اهل الفرائض على كتاب الله'' (۶۱) (اہل فرائض میں کتاب اللہ کے مطابق مال تقسیم کرو)۔ اسلامی معاشرے میں گردش دولت کو ہی معاشرتی زندگی کا اصول قرار دیا گیا ہے ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاء مِنكُمْ﴾ (۶۲) (تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے)۔

اسی طرح اہل ایمان کی نشانی بتائی کہ وہ اپنی ضرورت اور احتیاج کے باوجود دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۶۳) (اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ

خود محتاج ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں)۔

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ (٦٤) (اور دیکھو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تا کہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے؟)۔

اس طرح فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ. لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (٦٥) (جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے غربت کے خاتمہ کے لیے عملی اقدامات تجویز کیے۔ایک دفعہ ایک شخص کو آپ ﷺ نے مانگتے پھرتے دیکھا تو اس کو آپ ﷺ نے روک دیا اور فرمایا: تمھارے گھر میں کوئی چیز ہے تو اس نے کہا ایک موٹا کمبل ہے جس کا بعض حصہ اوپر لیتے ہیں اور بعض حصہ بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دونوں چیزیں لے آؤ۔جب وہ دونوں چیزوں کو لے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ان دونوں چیزوں کو کون خریدنا چاہتا ہے؟ ایک آدمی نے کہا میں ایک درہم میں خریدوں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک درہم سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو ایک اور آدمی نے کہا میں دو درہم میں خرید لوں گا۔آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں دے کر اس سے دو درہم لیے اور مانگنے والے انصاری کو دے کر فرمایا ایک درہم سے غلّہ خریدو اور اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑا خرید کر میرے پاس لاؤ، جب وہ لایا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے دستہ ڈال دیا اور فرمایا جاؤ لکڑیاں اکٹھی کرو اور بیچو اور فرمایا میں آپ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں، وہ آدمی چلا گیا،لکڑیاں اکٹھی کرتا رہا اور بیچتا رہا،وہ آیا تو اس کے پاس دس درہم تھے بعض کے اس نے کپڑے خریدے اور بعض کا غلّہ خریدا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ آپ کے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ مانگنے کی وجہ سے قیامت کے دن آپ کے چہرے پر سیاہی ہو (٦٦)۔

دورِ نبوی ﷺ میں مسلمان خود مزدوری کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے کام خود کرتے

تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی سوال کرنے کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، سب میں خودداری تھی، محنت کی فضا تھی۔
''محسن انسانیت'' میں نعیم صدیقی نے رسول اللہ ﷺ کے دور کے مثالی معاشرے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ ''کیا دنیا ان کا ایثار دیکھ دیکھ کر مبہوت نہ ہوتی ہوگی؟ کہ انصار نے اپنے گھر بار اور مال ومتاع آدھوں آدھ بانٹ کر مہاجرین کے سامنے رکھ دیے۔ کیا عوام کے دل اس مساوات کا سماں دیکھ کر کھنچتے نہ ہوں گے کہ ادنیٰ ترین غلام خاندانی ہستیوں کے ساتھ اور غریب طبقوں کے افراد اہل ثروت کے ساتھ اور گھروں سے اجڑ کر آنے والے لوگ مدینہ منورہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ صف واحد میں کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اہمیت حاصل ہے، ہر ایک کی عزت ہوتی ہے، ہر ایک کی رائے وزن رکھتی ہے، اور ہر ایک کو ذمہ داریاں اٹھانے اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک برادری ہے جس کے سارے افراد اچھے حالات میں بھی شریک رہتے ہیں اور تکلیف اور مصیبت میں بھی حصہ دار بنتے ہیں۔ ان کے غم مشترک، ان کی مسرتیں مشترک، ان کا سوچنا مشترک اور ان کے اقدام مشترک! بھوک کا دور ہے تو اس میں سب سے زیادہ حصہ دار سوسائٹی کا قائد ہے اور خوشحالی کا دور آتا ہے تو اس میں سب سے کم حصہ وہ اپنے لیے لیتا ہے۔ جاہلی تصورات کے مطابق اونچے اور فروتر خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہوں گے (٦٧)۔

رسول اللہ ﷺ غرباء سے محبت کرتے تھے اور اُن میں بیٹھنا پسند فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے ''ابغوني في ضعفاء كم، فانما ترزقون او تنصرون بضعفاء كم'' (٦٨) (مجھے ضعفاء میں تلاش کرو تمھیں کمزوروں کے سبب رزق دیا جاتا ہے یا تمھاری مدد انھی کے سبب کی جاتی ہے) رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے: ''اللهم احيني مسكينًا وامتني مسكينًا واحشرني في زمرة المساكين يوم القيامة'' (٦٩) (اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکین حالت میں مجھے موت دے اور مجھے قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا)۔

آزادیٔ نسواں:

موجودہ تہذیب کا ایک نعرہ عورت کی آزادی، مساوات اور ترقی کا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے حالانکہ مغرب

نے مساواتِ مرد وزن اور ترقی نسواں کے پُر فریب نعروں میں عورت کو گرفتار کر کے اسے زندگی کے مسائل اور تکالیف میں مردوں کے برابر بلکہ ان سے بھی آگے نکال دیا ہے۔ وہ اب صرف نائٹ کلبوں کی زینت ہی نہیں بلکہ مردوں کی ہوس کا سامان بننے کے لیے پرسنل سیکرٹری، ٹائپسٹ کے قدرے شائستہ روپ سے بڑھ کر ایئر ہوسٹس اور ماڈلنگ میں بے توقیری وتحقیری کا نشان بنی نظر آتی ہیں۔ تشہیر کے لیے بھی عورت کو استعمال کیا جاتا ہے، جہاں دوکوڑی کی چیز بھی نسوانی چہرہ کے اشتہار سے بکتی ہے، کاش وہ دن آئے جب عورت کو احساس ہو کہ ناظرین کی نظر میں یوں اس پراڈکٹ کی بجائے خود اس کی قیمت دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔ اس سے معاشرے میں سکون کی بجائے ذہنی پریشانی اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ جبکہ اسلام نے بحیثیت انسان مرد وزن کو برابر قرار دیا ہے۔ عقائد کے لحاظ سے بھی دونوں میں مساوات ہے، نیکی اور بدی کے بدلے کے لحاظ سے دونوں یکساں ہیں۔ جرائم کی سزا کے لحاظ سے بھی دونوں میں مساوات ہے۔ ملکیت رکھنے کے لحاظ سے بھی ہر ایک کو اپنی ملکیت میں تصرف کی اجازت ہے۔ اسلام مرد وعورت میں فطری صلاحیتوں اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے ذمہ داریوں کے لحاظ سے فرق سمجھتا ہے۔ گھر کے تمام مالی امور مرد کے ذمے ہیں۔ اولاد کی پرورش عورت کی ذمہ داری ہے۔ جہاں تک عورت کی آزادی کا تعلق ہے، پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں بھی عورت کو اپنی بات کہنے کی آزادی تھی۔ (۷۰) چنانچہ قرآن کریم نے حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کے واقعہ کو واضح طور پر بیان کیا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ﴾ (۷۱) (اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے)۔

حضور ﷺ صحابہ ﷡ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت اسماءؓ حاضرِ خدمت ہوئیں اور مندرجہ ذیل تقریر کی: ''رسول خدا ﷺ پر میرے ماں باپ قربان! میں مسلمان عورتوں کی طرف سے یہ پیغام لے کر آئی ہوں کہ اللہ نے آپ ﷺ کو مرد وزن کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ ہم سب آپ ﷺ کے متبع ہیں اور آپ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں مگر ہم میں اور مردوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم گھروں میں محصور ہیں۔ آپ

لوگوں کی اولاد کو پالتی ہیں، تم لوگ مرد ہو، نماز جمعہ اور نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہو۔ حج کرتے ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ راہ خدا میں جہاد کرتے ہو۔ ہم ان تمام معاملات میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ تمھارے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ لباس کے لیے چرخہ کاتتی ہیں تو کیا ہم اجر وثواب میں تمھارے ساتھ شریک نہ ہوں گی؟

ان کی تقریر سن کر حضور ﷺ صحابہ ؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم لوگوں نے مذہب کے بارے کبھی کسی عورت سے ایسی گفتگو سنی۔ صحابہ ؓ نے عرض کیا ہمیں تو کبھی اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ کوئی عورت ایسا سوال کر سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی رضامندی، فرماں برداری اور موافقت کرتی ہے اور زوجیت کے فرائض ادا کرتی ہے تو اسے بھی مردوں کے برابر ثواب ملے گا (۷۲)۔

مذہبی تعصب، قومی اور بین الاقوامی بدنظمی:

بعثت نبوی ﷺ کے وقت امن عالم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس وقت کی دو متمدن سلطنتیں روم اور فارس آپس میں برسرِ پیکار تھیں۔ بڑی طاقتوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے پورا عالمی امن تباہ تھا۔ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز تھی۔ معاشرہ میں طبقاتی کشمکش تھی۔ مختلف مذاہب کے پیروکار مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کے رجحانات رکھتے تھے۔ ہر طرف پریشانی کا عالم تھا۔ قرآن مجید نے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (۷۳) (خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا اس وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے کمایا) چنانچہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ مُّبِينٌ. يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (۷۴) (تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی راہ نمائی کرتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے توحید کی دعوت دی جو کہ تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت تھی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْاْ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (۷۵) (کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں)۔

اسی طرح پیغمبر ﷺ نے دیگر تمام معاملات جن کے اندر اختلاف اور برتری کا جذبہ تھا اس کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، چنانچہ یہ ارشاد ہوا ﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۷۶) (لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)۔

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''الا! لا فضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود، الّا بالتقویٰ'' (۷۷) (کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، اور کسی کالے کو کسی سرخ پر اور کسی سرخ کو کسی کالے، سیاہ پر کوئی فضیلت لحاظ وامتیاز حاصل نہیں، مگر ہاں تقویٰ کے سبب)۔ ان تمام حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تعصب کی نہیں بلکہ اکٹھا کرنے کی اور بین الاقوامی سطح پر اتحاد وتعاون کی تعلیمات ہیں۔

دہشت گردی:

قبل از اسلام عرب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بات بات پر جھگڑنا ان کا قومی شعار بن چکا تھا۔ پھر قبائلی رقابت اور نسلی تفاخر ان جھگڑوں کو مستقل جنگوں کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے، اس کے علاوہ

ان میں ''ثار'' کا عقیدہ راسخ ہو چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مقتول کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی روح پرندے کی شکل اختیار کر کے مسلسل چیخ و پکار کرتی رہتی ہے کہ ''میں پیاسی ہوں اور یہ پیاس صرف قاتل یا اس کے قبیلے کے کسی فرد کا خون بہانے سے ہی بجھ سکتی ہے''۔ اس عقیدے کے تحت اگر قبائل میں جنگ چھڑ جاتی تو بعض اوقات صدیوں تک جاری رہتی تھی۔

دنیا سے فتنہ وفساد ختم کر کے اللہ کا دین قائم کرنے کی ذمہ داری ہی حقیقتاً وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو دنیا ظلم سے بھری ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے بڑے منظم انداز میں سد باب کیا۔ بسا اوقات ایسے اقدامات اٹھاتے جن میں بظاہر تو اپنا نقصان معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے نتائج بڑے اچھے انداز میں ظاہر ہوتے۔ (۷۸)

شراب نوشی:

عرب میں شراب کا اس قدر رواج تھا کہ ہر انسان اس میں مبتلا تھا۔ بچے اور عورتیں شراب پلانے پر مامور ہوتے، شراب خانے ممتاز مقامات پر سارا وقت کھلے رہتے اور نشان کے لیے وہاں جھنڈے لہراتے رہتے تھے۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تمام ملک کس قدر اس میں مبتلا تھا اور جب تک کنایہ اور اشارہ سے گزر کر صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ ہی نہ سکے۔ سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (۷۹) (پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو! ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں)۔

ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نماز میں امامت کرتے ہوئے الفاظ غلط پڑھ گئے، اس کے بعد سورۂ نساء میں خمار کی حالت میں نماز کی ممانعت کی گئی ہے: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ﴾ (۸۰) (جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ)۔

اس بنا پر اذان کے ساتھ ساتھ منادی کر دی جاتی کہ شراب کی حالت میں کوئی نماز میں شرکت نہ کرے پھر بھی لوگوں نے شراب پینے سے ہاتھ نہ کھینچا اور نماز کے بعد شراب پیتے رہے پھر یہ ہوا

کہ چند انصار اور مہاجرین میں شراب کی حالت میں معمولی سی جھڑپ سے سخت لڑائی شروع ہوگئی اس کے بعد سورہ مائدہ میں شراب نوشی کی حرمت بیان کردی گئی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۸۱) (اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی) یہ خبر سنتے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے پیالے اور شراب کے برتن توڑ ڈالے اور شراب مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہادی گئی اور یوں امت نے شراب کو خیر باد کہا"۔(۸۲)

کفر و الحاد:

عرب جاہلیہ کی معاشرتی و سیاسی روایات سے متعلق اسلام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا اس رجحان و رویے کا اندازہ لگانے کے لیے احادیث طیبہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کی احادیث طیبہ کا بغور جائزہ لیں تو دونوں طرح کا طرزِ عمل سامنے آتا ہے، اسلام نے بعض چیزوں کو بالکل مسترد کردیا گیا اور اس معاشرے میں خیر کے جو پہلو تھے ان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا گیا بلکہ وہ اشخاص جو زمانۂ جاہلیت میں عزت و احترام رکھتے تھے، جب اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے انھیں اسی قدر و منزلت سے سرفراز فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خیارهم فی الجاهلية خيارهم فی الاسلام اذا فقهوا" (۸۳) (لوگوں میں جاہلیت میں جو بہتر تھے اسلام میں بھی بہتر ہیں اگر دین کی سمجھ حاصل کریں)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: "يعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلية (۸۴) (دورِ جاہلیت میں جو اخلاقی فضائل موجود تھے دورِ اسلام میں بھی ان پر عمل جاری رہے گا)۔

جو چیزیں بُری تھیں ان کو آپ ﷺ نے ختم فرما دیا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں: جاہلیت (زمانہ جاہلیت) میں نکاح چار قسم کا ہوتا تھا لیکن جب حضرت محمد ﷺ حق کے ساتھ بھیجے گئے تو انھوں نے آج کل کے نکاح کے علاوہ جاہلیت کے زمانے کے تمام نکاحوں کو ختم کردیا۔(۸۵)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خیارهم فی الجاهلية خيارهم فی الاسلام"

(۸۶)(جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بھلے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بھلے ہی ہیں)۔

اسلام کے مخاطبین صرف عرب کے لوگ ہی نہ تھے بلکہ وہ تمام نسل انسانی کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اس کا پیغام جغرافیائی حدود سے ماورا ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ ﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾ (۸۷)(اے نبی ﷺ ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

سیرتِ طیبہ ﷺ کا مطالعہ عصرِ حاضر کے تناظر میں:

صنعتی اور مشینی ترقی، سائنسی اور مادی اندازِ فکر، یورپ کے سیاسی غلبے اور مسیحیت کے فروغ کی مساعی نے اہل مشرق (جن میں مسلمانوں کی خاصی اکثریت ہے) کی زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے مثبت اور منفی اثرات ڈالے ہیں۔ سیاست، معاشرت، ثقافت، تعلیم و تحقیق، معیشت، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور ریاضت (کھیل) تک ہر چیز پر مغرب کے اثرات کی چھاپ ہے۔ ان تمام چیزوں میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو سامنے رکھنا چاہیے۔

سیرت نگاری، عصرِ حاضر کا ایک بڑا چیلنج:

مسلمانوں کے سیاسی زوال کا دور اُن کے علمی انحطاط کا دور بھی تھا۔ اگر ایک طرف دشمن نے بغض اور حسد کی بناء پر سیرت نبوی ﷺ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی، تو دوسری طرف عشق و محبت اور تعظیم و عقیدت کے نام پر خود مسلمانوں نے سیرت طیبہ میں ان امور کو داخل کر دیا جو عقلاً نقلاً مردود ہیں۔ اس کے نتیجے میں سیرت طیبہ کے اصل تابدار پہلو اور حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے نمایاں اور واجب الاتباع گوشے نظر انداز ہو گئے۔ اس افراط و تفریط سے خود بچنے اور دوسروں کو بچانے کے لیے سیرت طیبہ کا اس کے اصل مآخذ سے مگر جدید علمی اور تحقیقی انداز میں مطالعہ کرنا اور اس کی اشاعت کرنا مسلمان اہل علم کے لیے عصرِ حاضر کا ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور الحمد للہ گذشتہ صدی میں اس نقطۂ نظر سے سیرتِ طیبہ پر مختلف زبانوں میں بہت اچھا کام ہوا ہے۔ اس ضمن میں ایک محقق کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

عربی اور اردو کتب سیرت وحدیث نبوی ﷺ:

۱۔ اصح السیر ،حکیم عبدالرؤف داناپوری۔
۲۔ انسانِ کامل،ڈاکٹر خالد علوی۔
۳۔ الانوار الکاشفہ،عبدالرحمان بن یحییٰ المعلمی۔
۴۔ بحوث فی تاریخ السنہ المشرقہ اور السیرۃ النبویہ الصحیحہ (دونوں)،ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری۔
۵۔ پیغمبر انسانیت،شاہ محمد جعفر پھلواروی۔
۶۔ الجرح والتعدیل،ضیاء الرحمٰن اعظمی۔
۷۔ حجیت حدیث،مولانا محمد اسماعیل سلفی۔
۸۔ حجیت حدیث،مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔
۹۔ حجیت حدیث،ناصرالدین البانی۔
۱۰۔ حجیت سنت،ڈاکٹر عبدالخالق۔
۱۱۔ خطبات احمدیہ،سرسید احمد خاں۔
۱۲۔ خطبات مدراس،سید سلیمان ندوی۔
۱۳۔ خطبات بہاول پور،ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔
۱۴۔ دراسات فی الحدیث النبوی،ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی۔
۱۵۔ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی،ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔
۱۶۔ رسول رحمت،ابوالکلام آزاد۔
۱۷۔ رحمت عالم،سید سلیمان ندوی۔
۱۸۔ رحمۃ للعالمین،قاضی سلمان منصور پوری۔
۱۹۔ الرحیق المختوم،مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری۔
۲۰۔ سیرۃ النبی ﷺ،شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی۔
۲۱۔ سیرۃ المصطفیٰ،محمد ابراہیم سیالکوٹی۔

۲۲۔ سیرت محمد رسول اللہ، مولانا سید محمد میاں۔

۲۳۔ سلسلہ الاحادیث الضعیفہ، شیخ ناصر الدین البانی۔

۲۴۔ سلسلہ الاحادیث الصحیحہ، شیخ ناصر الدین البانی۔

۲۵۔ سنن کی صحیح اور ضعیف، شیخ ناصر الدین البانی۔

۲۶۔ سیرۃ المصطفیٰ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

۲۷۔ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی۔

۲۸۔ صحیح وضعیف الجامع الصغیر، ناصر الدین البانی۔

۲۹۔ عظمت حدیث، مولانا عبدالغفار حسن۔

۳۰۔ علوم الحدیث (فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ) پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر۔

۳۱۔ عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ، ڈاکٹر حمید اللہ۔

۳۲۔ معجم مصطلحات الحدیث، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی۔

۳۳۔ النبی الخاتم ﷺ، سید مناظر احسن گیلانی۔

۳۴۔ نبی رحمت ﷺ، سید ابوالحسن علی ندوی۔

۳۵۔ ''نقوش'' (رسول نمبر)۔

سیرتِ نبویہؐ اور مستشرقین کی علمی کاوشوں کا جائزہ:

۱۔ سیرت پر مستشرقین کی تصانیف میں سے ہر ایک مستشرق کے خیالات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

۲۔ بیسویں صدی میں حدیث وسیرت پر تمام مستشرقین کے افکار کا اجتماعی جائزہ لیا جائے۔

۳۔ حدیث اور سیرت پر مستشرقین ومستغربین ودیگر اعتراضات کا ارتقائی جائزہ۔

۴۔ مستشرقین اور مستغربین کے افکار میں مماثلت اور اس کی وجوہات کا جائزہ لینا۔

۵۔ سیرت وحدیث پر مستشرقین کے اعتراضات کے مقاصد کا تعین کر کے ان کے جواب لکھنا۔

حدیث نبویہ ﷺ

درج ذیل موضوعات پر کام کیا جانا ضروری ہے:

۱۔ امت مسلمہ کے دو بڑے مکاتب فکر اہل سنت اور اہل تشیع کی کتب حدیث کی مشترک روایات کو مناسب انداز میں یک جا کیا جائے، اس سلسلے کی ایک عمدہ کاوش شاہ محمد جعفر پھلواروی کی تالیف ''مجمع البحرین'' ہے جس میں انھوں نے اہل سنت اور اہل تشیع کے ہاں متفق علیہ احادیث کو مجتمع کر کے کتابی صورت دی ہے۔ یہ کتاب ''ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور'' نے شائع کی ہے۔ اہل سنت علماء، شیعہ کتب حدیث کو بھی اپنی تحقیق و مطالعہ کا موضوع بنائیں، اور اسی طرح شیعہ علماء، اہل سنت کی کتب حدیث کو اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنائیں۔

۲۔ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق احادیث کا جامع انتخاب مرتب کیا جائے، جو عقائد و اعمال میں ایک عام مسلمان کے لیے مددگار کتاب ثابت ہو۔ اسی طرح احادیث کے ایسے انتخابات کی ترتیب و تدوین بھی ضروری ہے جن سے معاشرے کے مختلف طبقوں کے حقوق و فرائض پر روشنی پڑتی ہو۔

۳۔ تدوین حدیث کی ایک جامع تاریخ مرتب کی جائے۔ اولین مرحلے کے طور پر ۴۵۸ھ تک کے ابتدائی دور پر توجہ مرکوز کی جائے (جب امام بیہقیؒ کا انتقال ہوا تھا اور حدیث کے بنیادی مجموعے مرتب ہو چکے تھے۔ کتبِ جرح و تعدیل مدوّن ہو گئی تھیں، نیز اصولِ حدیث کی داغ بیل پڑ گئی تھی)۔ مجوزہ تاریخ، عالمِ اسلام کے معروف اہلِ دانش کی مشترکہ کاوش کا ماحصل ہو، اس لیے یہ کام ایک عالمی بورڈ کی نگرانی میں ہو جس کے مخاطب امتِ مسلمہ کے ساتھ ساری دنیا کے اہلِ دانش ہوں۔ یہ تاریخ بیک وقت اردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہو یا پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلباء میں اس کام کو تقسیم کیا جائے۔

۴۔ وطن عزیز کے کتب خانوں میں جہاں متداول کتبِ حدیث کے سیکڑوں مخطوطات خطی نسخے موجود ہیں وہیں اس خطے کے اہل علم کی شرحوں، ان کے امالی، یادداشتوں اور تقاریر کا ذخیرہ بھی ہے۔ اس سارے ذخیرے کا توضیحی کیٹلاگ مرتب کیا جائے۔

۵۔ اسی حوالے سے تجویز کیا جاتا ہے کہ وطنِ عزیز یا بیرونِ پاکستان حدیث پر جو اعلیٰ سطح کا تحقیقی کام ہوا ہے اس کا انڈکس مرتب کیا جائے۔

۶۔ گذشتہ صدی میں حدیث کے متعدد متون شائع ہوئے ہیں۔تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ جو ذخیرہ تا حال شائع نہیں ہو سکا۔اس پر اعلیٰ سطح کا تحقیقی کام کیا جائے اور اسے شائع کیا جائے۔اس سلسلے میں برصغیر کے مقامی مسلم اہل فکر و دانش کو زیادہ اہمیت دی جائے۔

۷۔ فواد سزگین نے تاریخ ادب عربی میں چوتھی صدی تک علوم اسلامیہ میں دستیاب کتب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اسے علم حدیث کے حوالے سے پندرھویں صدی ہجری تک لانے کی ضرورت ہے، نیز چار ابتدائی صدیوں کے سرمائے کے حوالے سے ممکنہ اضافے کیے جائیں۔

۸۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں حدیث پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا آف حدیث) مدوّن کیا جائے۔جس میں حدیث کے جملہ پہلوؤں (اصولِ حدیث، محدثین، رواۃِ حدیث اور دنیا کے مختلف خطوں میں حدیث کی اشاعت، تعلیم و تعلّم اور تراجم و شروح کتب حدیث) کا احاطہ کیا جائے اور اس میں عالم اسلام کے معروف اہل دانش کے تجربہ و تحقیق کو سمو دیا جائے۔

۹۔ برصغیر میں مختلف زبانوں میں کتب حدیث کے تراجم کی روایت پرانی ہے، تاہم وقت کے ساتھ زبان بدلتی رہتی ہے اور زمانے کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔اس لیے ماضی کے قابلِ فخر ذخیرۂ تراجم حدیث کے باوجود ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو اور انگریزی زبانوں میں کتبِ حدیث کے تراجم کو آج کے اسلوب و محاورہ میں منتقل کیا جائے اور مختصر حواشی کا اضافہ کیا جائے۔

۱۰۔ حدیث کے تاریخی استناد کے حوالے سے علمی کام کا جائزہ لیتے ہوئے ایک پروجیکٹ کے تحت اپنے رفقاء، نیز باہر کے اہل علم کے تعاون سے ایسی کتاب/ یا کتابیں شائع کی جائیں جن سے نسل بہ نسل اور عہد بہ عہد امت مسلمہ کے حدیث سے اعتنا پر روشنی پڑتی ہو۔

۱۱۔ Islamization of knowledge کی تحریک نے گذشتہ پچیس برسوں میں کافی پیش رفت کی ہے۔معاشیات کے حوالے سے حدیث کے ایسے چند مجموعے مرتب ہوئے ہیں جن سے معاشیات کے نظریے اور عمل پر دینی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔اسی نہج پر سیاسیات، عمرانیات، تعلیم اور دوسرے علوم کے حوالے سے احادیث کے مجموعے مرتب کیے جائیں۔

۱۲۔ وطن عزیز میں متعدد دینی اور علمی مجلات شائع ہوتے ہیں جن میں دوسرے اسلامی علوم کے

ساتھ علم حدیث پر گاہے گاہے مضامین شامل ہوتے ہیں، تاہم آج کے دور تخصص میں جس طرح قرآن اور فقہ پر مختلف زبانوں میں مجلّات شائع ہو رہے ہیں حدیث پر بھی ایک specialized (تخصص) مجلے کا اجراء کیا جائے۔ محترم مولانا زبیر علی زئی صاحب نے اٹک سے ایک مجلّہ شائع کیا ہے اس انداز کا مجلّہ پاکستان کی کسی جامعہ سے شائع ہونا چاہیے۔

۱۳۔ پاکستان کی جامعات میں حدیث اور سیرت پر جو کام ہوا ہے (ایم۔اے، ایم۔فل، پی ایچ ڈی) اس کا کیٹلاگ تیار کیا جائے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ ندوی، سید سلیمان، خطبات مدراس (کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ، ملتان) ص ۱۱۴۔

2. ,Margoliouth ,D.S, Muhammad (Introduction).P:17

2-1 Encyclopaedia of Britanica(1958)v.31,p16-17

۳۔ یونس: ۱۶۔

4. Hitti ,P.K."History of Arabs" (St. Martin's Press London,1965)P.29

۵۔ الاحزاب: ۲۱۔

۶۔ المائدۃ: ۳۔

۷۔ آل عمران: ۱۹۔

۸۔ الاعراف: ۱۵۸۔

۹۔ سبا: ۲۸۔

۱۰۔ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح (دارالسلام، الریاض، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۸ء) ص ۲۱۲، حدیث نمبر ۱۱۶۳۔

۱۱۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دارالسلام، الریاض) ص ۵۸، حدیث نمبر ۳۳۵۔

۱۲۔ ندوی، سید سلیمان، خطبات مدراس (مسجد اہل حدیث، سانگلہ ہل، شیخوپورہ) ص ۲۵۔

۱۳۔ الاحزاب: ۴۵-۴۶۔

۱۴۔ الحشر: ۷۔

۱۵۔ النجم: ۳-۴۔

۱۶۔ الذاریات: ۵۶۔

۱۷۔ الاحزاب: ۷۱۔

۱۸۔ الحشر: ۹۔

۱۹۔ التوبہ: ۴۱۔

۲۰۔ احمد بن حنبل، المسند (دارالفکر، القاھرۃ) ۱/۱۲۶۔

۲۱۔ ابن قیم، زادالمعاد (مترجم سید رئیس احمد جعفری) (نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۲ء) ۲/۲۹۱۔

۲۲۔ الانعام: ۱۵۲۔

۲۳۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، السنن (دارالسلام الریاض، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۹۹ء) ص ۳۱۹، حدیث نمبر ۱۳۱۵۔

۲۴۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید القزوینی، السنن (داراحیاء سنۃ النبویہ، سرگودھا، ۱۳۹۸ھ) ص ۱۵۷۔

۲۵۔ ایضاً ص ۳۱۶، حدیث نمبر ۲۲۰۸۔

۲۶۔ ایضاً ص ۲۸۳، حدیث نمبر ۱۹۷۷۔

۲۷۔ التحریم: ۶۔

۲۸۔ النحل: ۹۰۔

۲۹۔ الشوریٰ: ۲۳۔

۳۰۔ المائدۃ: ۱۲۰۔

۳۱۔ احمد، المسند ۲/ ۳۶۵۔

۳۲۔ الاحزاب: ۲۱۔

۳۳۔ الاسراء: ۳۱۔

۳۴۔ الاعراف: ۱۰۔

۳۵۔ النسفی، ابوالبرکات، ابوعبداللہ بن احمد، کنز الدقائق (محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل، کراچی) ص ۴۱۵۔

۳۶۔ البقرۃ: ۳۶۔

۳۷۔ الزخرف: ۳۲۔

۳۸۔ خطیب تبریزی، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (دارالفکر، بیروت) ۳/ ۱۱۰، حدیث نمبر ۵۱۸۶۔

۳۹۔ ابن ماجہ، السنن ص ۳۴، حدیث نمبر ۲۲۴۔

۴۰۔ طٰہٰ: ۱۱۴۔

۴۱۔ الزمر: ۹۔

۴۲۔ فاطر: ۲۸۔

۴۳۔ البخاری، الجامع الصحیح ص ۹۰۱، حدیث نمبر ۵۰۲۷۔

۴۴۔ ابن ماجہ، السنن ص ۳۵، حدیث نمبر ۲۲۹۔

۴۵۔ السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۷۶۔

۴۶۔ ابن عبدالبر، یوسف، جامع بیان العلم وفضلہ (دارالفکر، بیروت) ۲/ ۸۔

۴۷۔ القاسی، محمد بن محمد، جمع الفوائد (المکتبۃ الاسلامیہ فیصل آباد) ۱/ ۴۸۔

۴۸۔ ترمذی، السنن ص ۶۰۲، حدیث نمبر ۲۶۵۳۔

۴۹۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن کثیر، سیرت النبی ﷺ (مکتبہ قدوسیہ لاہور، طبع اوّل ۱۹۹۶ء، اردو ترجمہ) ۱/ ۶۲۱۔

۵۰۔ التوبہ:۱۰۳۔

۵۱۔ البقرۃ:۱۶۸۔

۵۲۔ آل عمران:۱۳۰۔

۵۳۔ النساء:۲۹۔

۵۴۔ البخاری، الجامع الصحیح ص ۲۲۴-۲۲۵، حدیث نمبر ۱۳۹۵۔

۵۵۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۸۵۸۔

۵۶۔ عبدالحئی، ڈاکٹر، اسوۂ رسول اکرم ﷺ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) ص ۶۹۔

۵۷۔ التوبہ:۱۰۳۔

۵۸۔ البقرہ:۲۷۸-۲۷۹۔

۵۹۔ ابن ماجہ، السنن ص ۳۲۴، ح ۲۲۷۴۔

۶۰۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۵۱۵، حدیث نمبر ۲۹۵۰۔

۶۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن (دارالسلام، الریاض، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۹۹ء) ص ۴۲۲، حدیث ۲۸۹۸۔

۶۲۔ الحشر:۷۔

۶۳۔ الحشر:۹۔

۶۴۔ النحل:۷۱۔

۶۵۔ المعارج:۲۴-۲۵۔

۶۶۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۵۱۳، حدیث نمبر ۱۸۵۱۔

۶۷۔ صدیقی، نعیم، محسن انسانیت، (مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور) ص ۱۹۲-۱۹۳۔

۶۸۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۳/۱۲۰ ح ۵۲۴۶۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۲۰؛ ترمذی، السنن، ص ۵۳۷، ح ۲۳۵۲۔

۷۰۔ صدیقی نعیم، عورت معرض کشمکش میں (ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور ۱۹۹۳ء) ص ۱۲۰-۱۲۱۔

۷۱۔ المجادلہ:۱۔

۷۲۔ عاصمہ فرحت، سیرت نبوی ﷺ میں عورت کا کردار (اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۶ء) ص ۱۰۵-۱۰۶۔

۷۳۔ الروم:۴۱۔

۷۴۔ المائدہ:۱۵-۱۶۔

۷۵۔ آل عمران:۶۴۔

۷۶۔ الحجرات:۱۳۔

۷۷۔ نثاراحمد،ڈاکٹر،خطبہ حجۃ الوداع (کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، لاہور) ص۱۷۴-۱۸۶۔

۷۸۔ کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، رسول اکرم بحیثیت سپہ سالار (مکتبہ السلام وسن پورہ، لاہور) ص۴۱-۴۴۔

۷۹۔ البقرہ: ۲۱۹۔

۸۰۔ النساء:۴۳۔

۸۱۔ المائدہ:۹۰۔

۸۲۔ عبدالمجید، آخری نبی ﷺ اور ان کی تعلیمات (فضلی سنز، اردو بازار کراچی ۱۹۹۸ء) ص۴۲۳۔

۸۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص۵۶۵، حدیث نمبر۳۳۷۴۔

۸۴۔ احمد، المسند، ۳/۴۲۵۔

۸۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص۹۱۷، حدیث نمبر۵۱۲۷۔

۸۶۔ ایضاً، ص۵۶۵، حدیث نمبر۳۳۷۴۔

۸۷۔ الانبیاء:۱۰۷۔

برصغیر میں علماءِ حدیث کی خدماتِ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم

علمائے حدیث سے مراد اہل سنت مسلمانوں کا وہ گروہ ہے جو قرآن مجید کے ساتھ حدیث نبوی کو اسلامی شریعت کا حقیقی سرچشمہ قرار دیتا ہے اور دین وشریعت کے معاملات میں تقلید شخصی کا قائل نہیں۔ اس گروہ کے نزدیک اسلام کے اوّلین دور میں صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین کا یہی مسلک تھا۔ قرونِ اولیٰ میں اہل حدیث کی اصطلاح محدثین کے لیے بھی مستعمل تھی لیکن کتب حدیث، فقہ اور تاریخ وسیر میں اہل حدیث کا لقب عالم بالحدیث والسنہ کے لیے ہر دور میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ حدیث کی روایت وحفاظت، ترویج واشاعت اور اتباع سنت ہمیشہ علمائے اہل حدیث کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اہل حدیث کے عقائد خالص صحابہ کرامؓ اور اسلاف والے ہیں۔ خالص و بے آمیز تصور توحید اور اتباع سنت ان کا امتیازی نشان ہے۔ صفات الٰہی کے بارے میں بھی ان کا مسلک خالص سلفی ہے۔ شرک کو حرام اور بدعت کو ضلالت و گمراہی سمجھتے ہیں، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے دور رہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نیز دیگر انبیاء کرامؑ کی عصمت اور بشریت کے قائل ہیں۔

برصغیر میں انگریز حکومت نے ان کے لیے ''وہابی'' کی اصطلاح کو عام کیا جس کا پس منظر یہ تھا کہ سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید نے جبر واستبداد کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے ظلم کے ساتھ ٹکر لی اور راہ حق میں شہادت پائی۔ انھوں نے غیر مسلم حاکم سے ٹکرانے کے ساتھ ساتھ معاشرتی برائیوں اعتقادی غلطیوں اور بدعات کے خلاف بھی آواز بلند کی جس طرح کہ حجاز میں محمد بن عبدالوہاب نے اصلاح عقیدہ وتردید بدعات کے لیے تحریک برپا کی تھی، اس مماثلت کی بناء پر اس جماعت حقہ کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے اور اس مسلک کے پیروکاروں کو ''وہابی'' سے موسوم کیا گیا۔ اس کا اصل مقصد اس وقت انگریز کے لیے سخت جان حریف تحریک مجاہدین کو بدنام کرنا اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا تھا جس میں انگریز کامیاب ہوگیا اور لفظ وہابی یہاں پر ایک گالی کے مترادف ٹھہرا۔ حالانکہ انھیں وہابی کہنا علمی اور تاریخی لحاظ سے غلط ہے کیونکہ وہابی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ہم مسلک کو کہا جاتا ہے اور وہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں۔ اس کے برعکس اہل حدیث تقلید شخصی کے قائل ہی نہیں۔

پہلی صدی ہجری میں اس تحریک کا مقصد تعمیل وترویج سنت نبویؐ تھا۔ دوسری اور تیسری صدی

میں یہ تحریک فقہی اور علمی صورت اختیار کر گئی۔ اہل حدیث اور اہل رائے دو مستقل گروہ بن گئے۔ اگر چہ دونوں مسلکی اعتبار سے اہل سنت کہلاتے تھے (مقدمہ ابن خلدون میں اس پر بحث کی گئی ہے)۔

برصغیر پاک و ہند میں اہل حدیث کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اسلام کی۔ جب اسلام کا ابتدائی قافلہ وارد ہند ہوا تو اس وقت تقلیدی مذاہب کا کہیں وجود نہ تھا۔ تمام کا مرجع و ماویٰ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث وسنت تھا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد: "**لا تزال طائفة من امتی علی الحق حتی تقوم الساعة**" (۱) (میری اُمت میں سے ایک گروہ حق پر رہے گا حتی کہ قیامت آ جائے گی) کے مطابق تقلید و جمود کے رواج پا جانے کے باوجود یہاں ہر دور میں خال خال ہستیاں ایسی رہی ہیں جنھوں نے صحابہ کرام ؓ اور تابعین عظام کے نقش قدم پر کتاب وسنت کو ہی دین کی اصل بنیاد قرار دیا۔ پھر آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑے پُر حکمت انداز سے یہاں کے جامد ماحول میں تحریراً اور ان کے بعد حضرت امام شاہ محمد اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء نے عملاً ایسا ارتعاش پیدا کیا جس کی صدائے بازگشت قریہ قریہ، بستی بستی سنائی دینے لگی۔ شرک کی جگہ توحید اور بدعات کی جگہ سنت کا چرچا ہونے لگا۔ مدارس میں (جہاں حدیث پاک کی ایک آدھ کتاب محض بطور تبرک پڑھائی جاتی تھی) صحاح ستہ کو شامل نصاب کر کے اس کی تعلیم و تدریس کا آغاز کیا گیا اور کتب احادیث کی شروح وحواشی نیز ان کے تراجم کر کے ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جانے لگا تا کہ دین اسلام کے دوسرے بڑے ماخذ سے براہِ راست تعلق عام اور آسان ہو سکے۔ اس سلسلے میں علمائے اہل حدیث نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی "تحفۃ الاحوذی شرح سنن الترمذی"، مولانا شمس الحق ڈیانوی کی "عون المعبود شرح سنن ابی داؤد" اور مولانا عطاء اللہ حنیف کی "التعلیقات السلفیہ علی السنن النسائی" طالبان حدیث کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاریخ و رجال کی کتابوں سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام دو راستوں سے آیا ہے، ایک سندھ کی طرف سے اور دوسرا شمال مغربی جانب سے بلکہ پہلے قافلہ میں تو وہ حضرات بھی شامل تھے جن کا شمار صحابہ کرام ؓ مخضرمین و مدرکین میں ہوتا ہے جن کی تعداد پچیس شمار کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہاں تابعین کرام و تبع تابعین نے بھی اس خطے میں قدم رنجہ فرمایا۔ جن میں موسیٰ بن

یعقوب ثقفی، اسرائیل بن موسیٰ، حباب بن فضالہ الذہلی، قیس بن ثعلبہ، زیاد بن رباح، قیس بصری، سعد بن ہشام، ربیع بن صبیح بصری، عطیہ عوفی، ابومعشر نجیع سندھی، معاویہ بن قرۃ المزنی، عبداللہ بن محمد علوی رحمھم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے یہاں علم حدیث کا درس دیا اور یہ انھیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے افراد کا عموماً تعلق براہِ راست کتاب وسنت سے مربوط ہوا۔ چنانچہ مشہور مؤرخ علامہ مقدسی سندھ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''یہاں کے ذمی بت پرست اور مسلمانوں میں اکثر اصحاب الحدیث تھے، یہاں مجھے قاضی ابومحمد احمد بن محمد المنصوری سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مذہب داؤد ظاہری کے پابند تھے(۲)۔

اہل حدیث نے ترویج حدیث اور عمل بالسنہ کے لیے ہر جگہ اور ہر دور میں بڑی سرگرمی کا اظہار کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی تحریک اہل حدیث ابتدائی عہد سے موجود رہی (۳) المقدسی (م۳۷۵ھ) نے اقلیم سندھ میں اکثریت کو مسلک اصحاب الحدیث کا پابند بتایا ہے(۴) ابن حزم (م۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء) کے نزدیک بھی اس علاقے میں طالبان قرآن وسنت کی اکثریت تھی جنھیں وہ ظاہری کے لقب سے یاد کرتا ہے(۵) مغلوں کے آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور ان کے خاندان نے تحریک اہل حدیث کو بڑی تقویت پہنچائی (۶) ان کے بعد تعلیمی وتدریسی خدمات کے ساتھ عملی ونظری اعتبار سے حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی المعروف بہ شیخ الکل حضرت میاں صاحب (م۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) جانشین شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے اہل حدیث مسلک کو بڑا رواج دیا(۷) پھر ان کے سیکڑوں تلامذہ نے یہ تحریک برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچادی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اوّل میں عالم اسلامی کے اندر حدیث داں علماء بہت کم نظر آتے ہیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں حدیث کا چرچا تھا۔ بلکہ یہ ملک طالبان علم حدیث کا مرجع و ماویٰ بنا ہوا تھا۔ ترویج علم حدیث اور احیائے سنت کے سلسلہ میں علامہ رشید رضا مصری (م۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) نے بھی علمائے اہل حدیث کی گراں قدر خدمات کا شاندار الفاظ میں اعتراف کیا(۸)۔

سندھ میں عرب حکومت کمزور پڑ جانے کے بعد شمال مغربی سرحد کی جانب سے جب غزنویوں اور غوریوں کی حکومت یہاں قائم ہوئی تو براہ راست محدثین کی آمد و رفت کم ہوگئی۔ ان کی

بجائے خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے علماء یہاں فروکش ہوئے، اس دور میں مذاہب اربعہ کا رواج کسی قدر ہو چکا تھا۔ فاتحین حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان فقہاء کرام کا تعلق علم حدیث سے نہایت کم تھا جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے صراحت کی ہے "واشتغالهم بعلم الحديث قليل قديما وحديثا" (۹) (علم حدیث سے اس کا تعلق قدیم و جدید دور میں کم رہا ہے)

انھی عوامل کی بناء پر برصغیر میں حنفی مسلک کو فروغ حاصل ہوا، یہاں کے عوام کیا علماء کی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا رشید احمد ارشد استاذ جامعہ کراچی لکھتے ہیں:

"یہاں کے علماء حدیث کی اعلیٰ تعلیم کو غیر ضروری سمجھنے لگے بلکہ اس فن میں انتہائی معراج مشارق الانوار اور مشکوٰۃ المصابیح کی تعلیم ہوتی تھی اور یہ تعلیم بھی محض برکت حاصل کرنے کے لیے ہوتی تھی۔ اس کا مقصد مسائل کا استنباط اور فقہی مسائل کا اثبات نہ ہوتا تھا" (۱۰) اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ شمس الدین ترک جب آٹھویں صدی ہجری میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے دور میں وارد ہند ہوئے تو یہاں کے حالات کے متعلق سلطان وقت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

"میں نے سنا ہے کہ تمھارے شہر میں احادیث مصطفیٰ ﷺ کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور فقیہوں کی روایت پر عمل کی دیواریں استوار کی جاتی ہیں۔ تعجب ہے کہ جس شہر میں لوگ حدیث کی موجودگی میں فقہ کی روایت پر عمل کریں وہ شہر تباہ کیوں نہیں ہو جاتا اور اس پر آسمانی مصائب کیوں نہیں ٹوٹنے لگتے" (۱۱)۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم عہد تغلق میں علم حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس عہد میں اس ملک میں علم حدیث کے ساتھ لوگوں کو جو بے اعتنائی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لیے علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ مناظرہ کے ایک فریق شیخ نظام الدین سلطان الاولیاء تھے اور دوسری طرف تمام علماء تھے۔ شیخ کا بیان ہے کہ جب میں کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو علماء بڑی جرأت و بے باکی سے کہتے تھے کہ اس ملک میں حدیث پر فقہی روایت مقدم سمجھی جاتی ہے اور کبھی یہ کہتے کہ چونکہ اس حدیث سے شافعی نے استدلال کیا ہے اور وہ ہمارا مخالف ہے اس لیے ہم اس کو نہیں مانتے" (۱۲)۔

یہ واقعہ میر خورد نے سیر الاولیاء میں، مولانا ضیاء الدین صاحب تاریخ فیروز شاہی نے

''حسرت نامہ'' میں اور قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ فرشتہ میں نقل کیا ہے۔ یہ مجلس مناظرہ چاشت سے سایہ ڈھلنے تک قائم رہی۔ فرشتہ کے یہ الفاظ بڑے دردناک ہیں کہ شیخ کے جواب میں وقت کے قاضی نے کہا:

''قاضی گفت ترا بہ حدیث چہ کار تو مرد مقلدی روایت از ابوحنیفہ بیار تا بمعرض قبول افتاد۔ شیخ گفت سبحان اللہ من حدیث صحیح مصطفوی ﷺ نقل می کنم و تو ازیں روایت ابوحنیفہ می خواہی'' (قاضی نے کہا تیرا حدیث سے کیا تعلق تو مقلد ہے امام ابوحنیفہؒ کا قول پیش کرو تاکہ قبول ہو۔ شیخ نے فرمایا: سبحان اللہ! میں صحیح حدیث مصطفیٰ ﷺ بیان کر رہا ہوں اور آپ قول ابی حنیفہ طلب کر رہے ہیں)۔

اور یہ الفاظ تو مولانا برنی نے بھی نقل کیے ہیں کہ شیخ کے جواب میں علماء نے کہا: می خواہی در شہر ما عمل بر روایت فقہ مقدم است بر حدیث'' (تو جانتا ہے کہ ہمارے شہر میں روایت فقہ، حدیث پر مقدم ہے)

اس واقعہ کے ذکر کرنے میں سبھی مؤرخین متفق ہیں البتہ فرشتہ نے یہ بات زائد لکھی ہے کہ شیخ نے جو حدیث پیش کی اس کے الفاظ تھے ''**السماع مباح لاهله متمسك**'' اگر یہ فرشتہ کا وہم نہیں تو اس سے اس عہد کی حدیث دانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جبکہ یہ فقرہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بطور فتویٰ نقل کیا ہے۔ اسے حدیث کہنا قطعاً غلط ہے (۱۳)۔

لیکن اس کے باوجود محدثین کا یہ مقدس گروہ درباری زندگی سے الگ انفرادی طور پر اور بعض مدارس میں احادیث نبویہ کی شمعیں فروزاں کرتا رہا۔

مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) تحریک اہل حدیث کے بارے میں رقم طراز ہیں:

اس تحریک کا یہ فائدہ ہوا کہ مدتوں کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور جو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے رفع ہو گیا اور لوگ از سرِ نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قیل و قال کے مکدّر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمۂ مصفا کی طرف واپسی ہوئی (۱۴)۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں تحریک اہل حدیث کو عوامی تحریک بنانے کی کوشش شروع ہوئی اور دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے ایک ملک گیر، تنظیمی و تبلیغی ادارہ قائم کیا گیا جس نے مکتبوں اور درس گاہوں کے قیام، مبلغین کے وعظ و ارشاد اور جلسوں کے انعقاد کے ذریعے

پورے برصغیر میں تحریک و مسلک اہل حدیث کو عام کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے ساتھ مسلکی تنظیم و تبلیغ کے لیے دو بڑے ادارے معرض وجود میں آئے۔ ایک مغربی پاکستان میں ''جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان'' کے نام سے، جس کی شاخیں پورے ملک میں قائم کی گئیں۔ اس کے پہلے صدر اور امیر مولانا سید محمد داؤد غزنوی (م ۱۹۶۳ء) تھے۔ دوسری مشرقی پاکستان میں ''جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان'' کے نام سے، قیام پاکستان سے قبل اس کا نام ''کل بنگال آسام اہل حدیث جمعیت'' تھا۔ اس جمعیت کے پہلے صدر مولانا عبداللہ الکافی (م ۱۹۶۰ء) تھے۔ بنگال کے دیگر قائدین میں مولانا نعمت اللہ، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا عبدالرحیم، مولانا عبداللطیف، مولانا عباس علی اور مولانا عبداللہ الباقی (م ۱۹۵۲ء) رحمھم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں ادارے اپنے حلقوں میں مسلکی تبلیغ و تنظیم کے لیے کوشاں رہے۔ مشرقی پاکستان کا نام اب بنگلہ دیش ہے اور وہاں اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اہل حدیث کے نام سے ملک میں اس وقت بھی جو تحریک جاری ہے حقیقت کی رُو سے وہ قدم نہیں صرف نقش قدم ہے۔ مولانا اسماعیل شہید جس تحریک کو لے کر اٹھے وہ فقہ کے چند نئے مسائل نہ تھے بلکہ امامتِ کبریٰ، توحید خالص اور اتباع نبی ﷺ کی بنیادی تعلیمات تھیں۔

بہر حال اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانہ سے آج تک ہمارے دور ادبار کی ساکن سطح پر اس سے جو جنبش ہوئی وہ ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائق شکریہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا۔ قرآن پاک سے ہمارا رشتہ براہ راست دوبارہ جوڑا گیا۔ حدیث نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ سعادت نصیب ہوئی نیز فقہ کے بہت سے مسائل کی چھان بین ہوئی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباع سنت نبوی ﷺ کا جو جذبہ گم ہو گیا تھا، وہ سالہا سال تک کے لیے دوبارہ پیدا ہو گیا۔

اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ ''جہاد'' جس کی آگ اہل اسلام کے دلوں میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں

کے سر قلم ہو گئے۔ کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پا بجولاں دریائے شور عبور کرنے پر مجبور کر دیے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' آبادشاہ پوری کی ''سید بادشاہ کا قافلہ''، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی ''تاریخ اہل حدیث''، ڈاکٹر بہاؤالدین کی ''تاریخ اہل حدیث''، مولانا غلام رسول مہر کی ''سرگزشتِ مجاہدین'' اور ''جماعت مجاہدین''، سید نذیر حسین کی ''معیار الحق'' اور اسحاق بھٹی کی ''برصغیر پاک و ہند میں اہل حدیث کی آمد'' کا مطالعہ نہایت مفید ہیں۔

اہل حدیث علمی اور عملی دونوں میدانوں میں کام کرتے رہے ہیں۔ اس مضمون میں برصغیر پاک و ہند کے علماء حدیث کی صرف سیرت النبی ﷺ سے متعلق تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

علماء حدیث کی کتب سیرت:

- **قاضی محمد سلیمان منصور پوری (م ۱۹۳۰ء):**

۱۔ سید البشر (اردو) صفحات ۹۶۔

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے پہلے کے واقعات، پیدائش، پرورش، شادی نبوت اور آپ کے اخلاق پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ اسوۂ حسنہ (اردو) صفحات ۴۰۔

یہ کتاب قاضی صاحب کی تقاریر پر مشتمل ہے جو آپ نے سیرت نبوی کے موضوع پر مختلف مقامات پر کیں اور ان تقاریر میں آپ نے آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۔ مہر نبوت (اردو) صفحات ۴۰۔

اس کتاب میں سیرۃ طیبہ، خلق محمدی ﷺ اور تعلیمات نبوی کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ رحمۃ للعالمین (اردو) ۳ جلد مجموعی صفحات ۱۴۵۸۔

یہ کتاب نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر نہایت مستند کتاب ہے اور صحیح روایات سے مرتب و مدون کی گئی ہے۔ تمام علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نبوی ﷺ پر اس سے بہتر کتاب برصغیر

پاک و ہند میں نہیں لکھی گئی۔اس میں اسلام، مسیحیت، یہودیت کے مابین تقابل نیز سیرت نبوی پر اعتراضات کے عقلی و علمی ٹھوس جوابات دیے گئے ہیں۔

۵۔ رحمۃ للعالمین (عربی) ۳ جلد، مجموعی صفحات ۱۳۳۳۔

جلد اوّل، سوم عربی ترجمہ از مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (بنارس) جلد دوم۔مولانا عبدالسلام عین الحق سلفی (بنارس) ہندوستان

۶۔ سفرنامہ حجاز

● **شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء):**

۷۔ اسلامی تاریخ (اردو) صفحات ۳۲۔

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کے حالات طیبہ بطور حکایت قلم بند کیے گئے ہیں۔

۸۔ محمد رشی

۹۔ خصائص النبی ﷺ

۱۰۔ مقدس رسول ﷺ آپ کی ذات بابرکات پر ایک ہندو کی اعتراضانہ تحریروں کا رد کیا گیا ہے۔

۱۱۔ خلافت ورسالت

۱۲۔ حجیت اور اتباع رسول ﷺ

۱۳۔ خلافت محمدیہ ﷺ

۱۴۔ عید میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت

● **امام العصر مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (م ۱۳۷۵ھ):**

۱۵۔ زاد المتقین (اردو) صفحات ۴۸۔

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کی والدہ، رضاعی والدہ اور ازواج مطہرات کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

۱۶۔ سیرۃ المصطفیٰ (اردو) مجموعی صفحات ۳۷۲۔

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کے فضائل، سیاسی و تاریخی واقعات، اشاعت اسلام، ہجرت

مدینہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں خاص کر غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب دیے گئے ہیں۔

۱۷۔ علم غیب کا مسئلہ

۱۸۔ خلافت ورسالت

۱۹۔ وفات النبی ﷺ بجواب حیات النبی ﷺ

۲۰۔ خلافت محمدیہ ﷺ

۲۱۔ اخلاق محمدی

۲۲۔ ازواج النبی ﷺ

۲۳۔ غزوات نبویہ اور فتوحات اسلامیہ

۲۴۔ اشاراتِ محمدیہ

۲۵۔ اسوۂ حسنہ

۲۶۔ عصمت نبوت

۲۷۔ ختم نبوت اور مرزا قادیانی

۲۸۔ سلم العلول الی اسرار الرسول

۲۹۔ سیرۃ محمدیہ ﷺ

۳۰۔ تاریخ نبوی ﷺ

۳۱۔ عصمت نبوی ﷺ

۳۲۔ ختم نبوت

۳۳۔ قادیانی مذہب

۳۴۔ رسالت وبشریت (اردو) صفحات ۱۲۸

۳۵۔ رسالہ بشریت رسول ﷺ (اردو)

۳۶۔ تاریخ نبوی (اردو) صفحات ۵۶

۳۷۔ عصمت انبیاء

۳۸۔ بشارات محمدیہ ؐ

۳۹۔ سراجاً منیراً

۴۰۔ محمد ﷺ (اردو) قلمی

● **حافظ عبداللہ روپڑی:**

۴۱۔ العجالہ الخضریہ فی جمع الرسالہ البشریہ (اردو) صفحات ۱۲۴۔

۴۲۔ نبی معصوم

۴۳۔ مرزائیت اور اسلام

۴۴۔ مسئلہ زیارت قبر نبوی ؐ

۴۵۔ نور محمدی ؐ کی پیدائش

● **خواجہ عبدالحیٔ فاروقی:**

۴۶۔ نبی معصوم ؐ

۴۷۔ خیر البشر ؐ (اُردو)

● **مولوی محمد حیات قصوری:**

۴۸۔ ہمارے رسول ﷺ

● **مولوی عبدالوکیل دہلوی:**

۴۹۔ خاتم المرسلین ؐ

● **مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۳۷۷ھ):**

۵۰۔ رسول رحمت ؐ (اردو) صفحات ۷۹۹

یہ کتاب آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ پر ہر پہلو سے جامع ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کے ان مقالات وتحریرات پر مشتمل ہے جو آپ نے سیرت النبی ﷺ پر لکھے۔ اس کتاب کے مرتب مولانا غلام رسول مہر (م ۱۹۷۵ء) ہیں۔

۵۱۔ حقیقت معجزات

۵۲۔ خصائص محمدیہ

۵۳۔ سیرت طیبہ ماخوذ از قرآن مجید

۵۴۔ ولادت نبوی

۵۵۔ ختم نبوت

۵۶۔ خصائص محمدیہ

● **مولانا محمد داؤد راز دہلوی (م۱۴۰۲ھ):**

۵۷۔ سیرت مقدس (اردو) صفحات ۵۶

اس مختصر مجموعہ کی تفصیل اس طرح ہے:

پہلے باب میں: پیدائش سے ابتدائے نبوت تک۔

دوسرے باب میں: ابتدائے نبوت سے ہجرت تک۔

تیسرے باب میں: مدنی زندگی تا وفات۔

۵۸۔ مقدس مجموعہ (اردو) صفحات ۱۹۲

اس کتاب میں رحمت عالم ﷺ کی مقدس زندگی کے واقعات اور آپ ﷺ کی مختلف دعائیں جمع کی گئی ہیں۔

● **مولانا محمد صادق سیالکوٹی (م۱۹۸۶ء):**

۵۹۔ سید الکونین (اردو) صفحات ۴۳۸

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ از پیدائش تا وفات بیان کی گئی ہے۔

۶۰۔ جمال مصطفیٰ (اردو) صفحات ۵۴۴

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کی فوقیت تمام انبیائے کرام پر بیان کی گئی ہے۔

۶۱۔ ساقی کوثر (اردو) صفحات ۷۸

اس کتاب میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف حمیدہ بیان کیے گئے ہیں۔

۶۲۔ سبیل الرسول ﷺ (یہ کتاب اطاعت اور اتباع رسول کے موضوع پر لکھی گئی ہے)

۶۳۔ صلوٰۃ الرسول ﷺ (اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے متعلق تمام مسائل کو صحیح احادیث سے ثابت کیا گیا ہے)۔

۶۴۔ والیِ بطحا کے ارشادات

۶۵۔ ازواج النبی ﷺ

● **صفی الرحمٰن مبارکپوری:**

۶۶۔ الرحیق المختوم (عربی)

سیرۃ نبوی پر جامع کتاب ہے۔ تمام واقعات قرآن وحدیث اور مستند تاریخ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے مصنف کو اس کتاب پر ۱۹۷۹ء میں پہلا انعام ملا۔

۶۷۔ الرحیق المختوم (اردو) صفحات ۷۰۶

مصنف نے خود عربی سے اردو ترجمہ کیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ حذف واضافہ بھی ہے، ہر معنی سے یہ عربی کتاب سے زیادہ مفید ہے۔

۶۸۔ الرحیق المختوم (انگریزی)

یہ کتاب الرحیق المختوم ہی کا انگریزی ترجمہ ہے۔

۶۹۔ مقالات سیرت (عربی) صفحات ۴۰۔

۷۰۔ آئینہ جمالِ نبوت

● **مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی (م ۱۹۶۶ء):**

۷۱۔ حیات محمد ﷺ (اردو ترجمہ) صفحات ۶۵۲

محمد حسین ہیکل (مصری) کی عربی کتاب حیات محمد ﷺ کا ترجمہ

۷۲۔ مکالمات نبوی ﷺ

۷۳۔ سیاسی وثیقہ جات عہد نبویؐ سے خلافت راشدہ تک

(ترجمہ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

۷۴۔ ہمارے رسول ﷺ (اُردو)

- **مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (م ۱۳۷۸ھ):**

۷۵۔ معجزہ سیرت (اردو) شیخ ابن تیمیہ کی کتاب کا اردو ترجمہ

۷۶۔ اسوۂ حسنہ (اردو) علامہ ابن القیم کی کتاب زادالمعاد کے اختصار کا اردو ترجمہ سیرت نبوی پر مختصر مگر جامع کتاب ہے۔

- **مولانا محمد جونا گڑھی (م ۱۹۷۱ء):**

۷۷۔ اربعین محمدیؐ

۷۸۔ سیف محمدیؐ

۷۹۔ برہان محمدیؐ

۸۰۔ شمع محمدیؐ

۸۱۔ عقائد محمدیؐ

۸۲۔ ایمان محمدیؐ

۸۳۔ حیات محمدیؐ

۸۴۔ تعویذ محمدیؐ

۸۵۔ وضو محمدیؐ

۸۶۔ صلوٰۃ محمدیؐ

۸۷۔ سنت محمدیؐ

۸۸۔ عہد محمدیؐ

۸۹۔ خطبہ محمدیؐ

۹۰۔ دلائل محمدیؐ

۹۱۔ رکوع محمدیؐ

۹۲۔ غلبہ محمدیؐ

۹۳۔ زکوٰۃ محمدیؒ

۹۴۔ صیام محمدیؒ

۹۵۔ اذان محمدیؒ

۹۶۔ انعام محمدیؒ

۹۷۔ تحفہ محمدیؒ

۹۸۔ حج محمدیؒ

۹۹۔ نکاح محمدیؒ

۱۰۰۔ آئینہ محمدیؒ

۱۰۱۔ کرامات محمدیؒ

۱۰۲۔ معراج محمدیؒ

۱۰۳۔ میلادِ محمدیؒ

۱۰۴۔ ارشادِ محمدیؒ

۱۰۵۔ طریق محمدیؒ

۱۰۶۔ خطباتِ محمدیؒ (پانچ جلد)

۱۰۷۔ سیرتِ محمدیؒ

۱۰۸۔ سراجِ محمدیؒ

۱۰۹۔ ظلِ محمدیؒ

۱۱۰۔ فضائل محمدیؒ

۱۱۱۔ تعلیم محمدیؒ

۱۱۲۔ خلافت محمدیؒ (مصنف نے اپنی تمام تصنیفات میں لفظ ''محمدی'' لاحقہ کے طور پر استعمال کیا ہے)

۱۱۳۔ عصمت انبیاء (قلمی)

● **مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ (م ۱۹۶۸ء):**

۱۱۴۔ مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ (اردو) صفحات ٦٦

۱۱۵۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز

۱۱٦۔ حجیت حدیث، آنحضرت ﷺ کی سیرت کی روشنی میں

● **مولانا محمد اشرف سندھو (م ۱۹٦۴ء):**

۱۱۷۔ عقیدۂ حیاۃ النبی ﷺ، ۲ جلدیں (اردو)

۱۱۸۔ آخری نبی ﷺ (اردو)

● **مولانا عبدالمجید سوہدروی:**

۱۱۹۔ حیاۃ النبی ﷺ (اردو)

۱۲۰۔ رہبر کامل

۱۲۱ سفرنامہ حجاز

● **مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری (ولادت ۱۹۱۰ء):**

۱۲۲۔ دلائل صدقِ رسالت (اردو) صفحات ٦۴

۱۲۳۔ سفرنامہ حجاز

● **مولانا عبدالرب گونڈوی:**

۱۲۴۔ رسالت ایک نظر میں (اردو) صفحات ۸۰

۱۲۵۔ مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ (عربی) صفحات ۵۸

● **ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری (ولادت ۱۹۳۹ء):**

۱۲٦۔ علم غیب کا فتویٰ (اردو) صفحات ۲۰

● **حافظ مولانا عبداللہ غازی پوری (۱۲٦۰-۱۳۳۷ھ):**

۱۲۷۔ فراسة المومنين في رد هذا المنكرين (اردو) صفحات ٦۰۔

۱۲۸۔ سیرت النبی ﷺ

● **مولانا ابوالمکارم محمد علی میوی (۱۲۷۵-۱۳۵۲ھ):**

۱۲۹۔ کشف الغطاء (اردو) صفحات ۶۴

۱۳۰۔ البحث القوی عن سیرۃ النبی ﷺ (ص ۲۲۰)

● **مولانا محمد سعید محدث بنارسی (م ۱۳۲۲ھ):**

۱۳۱۔ تعظیم الابرار علی تعلیم الجبار (اردو)

۱۳۲۔ وفاۃ النبی بجواب حیاۃ النبی ﷺ (اردو)

۱۳۳۔ علم غیب (اردو)

● **مولانا نور حسین گرجاکھی:**

۱۳۴۔ وفات محبوب (اردو)

۱۳۵۔ معراج جسمانی وتردید قادیانی

۱۳۶۔ فضائل مصطفیٰ ﷺ

۱۳۷۔ معراج النبی ﷺ

۱۳۸۔ النجم الثاقب لهدایه الرجل الکاذب (اردو)

۱۳۹۔ انبیاء کی بشریت (اردو)

۱۴۰۔ عبدہ ورسولہ (اردو)

● **مولانا الٰہی بخش سیالکوٹی:**

۱۴۱۔ رسول اللہ ﷺ کی بشریت (اردو)

● **مولانا عبدالغفور جھنجانوالی:**

۱۴۲۔ الاعجاز المبین فی معجزات سید المرسلین (اردو)

● **مولانا عبداللہ جھاؤمیاں الہ آباد:**

۱۴۳۔ شق القمر لمعجزۃ سید البشر (اردو) صفحات ۱۰۰

● **مولانا عبداللہ محدث چھپروی (م ۱۳۴۸ھ):**

۱۴۴۔ القول الهمس لرد الشمس (اردو) صفحات ۱۸

۱۴۵۔ انواراسلام (اردو) صفحات ۶۰۰

● مولانا شکراللہ گونڈوی (۱۹۰۹-۱۹۶۵ء):

۱۴۶۔ فلسفۂ معجزات (اردو)

۱۴۷۔ ازواج النبی (اردو) صفحات ۲۴

● مولانا ہدایت اللہ سوہدروی:

۱۴۸۔ معجزات (اردو)

● مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی (ولادت ۱۹۲۹ء):

۱۴۹۔ آثار نبوت (اردو) صفحات ۱۵۸

۱۵۰۔ کشف الشرفی رد کشف السر (اردو) صفحات ۳۲

● مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (۱۳۰۷-۱۳۶۹ھ):

۱۵۱۔ رسالہ تردید حاضر وناظر (۲ جلدیں) (اردو) صفحات ۱۷۶

۱۵۲۔ ردِمرزائیت

۱۵۳۔ اربعین محمدیؐ

۱۵۴۔ معیار نبوت

● مولانا عبدالمبین منظر (۱۹۲۱-۱۹۸۹ء):

۱۵۵۔ الظفر المبین (اردو) صفحات ۱۶۔

۱۵۶۔ تصحیح العقائد بابطال شواھد الشاھد (اردو) صفحات ۱۲۱

● مولانا محمد رئیس ندوی (ولادت ۱۹۳۸ء):

۱۵۷۔ رسالہ دین وشریعت (اردو) صفحات ۱۸۰

● نواب صدیق حسن خان (۱۲۵۸-۱۳۰۷ھ):

۱۵۸۔ الشمامہ العنبریہ من مولد خیر البریہ (اردو) صفحات ۱۲۶

۱۵۹۔ بلوغ العلی بمعرفہ الحلی (اردو) صفحات ۳۰

۱۶۰۔ الکلمہ العنبریہ فی مدح خیر البریہ

۱۶۱۔ ولادت سرورعالم (اردو) صفحات ۴۸

● مولانا عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰-۱۹۲۶ء):

۱۶۲۔ سیرۃ الاسلام (اردو)

۱۶۳۔ برد الاکباد شرح قصیدہ بانت سعاد

۱۶۴۔ سیرۃ النبیؐ (اردو) قلمی

۱۶۵۔ سیرت محمدیؐ (اردو) صفحات ۱۰۶

۱۶۶۔ جویائے حق

۱۶۷۔ مکالمات نبویؐ (اردو) صفحات ۲۶۱

● مولانا محمد حیات قصوری:

۱۶۸۔ سوانح پیغمبر اسلامؐ (اردو)

● مولانا عبدالوکیل دہلوی:

۱۶۹۔ سراج منیرؐ (اردو)

● مولانا محمد یوسف شمس فیض آبادی (۱۳۰۰-۱۳۵۷ھ):

۱۷۰۔ سراج منیرؐ (اس کتاب میں پہلے وجود خدا اور پھر اثبات رسالت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اور اس کے بعد آنحضور ﷺ کی سیرت قلم بند کی گئی ہے)۔

۱۷۱۔ ہدایہ السنی المعروف بہ ردِ منکرِ نمازِ نبوی ﷺ

۱۷۲۔ محمد رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں (اردو)

۱۷۳۔ سوانح پیغمبر اسلامؐ

● مولانا عبداللطیف رحمانی:

۱۷۴۔ آنحضرت ﷺ (اردو)

۱۷۵۔ سوانح پیغمبر اسلام ﷺ (اردو)

● مولانا عبدالوکیل بن عبید الرحمٰن عمر پوری:

۱۷۶۔ رسالت کے سایے میں (اردو) صفحات ۱۸۹

● ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ولادت ۱۹۳۹ء):

۱۷۷۔ مختصر زاد المعاد فی هدی خیر العباد (اردو) صفحات ۳۸۴

(اس کے علاوہ رحمۃ اللعالمین جلد اوّل اور سوم کا عربی ترجمہ بھی کیا)

۱۷۸۔ سیرت الرسول ﷺ (اردو)

● مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (۱۲۹۷-۱۳۵۹ھ):

۱۷۹۔ ماہ یثرب (اردو)

● مولانا محمد گوندی سیف:

۱۸۰۔ مشکوٰۃ الانوار (اردو)

۱۸۱۔ اسوۃ النبی ﷺ (اردو)

۱۸۲۔ خدا کے رسول (اردو)

● مولانا محمد مہدی صاحب:

۱۸۴۔ داعی اسلام (اردو)

● مولانا محمد ناصرالدین سابق ستیہ دیو جی:

۱۸۵۔ سید البشر (اردو)

● مولانا ابوسعید عبدالرحمٰن فریدکوٹی:

۱۸۶۔ خیر البشر (اردو)

۱۸۷۔ سیرۃ النبی ﷺ (اردو)

● مولانا محمد کمال علی پوری:

۱۸۸۔ ترجمہ نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین (اردو) قلمی

● مولانا عزیز الرحمٰن سلفی (ولادت ۱۹۴۹ء):

۱۸۹۔ رہبر کامل (اردو) صفحات ۱۲۰

● مولانا عبدالمجید اصلاحی (ولادت ۱۹۳۲ء):

۱۹۰۔ ترجمہ زاد المعاد (۵ جلدیں) (اردو) قلمی

۱۹۱۔ النبی الامی (اردو) صفحات ۲۲۴

۱۹۲۔ تہذیب و تلخیص کتاب "دلائل النبوة لابی نعیم الاصبهانی" (عربی) غیر مطبوع

● ابوالمکرم سلفی (ولادت ۱۹۶۳ء):

۱۹۳۔ رہبر کامل (اردو)

● مولانا الٰہی بخش بڑا کری (م ۱۳۴۴ھ):

۱۹۴۔ تنویر السراج (اردو)

۱۹۵۔ نبی معصوم (اردو)

● مولانا محمد حنیف یزدانی:

۱۹۶۔ رسالہ ختم نبوت

۱۹۷۔ محمد رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں

● مولانا حافظ محمد گوندلوی:

۱۹۸۔ معیار نبوت

۱۹۹۔ ختم نبوت

۲۰۰۔ دوام حدیث

● محمد خالد خلف الرشید مولانا نور حسین گھرجاکھی:

۲۰۱۔ صلوٰۃ النبی ﷺ

● عبداللہ الکافی القرشی:

۲۰۲۔ سیرتِ نبوی (بنگلہ)

- **محمد حنیف ندوی:**

۲۰۳۔ چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں

۲۰۴۔ مرزائیت نئے زاویوں سے

- **عبدالرحمٰن آزاد مئوی اعظمی:**

۲۰۵۔ شرح قصیدہ بانت سعاد

۲۰۶۔ سوط النبی ﷺ معترض النبی ﷺ

- **مولوی ابوطاہر بہاری:**

۲۰۷۔ قصیدہ علیا

- **غلام علی قصوری امرتسری:**

۲۰۸۔ راہ سنت (منظوم)

- **سید حسن قنوجی:**

۲۰۹۔ ماسحبان (نظم)

- **عبدالعزیز قلعہ میہاں سنگھ والے:**

۲۱۰۔ نسبت احمدی

- **عبدالجبار کھنڈیلوی:**

۲۱۱۔ نور المبین

- **مولوی عبدالستار صاحب:**

۲۱۲۔ اکرام محمدیؐ (تفسیر سورۃ والضحیٰ)

- **غلام احمد حریری:**

۲۱۳۔ سیرۃ سرور انبیاء (یہ حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) کی کتاب **الفصول فی سیرۃ الرسول** کا اردو ترجمہ ہے)۔

- **ضیاء الرحمٰن اعظمی:**

۲۱۴۔ اقضیۃ الرسول ﷺ (یہ کتاب دراصل ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا اردو

ترجمہ ہے)۔

- **راقم الحروف ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر:**

۲۱۵۔ سیرت نبوی کے مصادر و مراجع

۲۱۶۔ الاسراء والمعراج: حقائق واسرار

۲۱۷۔ معراج النبی ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کا علمی جائزہ

۲۱۸۔ مقالاتِ سیرت (۲۰۰۵ء میں دو خوبصورت جلدوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہے)(۲۰۰۰ء میں پہلی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور کے مقالات)۔

۲۱۹۔ سیرت سید العوالم، لابن الفافا، تحقیق ودراسہ (عربی)۔

۲۲۰۔ علوم الحدیث، فکری، فنی و تاریخی مطالعہ۔

۲۲۱۔ اسوۂ کامل (کتاب ہذا)

۲۲۲۔ حمیدیة الزماں بافضیلة الرسول الاعظم بنص القرآن ابن منیر دمشقی تحقیق ودراسہ (عربی)

- **مولانا صہیب حسن:**

۲۲۳۔ اثبات ختم نبوت (تردید قادیانیت) انگریزی۔

- **سید نذیر الدین احمد جعفری ہاشمی:**

۲۲۴۔ ترجمہ وشرح شفا قاضی عیاض

- **سید ابوبکر غزنویؒ:**

۲۲۵۔ محمدیؐ انقلاب، چند خدوخال

۲۲۶۔ خطباتِ جہاد

۲۲۷۔ قربت کی راہیں

- **محمد ادریس فاروقی:**

۲۲۸۔ مقام رسالت

۲۲۹۔ نبی رحمتؐ

● عبدالرحمٰن کیلانی:

۲۳۰۔ آئینہ پرویزیت

۲۳۱۔ عقل اور انکار معجزات

۲۳۲۔ آنحضورؐ بحیثیت سپہ سالار

● محمد حسین بٹالوی:

۲۳۳۔ پاک و ہند کے علمائے کرام کا اوّلین فتوی (مرزا قادیانی کے کفر پر)

● مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری:

۲۳۴۔ سیرت النبی ﷺ

۲۳۵۔ علم غیب کا فتویٰ

● محمد صادق خلیل:

۲۳۶۔ ترجمہ حجۃ النبیؐ

۲۳۷۔ ترجمہ صلوۃ النبی ﷺ

● محمد علی جانباز

۲۳۸۔ معراج مصطفیٰ ﷺ

۲۳۹۔ آل مصطفیٰ ﷺ

۲۴۰۔ صلوٰۃ المصطفیٰ ﷺ

۲۴۱۔ توہین رسالت کی شرعی سزا

● ارشاد الحق اثری:

۲۴۲۔ پیارے رسول کی پیاری نماز

۲۴۳۔ قادیانی کافر کیوں؟

● محمد خالد سیف:

۲۴۴۔ مختصر سیرت رسول ﷺ (محمد بن عبدالوہاب کی ''مختصر سیرت الرسول'' کا ترجمہ)

● مولانا عطاء اللہ حنیف:

۲۴۵۔ پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں

● وحید الزمان حیدر آبادی:

۲۴۶۔ قواعد محمدی

● علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ:

۲۴۷۔ سفر نامہ حجاز

۲۴۸۔ القادیانیہ

۲۴۹۔ نماز نبوی ﷺ

۲۵۰۔ اسلام اور مرزائیت

● عبدالستار حامد:

۲۵۱۔ خطبات سیرت مصطفیٰ ﷺ

● مولانا ابوالحسنات عبدالغفور دانا پوری:

۲۵۲۔ تبیان حسن المسیح فی وجه المحمد ﷺ من المسیح

● مولانا عبدالوہاب دہلوی:

۲۵۳۔ امر الکلی فی قول الرسول صلوا کما رایتمونی اصلی

● میاں جمیل:

۲۵۴۔ آپ ﷺ کا تہذیب و تمدن

۲۵۵۔ آپ ﷺ کا حج

● ڈاکٹر فضل الٰہی:

۲۵۶۔ رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم

❀❀❀❀

حوالہ جات

۱۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل، البدایہ و النہایہ (دار الفکر بیروت) ۱۰/ ۳۷۹۔

ابن حجر، احمد بن علی العسقلانی، فتح الباری (دار النشر المکتبۃ الاسلامیہ، لاہور) ۱۳/ ۱۹۔

۲۔ المقدسی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، احسن التقاسم فی معرفۃ الاقالیم (ای جے بریل، لیڈن، ۱۹۰۶ء) ص ۴۸۱۔

۳۔ بھٹی، محمد اسحاق، برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۰ء) ص ۳۹-۴۷۔

۴۔ احسن التقاسیم، ص ۴۸۱۔

۵۔ ابن حزم، ابومحمد علی بن احمد، جوامع السیرۃ (دار المعارف، مصر) ص ۳۵۰۔

۶۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ (المکتبہ السّلفیہ، لاہور ۱۹۷۵ء) ۱/ ۱۵۲: ''اعلم ان الناس کانوا قبل المائہ الرابعہ غیر مجمعین علی التقلید الخالص لمذھب واحد بعینہ''۔

۷۔ بہاری، مولانا فضل حسین، الحیاۃ بعد المماۃ (مکتبہ شعیب، حدیث منزل، کراچی ۱۹۵۹ء) ملاحظہ ہو مکمل کتاب۔

۸۔ محمد فواد عبدالباقی، مفتاح کنوز السنہ (المکتبۃ الامدادیہ مکہ مکرمۃ) (مقدمہ، ث: ق)۔

۹۔ شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف (ھیئۃ الاوقاف البنجاب، لاہور) ص ۵۵۔

۱۰۔ مجلّہ البلاغ، ماہنامہ (ذوالحجہ ۱۳۸۷ھ، ج ۱، شمارہ ۱۲، کراچی) ص ۲۲۔

۱۱۔ برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی بحوالہ محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) ۱/ ۲۲۳۔

۱۲۔ ندوی، سید سلیمان، مقالات (لاہور) ۲/ ۶-۷۔

۱۳۔ ایضاً ص ۲/ ۷۔

۱۴۔ نوشہروی، ابویحییٰ امام خاں، تراجم علماء حدیث (مرکزی جمعیت اہل حدیث لائل پور، فیصل آباد، طبع دوم ۱۳۹۱ھ) ص ۳۳ (مقدمہ از مولانا سید سلیمان ندوی)۔

نوٹ:

راقم نے اس مضمون میں بعض مجلات مثلاً محدث اور ترجمان الحدیث اور کتب میں ''ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات''، ''اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' اور ''تذکرہ ابوالوفاء'' وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

❁❁❁❁

مستشرقین اور سیرت نگاری

تاریخ کے اوراق اس اَمر کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلم امہ کے سکالرز اور فضلاء نے ہر زمانے میں سیرت سرورِ کائنات پر لکھ کر سعادتِ دارین کا سزاوار بننے کی سعی کی ہے۔ ہر دور میں عصری راہنمائی کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ملت اسلامیہ کے علماء سیرتِ سرورِ دو عالم پر قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ادب اسلامی کی با قاعدہ صنف ''سیرت النبیؐ'' پر لکھنے کا تسلسل آغاز اسلام سے عصر حاضر تک کسی دور میں منقطع نہیں ہوا ہے۔ جہاں حب رسولؐ کے تقاضا کے تحت ابنائے اسلام کی عقیدت مندانہ تحریریں سیرت نبوی کے زریں باب کی وسعت کا سبب بن رہی ہیں وہیں غیر مسلم اہل قلم کے نام بھی اس صف میں نظر آتے ہیں۔ غیر مسلم سیرت نگاروں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مغربی سکالرز۔

۲۔ غیر مغربی سکالرز (عرب ہند، جاپان وغیرہ کے غیر مسلم)۔

ان میں سے اول الذکر گروہ کو عموماً مستشرقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خواہ ان کے مقاصد کچھ بھی ہوں مگر اس میں شامل افراد کی ایک طویل فہرست ہے جو سرور دو عالمؐ کی سیرت طیبہ پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان میں ولیم میور، مارگولیتھ، لامنس، اسپرنگر اور ولیم منٹگمری واٹ زیادہ معروف ہیں۔ سیرت نبوی پر مستشرقین کی تحریروں کے تعارف و جائزہ سے قبل استشراق کے متعلق جاننا ضروری ہے تاکہ مستشرقین کی ذہنیت، مقاصد اور تحریروں کے پس منظر کا صحیح ادراک ہو سکے۔

استشراق کا لغوی مفہوم:

یہ لفظ جدید ہے۔ اس لیے قدیم لغات میں نہیں پایا جاتا۔

لسان العرب کا فاضل مصنف تحریر کرتا ہے:

''(شرق) یقال شرقت الشمس اذاطلعت، اشرقت أضاءت..... والشرق وکل ماطلع من المشرق فقد شرق ویستعمل فی الشمس من الارض وروی ثعلب عن ابن العربی قال: الشرق الضؤ الشرق الشمس''(۱)۔

(شرق کہا جاتا ہے۔شـرقـت الشـمـس، شرقت الشّمس کہا جاتا ہے جب سورج طلوع ہوجائے اور روشن ہوجائے اشرقت: جب سورج روشنی پھیلا دے اور مشرق اور ہر وہ چیز جو مشرق سے طلوع ہو اُس پر شرق کے لفظ کا استعمال کرتے ہیں ...... اور ثعلب نے ابن العربی سے روایت کیا ہے الشرق کا معنی روشنی بھی ہے اور سورج بھی)۔

اصطلاحی تعریف:

استشراق کے معنی مشرقی علوم میں مہارت حاصل کرنا اور مستشرق کے معنی مشرقی علوم کا ماہر اور مشرقی آداب سے آگاہ ہونا ہے(۲)۔

وہ شخص جو مشرقی زبانوں، علوم وفنون، آداب وثقافت، اور تہذیب وتمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہے اور بقول مولوی عبدالحق ماہر مشرقیات ہو(۳)۔

عمر فروخ کے مطابق مستشرق: علوم اسلامیہ کا وہ مغربی (یورپین یا امریکی) سکالر ہوتا ہے جو غیر مسلم ہو(۴)۔

آکسفورڈ ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق استشراق "Orientalism" اور مستشرق "Orientalist" کی اصطلاحات "Orient" سے مشتق ہیں اور "Orient" کے بارے میں تحریر ہے:

"Orient to place facing the east, belonging to, or that part or region or heaven in which the sun rise"(5).

استشراق کے بارے میں ''الموسوعة المسيره في الاديان والمذاهب'' کا مؤلف لکھتا ہے:

''الاستشراق "Orientalism"، هو ذلك التيار الفكرى الذى تمثل فى الدراسات المختلفة عن الشرق الاسلامى والتى شملت حضارته والديانة وآدابه واللغة وثقافته، والقد اُسهم هذا، الاتيار صباغة اتصورات الغربيه من العالم الاسلامى معبراً عن الخليفة الفكرية للصراع الحضارى بينهما ''(٦) (استشراق وہ فکری منصوبہ ہے جو مشرق اسلامی کے بارے مختلف تعلیمات، تمدن، ادیان، ادب، لغات، ثقافت پر مشتمل تعلیمات میں

مثال پیش کرتا ہے)۔

ڈاکٹر عبدالمتعال محمد الجبری اپنی تالیف ''الاستشراق وجه للاستعمار الفکری'' میں ''المراد بالاستشراق'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''المراد بالاستشراق دراسة علوم الشرق، احواله، تاریخه، ومعتقداته وبیئاته الطبیعة، والعمرانیة، والبشریة، ودراسة لغاته ولهجاته وطبائع الامة، الشخصیة فی کل مجتمع شرقی فلکل اُمة مشخصاتها ودراسة الاشخاص والهیئات، والتیارات الفکریة والمذاهبیة فی شتی صورها، وانواعها''(۷) (استشراق سے مراد شرق کے علوم کی تعلیم، اس کے احوال، تاریخ، اعتقادات، طبعی معاشرے، عمرانیات، بشریات، اس کی زبانوں کی تعلیم، لہجہ کے بارے میں مشرقی معاشرے میں اُس کی ذاتیات، اشخاص کی تعلیم، صورتوں، فکری منصوبہ بندی کا مختلف صورتوں اور نوعیتوں سے قصد کرنا)۔

تاریخ تحریکِ استشراق کا ایک جائزہ:

اگرچہ معروف معنوں میں تحریک استشراق قدیم العہد نہیں لیکن جس جذبہ فکر کی حامل یہ تحریک ہے اس کا آغاز ظہور اسلام کے فوراً بعد یہود و نصاریٰ سے اسلام کی آویزش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ عقیدہ کے تصادم اور نظریاتی مخالفت کی بناء پر یہود و نصاریٰ کے خیبر اور یرموک میں مسلمانوں سے عسکری تصادم کے نتیجہ میں اس جذبہ فکر کو زیادہ مہمیز ملی جس نے کئی صدیاں پہنچنے کے بعد تحریک استشراق کا روپ دھارا۔ تاریخی حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے اس تحریک کی تاریخ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تاریخی پس منظر (ساتویں صدی سے پندرھویں صدی تک)

۲۔ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز وارتقا (سولھویں صدی سے عصر حاضر تک)

۱۔ تاریخی پس منظر (ساتویں صدی سے پندرھویں صدی تک):

اس دور کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ساتویں تا گیارہویں صدی:

ساتویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک کچھ ایسے غیر مسلم معاند مصنفین کے نام ملتے ہیں جن کا تعلق مغرب سے نہیں بلکہ جغرافیائی طور پر مشرق (عرب) سے تھا اور انھوں نے مذہبی تعصب ومنافرت کی بناء پر اسلام کے خلاف قلم اُٹھایا۔اس دور میں سب سے پہلا نام جان آف دمشق کا آتا ہے۔جس کی کتاب (De Heere Sibees) ہے۔اسے بازنطینی روایات کا بانی سمجھا گیا ہے۔ دوسرا اہم نام عبدالمسیح الکندی معروف ہے جس کا رسالہ ''الکندی'' آج بھی مسیحی مشنریوں کے لٹریچر میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔الکندی اور جان کی تحریر میں فرق یہ ہے کہ الکندی نے اپنے ایک مسلم دوست کے خط کے جواب میں مسیحی عقائد کو سچا گردانا اور اس کے دلائل دیئے۔اگرچہ اس کا قلم سوئے ادب کی حد کو عبور کرتا ہے لیکن اس کے برعکس جان آف دمشق نے تعصب ومنافرت کی تمام حدود کو عبور کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر قلم اُٹھایا اور آپ ﷺ کی شخصیت کی (نعوذ باللہ) اخلاق سے گری ہوئی ایسی تصویر کشی کی جس کی بنیاد پر بعد میں قرون وسطٰی کے مصنفین نے ایک نبی صادقؑ کو جنسی وشہوانی ہستی کے طور پر پیش کیا۔نیز اس نے محمد ﷺ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے آپ ﷺ کو (نعوذ باللّٰہ) ملحد، بدعتی اور گمراہ قرار دیا (۸)۔

۲۔بارہویں تا تیرہویں صدی:

یہ عہد صلیبی جنگوں کا ہے، ان جنگوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں سے مقابلہ کرتے ہوئے یورپ کے لوگوں کو پہلی بار باقاعدہ مسلمانوں سے معاملت کا واسطہ پڑا تھا۔چنانچہ پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کے پیش کردہ مسلم مخالف تصورات کو عملی طور پر ان لوگوں نے غلط محسوس کیا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ان کے مذہب کے حوالے سے جاننے کی عوامی کوشش کا آغاز ہوا۔لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پادری صاحبان نے جنگی محاذ پر پسپا ہو کر ذہنی وفکری محاذ پر اسلام کو زک پہنچانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے بارے میں ایسی غلط منظر کشی کی کہ لوگ اسلام سے متنفر ہوں تاکہ عیسائی مذہب کا دفاع آسان ہو سکے۔جس کے نتیجے میں خلاف حقیقت الزامات سے بھرپور ناقص اور مبہم معلومات کے بل بوتے پر افسانہ طرازی کے ذریعے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں افکار پیش کیے جانے لگے (۹)۔

۳۔ چودھویں صدی سے پندرھویں صدی تک:

اس دور میں پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے اسلام کے خلاف عوام کے ذہن میں بہت کچھ نفرت انگیز مواد ڈالا گیا۔ نیز اس پس منظر میں مستشرقین نے ایسے اذہان تیار کر دیے تھے جنھوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیاں اور تشکیک کے بیج بو کر ایسا جنگل تیار کر دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا۔ برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملے میں بہت زیادہ راسخ کر دیا تھا۔

دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانے میں مسلمان علم وفن کے میدان میں جو ترقی کر رہے تھے اس کے سبب یونانی علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعے عربی میں منتقل ہو چکی تھیں اور یوں ان کے آباؤاجداد کا علمی ورثہ جس سے وہ ناواقف تھے عربی میں محفوظ ہو چکا تھا(۱۰)۔

علاوہ ازیں علوم وفنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے استفادہ کے لیے اور اُندلس میں مسلمانوں کے اسلاف کی روشن کی ہوئی شمع عرفان وحقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو مستفید کرنے کے لیے عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم وثقافت سے واقفیت حاصل کی (۱۱)۔

۲۔ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز وارتقا

سولھویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آ گیا جب ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا۔ جس کے نتیجے میں ان سب نے مل کر اسلام کو اپنا مشترک دشمن قرار دیا اور ایک متحد رومن کیتھولک (ROMAN CATHOLIC) چرچ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی راہب، پادری، یہودی علماء، قصہ گو، مناظر اور شاعر ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے ان وکلاء وفضلاء نے لے لی، جو درس وتدریس کی مسند پر فائز ہو کر اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف نفرت وبغض کے بیج بونے لگے۔ وہ یہ کام علمی تحقیق کی آڑ لے کر کرتے۔ گیام پوسٹل مستشرقین کا باوا آدم شمار ہوتا ہے بلکہ وہ پہلا مستشرق تھا جس نے تحریکِ استشراق کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پوسٹل نے ۱۵۳۹ء میں کالج آف فرانس قائم کیا اور عربی کی پہلی

کرسی صدارت پر فائز ہوا۔ بعدازاں اس کے اس کام کو جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا (۱۲)۔ اس دور کو تحریکِ استشراق کا نقطۂ آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں مستشرقین نے کام کا بھرپور اور منظم نقشہ مرتب کیا۔ اس تحریک کا آغاز خالص مسیحی و مشنری اور کلیسائی پس منظر میں ہوا جس کا اثر ما بعد بھی جاری وساری رہا کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ کا ہی پروردہ تھا (۱۳)۔ بعدازاں اسلام دشمنی کی سوچ پر ان سے متفق یہودی بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

۱۔ سترہویں صدی:

اس دور کو تحریکِ استشراق میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ اس تحریک کے عروج کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور کے معروف مستشرقین کے نام بلحاظ زمانہ اس طرح ہیں:

۱۔ جینن برڈر (Genebrard) (۱۵۳۵ء تا ۱۵۹۷ء) (اس کا دور تو اگرچہ سولھویں صدی کا تھا لیکن اس کا لٹریچر اس دور میں (سترھویں صدی) عام ہوا)۔

۱۔ ولیم بیڈول (W. Bedwell) (۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء)۔

۲۔ ایڈورڈ پوکاک (Edward Pocock) (۱۶۰۴ء تا ۱۶۹۱ء)۔

۳۔ واٹیئر (P. Vattier) (۱۶۱۳ء تا ۱۶۶۱ء)۔

۴۔ ہانجر (J.H Hottinger) (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء)۔

۴۔ ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr.Henry Stubbe) (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء)۔

۵۔ لینسولٹ ایڈیسن (Lancelot Addison) (۱۶۷۹ء)۔

۶۔ ہمفرے پرائی ڈیکس (HumphreyPridcaux) (۱۶۹۷ء) (۱۴)۔

یہ بات خاص طور پر مدنظر رہے کہ ان میں ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) کا شمار ایک معتدل مصنف کے طور پر ہوتا ہے، اُس کی مشہور کتاب (جو سب سے پہلے لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی) کا نام ہے:

"An Account of the rise and progress of Mohammetanism"

کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظرانداز کر دی جائیں تو اسے سیرتِ

رسولؐ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جیسا کہ اُس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسولؐ کے بارے میں اوّلین اعتذار ہے۔ اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مسیحی مصنفین نے اختیار کر رکھا تھا بلکہ اُن مصنفین کی اس تصویر کو مکروہ قرار دیا ہے جو انھوں نے اخلاق و کردارِ نبویؐ کے متعلق پیش کی تھی اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ:

''اس آسمان کے نیچے سوائے محمد ﷺ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکزِ توجہ بنی ہو اور اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں، غیر اسے نگاہِ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا (۱۵)۔

۲۔ اٹھارویں صدی عیسوی:

اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران بھی تحریکِ استشراق اپنے جوبن پر تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کو اپنے مال و اسباب کی قیمت اور ساز و سامان کی حقیقت معلوم ہوتی چلی گئی۔ اس دور میں تمام تر مذہبی مشنری، سیاسی اور اجتماعی عزائم کے باوجود مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی پیدا ہوئی۔ اس نرمی کا سبب صرف یہ تھا کہ ان میں سے چند ایک کا رویہ، اسلوب اور اندازِ بیان نسبتاً انصاف پسندی پر مبنی تھا۔ اس دور کے اہم مستشرقین درج ذیل ہیں:

۱۔ ریلان (H. Reland) (۱۷۰۴ء)۔

۲۔ سائمن اوکلے (S. Ocklay) (۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۰ء)۔

۳۔ جارج سیل (G. Sale) (۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء)۔

۴۔ جین گیجنیر (J. Gagnier) (۱۶۷۰ء تا ۱۷۴۰ء)۔

۵۔ رسک (J.J. Reiske) (۱۷۱۶ء تا ۱۷۷۴ء)۔

۶۔ ایڈورڈ گبن (E. Gibbon) (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء)۔

۷۔ والٹیئر (Fr. Voltaire) (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء) (۱۶)۔

۳۔ انیسویں صدی سے عصرِ حاضر تک:

تحریک استشراق کا عروج:

انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے ربع اوّل تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے کئی پہلوؤں سے اہم ہے۔ پچھلی صدیوں میں عالمِ اسلام کو دنیا کے مختلف حصّوں میں سقوط و انحطاط کے جن مراحل سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو اُن کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف ''مغرب'' کو زمانۂ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالا دستی حاصل ہوتی چلی گئی اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالمِ اسلام خستہ و نزار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہوا اقوامِ مغرب کے لیے بہر حال خوش آئند تھی اور اس سے برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا۔ چنانچہ زیرِ نظر دور تحریک استشراق کے عروج و کمال کا آئینہ دار ہے۔ اس عہد میں تحریکِ استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا۔ مستشرقین کے انداز و اطوار اگرچہ بدل گئے تھے تاہم کیفیت و کمیّت دونوں اعتبار سے اُن کے اخلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے، چنانچہ اس دور کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ کمیّت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی، اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے۔ مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیئم، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے (۱۷)۔

۲۔ کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیف و تالیف کے ڈھیر لگا دیے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائدِ اسلام، قرآن، حدیث، فقہ، اجتہاد، عرب اور اہل عرب کے احوال، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و سوانح پر کثرت سے لکھا گیا۔ اس دور میں مستشرقین کا معیارِ تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و

اکتشاف میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا جو آج بھی باعثِ حیرت ہے۔قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار قدیمہ کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح واشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب وتدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں ان کی محنت وریاضت کی روشن دلیل ہیں۔انھیں کی کوششوں کی بدولت بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک پھر سے پہنچیں اور مشہور ومتعارف ہوئیں۔

۳۔ مستشرقین کے گروہ میں حسبِ سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف وتالیف میں بھر پور حصہ لیا۔ایک طرف اگر روایتی قسم کے تشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف حقیقت بین، انصاف پسند، نرم رَو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے۔مثلاً گاڈ فرس ہگنز، کاسن دی پرسیوال، ویل، بیان، گوئٹے، شول، کارلائل، درمنگھم وغیرہ (۱۸)۔

۴۔ مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا رویّہ پہلے جیسا نہ رہا۔ بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا۔محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل واستدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات واسفار نے ان پر اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کر دی اور بیان واقعات کا تضاد سامنے آ گیا۔دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی۔ نیز جدّت پسندی، سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصّب اور تقشّف کے خلاف عام بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی مؤثر عوامل ثابت ہوئے۔ ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودّت کے جذبات غالب آ گئے تھے بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انھیں نقطہ نظر بدلنے پر مجبور کیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بہر حال اصل سبب ہم کسی بھی محرک کو قرار دیں، عملاً یہ واقعہ پیش آیا کہ اب تحریک استشراق کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے:

۱۔ اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہو گئیں اور الزامات واتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہو گیا۔

۲۔ صورتِ حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیے، جنھوں نے جرأت

سے کام لے کر اپنے پیشرو مصنفین کی تغلیط کی اور اُن کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کیا (۱۹)۔

۵۔ اپنی ان تمام تر سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے۔ مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ ۱۸۲۳ء اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ۔ ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیے جن سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی۔ لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں ان رسائل و جرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے متذکرہ بالا مجلّات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اپنی حکمتِ عملی کا مستقل حصّہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل و جرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ چنانچہ امریکہ سے "The Muslim World" کا اجراء، پیرس سے ۱۸۹۵ء میں "Revaed el Islam" کا اجراء، روس سے ۱۹۱۲ء میں "Mid Islam" وغیرہ کا اجراء ہوا۔ رسائل و جرائد اور مجلّات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا مقصد بظاہر تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں لیکن بہ باطن مدعا اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا۔ رہی اُن کی بلند آہنگی، تو وہ نتیجہ تھی اقوامِ یورپ کی بالادستی اور استعماری و سامراجی تسلط کا۔ اب وہ منزل بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۳ء میں اُسے پہلی بار عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ عالمی کانفرنسوں کا اِنعقاد بھی ان کے لیے بڑا مفید ذریعہ تھا۔ مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء فضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات، صلاح مشورے، قراردادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریکِ استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنۂ توجہ نہیں چھوڑا اور ۱۹ ویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کر دیا۔ یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے رُبع اوّل تک کا زمانہ تحریکِ استشراق کا دورِ عروج و کمال تھا۔ اور پھر یہ کہ اس تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی سرعت سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک (Discipline) نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں بہت منظم طریقے سے، ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں۔ اسی عہد کی آخری دہائی میں عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور

متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی سماجی اور معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ منقلب کر ڈالا (۲۰)۔

اس دور کے مشہور مستشرق درج ذیل ہیں:

۱۔ ولیم رائٹ (W Wright) (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء)

۲۔ فلاشیر (H.C.Fleischer) (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء)

۳۔ سلیم نوفل (Salim Nofel) (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۲ء)

۴۔ سر ولیم میور (Sir William Muir) (۱۸۵۷ء)

۵۔ گولڈ زیہر (Y. Goldziher) (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء)

۶۔ ولہاؤزن (J. Wellhausen) (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۸ء)

۷۔ واشنگٹن اروِنگ (Washington Irving) (۱۷۸۳ء تا ۱۸۵۹ء)

۸۔ نکلسن (R.A. Nicholson) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۵ء)

۹۔ نولدیکے (Th. Noldeke) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء)

۱۰۔ ہر گرونج (Snouck Hergrenje) (۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۶ء)

۱۱۔ ونسنک (A.J. Wensink) (۱۸۸۱ء تا ۱۹۳۹ء)

۱۲۔ پروفیسر زخاؤ (E Sahau) (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۰ء)

۱۳۔ جوزف ہورووز (J. Horovitz) (۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۱ء)

۱۴۔ کارل بروکلمان (C. Brockelmman) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء)

۱۵۔ ایچ.جی ویلز (Wells Herbert George) (۱۸۸۶ء تا ۱۹۴۶ء)

۱۶۔ گب (Gibb. Sir Hamilton) (۱۹۴۹ء)

۱۷۔ برنارڈ لیوس (Levis. Berrnard) (۲۱)۔

اسباب ومحرکات:

تحریک استشراق کا علمی وتاریخی جائزہ لینے سے درج ذیل اسباب ومحرکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ مستشرقین کے مخاصمانہ اور معاندانہ رویے کی ایک وجہ مذاہب کا نظریاتی وفکری اختلاف

ہے۔اسلام توحید کا علمبردار ہے جبکہ دوسرے مذاہب میں شرک کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

۲۔ فکری و نظریاتی سبب کے علاوہ دوسری وجہ تاریخی ہے۔اسلام مختصر مدت میں تیزی اور سرعت کے ساتھ (نصاریٰ کی سیاسی طاقت کو مغلوب کرتے ہوئے) عرب کی سرزمین سے نکل کر دور دراز حصّوں تک پھیل گیا۔(یہ سیاسی ہزیمت ان کو علمی محاذ آرائی پر مسلسل ابھارتی رہی)۔

۳۔ صلیبی جنگیں تحریک استشراق کا ایک ایسا سبب ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔

۴۔ تحریکِ استشراق کا ایک سبب مسلمانوں کا اخلاقی زوال اور مسلم سلطنتوں کا سقوط وانحطاط ہے۔

۵۔ مغرب کی علمی بیداری کو بھی تحریکِ استشراق کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

۶۔ تجارتی مفادات بھی تحریکِ استشراق کا ایک سبب ہیں (۲۲)۔

مستشرقین کی اقسام:

معتدل مزاج مستشرقین:

مستشرقین کا وہ گروہ جو اپنے آبائی مذہب پر سختی سے کاربند ہونے کے باوجود اسلام کے بارے میں مثبت رائے رکھتا ہو اور سیرت سے بہت حد تک متاثر ہو۔ان میں سے چند ایک مستشرقین درج ذیل ہیں:

۱۔ کاسن دی پرسیول:

یہ ایک فرانسیسی مستشرق تھا۔اس کا زمانہ ۱۷۹۵ء سے ۱۸۷۱ء تک تھا۔اس کے آثار میں ایک تاریخ العرب ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی دوسری کتاب کا تعلق قبل از اسلام اور عہدِ رسالت سے متعلق ہے۔سید امیر علی نے اپنی کتاب ''A critical examination of the life and teaching of Muhammad'' کے مقدمہ میں کاسن کے کام کو عالمانہ اور تحقیق سے بھرپور قرار دیا ہے (۲۳)۔

۲۔ مائیکل ایچ ہارٹ:

مائیکل نے ایک سو عظیم شخصیات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔اس نے اپنی کتاب The

100, A ranking of the most influential persons in History میں حضرت محمد ﷺ کا نام سرِفہرست رکھا اور اس کی وجہ وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

''محمد ﷺ نے تاریخِ انسانیت پر بے مثال دینی اور دنیاوی اثرات ڈالے ہیں۔ وہ میری نظر میں اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں تاریخِ انسانی کی مؤثر ترین شخصیت قرار دیا جائے'' (۲۴)

مائیکل دوسری طرف محمد ﷺ کو تعصب کی نگاہ سے بھی دیکھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"Moreover, he is author of the muslîms holy scriptures, the Koran, a collection of certain of Muhammad's insights (that he believed had been directly revealed to him by Allah")(25)

(مزید برآں وہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کا مصنف ہے جو محمد ﷺ کے خیالات کا مجموعہ ہے اور جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ان پر اللہ کی طرف سے براہِ راست نازل ہوئی)۔

مائیکل کی اگر پہلی عبارت پر نظر دوڑائی جائے تو وہ اسلام کا ہمدرد نظر آتا ہے۔ لیکن دوسری عبارت میں آنحضور ﷺ کی شان میں یہ گستاخی کرنا کہ آپ ﷺ نے قرآنِ مجید خود لکھا ہے ایک تعصب پر مبنی سوچ ہے۔

متعصب مستشرقین:

اس گروہ میں وہ یورپی مستشرقین شامل ہیں جنھوں نے غیر جانبداری اور بے لاگ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق خرافات پیش کی ہیں ہم ان کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

کیمون ایک فرانسیسی مستشرق اپنی کتاب میں اس طرح لکھتا ہے:

''محمد ﷺ کی قبر کی مثال ایک بجلی کے کھمبے جیسی ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پیدا کرتا ہے اور انھیں ایسے کام کی طرف ترغیب دلاتا ہے جو مرگی کے مریض اور مخبوط الحواس لوگ کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مسلمان مسلسل لفظ اللہ کا تکرار کرتے رہتے ہیں اور وہ ایسی چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں جو سادہ طبیعتوں کا خاصا ہیں۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانے، شراب نوشی اور موسیقی سے نفرت اور جو چیزیں سفاکی اور بدکاری کے خیالات سے جنم لیتی ہیں'' (۲۶)۔

یہی مستشرق ایک اور جگہ پہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اس طرح لکھتا ہے:

''دینِ محمدی، نعوذ باللہ جذام کا مرض ہے جو لوگوں میں پھیل رہا ہے۔ اس مرض نے لوگوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، یہ ایک عام فتنہ اور ایسا جنون ہے جو سب کچھ فراموش کرا دیتا ہے۔ جو انسان کو سستی اور کاہلی پر ابھارتا ہے۔ جو آدمی اس مرض میں مبتلا ہوا سے قتل و غارت، شراب نوشی اور بدکاری کی دعوت کے سوا کوئی چیز سستی اور کاہلی کے اس جال سے نہیں نکال سکتی'' (۲۷)۔

یہ تحریریں یہ بات واضح کرتی ہیں کہ یہ مستشرقین نہ تو علم کے شائق ہیں اور نہ ہی تحقیق سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ وہ علم اور تحقیق کو بنیاد بنا کر اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ مستشرقین کے اس طبقہ نے جو رویہ اختیار کیا اس کے اسباب تاریخی ہیں کیونکہ اسلام نے یہودیت اور عیسائیت کو عسکری میدانوں میں شکست دی تھی اس سے کئی ممالک میں ان کی رسوائی ہوئی نیز اقتدار اور وقار بھی ان کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ اس طبقہ میں چند ایک مستشرقین اور بھی ہیں۔

ایڈورڈ گبن:

اس کا زمانہ ۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء تھا۔ یہ ایک انگریز مؤرخ تھا۔ اس کی شہرت کی وجہ اس کی کتاب ''تاریخ زوالِ رومہ'' ہے۔ نیز یہ انگریزی تاریخ نگاری میں بھی کافی شہرت کا حامل ہے۔ اس نے اپنی کتاب کے پچاسویں باب میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے متعلق نہایت معاندانہ خیالات کا اظہار کیا اور رواداری کے نام نہاد دعویٰ کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بہت ہی نامناسب الفاظ اور زبان استعمال کی (۲۸)۔

ولیم میور:

ولیم میور مشہور انگریز مستشرق تھا۔ عربی کا عالم اور انگریز سرکار کا نمائندہ بھی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آگرہ میں شعبہ جاسوسی کا سربراہ تھا اور متعدد کتابیں اس سے منسوب ہیں۔ ولیم میور نے ''The Life of Muhammad'' کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں پہلی مرتبہ ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا جواب سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' میں دیا ہے۔ اس کا بھائی جان میور بھی مستشرق تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم بھی تھا (۲۹)۔

پیشہ ور مستشرقین:

استشراق کی تحریک کی بنیاد ہمیشہ استعمار کی طرف سے ملنے والی مالی امداد اور سماجی حیثیت پر بھروسا کرتی رہی ہے اور مستشرقین یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور میڈیا کے بڑے بڑے عہدوں کی شکل میں اپنی کوششوں کا انعام پاتے رہے ہیں۔ اہلِ مغرب خواہ یہودی ہوں یا عیسائی ان کے عزائم دینی ہوں، سیاسی، یا اقتصادی۔ ان کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے۔ استعماری طاقتوں کی نظر اسلامی ممالک کے ذخائر پر ہے، ان میں سے ہر ایک کے ارادوں کے راستے میں امتِ مسلمہ ایک دیوار کی مانند کھڑی تھی۔ اس لیے ہر وہ شخص جو اس دیوار کو منہدم کرنے کی کارروائیوں میں کسی بھی حیثیت میں شریک ہوتا وہ پادریوں کا بھی منظورِ نظر ہوتا اور سیاست دان بھی اس کی پذیرائی کرتے۔ اس وجہ سے لاتعداد مدعیانِ علم، دولت، شہرت وحشمت کی اس دیوی کی خاطر اسلام کی اس دیوار کو منہدم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے عالمِ اسلام اور اسلامی ادب کے ذخیرے کو کھنگال مارا تا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس کے ذریعے مسلمانوں کے کردار کو داغ دار کیا جائے۔ مسلمانوں کی ان خامیوں کو نوٹ کیا جائے۔ ان کے ذریعے باہم لڑا کر انھیں کمزور کیا جائے (۳۰)۔

ملحد مستشرقین:

یورپ میں جب مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم شروع ہوا تو یورپ میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو علم کے پیاسے تھے لیکن ان کے ساتھ پاپائے روم کا جو سلوک تھا اس کو ڈاکٹر ڈریپر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

پاپائے روم کے ہاں ہر وہ عیسائی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے بالاتر ہو کر سوچتا۔ علمی کتابیں لکھتا۔ سائنسی انکشافات کرتا۔ مسلمانوں کی تہذیب یا کسی اور بات کو اچھا سمجھتا یا ہر روز نہاتا تھا۔ ایسے کافروں کو سزا دینے کے لیے پاپا نے ۱۴۷۸ء میں ایک مذہبی عدالت قائم کی۔ اس عدالت نے پہلے سال دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا اور سترہزار کو قید وجرمانہ کی سزا دی۔ دس برس میں اس نے ستر ہزار افراد کو آگ میں پھینکا۔ ستانوے ہزار تین سو کیس کو قید وبند کی سزا دی اور ساتھ ہی مختلف علوم کی چھ ہزار کتابیں جلا دیں۔ پوپ کی مرکزی، مذہبی عدالت نے ۱۴۸۱ء اور ۱۸۰۸ء کے درمیانی عرصہ میں تین لاکھ چالیس

ہزار افراد کو نہایت المناک سزائیں دیں۔ ان میں سے بیس ہزار کو زندہ جلایا گیا (۳۱)۔

انسانیت پر اس ظلم کی وجہ سے علم کے شیدائی مذہب کے دشمن ہو گئے۔ مذہب اور کلیسا میں ایک طوفان اٹھا اور یہ طوفان پوپ اور کلیسا کے اختیارات کو بہا کر لے گیا۔ اہلِ مغرب نے مذہب کو زندگی کے معاملات سے فارغ کر کے گرجے میں بند کر دیا جہاں ہر اتوار کے روز چند عیسائی اپنے قیدی مذہب کی زیارت کے لیے چلے جاتے۔ مسلم ممالک میں بھی مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دیتے اور اسے معاشرتی زندگی سے لاتعلق کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ یورپ کے اسی تجربہ کا عکس اسلام کے آئینہ صافی میں دیکھنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ اسلام کلیسا کی طرح علم کا دشمن نہیں بلکہ وہ تو مہد سے لے کر لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

اس صورت حال کی وجہ سے یورپ میں الحاد کی تحریک نے زور پکڑا۔ اہلِ یورپ کی قومی زندگی کا ہر شعبہ عملاً ان لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو عیسائی کہلاتے تھے لیکن سوچ ملحدانہ تھی اور ان کا عمل بھی ملحدانہ تھا۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح استشراق کی تحریک میں ملحد بھی شامل ہو گئے۔ ان ملحدوں کو استشراق کی شکل میں ایک میدان میسر آ گیا جس کے لبادے میں انھوں نے مذہب کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔

والٹیئر، ایک ایسا ہی ملحد تھا، وہ کلیسا کا شدید ترین دشمن تھا لیکن اس نے کبھی کھل کر بنو اسرائیل کے کسی نبی پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کسی پوپ وغیرہ کو براہِ راست اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس صورت میں کلیسا، عوام اور حکومت کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس صورت حال کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس نے تمام ادیان اور ان کے بانیوں پر کیچڑ اچھالنے کے لیے حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو بطور رمز استعمال کیا۔ اس نے حضور ﷺ پر ایسے رکیک حملے کیے جن کی ہمت اس سے پہلے کسی کو نہ تھی۔ اس مستشرق نے گویا انتہا کر دی تھی اور اپنی تحریروں میں حضور ﷺ کے متعلق خاکمِ بدہن انتہائی نازیبا کلمات استعمال کیے۔ اس لیے اس نے اپنے اس کارنامے پر پوپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی کتاب کا انتساب پوپ کے نام کر دیا۔ اس طرح اس ملحد مستشرق نے کلیسا اور اسلام دونوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی اور اسے کسی خطرے کا سامنا بھی نہ کرنا

پڑا(۳۲)۔

یہ بات صرف اسی مستشرق تک ہی محدود نہ رہی بلکہ جن لوگوں نے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ان میں کثیر تعداد اسی قسم کے ملحد مستشرقین کی ہوتی ہے۔

نومسلم مستشرقین:

مستشرقین میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اسلام پر صحیح تحقیقات کیں اور جنھیں توفیقِ خداوندی نے حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ ذیل میں ہم چند خوش نصیب لوگوں کا ذکر کریں گے جن کو ان کی تحقیق اور توفیقِ خداوندی نے منزل مراد تک پہنچایا اور انھوں نے کلمہ توحید پڑھ کر دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کی۔

رسل ویب(Russel Webb):

ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ یہ ادیب، مصنف اور صحافی تھے۔ ان کا پورا نام محمد الیگزینڈر رسل ویب ہے۔ سینٹ جوزف گزٹ اور میسوری ریپبلکن کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ریاست متحدہ امریکہ کے کونسلر مقرر ہوئے۔ اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں گہرے اور وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ بعض نوجوانوں کے برعکس میں ابتداء سے مذہب کے ساتھ اچھا لگاؤ رکھتا تھا مگر بیس سال کی عمر میں جونہی شعور بیدار ہوا چرچ کی خشک اور بے معنی رسومات وقیود سے سخت بیزار ہو کر، عیسائیت سے متنفر ہو کر میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن کوئی مذہب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ آخر اسلام کو پڑھنے کا موقع ملا تو حق واضح ہو کر سامنے آ گیا۔ یاد رہے میں نے اسلام کو کسی جذباتی ردّعمل، اندھی عقیدت یا محض سطحی جوش سے متاثر ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل مخلصانہ، دیانتدارانہ اور قطعی غیر متعصّبانہ مطالعہ اور تحقیق کارفرما ہے(۳۳)۔

علامہ محمد اسد (پولینڈ):

آپ کا پہلا نام "لیو پولڈ ویس" تھا۔۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ بائیس سال کی عمر میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ جرمنی کے ایک اخبار "فرانکفرٹر" نے ان کو مشرق وسطیٰ کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کیا۔قبول اسلام کے بعد تقریباً چھ برس تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے پھر برصغیر آ گئے اور کئی سال تک علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھیں حکومت کی زیر سر پرستی ایک جدید محکمہ "اسلامی تشکیل جدید" کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ بعد میں ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور ان کا تقرر وزارتِ خارجہ میں مشرق وسطیٰ میں افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے بھی رہے۔ان کا قیام پاکستان، سعودیہ کے علاوہ مراکش میں بھی رہا۔انھوں نے اپنی زندگی تحقیق و تصنیف کے لیے وقف کر دی۔ "The Message of the Quran" کے نام سے ترجمہ و تفسیر کا نہایت وقیع علمی کام کیا۔ احادیث رسولؐ پر بھی ان کا کام ہے۔ "اسلامی تشکیل جدید" کے مجلّے "Arafat" کے مدیر مسئول رہے۔ان کی تین کتابیں "Islam at the Crossroads" ...... "A Road to Mecca" بہت مشہور ہیں (۳۴)۔

علاؤالدین شلبی:

آپ ایک جرمن مفکر تھے۔اسلام کے متعلق آپ اس طرح فرماتے ہیں:

"میں نے مغرب کی گمراہی کو محسوس کیا کہ الحاد اور سرمایہ داری کے مادی نظاموں میں سرگرداں ہیں وہ لوگ جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔اس تاریک ماحول میں، میں نے محسوس کیا کہ اسلام تمام ادیان کا نچوڑ ہے۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک روز میری نظر قرآن پڑھتے ہوئے اس آیت کریمہ پر پڑی (فـفـرّوا الی الله) دوڑو اللہ تعالیٰ کی طرف۔ میں نے سوچا کہ میں کہاں جاؤں۔ آخر کار قاہرہ (مصر) جانے کا فیصلہ کیا اور اتفاق سے میں نے ایک مجلس میں شمولیت اختیار کی جس میں اکنافِ عالم سے آئے ہوئے مسلمان رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر ذکر اللہ میں مصروف تھے اور میں بھی اس مجلس میں شامل ہو گیا۔ میں اس وقت تک اپنے آپ کو دنیا کا

خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا جب میرا ہاتھ ایک سیاہ فام مسلمان بھائی کے ہاتھ میں تھا اور ہم اللہ احد پڑھ رہے تھے۔ سچ ہے اسلام وہ دین ہے جو کبھی مغلوب نہ ہوگا (۳۵)۔

مختلف ادوار میں مستشرقین کی کتب سیرت:

سید حبیب الحق ندوی کی ایک تحریر سے مستشرقین کی کتب سیرت کا تاریخی جائزہ قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق (۷۰۰ یا ۷۴۹ء) سے جاملتا ہے۔ اس نے آنحضرت ﷺ پر الزام لگایا کہ آپ ﷺ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے ''اسلام'' کے نام سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا، اسلام میں محمد ﷺ کی پوجا کی جاتی ہے۔

جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرت ﷺ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق و ریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا۔

ولیم میور نے اس کا ملخص ترجمہ زیر عنوان (The Apologe of Al-Kidi) لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا، یہ رسالہ دورِ وسطیٰ میں رہنما اصول کا کام دیتا رہا، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، رسالہ کے مرکزی مضامین میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار، قرآن کا مذاق (اسے خبط خیالات کا غیر مربوط مجموعہ قرار دینا) سیرت محمدیہ ﷺ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے، یہ رسالہ یورپ میں دورِ وسطیٰ کی اسکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا، آج بھی رسالہ کا آسیب مستشرقین کے سر پر سوار ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر اور نویں صدی عیسوی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین (۷۵۸ء-۸۱۸ء) نے کرانیکل لکھی، اس تاریخ (The Chranicles of Theosophane, The Compessor) کو اناسٹیس Anastasius نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنالیا۔ اسی کرانیکل میں آنحضرت ﷺ کے جنونی دورے (Epiletic Fite) کی داستان بھی گھڑی گئی۔

نویں صدی عیسوی میں شاہ بیل (۸۶۷ء-۸۸۶ء) کی فرمائش اور حکم پر ایک بازنطینی مؤلف نے آنحضرت ﷺ کے خلاف ایک کتاب Refutatio Mohammad لکھی، جس میں آپ ﷺ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا، قرآن کو کذب اور خرافاتی داستانوں کا مجموعہ

قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے اساسی عقیدہ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ کا شدید مذاق اُڑایا۔

گیارہویں سے تیرھویں صدی کے دوران ونسنٹ ڈی بیوس (Vincent De Beaauvais) متوفی ۱۲۶۴ء کا نام آتا ہے۔ اس نے اپنی تمام داستانوں کو اپنی تالیف Specculom Hisloricale میں جمع کر دیا، اور آنحضرت ﷺ کو وثنی Pagan اور Low Born ثابت کیا، ان کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکا دے کر اس کو برقرار رکھا۔

اس دور میں سیرت محمدی ﷺ اور اسلامی تاریخ کی تمسیخ کی نئی تحریکیں چل پڑیں، ۱۱۴۱ء میں (Peter the Venerable) نے چند عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے، رابرٹ (Robert) اور ہرمن (Herman) نامی مؤلفین نے چار عربی کتب کے تراجم کیے، جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، رابرٹ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور پیٹر نے اس کی تردید کی، نیز یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں، پیٹر کی تحریرات اور تالیفات سے یورپ میں اسلام اور حضرت محمد ﷺ کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی میں لاطینی زبان کے علاوہ یورپ کی دیگر زبانیں بھی صف آرا ہو گئیں، نثر کے ساتھ نظم بھی صف آرا ہوئی، فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔

والٹر (Walter of Sens) نے لاطینی زبان میں الیگزینڈر (Alexander Dupont) نے فرانسیسی زبان میں آنحضرت ﷺ کے خلاف دل کھول کر لکھا، ایک شعری مرثیہ گیارہ سو بیالیس اشعار پر مشتمل زیر عنوان (Avila Muhammitt) لکھا گیا، اور اسے بارہویں صدی کے شاعر ایمبر یکو (Embrico of Maint) کے نام سے منسوب کر دیا گیا، اس میں آنحضرت ﷺ کے خلاف نفرت کا اُمنڈتا ہوا ایک طوفان تھا، ہر قسم کے غلیظ القابات استعمال کیے گیے۔ بعضوں نے اسی مرثیہ کو ہائلڈ برٹ (Hildebert of Tours) نامی شاعر (متوفی ۱۱۳۳ھ) کی طرف منسوب کر دیا، یہ مرثیہ گویا آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا شعری مجموعہ تھا، اسی قسم کی شعری سیرت زیر عنوان اوٹیوڈی (Oteode Mehamat) کے زیر عنوان بھی لکھی گئی جو ۱۱۰۹ اشعار پر مشتمل تھی، والٹر نے وسط بارہویں صدی میں لکھی جو پہلے مرثیہ کا نقش ثانی تھا، حروب صلیبیہ پر تالیفات کا زور ہوا، معروف مؤلف گلبرٹ (Guilbert of Nogent) نے

پہلی صلیب پر ایک کتاب زیر عنوان گیستا (Giesta Dei Der Fracheoos) لکھی اور ۱۱۱۲ء سے قبل ہی مکمل کرلیا، اس تالیف میں آنحضرت ﷺ کی سیرت پر ایک باب ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا چربہ ہے، آنحضرت ﷺ کے نام تک کو مسخ کرنے کی سعی کی ہے، اور محمد ﷺ کے بجائے موتھومس (Mathomus) لکھا ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ داستان یہ گھڑی گئی کہ محمد ﷺ خود پادری (Cardinal) تھے، اور پوپ (Pope) کے مرتبہ پر ترقی پانے کے امیدوار بھی، مگر جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ روم سے بھاگ کر عرب چلے گئے اور وہاں نبوت کا دعویٰ کردیا، ایک روایت کے مطابق یروشلم کے بشپ سرگیس (Sergius) نے حضرت محمد ﷺ کو نبوت کے دعویٰ پر اُکسایا اور ان کے لیے قرآن نامی کتاب لکھی۔

۱۲۷۱ء میں ولیم (William of Tripole) نے آنحضرت ﷺ کی سوانح لکھی، تاکہ مشنری اپنی تبلیغ کے لیے استعمال کرسکیں اس سوانح میں مؤلف خرافات کے علاوہ کچھ پیش نہ کرسکا۔

دانتے اٹلی کا معروف شاعر، ازمنۂ وسطیٰ اور نشأۃ کا جدامجد ہے، بلکہ یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے، اس کی معروف وشہرۂ آفاق نظم (The Divine Comedy) کو نشأۃ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم کی تدوین وتاسیس میں دانتے نے آنحضرت ﷺ کی احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے؛ میڈرڈ یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے استاد پلاسیوس (Placious) نے ۲۵ سالہ ریسرچ اور جانکاہ اور دیدہ ریز محنت کے بعد یہ ثابت کیا ہے دانتے نے اس نظم کی تدوین میں نہ صرف معراج کی احادیث سے استفادہ کیا ہے بلکہ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور المعری کے رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا، دانتے نے علوم اسلامیہ اپنے اطالوی استاد برونیلو (Brunello Latini) سے جو عربی زبان کا ماہر تھا، حاصل کیے، نظم کی ترتیب میں فتوحات مکیہ کی نقل کی، یورپ میں احادیث معراج پر خاصا مواد موجود تھا، پیرس کی لائبریری میں احادیث معراج پر مخطوطات بھی موجود تھے، پروفیسر منارٹ نے اپنی کتاب زیر عنوان ''بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں مطالعۂ اسلام'' میں ان فرانسیسی مسودات کے نام تک گنوائے ہیں، جہاں تک دانتے کی رسائی ممکن تھی، غزالی کی الدرۃ الفاخرۃ اور معرج نامہ تک دانتے کی رسائی تھی، کتاب المعراج کے لاطینی اور فرانسیسی تراجم اس وقت موجود تھے۔ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو (معاذ اللہ)

جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی، وہ تفریق مذہب کے مجرم بنے، شاعر کی دریدہ ذہنی کا یہ عالم ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مثلہ کردہ زیر عذاب دکھلاتا ہے۔

انگریز فلسفی راجر بیکن (R.Becon) نے آنحضرت ﷺ کو جادوگر کی حیثیت سے پیش کیا، اور اپنے مقالات بالخصوص (Of Boldness) میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں خرافات وضع کیں۔

مسیحی فرقہ پروٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر کا سارا حملہ اگرچہ چرچ اور پوپ کے خلاف تھا۔ اس لیے اس نے آنحضرت ﷺ کو پوپ سے بھی زیادہ بدتر قرار دیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس امر کی تحقیق کی جائے کہ اسلام اور محمد ﷺ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آخری دشمن تھے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مذہب عیسائیت کی بربادی کے ذمہ دار اسلام اور محمد ﷺ ہی تھے۔ لوتھر نے آنحضرت ﷺ کو گاگ اور میگاگ کا خطاب دیا۔

سترہویں صدی کے نامی مؤلف بڈول (Bedwell) متوفی ۱۶۳۲ء نے اپنی تالیف ''محمد الکاذب'' (Mahammed Imposture) میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت گستاخی کی، جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہے (Gonebard) نامی کیتھولک مؤلف کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمد ﷺ نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان مثلاً لاطینی، عبرانی اور یونانی میں نہیں کی، بلکہ ایک وحشی زبان میں کی، چونکہ محمد ﷺ خود (العیاذ باللہ) جانور (Beast) تھے اس لیے قرآن کو بھی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا۔

جدید تحریکات کے زیر اثر سترہویں صدی میں اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا، مگر لاطینی خرافاتی روایات سے گلوخلاصی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بعض روشن خیال اسکالرز نے وقتاً فوقتاً روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی، ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک (Edward Peacoke) متوفی ۱۶۹۱ء تھا، موصوف نے چند عربی کتب کے عربی ترجمے کیے، نیز حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس نے سیرت محمدیہ ﷺ پر نظر ثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا۔

انگریزی چپلین یا پادری (Chaplain) ایڈیسن (Lanolot Addison) نے حیات وموت محمد (Life and Death of Muhammad) کے زیر عنوان اپنی کتاب

۱۶۷۸ء میں لندن سے شائع کی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرت ﷺ کے خلاف مؤلف کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی کتاب قرآن کو شائع نہیں کیا، ۱۶۹۷ء میں ناروچ کے ڈین (Dean of Norwich) ہمفری (Humphery Prideaux) نے آنحضرت ﷺ کی سوانح لکھی اور آپ ﷺ کو نبی کاذب (Imposture) قرار دیا، مؤلف نے اعتراض کیا کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے، مؤلف رکاڈو (Ricado) سے بے حد متاثر ہوا تاہم، ہمفری کی کتاب تقریباً ایک صدی تک مستشرقین کے لیے حوالہ کا کام دیتی رہی، کتاب کا مرکزی مضمون اسلام کو بطورِ مذہب دھوکا ثابت کرنا تھا۔

اٹھارویں صدی بھی لاطینی روایات اور ازمنۂ وسطیٰ کے عقائد کی زد میں رہی، سب سے پہلے ڈچ مستشرق ایچ، ریلان (H. Relan) نے آنحضرت ﷺ کی جانب رویہ میں تبدیلی پیدا کی، اپنی معروف تالیف ''مذہب محمد'' (Dereligione Mahammadiea) (۱۷۰۴ء) میں اس نے ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات سے رہائی کی کوشش کی، اور اسلام اور محمد ﷺ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، غالباً یہ پہلا مستشرق تھا، جس نے رواداری (Tolerance) کا مطالبہ کیا۔

کانٹ بولین (Caunt De Boulainrillious) نے اپنی کتاب (Via De Mohamet) (لندن ۱۷۳۰ء) میں اسلام اور محمد ﷺ کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا، تو اس کے خلاف حملے شروع ہو گئے، اور اس پر مسیحیت کی تخفیف کا الزام بھی لگایا گیا، ناقدین کے مطابق یہ کتاب اسلام اور محمد ﷺ کی جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی، جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی، مؤلف نے اسلام کو پہلی بار ایک عقلی مذہب (Rational Religion) قرار دیا اور آنحضرت ﷺ کو نبی تسلیم کر لیا، یہ اقدام تمام سابقہ مسیحی اور یہودی مستشرقین کے عقائد و مزاج کے خلاف تھا اس میں نہ صرف قرونِ وسطیٰ اور لاطینی خرافات کی نفی تھی، بلکہ نشاۃ ثانیہ جیسے روشن خیال دور کی اسلام دشمنی کے خلاف بھی پہلی صدائے بازگشت تھی یہ رویہ مستشرقین کے لیے نا قابل قبول تھا، چنانچہ اس کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت پڑی، تا کہ یہ خیالات یورپ میں جڑ نہ پکڑ سکیں، اور یہی ہوا۔ جارج سیل (George Sele) اور راڈول (J.M.Rodwell) کے معاندانہ جذبہ میں شدت پیدا ہوئی، سیل نے بڑی چستی کے ساتھ

آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False Religion) قرار دے دیا، جین گگیز (Jean Gagasier) نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کتاب ۱۷۳۳ء میں اور دوسری ۱۷۴۸ء میں منظر عام پر آئی، ان دونوں کتب کا مقصد بولین کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین کی تالیف کے مقابلے میں ایک میں نئی تالیف محمد (Idle De Mohamet) پیش کی جو ایمسٹرڈیم سے ۱۷۴۷ء میں نمودار ہوئی کتاب کے مقدمہ میں بدبخت مؤلف نے آنحضرت ﷺ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن، بلکہ خدا کا بھی دشمن قرار دیا۔

سیوری (Savery) نامی مؤلف کا ذکر کافی ہے، موصوف نے ۱۷۵۶ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ کیا، اور اس میں حضرت محمد ﷺ کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرت ﷺ کے لیے نرم الفاظ استعمال کیے، اور آپ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا۔

ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کا نام محتاج تعارف نہیں، زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر موصوف نے آفاقی شہرت حاصل کی اور انگریزی تاریخ نویسی کے معمار بن گئے۔ ۱۷۸۰ء میں کتاب مذکور کے پچاس ویں باب میں اسلام اور محمد ﷺ کے بارے میں نہایت دل سوز رائے کا اظہار کیا، رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب (Imposteure) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرت ﷺ آخری ایام میں شہوت اور لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی (Lust and Ambition) سے مغلوب ہو گئے، محمد ﷺ ظلم، دھوکے اور ناانصافی کا مجسمہ تھے۔

والیٹر فرانسیسی نے (۱۶۹۳ء-۱۷۷۸ء) اپنے ڈرامہ (Play) دین محمد (Le Fanall Sou Ou Mahamet Laprophéis) میں جو ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا، اس نے یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمد ﷺ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا، یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب (Imposture) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب (False Barbarous Religion) سے موسوم کیا، اس نے اپنے ڈرامہ کو پوپ (Pope Benedict xtr) کے نام سے منسوب کر دیا، اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اُگلا، مسلمانوں کو درندہ، جنگلی اور وحشی (Barbarous

(Seci) کا خطاب عطا کیا، اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والیٹر نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا، مجموعۂ مقالات (Essai sur les Moeurs at L. desnation) میں اس نے آنحضرت ﷺ کو برطانوی سیاستداں کرام ویل (Cramwall) کی عیاری سے تشبیہ دی ہے، والیٹر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پوری دعوت میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی، اس کے سوا کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ڈیڈراٹ (Diderat) جس نے آنحضرت ﷺ کی گھناؤنی سیرت پیش کی اور آپ کو عقلیت (Reaon) کا دشمن اور عورتوں کا دلدادہ ثابت کیا، فرانسیسی مستشرق رینان (Rennan) (۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۲ء) نے بھی اسلام کو عقل کا لاعلاج دشمن (Incurable Enemy of Reason) قرار دیا۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۰ء تک تقریباً نصف صدی میں متعدد کتب اسلام اور محمد ﷺ پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر ڈیوڈ پرائس کی تالیف Ghranological Retrospect of Mohammedan) تھی، جو ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۱ء تک شائع ہوئی۔ دوسری اہم قابل ذکر تالیف ایڈورڈ افام (Edward Upham) کی ہے، موصوف نے ترکی کی تاریخ (History of Ottoman Empire) لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی، مؤلف نے آنحضرت ﷺ کو حسب معمول نبی کاذب کے لقب سے یاد کیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر، اور انیسویں صدی کے نصف اوّل پر گہرے اثرات چھوڑے، شاعر نے بظاہر دراسات اسلامیہ اور شرق اوسط سے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، مگر درحقیقت اسلام کے خلاف اپنے پیش رو قائدین کے نقش قدم سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا بلکہ آگے نکل گیا، ۱۷۷۳ء میں اس نے آنحضرت ﷺ پر ایک نظم ترانہ محمد (Mohamet is Gesong) لکھی، آنحضرت ﷺ کو ایک چشمہ سے تعبیر کیا، اور وحدۃ الوجود کا مدرس بتاتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کیے۔ گوئٹے نے ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۴ء تک اپنی نامکمل نظم لکھی، شاعر نے ثابت کیا کہ محمد ﷺ ابتداء میں مخلص تھے، بعد میں وہ مادیت اور بوالہوسی کے شکار ہو گئے اور ان کا روحانی حصہ ضائع ہو گیا۔ یہ وہی کلاسیکی مضمون ہے جو آج تک مستشرقین کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز ہے، شاعر نے یہ بھی "ثابت کیا" کہ محمد ﷺ کی شخصیت مبہم اور غیر واضح تھی۔

مستشرقین کی ان متعفن تحریروں کے برعکس کارلائل نے کچھ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے آپ کی ذات پر اچھالے گئے چھینٹوں کے داغ دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ رقم طراز ہے کہ اسلام اور محمد ﷺ کے خلاف افتراء اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے وہ ہم عیسائیوں کے لیے باعث شرم ہے، یہ باتیں کہ محمد ﷺ کاذب تھے، یا مذہب اسلام مجموعۂ خرافات ہے، اس روشن دور میں قابل قبول نہیں، محمد ﷺ کی تعلیم ۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے، بارہ صدیوں سے انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں، کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ کیا یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں؟۔ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نے آپ کو تاریخ کی عظیم شخصیت ،ایک بڑا ہیرو اور قائد (Great Human Person) کی حیثیت سے اُبھارنے کی سعی کی، مگر پھر کارلائل کے دیگر کلمات کو پڑھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے، جب وہ آنحضرت ﷺ کو جنگلی اور بادہ نشین (Son of The Wildreness) غیر مہذب، حیوانی اور وحشیانہ آغوش فطرت کا پروردہ (Uncultured Semi-Barbarous Son of Nature) قرار دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک آنحضرت ﷺ کی سوانح کے عربی مصادر مثلاً ابن ہشام کی سیرت نبوی، واقدی اور ابن سعد اور طبری کی تالیفات یورپ میں عام طور پر رائج نہیں ہوئی تھیں، یہ سب مسودات اور مخطوطات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے، لیکن رینی کے نے جب تاریخی تنقید کی تحریک چلائی اور مصادر کی سراغ رسانی کا زور ہوا تو تاریخ فہمی میں نیا انقلاب برپا ہوا۔

گستاو ویل (Gustaw Weil) نے آنحضرت ﷺ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب (Mohummad der prophet sein Leber und seine Lehre) لکھی، مؤلف کے پاس ابن ہشام کا قدیم نسخہ موجود تھا، اس کے مطالعہ اور تحلیل و تجزیے میں اس نے تاریخی تنقید کے نئے اصول اور قواعد وضوابط اختیار کیے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ اختیار کیا، مگر قدیم مکتب فکر سے آزاد نہ ہو سکا، اس کا مؤقف قدیم اور فرسودہ خیالات کے مدار سے ہٹ نہیں سکا۔

فرانسیسی مستشرق گاسن دی پرسی ول (Goussiede Perceval) نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ

عرب (Essat surli Histoine Arabes) لکھی اور اپنے رویہ میں نرمی کا مظاہرہ کیا۔

فرانسیسی مستشرق نے بڑی ہمت سے کام لے کر لکھا کہ حضرت محمد ﷺ کو محض کاذب کہنا ناانصافی ہے، وہ اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو جہالت سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

۱۸۳۳ء میں ابراہام گیگر (Abraham Geiger) نے ایک مقالہ زیرعنوان: محمد ﷺ کے یہودی مصادر و مآخذ (What did Muhammad Take From Judaism) پیش کیا اور بہت سے نئے نظریات کی داغ بیل ڈال دی، اب ایک نئی تحریک چل پڑی کہ یہودیت و نصرانیت اور اسلام کے درمیان قریبی ربط وضبط ثابت کیا جائے، تاکہ محمد ﷺ کے یہودی وعیسائی مآخذ کو حتی الامکان ثابت کر دیا جائے، یہاں پر اس کتاب کا ذکر کر دینا قاری کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ۱۹۶۷ء میں نیویارک سے زیرعنوان ''اسلام کی یہودی بنیاد'' (The Jewish Foundation of Islam) شائع ہوئی، اور اس کے مؤلف ییل یونیورسٹی (Yale University) میں سامی زبانوں کے پروفیسر چارلس کٹلر ٹوری (Charles Gutler Torroy) ہیں۔ اس کتاب پر مقدمہ معروف مستشرق روزن تھال (Frang Rosenthal) کا ہے جس نے ابن خلدون کا ترجمہ کیا ہے، اور اسلامی تاریخ نویسی پر مبسوط کتاب بھی لکھی ہے۔ اسلام کی اصلیت مستشرقین کا محبوب موضوع بن گیا ہے اور تین معروف مستشرقین ولیم میور، اسپرنگر اور نالدیکے، اس تحریک کے سرخیل بن گئے۔ اسپرنگر نے آنحضرت ﷺ کے مطالعہ کا ایک نیا اسکول قائم کیا جسے بائیلوجی یا علم الامراض یا اسباب امراض کا اسکول کہا جاتا ہے۔ درج ذیل کتب خاص اس نقطہ نظر سے معرض تحریر میں لائی گئیں۔

۱۔ حیات محمد ﷺ اصل مصادر کی روشنی میں الہ آباد ۱۸۴۸ء

① Life of Muhammad from Original Sources, Allahabad, 1848.

۲۔ حیات اور تعلیم محمد ﷺ (۳ جلدیں، مطبوعہ برلن از ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء۔)

②Des Leban and Lehre Des Muhammas (Berlin 1861-1865,3 Vols)

۳۔ محمد ﷺ اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ (ہیمبرگ ۱۸۸۹ء)۔

③Mohammad Under Karan: Eine Psychologischo Studies(Hamburg 1889).

ان تالیفات نے جنھیں اسلام کی اصلیت کے اثبات پر پوری قوت صرف کی گئی تھی، نقد ونظر کا ایک نیا طوفان برپا کر دیا، اسپرنگر چونکہ خود ڈاکٹر تھا، اس لیے اس نے چودہ سو سالوں کے بعد بھی اسلام اور محمد ﷺ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا، طبی معائنہ کی رپورٹ میں اس نے ثابت کیا کہ آنحضرت ﷺ اعصابی مریض یا مصروع (Epileptic) تھے۔

طبی معائنہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کا نروس سسٹم چونکہ خراب تھا (نعوذ باللہ) اس لیے ہذیان اور بدحواسی کے دورہ میں انھوں نے قرآن کی تصنیف گڑھ لی، نیز اسلام نامی مذہب کو گھڑ لیا، اب اسلام ہذیان الاصل قرار پایا، محمد ﷺ پر چونکہ ہذیان یا امتلاس اور اعصابی اضطراب جو محض ہنسنے اور رونے کا سبب بنتا ہے (Hysteric Freazy) کے دورے پڑتے تھے۔ اس لیے اسلام وجود میں آ گیا۔

نالدیکے نے تاریخ قرآن (Geseni Chtedes Quran is) لکھی جو برلن سے ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی، آج تک یعنی سو سالوں سے مستشرقین کی رہنمائی کے لیے یہ تاریخ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے پیش رو کے طبی معائنہ کی مخالفت کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ محمد ﷺ ہذیان کے مریض نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی اور جذباتی دورے (Fits of Emotion) کے مریض تھے، اسی دورے کے زیر اثر ان کو اس بات کا یقین آ گیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، اسی میں انھوں نے قرآن کی تالیف کر ڈالی، ساتھ ہی اسلام نامی مذہب کی داغ بیل ڈال دی، یہ تمام تالیفات اور ان کے مرکزی خیالات اور عمومی مضامین ازمنۂ وسطیٰ یا لاطینی خرافات سے کسی طرح مختلف نہیں تھے۔

انیسویں صدی سے آنحضرت ﷺ کی سیرت وسوانح کے مصادر پر نقد اور جرح وتعدیل کا سلسلہ شروع ہوا، اب نقد کا سارا زور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرۃ النبی کی تحلیل وتفرید پر تھا، قرآن کو غیر مرتب اور مبہم توہمات کا مجموعہ قرار دیا گیا، غیر مہذب اور غیر متوازن ہونے کی وجہ سے غیر ثقہ بھی سمجھا گیا، یعنی قرآن، اسلام اور محمد ﷺ کی تحریکات کی واضح صورت پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن پر سنگین حملوں کے بعد نزلہ، احادیث نبویہ پر گرایا گیا، چونکہ احادیث قرآن کے بعد مصدر ثانی کی حیثیت رکھتی تھیں، لہٰذا ان کو منہدم کرنا مستشرقین کا اوّلین فریضہ تھا، اب احادیث کے کذب وافتراء کے افسانے گھڑے گئے،

یوں تو نالدیکے نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل تھا، لیکن انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل گولڈز یہر (Ignaz Goldziher) نے ڈالی اور اپنی تالیف دراسات محمدیہ (Mohammadeiseh Studien) میں اپنے نظریہ کی اساس ڈالی، اس نے اس سوال کے ذریعے کہ کیا سیرت نگاری کے لیے احادیث پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ سب سے عظیم فتنہ کھڑا کیا۔

ہیوبرٹ گریمی (Hubert Grimme) نامی جرمن مستشرق نے جو عربی کا سکالر تھا، اسلام اور آنحضرت ﷺ پر دو کتابیں لکھیں جو ۱۸۵۲ء تا ۱۸۹۵ء طبع ہوئیں اس نے اپنی کتب میں پہلی بار واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے عرب کا جہاں اسلام ظاہر ہوا، سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ اسلام اور محمد ﷺ کو کما حقہ سمجھنے کے لیے لازمی ہے۔ اشتراکی تحریک کے ظہور سے پہلے ہی اس نے اس مکتب فکر کی بنیاد ڈال دی اور اعلان کر دیا کہ اسلام کا ظہور عروج محض ایک سماجی مظہر (Socialistic Phenomena) کا اظہار تھا جس پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

معاشی، سماجی تحریک میں مارگولیتھ (۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء) نے سیاسی مصالحہ لگا کر ایک نیا مثلث سیاسی اچار کا اضافہ بھی کر دیا، یعنی محمد ﷺ کی دینی و مذہبی شخصیت کو ختم کر کے اس نے آپ کو محض ایک سیاسی مبصر اور قائد کی حیثیت دے دی۔

اٹلی کا معروف مستشرق سیلون کیتانی (۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۴ء)(Princeleone Caetani) بھی اسی مکتب فکر سے منسلک تھا، اس نے بھی آنحضرت ﷺ کی دینی شخصیت کو ختم کرنے کی سعی کی، اور عربیہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کے مطالعہ پر زور دیا جس کا مظہر اسلام تھا، اس نے اپنی تالیف اسلام میں ۶۳۳ء کے بعد کے واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بحث کی ہے۔ اپنی تالیف دراسات شرقیہ (Studi Disorig Orientale) کی تیسری جلد میں اس نے آنحضرت کو محض ایک سیاسی قائد (Statesman) کی حیثیت دی ہے، اور ظہور اسلام کو عرب کے سیاسی، معاشی اور سماجی اضطراب کا مظہر ثابت کیا ہے۔

فرانز بہل (Dane Frantz Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) دونوں نے مذہب اور علم النفس یا مذہبی نفسیات (Religious Psychology) کی تازہ ترین معلومات

کو اسلام اور محمد ﷺ کے مطالعہ پر منطبق کر دیا۔

بھل اس نتیجے پر پہنچا کہ غیر معمولی اعصابی (Abnormal Nervous System) سسٹم کی وجہ سے محمد ﷺ اپنے آپ کو دھوکا دینے یا مغالطہ میں پڑ جانے کے عادی ہو گئے تھے، اسی دھوکہ کا نتیجہ تھا کہ محمد ﷺ نے یقین کر لیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمد ﷺ ایک نہایت مشکوک اور مبہم (Ambiguous) کردار کے فرد تھے، جس کا سمجھنا مشکل ہے، وہ (Eptileptic) نہیں بلکہ (Hysterical) تھے، وہ حقیقی مفکر تو ہرگز نہیں تھے (نعوذ باللہ)۔

دوسرا عظیم نامی گرامی مستشرق بلاشیر ہے، اس نے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا، یعنی آنحضرت ﷺ کی سوانح پر بحث کرنے کے بجائے، مصادر سیرت پر بحث شروع کی اور اعلان کر دیا کہ ان مصادر کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک جدید تنقید کے تکنیکی اصول ان پر منطبق نہ کر لیے جائیں، یہ سازش واضح طور پر اس بات کی دعوت تھی کہ مصادر اسلامیہ جدید تنقیدی اصولوں پر نہ پورا اتریں گے، نہ ان کی ثقاہت ثابت ہو سکے گی! یہ وہی پرانی شراب ہے جو نئے جام میں ڈھالی گئی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ہملٹن گب کو سمجھا جاتا ہے۔ موصوف کی کتاب محمد نزم (۱۹۶۲ء) خود بد مذاقی کا عظیم ثبوت ہے، اگرچہ اب اس کا نام اسلام رکھ دیا گیا ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ جدید معقول دینیات (Rational Theologe) اب محمد ﷺ کے ہیجانی دین (Emotional Cult) پر غالب آ گئی ہے یعنی جدت قدامت پر اور بغاوت روایت پر غالب آ گئی ہے۔

معروف مستشرق منٹگمری واٹ کی رواداری اور انصاف پسندی کا کافی چرچا ہے، اس کی تین معروف تالیفات مغرب اور مشرق دونوں جگہ مقبول ہیں، ''محمد در مکہ'' ۱۹۵۳ء، ''محمد در مدینہ'' ۱۹۵۶ء اور ''محمد نبی اور مدبر'' ۱۹۶۱ء۔ پروفیسر واٹ نے ان کتب میں آنحضرت ﷺ اور اسلام کے منظر و پس منظر کا تحلیلی مطالعہ کیا ہے، جس کے ذریعے وہ اسلام کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں (۳۶)۔

چودہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ مستشرقین کی حکمت عملی ہمیشہ اسلام کے خلاف اور تفسیر لـــن تـرضـیٰ عنـك کی آئینہ دار ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے اب تک مستشرقین کا مؤقف ہمیشہ اسلام

کے مخالف ہی رہا ہے۔

مستشرقین کی کتب سیرت کی فہرست:

قارئین کی معلومات اور استفادہ کے لیے ذیل میں مستشرقین کی کتب سیرت کی ایک فہرست دی جارہی ہے جو ڈاکٹر نثار احمد نے بڑی محنت سے مرتب کی تھی۔

1	Mohammad and Mohammadanism. Chicago,1900	Adams, Isaac	آدم
2	The life and death of Muhammad, the author of the Turkish Religion (London.1779)	Addison, Lancelat	ایڈیسن
3	Mohammed. (Philladelphia 1901)	Addler, Felix.M.	ایڈلر
4	Mohammadals Religions stifter (Leipzig. 1935)	Ahren, Karl.	اہرن
5	The Land of the Messiah,Mohomet, and the Pope (London. 1854)	Aiton, John	ایٹن
6	The Preaching of Islam (London. 1896).	Arnold. T.W.	آرنلڈ
7	Islam, its history, character and relation to christianity (London1874)	Arnold, J.M.	آرنلڈ
8	Life of Mahomet (New York 1811)	Irving. washington	ارونگ
9	History of the Saracens (London 1847)	Ockley, Simon	اوکلے

10	Confutacion del Alovany Secta Mahammetana (Gronada 1555)	Oksegon, L.Le	اوکسی گان
11	Mohammad de Profet der Arabieren (Amesterdam 1898)	Eigeman, Jakob	اتیج مین
12	Deseffects de tareligion de Mohammed	Oelsner, C.E.	اوسنر
13	Islam under the Arabs (London. 1876)	Osbon, R.D.	اوسبم
14	Vizlat Muhammad Kuranjanak Ethik ajabiz. Budapest. 1902.	Osztern. S	اوزرن
15	An Account of the rise and progress of Mahometanism (London 1911).	Stubbe. h	اسٹیب
16	History of the Ottomon Empire. Preceded by the life of Mohammad (Hurst. 1826.35)	Upham, Edward	افام
17	i۔ تاریخ العرب وآداھم (لندن ۱۸۹۰ء) ii۔ ترجمہ روضة الصفا فی حیاۃ محمد المصطفی (لندن ۱۸۹۳ء) بمعاونۃ ریہاستسک	Arbuthnot, F.F.	اربثوٹ

18	Life of Mohammad (Allahabad. 1851) (Das Lebas and die Lehredes Mohammad. 1851 -1861).	Sprenger, A.	اسپرینگر
19	Muhammad and Muhammadenism London. 1874 (Reprint-Lahore)	Smith, Bosworth.	اسمتھ باسورتھ
20	Mahmomet at les Arabs (Rome. 1878)	Bachelat, Theodore	بخیلات
21	Mohammad and Islam. A comparison with orthodox christianity (New York 1911)	Bacon. A.S.	بیکن
22	Mohammad und de Seinen (Leipzig 1907)	Beckendarf. H.C	بیکن ڈارف
23	Talks on Mohammed and his followers (London 1932)	Barton, Theodore.	بارٹن
24	The dictionary historical and critical of Mr. Peter Bayle(Ed) (London. 1734-1738)	Bayle, Pierre	بائیل
25	Mohammedis impos turae (London 1615)	Bedwell. W.	بیڈویل

26 Mohammad, His Biography and the beginning of the religion of Islam (Warsaw. 1914) — Bernfeld, Simon — برن فیلڈ

27 The life and teachings of Muhammad (Adyar 1932) — Besant, Annie. — بیسان

28 Le Problems de Mahomet Paris, *1952.* — Blachare, Regis — بلاشیئر

29 Mohammad of Koramen (Hamar) 1904. — Blom. P. — بلام

30 *Muhammad Islam Store Profet.* Kristiannica. 1911). — *Blytt. Eva.* — بلائٹ

31 Life of Mohammad (Bombay 1851). — Bowen, George. — بووین

32 Muhammad skuespiel. the akter. (Ohenhaven 1895). — Brandes. C.E.C — برانڈے

33 The Messenger (the life of Mohammad) (London 1946). — Bodley, R.V.C — بوڈلے

34 i. Historedes Arabes, aved. la vie de Mahomet (Amesterdam 1731) — Boulain Villiers H.C — بولین ویلیرز
ii. Vie de Mahomet. 1730.

35 Veber Muhammed (Frankfurt 1791) — Brequigny. H.D — بری گنی

36	Budha, Muhammad, Jesus (London, 1938).	Briem. O.E.	بریم
37	History of the Islamic People (New York. 1947) Eng. Tr.	Brockelmann C.	بروکلمان
38	Islam A short study.	Brooks, Archihald	بروکس
39	The way of the Prophet: An introduction to Islam. (London. 1962).	Brown, D.A	براؤن
40	The Era of Mahomet (London 1856)	Brown, G.L.	براؤن
41	The Begger or the soldier Gautame or Mahomet. (London 1903).	Buckle, Henry.	بکل
42	Des Leban Muhammeds (Leipzig 1930)	Buhl, F.P.W	بوہل
43	Founders of Great Religions: Being perosnal sketches of the famous leaders. (New York 1931)	Burrows, Miller	براؤز
44	The life of Mohammed: Founder of the Religion of Islam and theEmpire of the saracens (New York 1830).	Bush, George	بُش
45	قصیدۃ البردہ۔ بوصیری مع سیرت مصنف، نقد وشرح ۱۸۹۴ء	Basset, Rene	باسے

46	Pilgrimage to Mecca and Medina (1856).	Burton	برٹن
47	Mohammed under Koran (Stuttgart. 1951).	Ponet, Rudi	پونی
48	The Hcly Sworel the story of Islam from Muhan to the present. (London 1961).	Payne, P.S.R.	پائنی
49	Contra Lospartalista. Mahometanos (Rome. 1905-06)	Pedio, San Paswal.	پیڈیو
50	Uber die Bluctrache beiden Voreslamisschen Arabern und Mahomeds. (Leipzig 1899)	Prucksch, otto.	پروخش
51	History of Mohametanism and its sects. (London 1834).	Taylor W.C.	ٹیلر
52	Sances of the Qeien, (London 1905)	Tinsdall, W. st. C.	ٹنسڈال
53	Muhammad the Great Arabian (Houston 1912)	Townsend. Med. W.	ٹاؤن سینڈ
54	A study of History (London. 1954-61)	Toynbee A.J.	ٹائن بی
55	Muhammad (Leipzig 1907)	Trampe. E.Von	ٹرمپے

56	Studies in Biography (London 1865).	Trotter, H.J.	ٹروٹر
57	Historie de la vie de Mahomet, Legislative de L Arabic (Paris 1776-79)	Turpin, F.R.	ٹرپن
58	Muhammed and the conquests of Islam (New York 1968).	Gabrieli, Francesco.	جبرئیلی
59	Vie de Mahomet (Amesterdam 1748)	Gagnier, J.	جیگنیئر
60	Mohammed (Paris 1838).	Genevay A.	جینوے
61	Mohammadein characrbild.(Berlin. 1878)	Georgens, E.P.	جیورگن
62	Islam Mohammed and his religion (New York 1958)	Jaffery, Arthur	جیفرے
63	Muhammad and his power(New York 1901)	Johnston, P.Lacy de	جانسٹن
64	سیرۃ ابن ہشام مع متن و ترجمہ لاطینی، لیڈن ۱۸۸۱ء بمعاونت ڈی خویہ	Jong. P.de	جونگ
65	La vie de Mahmet, (Paris 1962).	Cheorghue. c.v.	چیورغیو
66	Mahomet les Khalifes (Paris 1912)	Chagavat, Michel.S	چگاوٹ

67	La vie de Mahomet, (Paris 1929).	Dermenghem. E.	درمنگھم
68	Maometton. (سیرۃالرسول(فلورنس ۱۹۲۹ء 1931.	Ducati, Bruno	دوکات
69	Maishaya Muhammad (London 1909)	Dale Codetrey.	ڈالے
70	Mohammad (New York 1926) Dibble, R.F	Dibble. R.F.	ڈبلے
71	Apology for Mohammad and the Quran. London. 1869). Reprint, Lahore. 1975).	Davenport. John.	ڈیون پورٹ
72	The Alcoran of Mahomet (London 1649)	Duryer, Andre	ڈورر
73	Mahomet, Founder of Islam (London 1915).	Draycott. G.M	ڈریکاٹ
74	Mahomet dauson lemps (Geneva 1908).	Ducasse Raymond	ڈوکاسے
75	Vie de Mohammed (Paris 1837)	Desvergers. N.	ڈیورجرس
76	Spanish Islam(1863). Het. Islaminne (Kruseman. 1863).	Dozy. R.P.A	ڈوزی
77	The life and death of Mahomet (London 1637).	Raleigh, Sir. W.	ریلے

78	Vita di Maometto (Milano 1922).	Ram Polde	رام پوڈی
79	Mohammad unddieseninen (Leipzig. 1907)	Reckender, H.	ریکینڈر
80	Reflections on Mohammedenism and the conduct of Mohammed (London 1712)	Reeland. A.	ریلینڈ
81	Mohammad und die welt des Islam (Leipzig. 1755).	Rehm. H.S	ریم
82	Notice Sur Mahomet (Paris. 1860).	Reinaud. J.J.	رینو
83	De religione Mohammedica Libra due (utruht 1704).	Reland. H.	ریلان
84	Mahomet et ler origines de L Islamism (Paris 1880).	Renan, Ernest.	رینان
85	L. Islam et son prophet. Lausanne 1870).	Rink, F. Th.	رنک
86	Hayyey Muhammad (Mizz. 1932).	Rivlin, Josef. J.	ریولین
87	i. L Islam: Mahomet et les origins de L' Islam.. Paris 1957. ii. Mahomet. (Paris. 1961).	Rodinson. M.	روڈنسن
88	Life of Mahomet(London 1833).	Robuck J.A	روبک
89	Mohammed (Newyork 1907).	Romro, Jacob	رومرو

90	Voici le vraj Mohammed et la faux Coran. Paris 1960.	Zakarias, Henna.	زکریا
91	Le Gedenze religose de Maometto. Rome 1922.	Sacco G.	سیکو
92	The Koran or Al-Coran of Mohammad (London 1734).	Sale, George.	سیل
93	Morale de mahomet (Paris. 1784).	Sawary Claude E.	سوارے
94	The life of Mohammad (London. 1913).	Sell, Edward.	سیل
95	Quosuccessu Davidiros. Hymanas Unitatussit Muhammad (Upsaluse. 1886).	Svan Borg A.	سوان
96	A History of Medieval Islam (London. 1965).	Saunders, J.J.	سونڈرز
97	Muhammadtestics veritatis contraseipsum (Leipzig. 1718).	Schroeder. M.G	شروڈر
98	Mohammad: The Man and his faith (Tr.) London 1956.	Tor. Andrae	طور اینڈرے
99	Mahomet: La Science chezes Arabs. Paris 1866).	Favrot. Alexis	فیورٹ

100	Mahometanism unveiled (London 1829).	Forster Charles	فارسٹر
101	Mohammad a Pegebbi Zsidosag Megitelescben. Budapest. 1934).	Fried, Dezro	فرائڈ
102	(i) Annali dell s islam (hepoli 1905-26) (ii)Maometto profeta D'Arabia(itlina,191)	Forebing. J.C	فوربنگ
103	(i)Annali de s islam (hepoli 1905-26) (ii)maometto profeta d'Arabia(italina 1910)	caetani,leone	کیتانی
104	The hero as prophet Mahomet.(Newyork1902)	Carlyle,Thomas	کارلائل
105	Comte dp.l.islam.impressions et.etudes (paris 1912)	Castries Henridelac	کاسٹری
106	Leban Muhammad,sdes stifters der muhammadnisom religion (Hemburg 1814)	clemens,J,F,G	کلیمن
107	Muhammed's religionaus deen Koran (Atona 1908)	Vludius,H,H.	کلاڈیس
108	Maometto egli Ebrei (Milano1925)	Corinaldi ,guide	کورینالڈی

109 Anacdotes of Hazrat Mohammad(London 1939)	karimi R.W.	کریمی
110 Muhammad,Hans Lefnad beratted (Stockholm. 1908)	Kastman, Carl.	کاسٹ مین
111 Mohammad and Mohammedanism (London 1889).	Koelle S.W.	کوئیل
112 Mohammad der prophet (Hamburg 1851)	Kroppen, P.	کروپن
113 Essai sur L' Historire des Arabes(1847).	Caussin de Perceval A.P	کاسن ڈی پرسیوال
114 Risalah Ed. Tien, (London 1880) The Apology of al-kindi (London 1887). by Muir.	al-Kindi.	الکندی، عبدالمسیح بن اسحٰق
115 Le Doctorine et les Deviors de La Religion Musulmane (Paris. 1826).	Garcin de Tussy.	گارساں دی تاسی
116 Mahomet. (Paris 1957)	Gaudefroy Demombynes	گاڈفرے ڈی ممبائن
117 Mohammedanism an Historical survey. London (1953).	Gibb. H.A.R.	گب

118	Life of Mahomet (New York 1879).	Gibbon, Edward.	گبن
119	Mohammed & Islam (Tr) Yale 1917).	Goldziher, Ignaq	گولڈزیہر
120	The Saracens (London. 1887).	Gilman, Arthur	گلمین
121	Mahomet. at son Denure. (Paris 1887)	Gold I. L	گولڈ
122	The life of Mahomet, founder of the religion of Islam and the empire of the Saracens (London 1840).	Green Samuel	گرین
123	Mohamad Des Leban Nachden Quellen (Mimster 1892-95)	Grimme Hubert.	گریم
124	Muhammad (London 1983)	Lings, Martin.	لنگز
125	Vie de Mahomet dapres la tradition. (Paris 1897-98.)	Lamairesse EFD.G	لیمیرلیس
126	i. Mahomet in les grand Bommes de orient (Paris 1889) ii. Histore de la Turquite (Paris 1854).	Lamartine, A.M.	لامارٹن
127	Muhammadanism (woking 1889) Reprint Lahore 1893.	Leitner G.W.	لیٹنر
128	vie de Mahomet (Paris 1939)	Lerougue R.	لیروگ

129	Moise Jesus et Mahomet on les Trios grands (Paris 1887)	Levy, Simon	لیوی
130	The Arabian Prophet, a life of Mohammad from Chinese and Arabic Sources.(Shanghai.1921)	Lew, Che, Fi	لیوچی فی
131	Islam, Her moral and spiritual value (London 1927)	Leonard, Arthur G.	لیونارڈ
132	The speeches and table talks of the Prophet Mohammad (London 1882).	Lane Pool, Stainley	لین پول
133	اخلاص محمدؐ (۱۹۱۱) فاطمہ بنتِ محمدؐ (روم ۱۹۱۲) عہد الاسلام (روم ۱۹۱۴)	Lammens P.H.	لامنس
134	Muhammai mais hayake, Pamoje na haboariza waslium na Maturuki (London 1888). Engt. T London 1896.	Madan A.C.	میڈن
135	i. Allahe ilsue prefeta parma (Estere 1922). ii. Mahomet ne imposter (London 1920).	Magnami L.	مگنامی

136	La vita di Maometto (Milano 1888)	Manfredi vit.	مینفر یدی
137	Mohammad and the rise of Islam . (New York, 1905).	Margolioth. D.S.	مارگولیتھ
138	Mahomometiv ita rerunque gestarm synopsis (Roma 1691).	Maracci, Loius	مراکی
139	Historia del falsay perverso profete Mahoma (Madrid 1781).	Martin M.J.	مارٹن
140	The life and the religion of Mohamad and the prophet of Arabia (London 1912).	Menezes, J.L.	مینازیس
141	Maometto eil paradise (Milano 1946).	Messara, Pina.	مسارا
142	A History of Muhammedanism (London 1817)	Mills, Charles	مِل
143	Memories of the life of Mahomet (London 1727).	Millman. H.H	مِل مین
144	Mahoma su vida (Madrid. 1727).	Montero y vidal J	مونٹیرو
145	False divinites. On Moses christ and Mahomet and other religions deceptives (London 1870).	Moses, the Lawgiver	موسس

146	History of religions. Judaism, christianity, Mohammedanism (New York 1929).	Moore G.F.	مور
147	The life of Mahomet from original sources (London. 77)	Muir, Sir William.	میور
148	Spiritual heroes, a study of some of the world's prophets. (New York 1959).	Muzzay, D.S.	موزے
149	Vita di Maometto (Rome 1946).	Nathene, C.A.	ناتھن
150	A literary history of the Arabs (New York. 1907).	Nicholson R.A.	نکلسن
151	Das Heben Muhammed's nach der Quellen popular darquistett. (Hanover 1863).	Noldeke, Theodor	نولدیکے
152	An outline of Islam (London 1934)	Norlth C.E.	نارتھ
153	i. Muhammad at Mecca (1953) ii. Muhammad at Medina (1956) iii. Muhammad Prophet and statesman(London 1961)	Watt. W.M.	واٹ
154	Mohammad de Prophet sein leban and scine lechre (Stuttgart 1843).	Weil, Gustay.	ویل

155	Fra Missionen Blanat Muhammedaners (Denmark 1909)	Wellejus, H.	ویلیجس
156	Half hours with Muhammad: Being a popular Account of the prophet of Arabia and of His More immediate followers together with a short synopsis of the religion he founded (London).	Wollaston Sir. A.N.	والسٹن
157	Muhammad und sein werk (Stuttgart, 1923).	Wueaz, Friechich	ویاز
158	(تاریخ مکہ المکرمہ، سیرۃ ابن ہشام مع تعلیقات، اراضی مدینہ منورہ تاریخ اشراف مکہ وغیرہ)	Wusten feld. F.	وسٹنفیلڈ
159	L' Histore Mahometane (Paris 1657)	Vattier. Pierre.	ویٹیئر
160	i. Mohammad Messenger d' Allah (Philip 1657). ii. Mohammad (A Bengali Account of the life of Muhammad) Calcutta 1892.	Vieillard, Rene	ویلارڈ
161	Religio Turcica, Mahometisvita Succorum) 1659.	Wallich J.U.	والش

162	Das Bilal Muhammeds in wandel der Zeiten (Berlin 1916).	Hoas Hans	ہوس
163	Mohammad elete estana (Budapest 1878).	Hatala, Peter	ہٹیالا
164	The three great prophets of the world(woking) 1923.	Headley Rowland G.	ہیڈلے
165	An apology for the life and character of celebrated prophet of Arabia called Mohammad or the illustrious (London 1829).	Higgins, Godfray.	ہگنز
166	History of Mahomet the Great imposter. (Falkirk. 1821).	Hillard, Frederick H	ہلارڈ
167	Mohammed (Bataria 1939).	Hoevell, W.R.B.V.	ہوویل
168	Moises, Jesus, Mahomet (L. Valencia 1903).	Holbach, Paul H.	ہولباش
169	Mohamet Prophete des Arabs(Paris. 1946).	Holma Harri	ہولما
170	The story of Mohammad (London 1914).	Holland, Edith	ہالینڈ
171	Muhammad in selected works (ed) Leiden. 1957).	Hurgronje, C.S.	ہرگرونج

مستشرقین کا منہجِ سیرت نگاری:

مستشرقینِ یورپ نے سیرت نگاری پر جتنا بھی کام کیا اس تمام کو ہم مندرجہ ذیل چھ نکات میں بیان کریں گے۔

پہلا نکتہ: ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال:

مستشرقین نے سیرت نگاری میں ضعیف اور موضوع روایات کو بنیاد بنایا اور انھی روایات پر اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ نیز اپنے نظریے کی تعریف کے لیے شاذ و غریب احادیث کو پیش کرتے ہیں۔ نیز اپنے اس نظریے کو مزید تقویت دینے کے لیے مشہور و مستند روایت پر تنقید کرتے ہیں خواہ وہ نقد و جرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی ثابت کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ شکوک و شبہات پیدا ہوں (۳۸)۔

دوسرا نکتہ: یہودیت اور عیسائیت سے اخذ کرنے کا الزام:

مستشرقین کوشش کرتے ہیں کہ سیرت نبوی سے متعلق واقعات کو وہ عیسائیوں یا یہودی اصولوں سے اخذ کرنے کا الزام ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مستشرقین کی بڑی تعداد مسیحی ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے اصل محاسن کا سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں اور جو مستشرقین یہودی ہیں وہ خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کو یہودیت سے ماخوذ ثابت کیا جائے۔ مثلاً برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ کہتے ہیں: ''اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد ﷺ کی غارِ حرا میں آمد و رفت کوئی ناممکن بات نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ موسمِ گرما میں شہرِ مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جا سکتے تھے وہ غارِ حرا میں جاتے رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہب ہونے کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ خود محمد ﷺ کے ذاتی تجربے نے ان میں بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی کی آرزو، امنگ اور رغبت پیدا کی ہو اور یہی مستشرق دوسری جگہ پر اس طرح رقم طراز ہے:

''ناموس کا لفظ یونانی لفظ موس (Momos) سے مشترک ہے جس کے معنی کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰ کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے اور ورقہ بن نوفل نے جب حضرت محمد ﷺ پر وحی کی کیفیت

دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہہ ومماثل ہے مگر محمد ﷺ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں اور جیسا کہ ابتدا میں ہوتا ہے حضرت محمد ﷺ شروع میں طبعی طور سے متردد تھے اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی حضرت محمد ﷺ کی داخلی کیفیات کے لیے اہم چیز ثابت ہوئی اس لیے بعد کی اسلامی تعلیمات میں وہ ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں (۳۹)۔

تیسرا نکتہ: غلط فکر سے معکوس نتائج کا استنباط:

مستشرقین کا سیرت نگاری کے حوالے سے مطالعہ معکوس طریقہ پر مبنی ہے۔نتائج کا استنباط وہ اپنی عقل سے کرتے ہیں۔سیرت نبویؐ کی تدوین سے پہلے اس کے متعلق کچھ خیالات قائم کر لیتے ہیں پھر جب سیرت سازی شروع کرتے ہیں تو رطب ویابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کرتے ہیں نیز ان روایتوں پر خاص طور پر اعتماد کرتے ہیں جن سے اُن کے مؤقف کی تائید ہوتی ہو وہ ضعیف یا شاذ کی پروا نہیں کرتے بلکہ انھی ضعیف اور شاذ احادیث کو اپنے استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے اور آج تاریخِ اسلام کے نئے ماہرین انھی کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدّ نظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں اور باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں۔

نومسلم مستشرق ''ایتین ڈینیہ'' نے اپنی کتاب ''الشرق کما یراہ الغرب'' (مشرق مغرب کی نظر میں) میں اس طرز ونہج کے متعلق بعض باتیں خوب لکھی ہیں۔ڈاکٹر اسنوک ہرگونج کی یہ رائے درست ہے کہ حضرت ''محمد ﷺ'' کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں''۔اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا۔

منٹگمری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کیے ہیں۔جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا مطالعہ

ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی آراء کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ مطالعہ وتجزیہ کے نام پر ایک بدنما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق دلائل کو اکثر وبیشتر غلط رُخ دیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت وموضوعیت کی پروا کیے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات وافکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں (۴۰)۔

چوتھا نکتہ: اسرائیلی روایات سے استدلال:

مستشرقین اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں بالخصوص یہودیوں کے لیے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اسرائیل ولفن سون بنونضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملہ کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مؤرخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی سازش کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ مستشرقین اس سے اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی دلیل وہ یہ لیتے ہیں کہ سورۂ حشر میں جو بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت نازل ہوئی تھی کہیں اس سازش کا ذکر نہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر چشم بینا رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسے حالات میں یہود اب یہ سازش کر سکتے تھے اور اگر ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی تو وہ بجائے اس کے کہ آپ ﷺ پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے، آپ ﷺ کو اچانک ہاتھ میں پا کر قتل کر دیتے۔ بروکلمان لکھتے ہیں کہ مشرکین پر رسول اللہ ﷺ کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں۔ قدیم عربی شرافت فکر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی۔ مدینہ والے اپنے طاقت ور پڑوسیوں سے صلح وامن کی فضا کو غبار آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو آنجناب علیہ السلام نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ روانہ کیا جس نے ایک تجارتی قافلے پر حملہ کیا اور کافی مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا۔ اس قدیم ضابطۂ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیے تھے (۴۱)۔

پانچواں نکتہ: سیرت نگاری میں مستشرقین کا صلیبی اسلوب:

مستشرقین نے سیرت نگاری اور تاریخ نگاری میں بہت زیادہ شکوک وشبہات پیدا کیے اور پھر انھی کی اپنی مرضی سے نفی بھی کی۔ آنحضور ﷺ کی گھریلو زندگی پر بہت زیادہ تنقید کی۔ پیدائش سے لے کر

ازدواجی زندگی تک ہر شعبۂ زندگی پر تنقید کی۔ بہر حال سیرت سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں حالاں کہ تمام انبیاء ورسل میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ درمنگھم اس نکتہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیتھ، اسپرنگر وغیرہ نے بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا اور ان کی کتابوں میں خاص طور سے سیرت نبویؐ کی کردار کشی کی گئی۔ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ فکر برابر صلیبی رہا ہے(۴۲)۔

چھٹا نکتہ: مستشرقین کا معروضی طرز تحقیق:

مستشرقین کی تحریروں کا انداز غیر منطقی وغیر تحقیقی ہے۔ وہ سیرت کے زمانے کو موجودہ زمانے کے معیار کے مطابق جانچتے ہیں۔ ایتین ڈینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات، رجحانات، ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں، اسی وجہ سے سیرت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہ ؓ میں انھوں نے انتہائی درجہ تحریف وترمیم سے کام لے کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی، تعصب سے پاک، حقیقت پر مبنی اور علمی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر مؤلف جرمن مستشرق ہے تو حضرت محمد ﷺ جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اطالوی ہے تو حضرت محمد ﷺ کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مصنف کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی شخصیت بھی بدلتی ہے۔ اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے تو وہ نہایت مدہم نظر آئے گی۔ یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں (۴۳)۔

مستشرقین کی اہم کتب سیرت کا ناقدانہ جائزہ:

ایک مستشرق اپنی مغربیت اور اپنے خارجی تصور کی وجہ سے سیرت کے مزاج اور فطرت میں شکست وریخت کے عمل کو اپناتا ہے اور اس طرح مذہبی جذبات سے تصادم مول لے کر ثابت شدہ حقیقتوں سے متعلق آشفتہ بیانی سے کام لیتا ہے اور ''اپنے ثابت شدہ'' حقائق کی روشنی میں سیرت کے جسد سے اس کی روح اور معنویت کو جدا کرنے کی بے سود کوشش کرتا ہے۔ جیسے گویا یہ بھی کوئی مادی جسم ہے

جس پر تجربات کرنے کے لیے بحث و جدال کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا ضروری ہو۔ ان نقطوں کی روشنی میں کسی بھی مستشرق کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے بارے میں خالص اسلامی طرز عمل یا کوئی سنجیدہ مؤقف اختیار کر سکے۔

سیرت کے موضوع کو سنجیدگی سے سمجھنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے اس کی بنیاد تین مرحلوں پر ہے۔ پہلے مرحلے میں اس غیبی سرچشمے پر ایمان لانا یا کم از کم اس کا احترام کرنا ضروری ہے جس سے پیغام محمدی ﷺ اور حقیقت وحی کا تعلق ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ موضوع کے دائرہ میں رہ کر اپنے مؤقف پر مضبوطی سے قائم رہے ایسا نہ ہو کہ پیشگی فیصلہ یا تصور کی وجہ سے فہم کی راہ میں جو موانع پیش آئیں ان کی روشنی میں اصل موضوع ہی کے اجزاء میں کانٹ چھانٹ ہونے لگے۔

تیسرا مرحلہ خالص اصولی طریق بحث کا ہے جس میں تحقیق کے تمام وسائل کا احاطہ کرلیا جائے تو زبان سے واقفیت اور بنیادی مواد کی فراہمی سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے اور تقابل و موازنہ اور تنقید و تحقیق وغیرہ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

مستشرقین اصول تحقیق کے تیسرے مرحلے میں تو پختگی اور کمال کی چوٹیوں پر نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ سیرت کے موضوع پر صحیح علمی کارنامے سرانجام نہیں دے سکتے، وہ موضوع کو پورے طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ غیبی سرچشمے کے احترام اور موضوع کے دائرہ میں محدود رہنے کے لیے خالص علمی طرز سے ہم آہنگ ہونا ضروری تھا اور ان کے ہاں یہی چیز مفقود ہے۔ پہلے مرحلے میں مستشرقین اور مادہ پرستوں سے ایمان راسخ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا نیز ان کے لیے یہ ممکن نہیں لیکن چونکہ سیرت کے واقعات غیبی پس منظر رکھتے ہیں ایک آسمانی مذہب جو بالاتر قوت سے تعلق رکھتا ہو وہ انسان کے زمینی یا مادی تجربوں کا صحیح عکاس نہیں ہو سکتا اس کی تفہیم کے لیے حقیقی سرچشمہ کا ادراک ضروری ہے۔

مغربی محققوں پر دوسرے مرحلہ میں گرفت کی جا سکتی ہے کہ وہ اصل موضوع سے بار بار ہٹ جاتے ہیں، اگر وہ اس کے پابند ہوتے تو زمان و مکان، مسلک اور نفسیات کی پیچیدگی سے اپنی عقل کو آزاد کر لیتے ان اضافی رجحانات اور اصل موضوع میں کانٹ چھانٹ سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے تو یقیناً ان کی یہ تحقیقات سیرت کی روح اور اس کے مزاج کے زیادہ قریب ہوتیں اور ان میں پختگی بھی زیادہ

پائی جاتی (۴۴)۔

مغربی محققین سیرت کے واقعات اور اس کی فطری ترکیب کو پورے طور پر سمجھنے میں قاصر رہ جاتے ہیں۔ نیز اگر کسی مغربی محقق نے سیرت کے کسی موضوع پر کوئی معرکۃ الآراء کام کیا ہے تو اس میں اس سے تاریخی جزئیات یا عقائد کی تفصیلات پر بحث وگفتگو بے فائدہ اور اس پر تنقید وقتی فائدہ کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کے مقابلہ میں جزئیات کو زیر بحث لانے کی بجائے ان بنیادی امور پر بحث کرنی چاہیے جن سے وہ شک وریب کی دلدل سے نکل سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایک ایسے عادلانہ طریق بحث ونظر کو اختیار کیا جائے جس میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ ایک نبی کی سیرت دوسرے افراد کی سوانح سے واضح طور پر مختلف اور جداگانہ چیز ہے۔ یہ مستشرقین اگر سیکولر اور مادہ پرست ہیں اور ان کا غائب پر ایمان نہیں اور اگر یہودی ہیں تو ان کو اپنی نسل سے باہر کوئی نبی تسلیم نہیں اور اگر عیسائی ہیں تو ان کو اپنے بعد کسی کی نبوت ورسالت کا یقین نہیں ہوتا۔

سیرت طیبہ نے غائب وشہود کی یکجائی کے ساتھ اسلامی عقیدہ کے اثر ونفوذ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ اس نے تحریف شدہ مسیحیت کو جڑ سے ختم کر دیا۔ جس کی وجہ سے سیرت اور مستشرقین کے درمیان فاصلے زیادہ ہو گئے اور وہ فہم سیرت سے محروم ہو گئے، وہ اگرچہ بار بار اپنی غیر جانبداری اور معروضیت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اپنے منطقی تجزیہ اور معلومات کی کثرت کے باوجود ان کی تحقیقات کو صف اوّل میں جگہ نہیں دی جاتی۔ مستشرقین کی تحقیقات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ ان میں تاریخی تحقیق کے ضمن میں سیرت کے مختلف گوشوں پر بحث کی جاتی ہے اور تحقیقی اداروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں ان کا نام معروف ہو جاتا ہے۔ ان میں کچھ تحقیقات ایسی ہیں جن میں فہم وفراست کے لیے جدید وسائل سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے ان میں اگرچہ تاریخ، بحث کا اسلوب معتبر اور پسندیدہ نہ ہو۔ تب بھی مطالعہ سیرت کے وقت ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی اور ان کے منحرفانہ اندازِ ترکیب کو نمایاں کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کا تنقیدی مطالعہ کریں۔

رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اہل مغرب کے مؤقف کا تعین مذہبی اغراض کے لیے ہوا تھا۔ ان کے ہاں تعصب، نفرت اور غصہ کے جذبات کارفرما تھے۔ ناواقفیت نے کہیں دانستہ اور کہیں

نادانستہ طور پر رسول اکرم ﷺ کے اور ان کے درمیان ایسے دبیز پردے ڈال دیئے جن کی وجہ سے خالص علمی، تعلیمی، تاریخی یا معروضی تحقیقات وجود میں نہیں آسکتیں۔ نصرانی کلیسا کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کے مذہبی نمائندوں نے ایک بے پناہ سیلاب کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے بعد یہی کام ان کے سیکولر افراد نے سرانجام دیا اور ان کا کلیسا سے کوئی تعلق نہیں مگر نفرت اور تعصب سے گذشتہ روایت آج تک برقرار رکھی۔ (۴۵)۔

پروفیسر ولیم منٹگمری واٹ کی کتب سیرت:

پروفیسر ولیم منٹگمری واٹ کا شمار مستشرقین کی صف اوّل میں ہوتا ہے۔ اس مستشرق نے مختلف اسلامی موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ جن میں "علم الکلام"، "اسلامک فلاسفی" اور "سیرت طیبہ ﷺ" نمایاں ہیں۔ سیرت کے موضوع پر مؤلف کی تین مشہور کتب درج ذیل ہیں:

1. Muhammad At Mecca
2. Muhammad At Madina
3. Muhammad The prophet and Statesman

اپنی تالیف "Muhammad at Mecca" میں مصنف نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ عیسائیت اور اسلام کے فقہی مسائل پر اعتدال پسندی کا مظاہرہ کرے گا۔ یعنی معروضیت کا پابند رہے گا۔ اپنی کتاب میں وہ اس طرح رقم طراز ہے:

On the theological Questions at issue between chrischanity and Islam anattempt has been made to preserve neutrality. (46)

لیکن یہ بات عملاً درست نہیں کیونکہ وہ سیرت کے ابتدائی مطالعہ ہی کے دوران ناانصافی اور تعصب میں پھنس کر رہ گیا۔

مصنف حضور ﷺ کی حیرت انگیز کامیابیوں کو خدا کا کام تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس کی نظر میں خدا صرف بنو اسرائیل کا ہے۔ باقی نسل انسانی سے اس کا تعلق (نعوذ باللہ) برائے نام ہے۔ اس لیے کہتا ہے

کہ حضور ﷺ کو حالات اتنے سازگار میسر آ گئے تھے کہ آپ ؐ نے جو کہا وہ ساری دنیا کے دل کی آواز بن گیا۔ منٹگمری واٹ نے اپنی اس کتاب میں عربوں کا معاشرہ، ان کی معاشی اور روحانی قدروں پر لکھا۔ اس کے مطابق حضور ﷺ نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ معاشرے کے حقیقی مرض کا سراغ لگایا اور معاشرہ جس قسم کی قدروں کے لیے تشنگی محسوس کر رہا تھا۔ آپ ؐ نے کچھ اپنے تخیل کے زور سے اور کچھ دیگر ادیان سے نقل کر کے چند دیگر قدریں وضع کیں اور پھر انھیں قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ عرب ایسی قدروں کے منتظر تھے۔ انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔ مصنف یہ بات اس طرح لکھتا ہے:

During the years just before he receive the call to profithood Muhammad must have been increasingly aware of the unsatisfactory social condition in Mecca. This was something he could observe for himself and did not require to be shown by the revelation. The fundamental source of the trouble was that the traditional values of nomadic society (which was that at recent ancestors of Meccans) were proving in adicute in the prosperous mercantile economy of Mecca and were fading away. The wealthy merchants who were also the leading men of the clans were neglecting the traditional duty of carrying for the needy and unfortunate among their kinsmen.....Muhammad may well have come to see the route of the troubles as the secular, materialistic outlook of very wealthy and may even have decided that this could only be got rid of by some form of religious belief.

ایک اور جگہ پر محمد ﷺ پر بُت پرستی کا الزام لگاتے ہوئے لکھتا ہے:

"Muhammad's original belief may have been in Allah as High God or supreme deity, combined with lesser local deities whom he may have come to regard as angels who could intercede with the supreme being"(47).

(محمد ﷺ کا ابتدائی عقیدہ غالباً یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بڑا خدا ہے اور اس کے علاوہ کچھ مقامی چھوٹے خدا ہیں جن کو محمد ﷺ نے فرشتوں کا نام دیا جو خدا کے حضور شفاعت کر سکتے تھے)۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر بھی الزام اس طرح لگاتا ہے:

"It is further to be noted that in the early passages of the Quran, there is no assertion that Allah is uniquely God. It is possible that Muhammad himself to some extent shared the belief of many of his contemporaries that Allah was a High God with whom other beings could intercede. It is unlikely that he thought of these beings as lesser deities, but, as just suggested, he may have thought of them as angels"(48).

(مزید برآں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں اس بات پر زور نہیں کہ اللہ تعالیٰ خدائے واحد ہے۔ یہ بات ممکن ہے کہ محمد ﷺ کا اپنے اکثر ہم عصر لوگوں کے مطابق یہ عقیدہ ہو کہ اللہ بڑا خدا ہے جس کے سامنے دوسری کئی چیزیں شفاعت کر سکتی ہیں۔ اس بات کا امکان تو کم ہے کہ آپ ان شفاعت کرنے والوں کو چھوٹے خدا سمجھتے ہیں لیکن جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ آپ اس مخلوق کو فرشتے سمجھتے ہوں گے)۔

قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے کہ تم خدا کے سوا جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو وہ کسی قسم کی

طاقت نہیں رکھتے۔اس سے مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآنِ حکیم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔واٹ اسی کو تفصیل سے اس طرح لکھتا ہے:

In all these passages and in a number of briefer references there is no attempt to deny the existence of being worshipped but they are described as powerless to do any thing for the worshippers and as repudiating them(49).

مصادر و مراجع:

منٹگمری واٹ نے زیادہ تر رچرڈ بیل، بوہل، کائتانی، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، گولڈزیہر، نکلسن، نولدیکے، سیل اینڈ دہری، ٹوری اور ولہازن وغیرہ کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ بخاری کے فرانسیسی ترجمہ سے استفادہ کیا۔قرآن مجید کو رچرڈ بیل کے ترجمہ سے لیا گیا۔ازرقی کی کتاب ''اخبارِ مکہ'' کا سہارا جرمن اسکالر وسٹن فیلڈ سے لیا گیا۔ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول ﷺ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ اور واقدی کی کتاب ''المغازی'' سے بھی استفادہ کیا گیا۔

مصنف نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کیا کہ اپنے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالہ سے اس کو مستند اور قابلِ اعتبار بنانے کی سعی کی ہے۔ترجمہ کے حوالوں سے تحقیقی کام اپنی خوبی کھو دیتا ہے۔پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالے سے تحقیقی تحریر، ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔جب کہ مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور انھی کا سہارا لیا ہے۔ جس سے اس کا تعصّبانہ انداز واضح ہوتا ہے۔عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس وجہ سے کتاب کی ثقاہت بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

Muhammad at Madina پر ایک نظر:

مصنف نے ایک اور کتاب "Muhammad at Madina" میں بھی اپنا وہی طرزِ استدلال اور منہج تحقیق رکھا جو کہ "Muhammad at Mecca" میں رکھا۔ذیل میں ہم اس کتاب سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے منٹگمری واٹ کی مسیحی سوچ واضح ہوتی ہے۔

حج کی رسوم کو مشرکانہ رسوم قرار دینا اور یہ کہنا کہ حضرت محمد ﷺ نے بُت پرستی کا قلع قمع کیا لیکن جو رسمیں شرک سے متعلق تھیں اور عرب ان سے مانوس ہو چکے تھے، ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنا آپ ﷺ نے خلافِ مصلحت سمجھا اور شرک کو اصولی طور پر ختم کرنے کے لیے بعض مشرکانہ رسوم کو مصلحتاً قبول کرلیا۔ واٹ اپنے اس الزام کو اس طرح بیان کرتا ہے:

Despite this extirpation of idolatry, many old ideas and practices were retained(50).

گو اسلام نے بُت پرستی کو ختم کر دیا لیکن اس کے باوجود اس نے بہت سارے مشرکانہ نظریات اور رسوم کو باقی رکھا۔

ایک طرف وہ یہ بھی مانتا ہے:

(Muhammad) established a religious and social frame work for the life of a sixth of the human race today. That is not the work of a traitor or a lecher"(51).

(محمد ﷺ نے ایک روحانی اور سماجی نظام قائم کیا جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے چھٹے حصے کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ کام کسی دھوکے باز یا عیاش شخص کا نہیں ہوسکتا)۔

ایک جگہ یہ اس طرح رقم طراز ہے:

We conclude, then, that virilocal polygyn or the multiple virilocal family, which for long was the distinctive feature of Islamic society in the eyes of Christendom, was an innovation of Muhammad's. There may have been some instances of it before his time, but it was not widespread, and it was particularly foreign to the outlook of the Madinans(52).

(ایک خاوند اور کئی بیویوں پر مشتمل گھرانہ جو مدتوں عیسائیوں کی نظر میں اسلامی معاشرے کی

خصوصی پہچان رہا وہ حضرت محمد ﷺ کے ذہن کی اختراع تھی، ممکن ہے آپؐ سے پہلے اس کی چند مثالیں موجود ہوں لیکن یہ رسم عام نہ تھی اور خصوصاً اہلِ مدینہ کے لیے یہ بات بالکل نئی تھی)۔

اپنی اس کتاب میں تعدد ازدواج کے بارے میں بہت ہی معقول رائے لکھی ہے:

"Ibn Sa'd's biographies, of course, have numerous examples of men who had more than one wife; but this is balanced by the examples of women with more than one husband(53).

(طبقات ابن سعد میں بے شمار مثالیں ایسی ہیں جن میں ایک مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں لیکن چونکہ ایسی عورتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے ایک سے زیادہ خاوند تھے، اس لیے حساب برابر ہو جاتا ہے)۔

مصنف کی دونوں کتابوں میں بہت سے موضوعات پر تکرار بھی ہے اور دونوں کتابوں کا اندازِ تحقیق بھی ایک ہی ہے اور تحقیق کے نقائص بھی دونوں کتابوں میں ایک جیسے پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ''محمد ایٹ مدینہ'' کا تفصیل سے جائزہ لینا بہت زیادہ طوالت کا باعث بنے گا۔

واٹ کی کتاب Muhammad: The Prophet and Statesman پر ایک نظر:

واٹ نے اپنی اس کتاب میں وہی طرزِ تحقیق اختیار کیا ہے جو اس نے اپنی دیگر کتب میں اپنایا ہے۔ اس کتاب میں اس نے آنحضرت ﷺ کے غزوات وسرایا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کی ریاست کی تشکیل کے بارے میں اس میں کافی لکھا ہے۔ غزوات وسرایا کے متعلق واٹ نے بہت ہی متعصبانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اور غزوات وسرایا کو ڈاکے سے تشبیہ دی ہے۔ ایک جگہ پر اس طرح رقم طراز ہے:

"When on looks at all alternatives, however it seems clear that even before he left Mecca Muhammad must have look on raids on Meccan carvans as possibility even a probability. In the raids the Muslim were taking ofensive. Muhammad cannot have

failed to release that even if the raids were only slightly successful, the Meccans were bound to attempt reprisals. In these little raids then he was deliberately challenging and provoking. The Meccans in our peace-conscious age it is difficult to understand how a religious leader could thus engage in ofensive war and become almost an aggressor".(54).

(جب انسان ان تمام امکانات کا جائزہ لیتا ہے جو حضرت محمد ﷺ کے پیش نظر تھیں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے ہجرت سے پہلے ہی مکی قافلوں پر حملے کے امکان بلکہ غالب امکان پر غور کیا ہوگا۔ ان حملوں میں مسلمانوں کا رویہ جارحانہ تھا۔ حضرت محمد ﷺ اس بات کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے کہ وہ ان حملوں میں ان کی معمولی کامیابی حاصل ہو لیکن مکہ والے انتقامی کاروائی ضرور کریں گے، ان چھوٹے حملوں میں محمد ﷺ مکہ والوں کو چیلنج کر رہے تھے بلکہ ان کو اشتعال دلا رہے تھے۔ ہمارے امن پسند زمانے میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی رہنما کیوں کر جارحانہ جنگوں میں مشغول ہو کر ایک جارح بن سکتا ہے)۔

واٹ غزوات وسرایا کو ڈاکہ زنی سے تشبیہ دیتے ہوئے وہ اس طرح لکھتا ہے:

"Thus whether Muhammad incited his followers to action and then used their wrongs to justify it, or whether he yielded to pressure from them to allow such action, the normal Arab practice of the razzia was taken over by the Islamic community. In being taken over, however, it was transformed. It became an activity of believers against unbelievbers, and therefore took place within religious context".(55).

(خواہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو جارحیت پر ابھارا ہو اور پھر ان کے ساتھ ہونے

والی زیادتیوں کو اس عمل کے جواز کے لیے استعمال کیا ہو یا انھوں نے اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس عمل کی اجازت دینے کے مطالبے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کے ہاں معروف ڈاکہ زنی کے عمل کو امت مسلمہ نے اپنا لیا اور اس عمل کے اپنا لینے کے بعد انھوں نے اس کی ہیئت میں تبدیلی کر دی، اس طرح یہ ایک ایسا عمل بن گیا جو مومن؛ کافروں کے خلاف سرانجام دیتے تھے اور (ڈاکہ زنی کا) یہ عمل مذہبی دائرے کے اندر سرانجام پاتا تھا)۔

پھر مستشرق مذکور اس تبدیلی کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The change from razzia to the Jihad may seem to be no more than a change of name, the giving of an aura of religion to what was essentially the same activity".(56).

(ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا تھا۔اس طرح وہ کام جو دراصل ڈاکہ ہی تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی)۔

واٹ کا مقصد آپ ﷺ کی شان کو گھٹانا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی تمام تر زندگی صرف کر دی ہے۔لیکن اس حقیقت کے باوجود اس کے قلم سے کبھی کبھی ایسی صاف باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں جو حضور ﷺ کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہیں۔اس نے آپ ﷺ کے اخلاقی مقام کو گھٹانے کی کوششیں کی ہیں لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ کے اخلاق کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔آپ ﷺ کی عظمت کے متعلق واٹ کے قلم سے اعترافات درج ذیل ہیں:

"He gained men's respect and confidence by the religious basis of his activity and by qualities such as courage, resoluteness, impartiality and firmness inclining to severity but tempered by generosity. In addition to these he had a charm of manner which won their affection and secured their devotion".(57).

(آپ ﷺ اپنے مذہبی افعال، جرأت، استقلال، غیر جانبداری اور ثابت قدمی جیسی خصوصیات کے ذریعے لوگوں کا اعتماد حاصل کرتے۔آپ ﷺ تشدد کی طرف مائل تھے لیکن آپ کی سخاوت، اس میں توازن پیدا کر دیتی تھی۔ان کے علاوہ آپ ﷺ کا حسن اخلاق لوگوں کو آپ ﷺ کا گرویدہ بنا دیتا تھا)۔

واٹ حضور ﷺ کے مشکل مشن کے لیے یقین کامل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"To carry on in the face of persecution and hostility would have been impossible for him unless he was fully persuaded that God had sent him; and the receiving of revelations was included in his divine mission".(58).

(اگر حضرت محمد (ﷺ) کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اذیتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں آپؐ کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھنا ممکن نہ رہتا)۔

ٹار اینڈ رائے کی کتاب Muhammad: The Man and His Faith کا ایک جائزہ:

یہ کتاب مشہور زمانہ مستشرق ٹار اینڈ رائے کی ہے، اس نے سیرت پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔اس کتاب میں حضرت محمد ﷺ کے ایمان واعتقاد، آپ ﷺ کی فتوحات جیسے موضوعات پر زیادہ زور دیا ہے۔غزوات وسرایا کی مہمات کے بارے میں مؤلف نے ہرزہ سرائی کی ہے۔وہ لکھتا ہے:

"The method, then, which the prophet employed in order to provide sustenance for himself and all his companions, was that of plundering the caravans which passed Medina on the way to or from Syria".(59).

(پیغمبر ﷺ نے اپنی اور اپنے تمام صحابہ کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے جو طریقہ اپنایا وہ ان تجارتی قافلوں کو لوٹنے کا تھا جو شام جاتے ہوئے یا شام سے واپس آتے ہوئے مدینہ کے

پاس سے گزرتے تھے)۔

مستشرق مذکور مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے تلوار استعمال کی بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اسلام کی اصل مبلغ ہی تلوار ہے، وہ جنگ بدر کے اثرات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"The satisfaction and joy of victory increased the prophet's consiousness of his calling. The thought grew in him that the world must be compelled by force to obey Allah's word and commandments, if preaching did not succeed...... Thus, even at this time, shortly after the battle of Bedr, the principle is formulated which for a season made the sword the principal missionary instrument of Islam".(60).

(فتح کی خوشی اور اطمینان نے حضرت محمد(ﷺ) کے دل میں اپنی دعوت کا احساس تیز تر کر دیا۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر دنیا تبلیغ کے ذریعے خدا کے احکام کے سامنے نہیں جھکتی تو اسے بزور شمشیر ایسا کرنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ بدر کی جنگ کے فوراً بعد طاقت کے استعمال کا اصول وضع کیا گیا جس کی بنا پر ایک مدت تک تلوار ہی اسلام کی تبلیغ کا اصل ذریعہ رہی)۔

ٹارانیڈ رائے نے حضورﷺ کے دعویٰ نبوت کے لیے ایک اور محرک تلاش کیا، وہ یہ کہ یہودی ایک نبی کے منتظر تھے۔ حضرت محمد(ﷺ) کو اس چیز کا علم تھا۔ اور اسی بات نے آپ کو دعویٰ نبوت ورسالت کی طرف مائل کیا، وہ کہتا ہے:

"Muhammad knew of the Jewish expectation of the coming Messiah. He knew that a prophet was promised in Torah, and linked this prophecy with Jesus, promise that he would send the comforter. For him, this belief in Messiah provided

a support for his conviction of his call, but he cannot have invented it".(61).

(حضرت محمد (ﷺ) کو معلوم تھا کہ یہودی ایک مسیح کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم تھا کہ تورات میں ایک رسول کے آنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے تورات کے اس وعدے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس وعدے کے ساتھ ملا دیا، کہ وہ ایک تسلی دینے والا بھیجیں گے۔ ایک نبی کے آنے کے عقیدے نے اس یقین میں حضرت محمد (ﷺ) کی مدد تو کی ہوگی کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن تورات اور مسیح کے یہ وعدے ان کی ایجاد نہیں ہو سکتے)۔

ٹارانیڈ رائے دوسرے مستشرقین کی طرح اسلام کی تعلیمات کا مصدر یہودیت اور عیسائیت کے علاوہ کوئی اور بھی بتاتا ہے۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے اسلام کی تعلیمات کو یہودیت اور عیسائیت سے متصادم قرار دیا اس کے مطابق اسلام کی تعلیمات مانی کے مذہب سے ماخوذ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کہتا ہے کہ مانی قوم یہودیت اور عیسائیت کے تسلط سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ مانی نے اپنی قوم کو اس تسلط سے آزادی کے راستے پر لگایا اور وہ اپنی قوم میں مقبول ہوگیا۔ حضرت محمد ﷺ نے بھی مانی کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا اور انھوں نے اپنی قوم کو یہودیوں سے بچانے کے لیے اپنی قوم میں مقبولیت حاصل کی اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ وہ اپنی کتاب میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

"It is clear that Muhammad must have been influenced, even if he was not actually awakened by the sttruggle for religious independence which had given Many and the Gnostics such a strong position among the peoples of orient".(62).

(یہ بات واضح ہے کہ مذہبی آزادی کی کوششوں نے مانی اور باطنی فرقوں کو مشرقی اقوام میں جو بے پناہ مقبولیت عطا کی تھی، حضرت محمد (ﷺ) اس سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے)۔

مصنف ٹار اینڈ رائے حضورﷺ کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف تو کرتا ہے لیکن مصنف کو آپﷺ کی ذات میں حسن خلق کی خوبی کہیں نظر نہیں آتی اور وہ اپنی متضاد رائے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"Inspite of everything that can be said in defence Muhammad's religious integrity and his loyalty to his call, his endurance, his liberality, and his generosityl, we are not doing the prophet of Islam an injustice when we conclude that his other endowments and indeed, not even upon the same level with his religious endowments. But if we would be fair to him we must not forget that, consciously or unconsiously, we the chiristians are inclined to compare Mohammad with the unsurpassed and exalted figure whom we meet in the Gospels, and that we cannot avoid seeing his historical personality against the background of the perfect moral ideal to which the faith of his followers tried to exalt him. And when it is measured by such a standard, what personality is not found wantings?"(63).

(مذہبی راست بازی، اپنے مشن سے وفاداری، ثابت قدمی، رواداری اور سخاوت وغیرہ جو باتیں محمدﷺ کے دفاع میں کہی جا سکتی ہیں، ان سب کے باوجود، یہ کہنا پیغمبر اسلام سے ناانصافی نہ ہو گی کہ ان کے اخلاق کا معیار وہ نہیں جو ان کی دیگر خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہے۔ بلکہ ان کی اخلاقی شخصیت، ان کی مذہبی شخصیت کے ہم پلہ بھی نہیں ہے۔ لیکن حضرت محمد (ﷺ) کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم عیسائی محمد (ﷺ) کا مقابلہ اس بے مثال اور عظیم

الشان شخصیت کے ساتھ کرنے کا رجحان رکھتے ہیں، جو ہمیں انجیلوں میں نظر آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم حضرت محمد (ﷺ) کے اخلاق کو اس کامل اخلاقی معیار پر پرکھیں جو ان کے پیروکاروں کی عقیدت نے ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے قائم کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے جب معیار اتنا بلند ہوگا تو وہ کون سی شخصیت ہوگی جس میں خامیاں نظر نہیں آئیں گی)۔

ولیم میور کی کتاب ''Muhammad & Islam'' کا ایک جائزہ:

ہندوستان میں استعماری خدمات انجام دینے والا ولیم میور بیسویں صدی عیسوی کا مشہور زمانہ مستشرق ہے۔ اگر چہ اس کی کتاب ''لائف آف محمد'' بہت معروف ہے۔ لیکن اس کی ایک اور کتاب ''محمد اینڈ اسلام'' بھی ہے جو کہ دراصل اول الذکر کتاب کی تلخیص ہے۔ اس کتاب میں اس نے مسیحی مشنری مصنفین کا طرز اختیار کیا ہے۔ اس کتاب میں بہت زیادہ مقامات پر مصنف نے اپنے تعصب کا اظہار کیا ہے اور اسلام کو اپنا اوّلین دشمن قرار دیا۔ اس نے بہت زیادہ حوالہ جات ضعیف روایات سے لیے ہیں۔

آنحضور ﷺ کو مرگی کا مریض (نعوذ باللہ) ثابت کرنے کے لیے اس طرح لکھتا ہے:

"There were periods at which the excitements took the shape of a trance or vision. Of these we know but little. Some christian writers have connected them with the symptoms noticed in his childhood. Such swoons or reveries are said sometimes to have preceded "The descent of inspiration," even in later life".(64).

(کچھ مواقع ایسے آتے جب بے قراری وجد یا کشف کی شکل اختیار کر لیتی۔ ہم ان کی تفصیلات سے بہت کم آگاہ ہیں۔ بعض عیسائی مصنفین نے ان کی کیفیات کو مرگی کے دورے قرار دیا ہے اور ان کا تعلق ان علامات سے جوڑا ہے جو آپؐ کے بچپن میں نظر آتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے میں بھی نزول وحی سے پہلے آپؐ پر اس قسم کی غشی اور بیداری کے سپنے کی کیفیت طاری ہوتی تھی)۔

اس کی کتاب لائف آف محمد کا جواب سر سید احمد خاں نے خطبات احمدیہ کی صورت میں دیا۔
مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے سیرت مصطفیٰ ﷺ میں اس کے بعض اعتراضات کا جواب لکھا ہے:

ڈی ، ایس مارگولیتھ کی کتاب "Mohammedanism and the Islamic world" کا ایک جائزہ:

اس نے سیرت پر کئی کتابیں لکھیں اور حضور ﷺ پر بے شمار اعتراضات بھی کیے۔ اس کتاب میں ایک باب علیحدہ سے لکھا جسے "Mohammed and the Quran" کے نام سے موسوم کیا۔ اس باب میں ایک طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ عرب کے حالات کو دیکھتے ہوئے آنحضور ﷺ نے محسوس کیا کہ کوئی اصلاحی تحریک ضرور ہونی چاہیے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے گردوپیش کے تمام نظریات وعقائد کا بغور مشاہدہ کیا اور عمیق جائزہ لینے کے بعد سب کو ملا جلا کر ایک نئی اصلاحی تحریک کا آغاز بطور مذہب کیا۔ کچھ عرصے کے بعد خود کو پیغمبر کہنا شروع کیا۔ ایک مصلح سے نبی بننے تک کے مختلف مراحل اور آپ ﷺ کی سوچ میں ارتقا قرآن کی سورتوں سے ثابت ہوتا ہے (۶۵)۔

واشنگٹن ارونگ کی کتاب ''Life of Mohamet'' کا جائزہ:

Irving نے بھی سیرت طیبہ کو اپنی تحقیق کا مرکز و بنیادی ہدف بنایا۔ بظاہر اس نے مثبت رویہ اپنایا لیکن اپنے تعصب اور تنفر کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ ﷺ کو مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ اسی حالت میں آپ ﷺ پر نزولِ قرآن ہوا۔ یعنی نزولِ قرآن محض ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کو آپ ﷺ نے وحی بنا کر پیش کیا اور حضرت خدیجہؓ کو ڈر تھا کہ آپ ﷺ کو بدروحوں نے گھیر رکھا ہے (۶۶)۔

آپ ﷺ کی تعدد ازواج کو بھی اس نے بطورِ خاص نشانہ بنایا اور خاص طور پر حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ کے نکاح کو بہت منفی اور گھٹیا انداز میں پیش کیا۔ آپ ﷺ کے نکاح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہے:

''لوگ دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے آئے۔ کھانا کھا کر آپ ﷺ کے اس نکاح پر زیدؓ کے طلاق دینے پر لعن وطعن کرتے ہوئے اور زید کو اس قربانی پر برا بھلا کہتے ہوئے جو انھوں نے محمد ﷺ

کی محبت کی تکمیل کی خاطر دی، چلے گئے (٦٧)۔

ہنری سٹب کی کتاب Mahmmatanism کا ایک جائزہ:

موصوف نے آپ ﷺ کے متعلق بہت مثبت رویہ اختیار کیا لیکن کتاب کے بعض مندرجات بہت عجیب ہیں۔ کتاب کے آغاز میں وہ خود لکھتا ہے کہ عیسائیوں نے آپ ﷺ کے متعلق بہت عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی وہ خود نفی کرتا ہے لیکن دوسری طرف اپنی اس کتاب میں کئی موضوع روایات بھی نقل کرتا ہے جن کو آج تک کسی نے بھی بیان نہیں کیا۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے کہ آنحضور ﷺ کو ان کے چچا نے یہودی، عیسائی، آریائی، بت پرستوں یعنی ہر مذہب کے متعلق مکمل معلومات دے دی تھیں۔ شام کے سفر میں بحیرا راہب سے ملاقات کے بعد آپ ﷺ کا علم مزید کامل ہو گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر لکھتا ہے کہ آپ ﷺ ایک عرصہ تک عیسائی فوج میں شامل ہو کر اپنی خدمات پیش کرتے رہے اور اسی دوران ایک مہم کے لیے شام گئے جہاں ایک بیوہ خدیجہ سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی اور آپ ﷺ کی ان سے شادی ہو گئی (٦٨)۔

الفریڈ گیوم کی کتاب The life of Muhammad کا جائزہ:

یہ کتاب ابن اسحاق کی سیرت کا انگریزی ترجمہ ہے لیکن اس میں بھی آپ ﷺ پر بے شمار اعتراضات کیے گئے ہیں، اپنی کتاب میں ایک جگہ اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کرتا ہے۔ بنو قریظہ نے آپ ﷺ کی مدد کی آپ ﷺ نے ان کو قتل کیا، ان کے دلوں پر ہیبت ڈالی اور اپنے محسنوں کو تباہ کر دیا ان کے خطہ پر قبضہ کر لیا (٦٩)۔

کیرن کی کتاب Muhammad کا جائزہ:

۲۹۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کا سبب تالیف رشدی کے بدنام زمانہ ناول The satanic verses کے نتیجہ میں مسلمانوں کا شدید ردعمل تھا۔ اس مصنفہ کو عام طور پر معتدل قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن اس کی کتاب میں لاتعداد مقامات پر آپ ﷺ کے مقام ومرتبہ کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے،

ایک مقام پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہے:

آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔ جتنے بھی معجزات واقعات ملتے ہیں یا آپ ﷺ کے بچپن، جوانی یا پھر مکی عہد نبوت کے واقعات ہیں سب افسانے ہیں۔اصل میں آپ ﷺ کی تاریخ مدنی عہد میں محفوظ ہوئی جب تاریخ نے نیا موڑ لیا(۷۰)۔

Karen ایک اور جگہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب کے بارے میں لکھتی ہے: ''آپ ﷺ نے قرآن کی سورتوں کی کوئی ترتیب مرتب نہ کی تھی۔ یہ بعد میں صحابہ ؓ نے خود طے کرلیا کہ کون سی سورت کو کہاں رکھنا ہے''(۷۱)

وحی کے نزول کے واقعات بیان کرتے ہوئے Karen لکھتی ہے کہ آپ ﷺ کو یہ شک ہوگیا کہ آپ ﷺ کاہن بن گئے ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے خود کو کاہنوں کے انداز میں ڈھال لیا(۷۲)۔

Karen نے جتنے بھی غیر مسلموں کی کتب استعمال کیں۔ وہ سب اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔اس نے واٹ جو کہ اسلام دشمنی میں صف اوّل میں شمار ہوتا ہے، کی کتب کو مصادر کے طور پر استعمال کیا ہے۔اسی طرح Bell سے اخذ واکتساب کیا ہے جس نے Introduction to Quran نامی کتاب میں قرآن کو نبی کریم ﷺ کی ذاتی تصنیف قرار دیا ہے۔

Karen نے کتاب کے آخر میں Foot notes دیئے ہیں جن میں ابواب کی ترتیب سے حواشی دیئے گئے ہیں، اس کے بعد اس نے Sellected Bibliography کے عنوان کے ذیل میں نوے کتب کے نام درج کیے ہیں۔جبکہ حواشی میں ۵۶ کتب استعمال کی گئی ہیں۔ باقی کتب کا کوئی براہ راست حوالہ موجود نہیں۔ان نوے کتب میں صرف نو کتب مسلمان مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کا ترجمہ جو مصنفہ نے استعمال کیا ہے مستشرق کا کیا ہوا ہے۔واقدی، ابن سعد اور طبری کی کتب کے حوالے مصنفہ نے Martin Lings کی کتاب سے دیئے ہیں۔ان کے علاوہ باقی سب کتب مغربی محققین کی ہیں جن میں غالب اکثریت بدترین اسلام دشمنوں کی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی ہی مخالفت کیوں؟

انسانیت کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی انقلاب آفریں فکر کو بغیر شدید مخالفت

کے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ ایسی فکر چونکہ معاشرتی ڈھانچے کو متاثر کرتی ہے جس کے باعث انفرادی اور اجتماعی مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لیے معاشرے کا مقتدر طبقہ اس فکر کو بالجبر روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے بھی ایک ایسی فکر کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے عرب کا پورا معاشرتی ڈھانچا تبدیل ہو گیا۔ اس معاشرتی تبدیلی نے رائج الوقت مذاہب کے مقتدر طبقات اور معاشرتی رسوم ورواج کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔

حضور ﷺ کا ہر انداز منفرد، بااختیار، بااقتدار اور پرعظمت ہے۔ دیگر انبیاء کی طرح ان کی بھی مخالفت کی گئی، اوروں کی مخالفت اس لیے ختم ہو گئی کہ یا تو معاشرہ ان پر حاوی ہو گیا یا پھر ان کی فکر اور تعلیمات کو معاشرے نے اپنے مفاد کے مطابق ڈھال لیا لیکن آنحضرت ﷺ نہ تو مغلوب ہو سکے اور نہ ہی معاشرہ ان کی محکم تعلیمات میں کوئی تبدیلی لا سکا۔ مسلم معاشرے کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا گیا اتنے ہی اجنبی معاشروں سے اس کا واسطہ پڑتا گیا۔ ہر اجنبی معاشرے نے اسلام کو انقلاب آفریں پایا۔ جس معاشرے نے جتنی شدت سے ضرورت محسوس کی اسی مناسبت سے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا (۴۷)۔

دور جدید میں نام نہاد تحقیق کے علمبردار مستشرقین نے اپنی تمام تر کوششیں ہر اس چیز کے خلاف صرف کی ہیں جس کا تعلق اسلام سے تھا۔ اسلام میں جو بھی چیز جتنی زیادہ اہم اور نازک تھی اسی چیز کو مستشرقین نے اپنا نشانہ بنایا۔ انھوں نے قرآن حکیم اور احادیث طیبہ سے ملت کے اعتماد کو متزلزل کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی۔ تاریخ اسلام کی تابنا کیوں کو شکوک شبہات کے غبار سے آلودہ کرنے کی کوشش کی اور اسلام کی اُن انقلاب آفریں پاکیزہ تعلیمات کو، جن پر عمل پیرا ہو کر دنیا کی اجڈ ترین قوم تہذیب وثقافت کی امامت کے مقام پر فائز ہو گئی تھی، اس انداز میں پیش کیا کہ جو بھی انھیں دیکھے کراہت محسوس کرنے لگے۔

مستشرقین کے حملے کا خصوصی ہدف حضور ﷺ کی سیرت طیبہ بنی۔ وہ عظیم ہستیؐ جس ماحول میں رہتی تھی وہیں پر اس عظیم ہستی ﷺ کے بدترین دشمن بھی رہتے تھے لیکن وہ اس عظیم المرتبت ﷺ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ تاریخ کے اوراق ان الفاظ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ان سب حقیقتوں کی صداقت کے بعد بھی مستشرقین آفتاب رسالت ﷺ کی ضیا پاشیوں کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہے

ہیں۔ مستشرقین کے اس رویے کی توجیہہ تعصب، ہٹ دھرمی، انانیت اور بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مستشرقین اس تابندہ ترین اور پاکیزہ ترین سیرت کے دامن پر دھبے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب انھیں سیرت رسول ﷺ کے دامن پر کوئی دھبہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنے تخیل کی قوتوں سے کام لیتے ہیں۔ اپنی سوچ کے زور پر وہ نہ صرف سیرت رسول ﷺ کے دامن پر فرضی دھبے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سیرت رسول ﷺ کے وہ پہلو جو پوری نسل انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں ان کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانیت کے نمونۂ کامل کی خوبیاں خامیاں نظر آنے لگیں اور وہ ہستی جس کی ایک جھلک دلوں کو شکار کر لیتی ہے اس کا نام سننے والے اس سے نفرت کرنے لگیں۔

یورپی مستشرقین کے ہاں انبیاء کی عصمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خود انھی کی کتب مقدسہ میں انھی کے آباء انبیاء کے متعلق دشنام طرازی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر عہد نامہ قدیم میں حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں درج ہے کہ: ''لوط صغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیوں کہ اسے صغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے تب پہلوٹی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مئے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تا کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مئے پلائی اور پہلوٹی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی'' (۴۷)۔

جن اقوام نے اپنے آباء انبیاء کی قدر و منزلت نہ کی اور ہمیشہ ان کی شان میں گستاخی کرتے رہے اور ان کے احوال و اقوال اگر چہ وہ ان کی کتاب میں درج بھی تھے۔ ان پر عمل نہیں کرتے چہ جائیکہ وہ آنجناب علیہ السلام کی قدر و منزلت کرتے۔

مستشرقین سے متعلق مسلمان سکالرز کی خدمات:

گذشتہ دو عشروں سے انگریزی زبان میں بعض کتابیں لکھی گئیں جنھوں نے مغربی حلقوں

میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نئی نوجوان نسل نے علم و تحقیق کی بنیاد پر اہم کتابیں لکھیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے مستشرقین کے حوالے سے مطالعۂ سیرت کا علمی محاذ سب سے پہلے سر سید احمد خان نے کھولا۔ سر سید نے جذبۂ ایمانی اور خالص جرأت مندانہ انداز سے کام لے کر اپنے ہم عصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف "The Life of Muhammad" کی اشاعت پر خاموشی کو اپنے لیے گناہ خیال کیا اور تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اہانت رسولؐ کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید اور محاسبہ کیا اور اس طرح انیسویں صدی کے اواخر سے مستشرقین کے مقابلے میں علمی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ یہی وہ دور تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرتِ رسولؐ کے عربی ماخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے۔ سر سید کی کتاب میں مناظرانہ رنگ نہ تھا بلکہ انھوں نے تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب ''الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرت المحمدیہ'' لکھی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء میں ادارہ ادبیات دہلی نے شائع کی۔

سر سید کی ان مخلصانہ کوششوں کی وجہ سے تحریک استشراق کے مقابلے میں ایک نئی علمی تحریک کا آغاز ہوا، اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف علمائے دین نے قلم اُٹھایا اور سیرت پر متعدد کتابیں تحریر کیں اور جن کو شہرت بھی حاصل ہوئی تاہم ان میں علامہ شبلی کو ۱۹۱۴ء میں بہت زیادہ پذیرائی ملی۔

علامہ شبلی نے سیرت النبی ﷺ جلد اوّل میں مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کیا اور سیرت کے حوالے سے ان کی غلط بیانیوں کو واضح کرنا ان کا حقیقی مقصود تھا۔ اس لیے انھوں نے سیرت نبویؐ کے مجوزہ خاکے کے پانچویں حصے میں خاص یورپین تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جو اگرچہ پورا نہ تھا لیکن آنے والی نسل کے لیے وہ رہنمائی کی روشنی چھوڑ گیا۔ اس کے بعد ہر زمانے میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا رہا۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے بھی اپنی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' میں مستشرقین کے اعتراضات کا بہت اچھا محاکمہ کیا ہے۔

تحریک استشراق اور غیر مسلموں کی تصنیفات کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے ۱۹۸۲ء میں

دارالمصنفین میں ایک بین الاقوامی سیمینار ''اسلام اور مستشرقین'' کے نام سے ہوا۔ اس سیمینار میں کئی نامور مسلم سکالرز نے شرکت کی اور کئی اہم موضوعات پر مقالے پڑھے ۔ ان مقالہ جات میں کئی مستشرقین کی کتب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ کئی سکالرز نے تحریک استشراق کا پورا تفصیلی پس منظر بیان کیا۔ کئی دنوں تک جاری رہنے والے اس سیمینار میں سیرت کے موضوعات پر لکھی جانے والی مستشرقین کی کتابوں کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا گیا۔ یہ تمام مقالہ جات سات جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

پیر کرم شاہ الازہری نے ''ضیاء النبی'' میں مستشرقین کے منہج سیرت نگاری پر بہت مفصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کی ساتویں جلد میں مستشرقین کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس کتاب میں تمام متقدمین و متاخرین کے اقتباسات کو بھی پیش کیا اور مستشرقین کے اعتراضات کا بھی جواب دیا۔ یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔

محمد مہر علی نے ''Seerat un Nabi and the Orientalists'' کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں کنگ فہد کمپلیکس مدینہ سے ۱۹۹۷ء شائع ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی نے ''موسوعۃ المستشر قین'' کے نام سے کتاب لکھی جسے ''دار العلم للملایین بیروت'' نے ۱۹۸۴ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اسی طریقے سے عصرِ حاضر میں مختلف جامعات میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علم بھی استشراق پر کام کر رہے ہیں۔ بالخصوص سیرت نگاری کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ حدیث و سیرت کے صدر ڈاکٹر علی اصغر چشتی نے اپنی گراں قدر تالیف ''تاریخ حدیث'' میں مستشرقین پر ایک پورا باب لکھا اور احادیث پر اعتراضات کے جوابات بھی دیے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ہی قرآن مجید اور مستشرقین کے موضوع پر ثناءاللہ حسین نے ''قرآن حکیم اور مستشرقین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مستشرقین پر عمدہ تنقید کی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ڈاکٹر حافظ محمد سجاد نے اپنی کتاب ''اسلامی اور مغربی تہذیب وافکار؛ تاریخی تناظر میں'' کے ایک یونٹ میں ''مستشرقین اور ان کی تحقیقات وافکار کے اثرات'' کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۹۱ تا ۲۰۶ پر مختصر تبصرہ لکھا ہے۔ شیخ زید اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور نے Arther Jaffery کے علم القراءت کے حوالے سے اعتراضات کا جائزہ لینے کے

لیے ایم۔فل کے ایک طالب علم کو یہ موضوع دیا اور پھر یہ کتاب اسی سنٹر نے شائع کردی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری وائس چانسلر، سرگودھا یونیورسٹی نے بھی اپنے کئی مضامین میں حدیث اور قراءت پر مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ پیش کیا۔ نیز ان کا ایک مضمون ''تحریک استشراق'' تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں شائع ہوا۔

جامعہ کراچی نے ''اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر'' پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھوایا ہے۔ اس مقالے کے مصنف ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی جبکہ مرتب آصف اکبر ہیں اور اس مقالے کو بیت الحکمت لاہور کے اشاعتی ادارے کتاب سرائے نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔ اس مقالے میں مستشرقین کی کتب اور افکار پر علمی انداز سے تنقید کی گئی ہے۔

اسی طرح سے ملکی وغیر ملکی مجلات میں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں مستشرقین کے منہج سیرت نگاری اور سیرت پر کیے گئے اعتراضات کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

ظفر علی قریشی نے "Prophet Muhammad and His Western Critics" کے نام سے کتاب لکھی جسے ادارہ معارف اسلامی لاہور نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔

مجلّہ نقوش کے رسول نمبر میں بھی مستشرقین اور مطالعہ سیرت کے عنوان سے ڈاکٹر نثار احمد نے بہت طویل مقالہ لکھا جو بہت جامع ہے۔ اس مضمون میں تاریخ، مقاصد اور مستشرقین کے طریقہ واردات کو بھی واضح کیا گیا ہے اور مستشرقین کی کتب کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔

''مناہج المستشر قین'' کے نام سے ایک کتاب مختلف علماء نے لکھی ان میں ڈاکٹر محمد احمد الرشید اور ڈاکٹر محی الدین صابر پیش پیش تھے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں مکتبہ تربیت العربی لدول الخلیج الریاض میں ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء میں شائع کی۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی نے مستشرقین کے حدیث پر اعتراضات اور ان کے مفصل و مدلل جواب پر مشتمل "Studies in Early Hadith Literature" کے عنوان سے کیمرج یونیورسٹی برطانیہ سے ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹریٹ کیا۔ یہ کتاب امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز نے ۱۹۶۷ء میں انڈیانا امریکہ سے شائع کی۔ ڈاکٹر صاحب نے "On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence" کے

نام سے کتاب لکھی جسے کنگ سعود یونیورسٹی الریاض نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ یہ شاخت کی کتاب Origins of Muhammadan Jurisprudence کا بہترین جواب ہے جس میں مستشرقین پر عمدہ تنقید کی ہے۔

راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب ''علوم الحدیث فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ'' میں مستشرقین کے حدیث پر کیے گئے اعتراضات پیش کیے ہیں اور ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ میرے زیر نگرانی ایم۔فل کی ایک طالبہ نے کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب ''محمد ﷺ'' پر ایک تفصیلی مقالہ تحریر کیا ہے۔ شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں پی ایچ ڈی کے طالب علم نے واٹ کی کتب سیرت پر ایک تفصیلی مقالہ تحریر کر کے حال ہی میں جمع کرایا ہے۔ اس کے علاوہ ایم۔فل کا ایک طالب علم مغربی مفکرین کی آراء میں تضاد پر مقالہ تحریر کر رہا ہے جو ابھی تک نامکمل ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور، لسان العرب (دار صادر، بیروت) ۷/ ۶۵۔

2. Hans Wehr, Dictionary of Modern written Arabic (Ed.J.M Cowan, New York 1961).

۳۔ عبدالحق، سٹینڈرڈ اردو ڈکشنری (انجمن اُردو پریس، دکن، ۱۹۳۷ء) ص ۷۹۶۔

۴۔ عمر فروخ، الاستشراق، ماله .... وما علیه، الاستشراق والمستشرقون (عدد خاص، مجلہ المنهل، عدد ۴۷ (اپریل/ مئی ۱۹۸۹ء) ص ۱۵۔

5. The Oxford Dictionary of English, The Biological Society, VII,P.200.

۶۔ الجهنی ، مانع بن حماد، الموسوعة المسیره فی الادیان والمذاهب المعاصره (الندوة العالمیة للشباب الاسلامی الریاض، ۱۹۸۹ء) ص ۳۳۔

۷۔ الجبری، عبدالمتعال محمد، الاستشراق، وجه للاستعمار الفکری (مکتبه وهبة، قاهره) ص ۱۳۔

۸۔ انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا (William penton Publisher,1961) ۱۲/ ۲۰۵ تا ۲۰۹۔

۹۔ انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا، ۱۲/ ۲۰۵-۲۰۹۔

۱۰۔ اظہر، ظہور احمد، صلیبی جنگیں (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ص ۲۱۹۔

۱۱۔ العقیقی ، الاسلام والمستشرقون (دار المعارف، مصر، طبع ثالث ۱۹۶۴ء) ۱/ ۴۸-۵۹۔

۱۲۔ نقوش، رسول نمبر (ادارہ فروغ اردو، لاہور) ۱۱/ ۵۰۱۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ العقیقی ، نجیب، الاسلام والمستشرقون، ۲/ ۶۴۴۔

۱۵۔ ایضاً، ضمیمہ، ص ۲۱۱۔

۱۶۔ چشتی، علی اصغر، ڈاکٹر، تاریخِ حدیث (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) ص ۴۵۷-۴۵۸۔

۱۷۔ العقیقی ، نجیب، الاسلام والمستشرقون، ۱/ ۲-۳۔

۱۸۔ ایضاً، ۲/ ۴۸۱۔

۱۹۔ نقوش، رسول نمبر ۱۱/ ۵۱۱-۵۱۲۔

۲۰۔ العقیقی ، نجیب، الاسلام والمستشرقون، ۱/ ۱۷۷۔

۲۱۔ ایضاً،۲/۸۰۳۔

۲۲۔ نقوش،رسول نمبر،۱۱/۵۲۷-۵۳۱۔

۲۳۔ ثناءاللہ حسین،قرآن حکیم اور مستشرقین (شعبہ حدیث وسیرت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،اسلام آباد)ص ۲۸۔۲۹۔

24. Michael H. Heart, The one hundred, A ranking of the Most influential persons in History, (Newyork, 1978) p 40.

۲۵۔ ایضاً،ص ۳۹۔

۲۶۔ ازہری،پیر کرم شاہ،ضیاءالنبی (ضیاءالقرآن پبلی کیشنز،لاہور)۶/۱۹۲۔

۲۷۔ ایضاً۔

۲۸۔ ثناءاللہ حسین،قرآن حکیم اور مستشرقین،ص ۳۲۔

۲۹۔ ایضاً،ص ۳۳۔

۳۰۔ ضیاءالنبی،۶/۲۰۰۔

۳۱۔ برق،غلام جیلانی،یورپ پر اسلام کے احسانات (غلام علی اینڈ سنز،لاہور)ص ۹۰۔

۳۲۔ یورپ پر اسلام کے احسانات،ص ۹۰۔

۳۳۔ عبدالغنی فاروق،ڈاکٹر،ہم کیوں مسلمان ہوئے (مکتبہ تعمیر انسانیت،اردو بازار،لاہور ۲۰۰۱ء)ص ۴۔

۳۴۔ ایضاً،ص ۲۰۰۔

۳۵۔ زکریا،ہاشم،الاسلام والمستشرقون،(لجنۃ التعریف باالاسلام جمھوریۃ العربیہ المتحدہ،۱۹۶۵ء)ص ۵۲۔

۳۶۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،اسلام اور مستشرقین از،مقالہ سید حبیب الحق ندوی (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ،یوپی،ہند ۲۰۰۳ء)۳/۱۶-۴۷۔

۳۷۔ نقوش رسول نمبر جلد نمبر ۱۱/۵۰۵-۵۶۰۔

۳۸۔ اسلام اور مستشرقین،۲/۱۵۴۔

۳۹۔ ایضاً،۲/۱۵۴۔

۴۰۔ ایضاً،۲/۱۵۶۔

۴۱۔ ایضاً،۲/۱۵۸۔

۴۲۔ ایضاً،۲/۱۵۸۔

۴۳۔ ایضاً،۲/۱۶۰-۱۵۹۔

۴۴۔ ایضاً،۶/۱۶۸-۱۶۹۔

۴۵۔ ایضاً،۶/۱۶۸-۱۷۰۔

46. Muhammad at Mecca,(Oxford University Press Karachi 1962)P.x.
47. Ibid, P. 49.
48. Ibid, P. 87
49. Ibid, P. 90.

50. Muhammad at Madina,(Oxford University Press, Karachi 1981)P310.
51. Ibid, P. 332.
52. Ibid, P. 277.
53. Ibid, P.275.
54. Muhammad: Prophet and Statesman,(Oxford University Press, London 1961) P 105.
55. Ibid, P. 108.
56. Ibid, P. 108.
57. Ibid, P. 231.
58. Ibid, P. 17.
59. Tor. Andrae,Muhammad:The man and his faith(George Allen anunwin Ltd. London 1956.)P. 140.
60. Ibid, P. 147.
61. Ibid, P. 98.
62. Ibid, P. 106
63. Ibid, P. 191.
64. William Muir, Muhammad and Islam(Religion Tract Society,London)P. 22.
65. D.S.Margoliouth,Mohammedanism and the Islamic world, (New Delhi 1988)P. 47-51.
66. Washington Irving, Life of Mohamet,(E.P Dution Co New Yark 1988)P. 38-39.
67. Ibid, P. 133.
68. Henry Stubbe, Rise and Progrers of Mahommatanism,Orientalia Afzal chambers Macleod road Lahore,Tr. by Hafiz Muhammad khan Shairani. P. 73-77.
69. Alfred Gullaume ,The life of Muhammad,(Oxford University Press 15th Edition 2001)P. 468.
70. Karen, Muhammad,P.48.
71. Ibid, P. 50.
72. Ibid, P. 85.

۷۳۔ جیلانی، ڈاکٹر عبدالقادر، اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر (بیت الحکمت، لاہور ۲۰۰۵ء) ۲۶۳-۲۶۴۔

۷۴۔ بائبل، پیدائش باب نمبر ۱۹ آیت نمبر ۳۰ تا ۳۴۔

باب دوم

نقوش سیرت

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم : قرآن کے آئینے میں

رسول اللہ ﷺ کی زندگی قرآن کریم کا کامل بلکہ اکمل نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی عملی زندگی قرآن کریم کے الفاظ کا عکس ہے۔ اس کی تائید قرآن کریم کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى﴾ (۱) (وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے) آپ ﷺ کی گفتار و کردار کی قرآن سے مناسبت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ سورۃ المجادلہ کی ابتداء میں ارشاد ہے: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ إِلَى اللّٰهِ﴾ (۲) (اللہ تعالیٰ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں آپ سے تکرار کر رہی تھی اور اللہ کے آگے شکایت کر رہی تھی)۔ عورت اپنے اور خاوند کے درمیان پیدا ہونے والے مسئلہ پر بحث و تکرار اور شکایت کر رہی ہے۔ قرآن اس کا نقشہ کھینچ رہا ہے کہ آپ ﷺ اس کی باتیں سن رہے ہیں اور خاموش ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کے لیے تیار نہیں حتی کہ آپ ﷺ پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔ یہ صاحب قرآن ﷺ کی قرآنی تصویر کی کتنی عمدہ مثال ہے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں جن سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب قرآن کا قرآن کے ساتھ ہمہ پہلو کتنا گہرا تعلق تھا۔ حضرت عائشہؓ سے جب سوال ہوا کہ آپ ﷺ کا اخلاق کیا تھا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ: "فان خلق نبی اللہ القرآن" (۳) (اللہ کے نبی ﷺ کا اخلاق قرآن تھا)۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے: "دراصل قرآن اور حیات نبوت معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرت اس کی تشریح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس "ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اوتوا العلم" میں ہے اور یہ ایک مجسم و ممثل قرآن تھا جو یثرب کی زمین میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا" (۴)۔ قرآن کریم نے جن اخلاقی رفعتوں کو سراہا لوگوں نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پایا۔ آپ ﷺ کے اخلاق عظیم کے پیکر ہونے کا اعلان قرآن نے کیا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (۵) (بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو)۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ رسول کریم ﷺ کو عملی قرآن بنانے کا اہتمام خود رب العالمین نے کیا۔ جبرائیل علیہ السلام جب پہلی وحی لے کر آئے تو آپ ﷺ فرمانے لگے: "ما انا بقاری" (۶) (میں نہیں پڑھ سکتا)، آپ ﷺ کا یہ

کہنا قرآن کریم کی ان آیات کے عین مطابق ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ﴾ (۷) (تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے) اور فرمایا: ﴿عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾ (۸) (آپ ﷺ کو وہ کچھ بتایا جو آپ ﷺ کو معلوم نہ تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے کہا یہ ہماری ذمہ داری ہے: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ﴾ (۹) (البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو، پھر تو نہ بھولے گا) پھر پڑھایا اور آپ ﷺ جلدی کرنے لگے تو فرمایا گیا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ. إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ. فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ (۱۰) (اس کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو آپ اس وقت ہماری قرات کے پیچھے پیچھے چلیں)۔

قرآن کی اس تعلیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا سینہ کھول دیا۔ جس کو قرآن میں بطور احسان بیان کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۱۱) (کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے نہیں کھول دیا) اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم و تعمیل کے لیے آپ ﷺ کا سینہ کھول دیا اور اسے آپ ﷺ کے لیے آسان کیا۔ آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے آداب مقرر کر دیے اور ساتھ ہی آپ ﷺ کی انسانی حیثیت کو بھی بیان کر دیا تاکہ کوئی انسان کسی وجہ سے دھوکے یا شک و شبہ کا شکار نہ ہو۔ کفار و مشرکین آپ کو اُبْتَر (بے نام و نشان) کہہ کر آپ کی دل آزاری کرتے اور اپنے ہم نواؤں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ جلد اس کا نام مٹ جائے گا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا اور فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۱۲) (ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا)۔ بحر اکاہل کے مغربی کنارے سے لے کر دریائے ہوانگ کے شرقی کنارے تک کے رہنے والوں میں سے کون ایسا شخص ہے جس نے صبح کے روح افزاء جھونکوں کے ساتھ فضا میں گونجتی اذان کی آواز نہ سنی ہو۔ جس نے رات کی خاموشی میں "اشھد ان محمدا رسول الله" کی سریلی آواز کو جان بخش نہ پایا ہو۔

آپ ﷺ کے ادب کے متعلق فرمایا: ﴿لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ اور ﴿لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ (۱۳) (اللہ سے اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو) یہ کہہ کر قرآن نے صاحب قرآن کی تعظیم و تکریم کو فرض کر دیا۔ اس

آیت نے بتا دیا کہ جس نے نبی ﷺ کی پیروی کی راہ اپنائی اور اپنی آواز اور رائے کو نبی ﷺ کے سامنے پست کر لیا اصل میں اس نے قرآن پر عمل کیا جس نے ایسا نہ کیا اس کے اعمال برباد ہوئے۔ ﴿ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ ﴾ (۱۴) (کہیں تمھارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں) آپ کے اس عالی مقام کو بیان کر کے ساتھ ہی قرآن کریم نے آپ ﷺ کی ذات کے متعلق پیدا ہونے والے ان شبہات کو رد کر دیا جن کو بنیاد بنا کر بعض لوگوں نے کفر و انکار کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی: ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ ﴾ (۱۵) (یہ کیسا رسولؐ ہے کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں پھرتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کو اس طرح دور کر دیا کہ آپ ﷺ کہہ دیں: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعاً مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ (۱۶) (میں کوئی انوکھا رسولؐ نہیں ہوں) بلکہ مجھ سے پہلے بھی بستیوں کی طرف رہنے والوں کی طرف رسولؐ آتے رہے اور جو بھی رسولؐ مجھ سے قبل آیا وہ انسان ہی تھا۔ ﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُّوحِيْٓ إِلَيْهِمْ ﴾ (۱۷) (ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسولؐ بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے) مجھ پر بحیثیت رسولؐ بشر ہونے کا اعتراض کیوں کرتے ہو۔ ان کے اعتراض کو قرآن نے نقل کیا ہے: ﴿ أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَراً رَّسُولاً ﴾ (۱۸) (کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا) رسول ﷺ نے اپنی انسانی حیثیت کو اس طرح واضح کر دیا۔ مسلم شریف میں ہے کہ مدینہ کے لوگ کھجور کو پیوند کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو۔ لوگوں نے پیوند نہ کیا تو پھل کم رہا۔ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "انما انا بشر، اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا به و اذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر" (۱۹) (بے شک میں انسان ہوں جب تمھیں تمھارے دین کے معاملے میں حکم دوں تو اس کو لے لو اور جب (دنیاوی امور میں) اپنی رائے سے بات کہوں تو میں انسان ہوں)۔

قرآن کریم میں کتنے ہی مقامات ایسے ہیں جن میں اس بات کو مختلف الفاظ اور صیغوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ ہر آن وحی کی پابندی کی زندگی گزارتے تھے۔ کسی مقام پر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو حکم دے رہا ہے: ﴿ اتَّبِعْ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ﴾ (۲۰) (اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے)۔ ﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ

رَّبِّكَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْراً﴾ (۲۱) (پیروی کرو اس بات کی جس کی تمھارے رب کی طرف سے تمھیں وحی کی جارہی ہے۔ اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو)۔ اور کبھی رسول کی زبان سے یہ کہلوایا جارہا ہے: ﴿قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحٰى إِلَيَّ مِن رَّبِّيْ﴾ (۲۲) (کہہ دیجیے میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے)۔

کتب سیرت میں لکھا ہے کہ رسول ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے روز دوپہر کے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ابوبکرؓ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہجرت اور ترک سکونت کی اجازت دے دی (۲۳)۔ جب تک آپ ﷺ کی طرف وحی نہیں آئی آپ ﷺ مصائب و آلام سہتے رہے لیکن مکہ کو نہیں چھوڑا تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ حکم الٰہی کے پابند تھے۔

﴿إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰى إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۲۴) (میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کردینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں)۔ آپ ﷺ ہر لحاظ سے آسمان کی طرف سے حکم کا انتظار کرتے۔

رسول اللہ ﷺ کی دلی آرزو تھی کہ ان کا قبلہ وہی ہو جو ان کے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی خواہش سے ایک بار بھی اس طرف رخ کرکے نماز ادا نہیں کی جب تک اللہ کی طرف سے حکم نہیں آگیا۔ آپ ﷺ آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر دعا کرتے اور انتظار کرتے تھے کہ اللہ اس کا حکم نازل فرمادے۔ جیسا کہ قرآن میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ (۲۵) (ہم تیرا منہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھتا دیکھ رہے ہیں جو قبلہ تو پسند کرتا ہے وہی ہم تجھ کو دیں گے)۔ جب تک آسمان سے ان الفاظ کے ساتھ وحی نہیں آئی آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نمازیں ادا کرتے رہے۔ جونہی وحی: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲٦) (اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے) نازل ہوئی آپ ﷺ اسی وقت مسجد حرام کی طرف پھر گئے اور ﴿ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰى إِلَيَّ ﴾ کی اعلیٰ مثال بن کر دکھایا۔

قرآن نے رسول ﷺ کو چار منفرد حیثیتوں سے پیش کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ﴾(۲۷)(اے اللہ! ان لوگوں میں ایک رسولؐ پیدا فرما جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب حکمت والا ہے) سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾(۲۸)(وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسولؐ انھی میں سے اٹھایا ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان چار صفات والے رسول کو مومنین پر اپنا انعام قرار دیا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾(۲۹)(درحقیقت اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں سے ایک ایسا پیغمبر مبعوث کیا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہی میں تھے)۔ آپ کی چوتھی صفت معلّم حکمت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (۳۰)(اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور ان لوگوں سے مباحث کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو)۔ آپ ﷺ ہمیشہ قرآن مجید کے اس حکم کے مطابق نصیحت فرماتے۔

چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے نصیحت کیجیے جو مختصر اور جامع ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو اپنی نماز میں کھڑا ہو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھ جو آخری نماز پڑھنے والا ہو اور ایسی بات نہ کہہ جس کے متعلق کل تجھے عذر بیان کرنا پڑے اور پوری طرح ناامید ہو جا اس چیز سے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے''(۳۱)۔

اس طرح حدیث کے متعلق فرمایا: ''نضر الله عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه'' (۳۲)(اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا پھر اس نے اسے یاد کیا اور محفوظ کیا اور پھر اسے

پہنچا دیا بہت سے فقہ لینے والے ہی غیر فقیہہ ہوتے ہیں اور کتنے ہی فقہ لینے والے زیادہ فقیہوں کو پہنچانے والے ہوتے ہیں)۔

آپ ﷺ کے ادب و احترام کا جو حکم قرآن نے دیا اس کا نقشہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیش کیا، چنانچہ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قریش کو بتایا: اے قوم! مجھے بارہا نجاشی، قیصر اور کسریٰ کے دربار میں جانے کا اتفاق ہوا ہے مگر مجھے کوئی بھی ایسا بادشاہ نظر نہیں آیا جس کی عظمت دربار والوں کے دل میں ایسی ہو جیسے اصحاب محمد ﷺ کے دل میں محمد ﷺ کی ہے۔ محمد ﷺ تھوکتا ہے تو اس کا آب دہن زمین پر گرنے نہیں پاتا کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے اور وہ شخص اس آب دہن کو چہرے پر مل لیتا ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ کوئی حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے سب مبادرت کرتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتا ہے تو مستعمل پانی کے لیے ایسے گر پڑتے ہیں گویا ان میں لڑائی ہو جائے گی۔ جب وہ کلام کرتا ہے تو سب کے سب چپ چاپ ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل میں حضرت محمد ﷺ کا اتنا ادب ہے کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے (۳۳)۔

صاحب قرآن نے قرآن کی آیت کے مطابق تعلیم دے کر ان کا تزکیہ کیا کہ لوگ گناہ سرزد ہو جانے پر اتنے پریشان اور بے چین ہو جاتے تھے کہ خود کو سزا کے لیے پیش کر دیا کرتے تھے تاکہ اس دنیا میں ہی اپنے آپ کو پاک کروالیں۔ صاحب قرآن نے ایسے لوگوں کا تزکیہ حدود اللہ کے نفاذ کے ذریعے فرمایا۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماعز بن مالک اسلمیؓ نے خود آ کر اقرار کیا کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے، مجھے پاک کر دیا جائے اور مجھے پاکیزگی کے لیے سزا دی جائے۔ چنانچہ اس کو رجم کیا گیا۔ (۳۴)

قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں بیان کیا ہے:

۱۔ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً﴾ (۳۵) (ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)۔

۲۔ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيرًا﴾ (۳۶) (ہم نے آپ ﷺ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے)۔

۳۔ ﴿إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ﴾ (۳۷) (آپ تو بس ڈر کی خبر پہنچانے والے ہیں)۔

۴۔ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (۳۸) (ہم نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو)۔

۵۔ ﴿إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (۳۹) (میں تو بس ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں)۔

مندرجہ بالا آیات میں قرآن نے صاحب قرآن کو خوشخبری دینے اور ڈرانے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ رسول کریم ﷺ زندگی بھر اس فریضہ کو ادا کرتے رہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نازل ہوا: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۴۰) (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ)۔ تو آپ ﷺ نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر فرمایا: "((یا صباحاہ))، فقالوا من هذا؟ فاجتمعوا إليه فقال: ارئيتم ان اخبرتكم ان خيلاً تخرج من صفح هذا الجبل وفي رواية ان خيلاً تخرج بالوادي تريد ان تغير عليكم اكنتم مصدّقيّ؟ قالوا: نعم ما جرّبنا عليك الا صدقا، قال: فانّي نذير لكم بين يدي عذاب شديد، قال ابو لهب: تبّالك الهذا جمعتنا؟ فنزلت: تبت يدا ابي لهب وتب" (۴۱) (اے بنی فہر، اے بنی عدی، اے قریش کے قبیلے کے لوگو، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گئے۔ اگر کوئی آدمی خود نہ آ سکا تو اس نے اپنا قاصد بھیجا تاکہ معلوم کرے کہ کیا ہوا ہے؟ ابولہب اور قریش آئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آپ کا کیا خیال ہے اگر میں تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کی ایک جانب سے لشکر نکلنے والا ہے؟ اور ایک روایت یہ کہ ایک لشکر وادی سے نکلنے والا ہے اور تمھیں غارت کرنا چاہتا ہے کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہاں، ہم نے آپ ﷺ کو ہمیشہ سچا پایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا میں تم کو ڈرانے والا ہوں میرے آگے سخت عذاب ہے۔ ابولہب نے کہا آپ ﷺ کے لیے ہلاکت ہو۔ اس لیے آپ ﷺ نے ہمیں جمع کیا (اس کے جواب میں) یہ آیت نازل ہوئی ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ﴾۔

اسی طرح آپ ﷺ نے بنی کعب، بنی مرۃ، بنی عبد شمس، بنی ھاشم اور بنی عبدالمطلب کو جمع کر

کے ان الفاظ کے ساتھ ڈرایا کہ: "انقذوا انفسکم من النار" (تم اپنی جانوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ) (۴۲)۔ اسی طرح حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کر کے خبردار کیا کہ: "انقذی نفسك من النار فانی لا املك لكم من الله شیئا یا فاطمة بنت محمد سلینی ما شئت من ما لی لا اغنی عنك من الله شیئا" (۴۳) (تم اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ اس لیے کہ میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اختیار نہیں پاتا۔ اے محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ مجھ سے (دنیا میں) جو مال چاہے مانگ لے یقیناً میں تیرے لیے اللہ سے (قیامت) کو کچھ نہ کر سکوں گا)۔

قرآن کریم نے رسول کریم ﷺ کی دوسری حیثیت بشیر کی بیان فرمائی اور آپ ﷺ اس کے عملی نمونہ تھے۔ کتنے ہی لوگوں کو آپ ﷺ نے حکم الٰہی سے دنیا میں جنت کی خوشخبری دی۔

ایک موقع پر فرمایا: "من شهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وان محمداً عبده ورسوله وان عيسى عبدالله ورسوله وابن امته وكلمته القاها الى مريم وروح منه والجنة حق والنار حق ادخله الله الجنة على ما كان من العمل" (۴۴) (جس شخص نے گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور اس کی لونڈی کے بیٹے ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کا حضرت مریمؑ کی طرف القا کیا اور اس کی (پیدا کردہ) روح ہیں اور جنت اور دوزخ حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے عمل کی بناء پر اس کو جنت میں داخل کرے گا)۔ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لے کر ان کو جنت کی خوشخبری دی۔

ایک دفعہ فرمایا کہ: "اتانی جبرئیل فاخذ بیدی فارانی باب الجنة الذی یدخل منه امتی فقال ابو بکر یا رسول الله وددت انی کنت معك حتی انظر الیه فقال رسول الله: اما انك یا ابا بکر اول من یدخل الجنة من امتی" (۴۵) (میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور میرا ہاتھ پکڑا پھر مجھے جنت کا وہ دروازہ دکھایا جس سے میری امت اس میں داخل ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ میں پسند کرتا ہوں کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتا تو اس کو میں بھی دیکھ لیتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ بے شک تو پہلا شخص ہوگا جو میری امت میں

سے جنت میں داخل ہوگا)۔

قرآن کریم میں آپ ﷺ کو نیکی کا پرچار کرنے اور برائی سے منع کرنے کا حکم دیا گیا ہے:
﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۴۶) (آپ معاف کریں، بھلائی کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کریں)۔ آپ ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی معاف فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے متعلق سب نے کہا آپ اچھے بھائی ہیں اور اچھے بھائی کے بیٹے ہیں تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (۴۷) (آج تم پر کوئی گرفت نہیں)۔ آپ ﷺ نے ابوسفیان (۴۸) اور اس کی بیوی ہندہ کو معاف کر دیا جب کہ وہ آپ ﷺ کے جانی دشمن تھے۔ اسی طرح وحشی بن حرب کو معاف کیا جو کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل تھا (۴۹) اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل کو بھی معاف فرمایا۔ (۵۰)

قرآن حکیم نے رسول اللہ ﷺ کی لوگوں کی اصلاح وہدایت کے لیے بے چینی کی بابت فرمایا:
﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ (۵۱) (آپ ﷺ ان پر حسرتیں کر کے اپنی جان کو ہلاک نہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں)۔
ایک اور مقام پر قرآن نے صاحب قرآن کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ أَسَفاً﴾ (۵۲) (پس اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو کیا ان کے پیچھے اپنی جان کو ہلاک کر لو گے؟)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سورۃ نساء سنی، جب اس آیت پر پہنچے ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْداً﴾ (۵۳) (پس کیسے ہوگا جس وقت لائیں گے ہم ہر امت سے گواہ اور ہم تمھیں ان پر گواہ لائیں گے) تو آپ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے صاحب قرآن کو کفار کی خوشحالی اور مسلمانوں کی تنگدستی کی بنا پر غمگین رہنے پر مخاطب کر کے فرمایا: ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ. مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ

جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ (۵۴) (آپ ﷺ کو کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ تو بہت ہی تھوڑا فائدہ ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ٹھکانہ تو جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے)۔

صاحب قرآن آیات قرآن کی عملی تفسیر تھے، دنیا کو کوئی وقعت نہ دیتے ہمیشہ آخرت کی تیاری رکھتے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا ایک کھردری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم پر اس کے نشان تھے۔ چمڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا! اے اللہ کے رسول ﷺ دعا کریں اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر وسعت کر دے۔ فارس اور روم کے لوگ خوش حال زندگی گزارتے ہیں۔ انھیں دنیا ملی ہوئی ہے حالانکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے، فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا میں دے دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی اللہ کے رسول میرے لیے استغفار کیجیے (۵۵)

احادیث نبویؐ میں بھی آنحضرت ﷺ کی زندگی کا نقشہ نہایت احسن انداز میں کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ آپ کی گھریلو زندگی کے متعلق فرماتی ہیں کہ "ما شبع آل محمد ﷺ من خبز الشعير يومين متتابعين حتى قبض رسول الله ﷺ" (۵۶) (آل محمد ﷺ نے لگاتار دو دن جو کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی حتی کہ آپ ﷺ اس دنیا سے چلے گئے)۔

قرآن نے مسئلہ توحید کو بہت زیادہ اجاگر کیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد فرمایا:
﴿شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ وَالْمَلاَئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِماً بِالْقِسْطِ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۵۷) (اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کے ساتھ دنیا کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ غالب اور حکمت والا ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے پوری زندگی توحید کے پرچار میں گزاری۔

قرآن نے صاحب قرآن کی زبان مبارک سے خطاب کیا کہ ﴿قُلْ إِنِّيْ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ﴾ (۵۸) (اے پیغمبر ﷺ کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے)۔

صاحب قرآن کریم نے ان آیات کو پڑھا اور مکے کی گلیوں، بازاروں میں لوگوں کو توحید کا

اعلان کیا: "کلمة تکلمتم بها، ملکتم بها العرب و دانت لکم بها العجم" (۵۹) (ایک کلمہ کہہ دو اس کے بدولت عرب کے بادشاہ بن جاؤ گے اور اس کی وجہ سے عجم بھی تمھارے زیر نگیں آ جائے گا)۔ وہ کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" تھا۔

فتح مکہ کے موقع پر توحید الٰہی کا اظہار اس طرح فرمایا: ﴿جَـآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَـاطِلَ كَـانَ زَهُـوْقًـا﴾ (۶۰) (حق آ گیا اور باطل چلا گیا بے شک باطل جانے والی چیز ہے) اور ﴿جَـآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ﴾ (۶۱) (حق آ گیا اور باطل کی پھر چلت ہوگئی) اور آپ ﷺ کی ٹھوکر سے بت چہروں کے بل گرتے جاتے تھے (۶۲)۔ بخاری شریف میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے کہ آپ ﷺ ﴿جَـآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ اور ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ﴾ پڑھتے جاتے تھے اور کمان سے بتوں کو ٹھوکر مارتے جاتے تھے (۶۳)۔

شرک کی مذمت میں قرآن نے آپ ﷺ کے متعلق فرمایا: ﴿لَئِنْ أَشْـرَكْـتَ لَيَـحْبَطَنَّ عَـمَـلُكَ﴾ (۶۴) (اگر آپ ﷺ نے شرک کیا تو آپ ﷺ کے عمل ضائع ہو جائیں گے) آپ ﷺ توحید اور شرک کے معاملے میں بہت حساس تھے چنانچہ آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے اتنا کہہ دیا۔ "ما شاء اللّٰہ و شئت" (جو اللہ نے چاہا اور آپ ﷺ نے چاہا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اجعلتنی للّٰہ ندا" (کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا) اور ساتھ ہی فرمایا 'قل ما شاء اللّٰہ وحدہ" (صرف ماشاء اللہ کہا کرو) (۶۵)۔

قرآن حکیم نے تین مقامات پر صاحب قرآن کو حکم دیا کہ وہ اپنے رب کی قسم کھا کر یہ اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا، فرمایا: ﴿زَعَـمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَن لَّنْ يُّبْعَثُوا قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُـمَّ لَتُـنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۶۶) (کافروں نے خیال کیا کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے آپ کہہ دیں کہ ہاں اللہ کی قسم تم ضرور دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے پھر جو تم نے کیا ہے اس کی خبر دیے جاؤ گے اور اللہ پر یہ بالکل ہی آسان ہے)۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ﴿وَقَـالَ الَّـذِيْـنَ كَفَرُوا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمَاوَاتِ وَلَا فِى الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ

مِن ذٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (٦٧) (کافر کہنے لگے ہم پر قیامت نہیں آئے گی کہہ دیجیے کیوں نہیں میرے رب کی قسم وہ تم پر ضرور آئے گی اُس کی خبر عالم غیب میں ہے آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے خواہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا وہ اس سے غائب نہیں وہ کھلی کتاب میں ہے)۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: "قال رسول اللہ ﷺ مثلی کمثل رجل استوقد نارا فلما اضاء ت ما حولها جعل الفراش وهذه الدواب التی فی النار یقعن فیها وجعل یحجز هن ویغلبنه فیقتحمن فیها قال فذلکم مثلی ومثلکم، انا آخذ بحجز کم عن النار هلم عن النار هلم عن النار فتغلبونی وتقحمون فیها" (٦٨) (میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ جلائی جب اس کا اردگرد روشن ہو گیا تو پتنگے اور دوسرے جانور آگ میں گرنے لگے وہ ان کو روکنے لگا وہ اس پر غالب آنے لگے اور ہجوم کرنے لگے۔ پس میں آگ سے بچانے کے لیے تمھیں پیچھے سے پکڑ کر روک رہا ہوں اور تم اس (آگ میں) کود رہے ہو۔ پس آگ سے بچو، آگ سے بچو، تم مجھ پر غالب آ کر اس آگ میں گرتے جا رہے ہو)۔

قرآن نے حضرت محمد ﷺ کو دنیا سے بے رغبت رہنے کا حکم دیا ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾ (٦٩) (اور اپنی نگاہوں کو ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ دوڑانا جو ہم نے ان لوگوں کو آرائش دنیا میں دی ہیں۔ تیرے رب کا دینا (رزق) بہت بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے)۔ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (٧٠) (تو بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو صبح شام پکارتے ہیں اور وہ اپنے رب کا چہرہ چاہتے ہیں اور دنیا کی زندگی کی خاطر تو اپنی آنکھ اُن سے نہ پھیر)۔ چنانچہ آپ ﷺ انھی غرباء سے محبت کرتے اور دعا کرتے "اللهم احینی مسکینا وامتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرة المساکین" (٧١) (اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین موت دے اور مسکینوں کے گروہ میں اٹھا)۔

قرآن کریم میں صاحب قرآن بلکہ تمام رسولوں کو حکم دیا: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ

الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (۷۲) (اے پیغمبروں کی جماعت پاکیزہ کھاؤ اور نیک اعمال کرو)۔

آپ ﷺ کی شفقت ومحبت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۷۳) (اور تجھ کو ہم نے بھیجا جہانوں کے لوگوں پر رحمت بنا کر) مزید ارشاد الٰہی ہے: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۷۴) (آیا ہے تمھارے پاس تم میں سے رسول، بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے، حریص ہے تمھاری بھلائی پر، ایمان والوں پر مشفق اور رحم کرنے والا ہے)۔ آنحضرت ﷺ کا رویہ بھی چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ قرآنی تعلیمات کے مطابق تھا ملاحظہ ہو:

"عن انس قال لما قدم رسول الله ﷺ المدينة اخذ ابو طلحة بيدي فانطلق بي الى رسول الله ﷺ فقال يا رسول الله انّ انسا غلام كيّس فليخدمك قال فخدمته في السفر والحضر والله ما قال لي لشيء صنعته لم صنعت هذا هكذا؟ ولا لشيء لم اصنعه، لِم لَم تصنع هذا هكذا" (۷۵) (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مجھے ساتھ لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا: اے اللہ کے رسول، انس عقل مند لڑکا ہے۔ آپ ﷺ کی خدمت کرے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے سفر وحضر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت کی۔ اللہ کی قسم! آپ نے کسی کام کے متعلق جو میں نے کیا، یہ نہ فرمایا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ کسی چیز کے لیے جو نہ کیا ہو، آپ نے یہ نہ فرمایا: آپ نے ایسا کیوں نہ کیا؟

آپ ﷺ نے معاشرے کے مظلوم اور بدحال لوگوں کی سرپرستی کی جب قرآن کریم میں رنگ، نسل اور دولت کی بنیاد پر برتری کے سابقہ قانون کو بدلا گیا اور اس کی جگہ تقویٰ وپارسائی کی بنیاد پر برتری اور فضیلت کا معیار قائم کیا گیا تو فرمایا ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ (۷۶) (لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو) تو اسی بات کی مناسبت سے آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا: "الا لا فضل لعربي على اعجمي ولا لعجمي على

عربی ولا لاحمر علٰی اسود ولا لاسود علٰی احمر الّا بالتّقوٰی" (۷۷) (دیکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو سرخ پر اور کسی سرخ کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں مگر تقویٰ کے ساتھ)۔

قرآن مجید میں اللہ نے مندرجہ ذیل لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۷۸) (اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ داروں اور اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو اور مسافروں اور جو لوگ تمھارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ نیک سلوک کرو)۔ مندرجہ بالا آیت کی آنحضرت ﷺ زندہ تصویر تھے۔

نبی رحمت ﷺ نے معاشرے میں جاری ظلم سے منع فرمایا اور اعلان کیا: "جو شخص کسی دوسرے شخص پر ایک بالشت برابر بھی ظلم کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گلے میں ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر ڈالے گا" (۷۹) پڑوسیوں کے متعلق ارشاد فرمایا: "من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یؤذ جارہ، ومن کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ" (۸۰) (آپ ﷺ میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی عزت کرے)۔

قرآن حکیم میں اعلان فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ (۸۱) (جو شخص یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب اس میں داخل ہوں گے)۔ ان لوگوں کے برعکس ارشاد نبوی ﷺ ہے: "الساعی علی الارملہ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ" (۸۲) (بیواؤں اور محتاجوں کا خیال رکھنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار ایک شخص نے آپ ﷺ سے اپنا قرض مانگا اور

سخت کلامی سے پیش آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس گستاخی کو برداشت نہ کر سکے اور اسے مارنے کے لیے اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے کہنے دو جس کا حق ہوتا ہے وہ باتیں کر سکتا ہے (۸۳)۔

ایک مرتبہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور کسی انصاری کے مابین جھگڑا ہو گیا۔ معاملہ آپ ﷺ کے حضور پیش ہوا تو آپ ﷺ نے (حقیقت کے مطابق) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انصاری برافروختہ ہو گیا اور کہا آپ ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے مگر آپ ﷺ نے اس سے درگزر کیا (۸۴)۔

ایک اور موقع پر فرمایا: "ما بعث الله نبيا الا رعى الغنم" (۸۵) (اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی نبی بنا کر بھیجا وہ ضرور بکریاں چرایا کرتا تھا)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ فرمایا: "نعم كنت ارعى على قراريط لاهل مكه" (۸۶) (ہاں! میں نے چند قیراط کے بدلے اہل مکہ کی بکریاں چرائی ہیں)۔ قتل کے بارے میں اللہ کا ارشاد اور رسول کریم ﷺ کا عملی پہلو ملاحظہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً﴾ (۸۷) (جس نے کسی کو بغیر بدلے جان کے یا زمین میں کسی فساد کے بغیر قتل کیا پس گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جس نے ایک نفس کو زندہ کیا گویا اس نے سب کو زندہ کیا)۔

ہادیٔ برحق ﷺ نے فرمایا: "فان دماء كم واموالكم واعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا فى بلدكم هذا فى شهركم هذا" (۸۸) (بے شک تمھارے خون، تمھارے مال، تمھاری عزتیں تم پر اس طرح حرام ہیں جس طرح یہ تمھارا دن، یہ تمھارا شہر (مکہ) اور تمھارا یہ مہینہ حرمت والا ہے)۔

قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کے متعلق رسولا منکم کہا گیا۔ اس لفظ منکم نے انسان کا اشرف المخلوقات ہونا بتلایا اور ساتھ ہی احساس دے دیا کہ ہر ایک انسان اپنے اعلیٰ ترین کمالات رکھتا ہوا بھی بشر ہی ہوتا ہے۔

کمالات عبدیت کا اتمام و اختتام حضور ﷺ ہی کی بشریت پر ہوا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک

مقام پر نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے: ﴿هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَراً رَّسُولاً﴾ (۸۹) (نہیں ہوں میں مگر بشر رسول)۔قرآن مجید میں ایفائے عہد کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً﴾ (۹۰) (وعدہ پورا کرو، وعدے کا سوال ہوگا)۔

آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر ایفائے عہد کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور حضرت جندل ؓ کو مکہ والوں کے حوالہ کر کے اپنے عہد کی پاسداری کی۔ دیگر معاہدات کی بھی آپ ﷺ نے ہمیشہ پابندی کی۔ یہودیوں کے ساتھ کیے ہوئے معاملات میں بھی آپ ﷺ نے کبھی وعدہ کی خلاف ورزی نہ کی۔

قرآن کریم میں شرک سے نفرت کو اہل ایمان کی بہت بڑی علامت کہا گیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ہمیشہ شرک سے بیزاری اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کفار اور منافقین سے سختی کرنے کا حکم دیا ہے: ﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (۹۱) (کفار اور منافقین سے جہاد کریں اور ان پر سختی کریں)۔ آپ ﷺ نے عملاً جہاد کر کے کفار اور منافقین سے سختی اور دشمنی کی مثالیں قائم کیں۔ جنگ بدر، احد، حنین اور تبوک سب اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

قرآن مجید میں اہل ایمان کے متعلق فرمایا: ﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۹۲) (وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں ایک دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ آیت تلاوت کی: ﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ﴾ (۹۳) (وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے اور فرمانبرداری کرنے والے اور خرچ کرنے والے اور پچھلی رات کو استغفار کرنے والے ہیں)۔ یہ تمام کی تمام صفات آنحضرت ﷺ میں عملاً موجود تھیں۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۹۴) (کہہ دیجیے اے اللہ تو شہنشاہ ہے جس کو چاہے بادشاہ بنا دے اور جس سے چاہے بادشاہت چھین لے تو جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ

میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

آنحضرت ﷺ نے اس کا عملی نمونہ فتح مکہ کے موقع پر دکھایا۔ ملک دینا اور چھین لینا اللہ کا اختیار ہے۔ ملک حاصل کرنے اور فاتح ہونے کے باوجود آپ ﷺ عاجز تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔

نیکی کا حکم اور جاہلوں سے منہ پھیرنے کا حکم قرآن ان الفاظ میں حکم دیتا ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۹۵) (اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو)۔ آپ ﷺ اس آیت کی زندہ تصویر ہیں۔ آپ ﷺ نے بڑے بڑے دشمنوں ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل، وحشی بن حرب اور ہندہ ابوسفیان کو معاف کرنے کے ساتھ مکہ کے لوگوں کو معاف کر دیا۔ اسی طرح امر بالمعروف میں آپ ﷺ نے کوئی کمی نہ چھوڑی اور اعراض جاہلین میں بھی آپ ﷺ ایک بہترین نمونہ تھے۔

حضور اکرم ﷺ کے فرائض اور مسلمانوں پر آپ ﷺ کے حقوق کے متعلق فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ مَكْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلاَلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُواْ النُّوْرَ الَّذِيْ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْن﴾ (۹۶) (وہ لوگ جو نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام قرار دیتا ہے اور ان سے وہ بوجھ ہلکے کرتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جس میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس نور کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (۹۷) (اے رسول ﷺ جو آپ ﷺ پر آپ ﷺ کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے، اگر آپؐ نے فریضۂ رسالت کا حق ادا نہ کیا) جب یہ آیت نازل ہوئی تو

آپ ﷺ نے تبلیغ میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔اس کے لیے آپ ﷺ نے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ایک ایک فرد سے لے کر گروہوں اور حکمرانوں کو آپ ﷺ نے دعوت دی بلکہ آخری وقت آپ ﷺ نے سب سے دریافت کر کے پوچھا کہ تم لوگوں کا کیا خیال ہے:"الا ھل بلغت؟" (کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟) تو انھوں نے کہاہاں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:"اللھم اشھد" (۹۸) (اے اللہ! گواہ رہ)۔آنحضرت ﷺ کے قرآن کے ہر حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہر حکم کو اپنا حکم قرار دیا۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (۹۹) (اے رسول ﷺ! تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں) اور اس وجہ سے قرآن نے آپ ﷺ کی زندگی کو لوگوں کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش فرمایا:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۱۰۰) (تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی بہترین نمونہ ہے)۔

دورِ حاضر میں ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات پر اس طرح عمل کریں جیسے رسول ﷺ نے کیا اور ہم آنحضرت ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہم مختلف مصائب وآلام اور عذابوں میں گرفتار ہیں۔مسلمانوں کے حالات کی بہتری اور دنیا وآخرت میں سربلندی کا راستہ صرف محمد ﷺ کی مجموعی زندگی کی پیروی ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ النجم: ۳-۴۔
۲۔ المجادلہ: ۱۔
۳۔ النسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، السنن (المکتبہ السلفیہ لاہور، طبع دوم ۱۹۷۹ء) ۱/ ۱۹۱۔
۴۔ ابوالکلام آزاد، رسول رحمت (غلام علی اینڈ سنز، لاہور) ص ۱۱۔
۵۔ القلم: ۴۔
۶۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی، الطبعۃ الثانیہ) ۱/ ۲۔
۷۔ الشوریٰ: ۵۲۔
۸۔ النساء: ۱۱۳۔
۹۔ الاعلیٰ: ۶۔
۱۰۔ القیامہ: ۱۶-۱۸۔
۱۱۔ الانشراح: ۱۔
۱۲۔ ایضاً: ۴۔
۱۳۔ الحجرات: ۱-۲۔
۱۴۔ ایضاً: ۲۔
۱۵۔ الفرقان: ۷۔
۱۶۔ الاحقاف: ۹۔
۱۷۔ النحل: ۴۳۔
۱۸۔ الاسراء: ۹۴۔
۱۹۔ مسلم بن حجاج القشیری، الجامع الصحیح (قدیمی کتب خانہ، کراچی، طبع دوم، ۱۹۵۶ء) ۲/ ۲۶۴۔
۲۰۔ الانعام: ۱۰۶۔
۲۱۔ الاحزاب: ۲۔
۲۲۔ الاعراف: ۲۰۳۔
۲۳۔ ابن کثیر، سیرت النبی (اردو)، ترجمہ مولانا ہدایت اللہ ندوی (مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور، طبع اوّل، اکتوبر ۱۹۹۶ء) ۱/ ۴۵۳۔
۲۴۔ الاحقاف: ۹۔

۲۵۔ البقرۃ:۱۴۴۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ ایضاً:۱۲۹۔

۲۸۔ الجمعہ:۲۔

۲۹۔ آل عمران:۱۶۴۔

۳۰۔ النحل:۱۲۵۔

۳۱۔ احمد بن حنبل، المسند (دارالفکر، القاھرۃ)۵/۴۱۲۔

۳۲۔ الخطیب التمریزی، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۹۷۷ء) ص ۳۵۔

۳۳۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۱/ ۳۷۸-۳۷۹۔

۳۴۔ مسلم، الجامع الصحیح ،۲/ ۶۷۔

۳۵۔ الاحزاب:۴۵۔

۳۶۔ سبا:۲۸۔

۳۷۔ فاطر:۲۳۔

۳۸۔ ایضاً:۲۴۔

۳۹۔ الاعراف:۱۸۸۔

۴۰۔ الشعراء:۲۱۴۔

۴۱۔ البخاری، الجامع الصحیح (دارالسلام، الریاض) ص ۸۹۱، حدیث نمبر ۴۹۷۱-۴۹۷۲۔

۴۲۔ مشکوٰۃ المصابیح، ص ۴۶۰۔

۴۳۔ ایضاً۔

۴۴۔ مشکوٰۃ المصابیح (دارالفکر، بیروت) ۱/ ۵۰، حدیث نمبر ۲۷۔

۴۵۔ ایضاً، ۳/ ۳۳۸، حدیث نمبر ۶۰۳۳۔

۴۶۔ الاعراف:۱۹۹۔

۴۷۔ یوسف:۹۲۔

مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم (مکتبہ عرفان الکویت، ۱۹۹۶ء) ص ۴۰۵؛
منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین (غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۲ء) ۱/ ۱۱۹۔

۴۸۔ الرحیق المختوم، ص ۴۰۰-۴۰۱۔

۴۹۔ ابن هشام، السیرۃ النبویۃ (انتشارات ایران) ۳/۷۶-۷۷۔

۵۰۔ ایضاً، ۴/۶۰-۶۱۔

۵۱۔ الفاطر: ۸۔

۵۲۔ الکهف: ٦۔

۵۳۔ النساء: ۴۱؛ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/٦۵۹۔

۵۴۔ آل عمران: ۱۹٦-۱۹۷۔

۵۵۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/۷۸۱-۷۸۲۔

۵٦۔ مشکوٰۃ المصابیح، ص ۴۴٦۔

۵۷۔ آل عمران: ۱۸۔

۵۸۔ الزمر: ۱۱۔

۵۹۔ الرحیق المختوم، ص ۱۱۴۔

٦۰۔ بنی اسرائیل: ۸۱۔

٦۱۔ سبا: ۴۹۔

٦۲۔ الرحیق المختوم، ص ۴۰۴۔

٦۳۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/٦۸٦۔

٦۴۔ الزمر: ٦۵۔

٦۵۔ احمد، المسند، ۱/۲۱۴۔

٦٦۔ التغابن: ۷۔

٦۷۔ سبا: ۳۔

٦۸۔ مسلم، الجامع الصحیح، ۲/۲۴۸۔

٦۹۔ طٰہٰ: ۱۳۱۔

۷۰۔ الکهف: ۲۸۔

۷۱۔ ترمذی، السنن (قرآن محل، کراچی) ۲/۷۰۔

۷۲۔ المؤمنون: ۵۱۔

۷۳۔ الانبیاء: ۱۰۷۔

۷۴۔ التوبہ: ۱۲۸۔

۷۵۔ مسلم، الجامع الصحیح، ۲/۲۵۳۔

۷۶۔ الحجرات: ۱۳۔

۷۷۔ احمد، المسند، ۵/۴۱۱، ڈاکٹر اسرار احمد، خطبہ حجۃ الوداع (انسٹی ٹیوٹ آف سیرت اسٹڈیز، بیت الحکمت، لاہور) ص ۱۷۴۔

۷۸۔ النساء: ۳۶۔

۷۹۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۱/۳۳۲

۸۰۔ ایضاً، ۲/۸۸۹، ابن ماجہ، السنن، (ادارہ احیاء السنہ النبویہ، سرگودھا، ۱۳۹۸ھ) ص ۲۶۹۔

۸۱۔ النساء: ۱۰۔

۸۲۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/۸۸۸۔

۸۳۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۱۷۶۔

۸۴۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/۶۶۰۔

۸۵۔ ایضاً، ۱/۳۰۱۔

۸۶۔ ایضاً، ۱/۳۰۱۔

۸۷۔ المائدۃ: ۳۲۔

۸۸۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۱/۲۳۴، خطبہ حجۃ الوداع، ص ۴۶۔

۸۹۔ الاسراء: ۹۳۔

۹۰۔ ایضاً: ۳۴۔

۹۱۔ التحریم: ۹۔

۹۲۔ آل عمران: ۱۶۔

۹۳۔ ایضاً: ۱۷۔

۹۴۔ ایضاً: ۲۶۔

۹۵۔ الاعراف: ۱۹۹۔

۹۶۔ ایضاً: ۱۵۷۔

۹۷۔ المائدۃ: ۶۷۔

۹۸۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۱/۲۳۵۔

۹۹۔ النساء: ۶۵۔

۱۰۰۔ الاحزاب: ۲۱۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت انسانِ کامل

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے قرآنی پیغام میں اس عالی مرتبہ ہستی کی سیرت وشخصیت کی جامعیت و ہمہ گیریت کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انسانی زندگی کی انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی معاشرتی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر پہلو کے لیے مطلوب رُشد و ہدایت کا کامل نمونہ ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب وہ ہستی ان تمام پہلوؤں سے کامل ہو جبکہ یہاں صرف کامل ہی نہیں بلکہ اکمل ترین ہستی رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس کا تذکرہ ہے۔

کاروانِ انسانیت کے رہبر اعلیٰ ﷺ کی سیرت طیبہ کو جب بنظرِ عمیق دیکھیں تو آپ ﷺ کی ذات اقدس ہر پہلو سے ایک ''انسانِ کامل'' کی تصویر پیش کرتی ہے۔

آپ ﷺ نے عائلی زندگی میں ایک مثالی شوہر اور مثالی باپ، میدان دعوت و تبلیغ میں مثالی مبلغ و مصلح اور مثالی معلم، امورِ سلطنت میں مثالی حکمران اور بے مثال مدبر و منتظم، میدانِ جنگ میں مثالی سپہ سالار اور ماہر فن حرب، معاشرتی زندگی میں تعلقات کی نزاکتوں کا پاس رکھنے والا مثالی شہری، بہترین ہمسایہ اور جامع صفات حسنہ کا حامل انسان کامل کا نمونہ پیش کیا ہے، چنانچہ سربراہ خاندان سے لے کر سربراہ مملکت تک ہر ہر حالت میں آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس اکملیت کی مثالِ وحید ہیں جس کا ثبوت آپ ﷺ کی عملی زندگی کے اس مطالعہ سے مہیا ہوتا ہے۔

آنحضور ﷺ بطور مثالی شوہر:

شوہر اور بیوی کے باہمی خوشگوار تعلقات کی پائیداری عائلی زندگی کی اساس ہے۔ ایک شوہر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شریک حیات کو سکون، اعتماد اور تحفظ مہیا کرے اور اس کا اہم وصف یہ ہے کہ وہ بیوی کا مزاج شناس ہو۔ اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرتا ہو۔ اس سے محبت و دل داری کا طریق جانتا ہو۔ حضور ﷺ اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور بھاری ذمہ داریوں کے باوجود روزانہ بعد از عصر ہر ایک بیوی کے پاس اس کے مکان پر تشریف لے جاتے، ان کی ضروریات معلوم فرماتے اور بعد از نماز مغرب سب سے ایک مختصر ملاقات فرماتے اور شب کو مساویانہ طور پر باری باری ہر ایک گھر میں

استراحت فرمایا کرتے تھے(۱)۔

حضور ﷺ کھانے، پہننے، رہائش، نان نفقہ اور میل ملاقات وغیرہ جملہ امور میں ہر ایک بیوی کے ساتھ ایسے عدل و انصاف اور مساویانہ سلوک سے پیش آیا کرتے تھے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر محال ہے۔ آپ ﷺ ان کی دلداری اور عطوفت کا بہت لحاظ رکھتے۔ کام کاج میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے۔ اگر وقت پر کوئی کام نہ ہوتا تو ناراض نہ ہوتے بلکہ نرمی کا برتاؤ فرماتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ بطور والد:

رسول اللہ ﷺ کو اپنی اولاد سے اتنی محبت تھی کہ شاید ہم میں سے کسی کو بھی اتنی محبت نہ ہو۔ فرق اتنا ہے کہ حضور ﷺ کی محبت کا معیار بلند تھا۔ حضور ﷺ کی محبت کا اسلوب جداگانہ تھا۔ ہماری محبت کا معیار پست ہے۔ حضور ﷺ کو بیشک اولاد سے محبت تھی، مگر یہ محبت خدا کی محبت پر غالب نہ تھی۔ آپ ﷺ آیت مبارکہ ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۲) (اے ایمان والو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں خدا کے ذکر سے غافل نہ کردیں) پر عمل فرماتے تھے۔

آنحضور ﷺ بطور شہری:

آپ ﷺ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے تمام اہلِ شہر سے مساویانہ سلوک روا رکھتے تھے یہاں جس شخص کو ایک معمولی سا عہدہ مل جاتا ہے اس کا دماغ ثریا پر چڑھ جاتا ہے اور مساویانہ برتاؤ تو رہا ایک طرف، وہ عوام کے ساتھ بیٹھنے کو عار سمجھتا ہے اور جب تک اسے اپنے مرتبے کی سوسائٹی نہ ملے وہ غرباء سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا مگر حضور ﷺ کا عمل اس کے بالکل خلاف تھا۔ آپ ﷺ تمام کام اپنے اپنے وقت معینہ پر کیا کرتے تھے اور تمام افراد کا خیال کرتے تھے۔ عدالت کا وقت ہوتا عدالت کرتے تھے۔ رشد و ہدایت کا موقع ہوتا تو وعظ و تلقین فرماتے۔ جنگ کا موقع ہوتا تو سپہ سالار بن جاتے، نماز کا وقت ہوتا تو امامت فرماتے مگر جب عام مسلمانوں میں آتے تو ان کے حقوق کی نگہداشت فرماتے۔ محلہ داروں سے ملتے، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتے، ہمسایوں سے ان کی ضروریات دریافت کرتے، بیماروں کی عیادت کے لیے جاتے۔ اگر کوئی جنازہ ہوتا تو اس میں شرکت فرماتے۔ حالی مرحوم نے اسی لیے کہا تھا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماؤی
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ (۳)

آپ ﷺ کے تعلقات کی وسعت:

آپ ﷺ نے ایک دفعہ ایک یہودی سے قرض لیا، اس نے میعاد مقررہ سے قبل ہی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ایک دن تو اس کا مطالبہ حد سے بڑھ گیا اور اس نے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ کر سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کہ ''میعاد مقررہ میں تین دن باقی ہیں''۔

اتنی دیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اس یہودی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روکا اور فرمایا: ''عمر تمھارا یہ حق نہ تھا کہ اسے مارتے ہاں اتنا کہہ سکتے تھے کہ بھئی میعاد مقررہ سے پہلے مطالبہ صحیح نہیں ہے اور مجھے یہ کہتے کہ آپ ﷺ جہاں تک ہو سکے جلد ادائیگی قرض کی فکر کریں'' (۴)۔

یہودی نے جب آپ ﷺ کی یہ نرمی اور خلق دیکھا تو اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

ہمسایہ اقوام سے تعلقات:

ایک دفعہ ایک یہودی عورت نے عرض کیا: ''میری دعوت قبول فرمایئے'' (آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ امیر سے امیر اور غریب سے غریب جو بھی آپ ﷺ کو دعوت کا کہتا آپ ﷺ منظور فرمالیا کرتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس یہودیہ زینب کی دعوت بھی منظور فرمالی۔ جب کھانا کھانے بیٹھے اور ابھی پہلا ہی لقمہ اٹھایا تو آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس کھانے میں زہر ملا دیا گیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور آپ ﷺ کے ایک صحابی جو آپ کے ساتھ ہی کھانا کھا رہا تھا، اسی زہر کے اثر سے شہادت پا گیا (۵)۔

آنحضور ﷺ کی ظرافت:

مذاق، مزاح، خوش طبعی، دل لگی وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جو انسانی فطرت میں داخل ہیں اور عصر حاضر کی تہذیب کے لوازمات میں گنے جاتے ہیں۔ وہ انسان جو خوش مذاق نہ ہو، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق نہ کر سکتا ہو، اسے بادہ کشان مغرب کے نزدیک اس دورِ مدنیت میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ ''عبوسا قمطریرا'' (خشک مزاج) ہے، مردہ دل ہے اور تہذیب جدید سے نا آشنا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ہمارے ساتھ میل جول میں مزاح فرماتے تھے۔

۲۔ ''عن عبداللہ بن حارث بن جزءؓ قال: ما رأیت احداً اکثر تبسماً من رسول اللہ ﷺ'' (۶) (میں نے کسی کو بھی حضور ﷺ سے زیادہ تبسم فرماتے ہوئے نہیں دیکھا)۔

۳۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ اکثر مجھ سے مذاق فرمایا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا ایسے مذاق پر کچھ مواخذہ تو نہ ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: '' ان اللہ لا یؤاخذ المزاح الصادق فی مزاحہ'' (۷) (اللہ تعالیٰ اس مزاحیہ کلام کا جو سچا ہو، مواخذہ نہیں فرمائے گا)۔

سنن ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ''کیا آپ ﷺ ہم سے مزاح فرماتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا، ''میں (ہنسی مذاق میں بھی ہمیشہ) حق بات ہی کہتا ہوں'' (۸)۔

اِن احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مزاح یا دل لگی جو سچ پر مبنی ہو اور اس پر جھوٹ کا شائبہ نہ ہو، نیز اس میں کسی کی دل آزاری یا توہین بھی مقصود نہ ہو تو وہ جائز ہے، بلکہ اگر کسی کا دل خوش کرنے کے لیے کوئی پُر لطف بات کی جائے، تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے خوش طبعی:

ایک دفعہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سواری کے لیے ایک اونٹ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں اونٹ کا بچہ دوں گا''۔ اس نے عرض کیا: ''حضور ﷺ! میں اُونٹ کے بچے کو لے کر کیا کروں گا؟ مجھے تو سواری کی ضرورت ہے، اُونٹ دلوایئے''۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! تجھے اُونٹ کا بچہ ہی دیا جائے گا''۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ لوگ ہنسنے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا: نادان! آخر اونٹ بھی تو اونٹ کا بچہ ہی ہو گا''(۹)۔

بوڑھی عورت سے خوش طبعی:

حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب جو بہت بوڑھی تھیں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں: ''حضور! دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمائے''۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے ام فلاں بوڑھے جنت میں نہیں جائیں گے''۔ وہ حیران رہ گئیں اور اسی حیرانی میں رونے لگیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اسے بتا دو کہ تم بڑھاپے کی حالت میں جنت میں داخل نہ ہو گی''۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً ۝ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴾ (۱۰) (اُن کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں باکرہ بنا دیں گے) حاشیہ میں ہے کہ وہ بوڑھی حضرت زبیر بن عوام ؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ تھیں (۱۱)۔

ایک صحابیہؓ سے خوش کلامی:

ایک دفعہ ایک عورت اپنے خاوند کا کچھ تذکرہ کر رہی تھی۔ آپ ﷺ نے از راہ تفنن فرمایا: ''تیرا خاوند وہی ہے جس کی آنکھ میں سفیدی ہے''۔ اس نے عرض کیا ''نہیں حضرت! میرے خاوند کی آنکھیں تو بالکل بے داغ ہیں''۔ اسے یہ خیال نہ آیا کہ ہر شخص کی آنکھ کا ایک حصہ سفید بھی ہوتا ہے (۱۲)۔

نبی اکرم ﷺ حضرت انس ؓ کو مزاحاً ''دو کانوں والے'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ (۱۳)

اس میں یہ بھی نکتہ ہے کہ حضرت انس ؓ نہایت ہی اطاعت شعار اور ہر وقت رسول ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔

حضرت علی ؓ سے خوش طبعی:

ایک دن آپ ﷺ چند صحابہ ؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک دوست کچھ کھجوریں لے آیا جو بطور تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ آپ ﷺ نے سب دوستوں کو حکم دیا کہ کھاؤ اور خود بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ حضرت علی ؓ جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے آپ ﷺ کے پاس بیٹھے

تھے۔ آپ ﷺ ازراہ مذاق کھجوریں کھا کر گٹھلیاں ان کے آگے رکھنے لگے۔ جب دوسرے صحابہ ؓ نے دیکھا تو وہ بھی گٹھلیاں حضرت علی ؓ کے آگے ڈھیر کرنے لگے۔ جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا بھائی بتاؤ سب سے زیادہ کھجوریں کس نے کھائیں''؟

صحابہ ؓ نے جواب دیا ''حضور! جس کے آگے گٹھلیاں سب سے زیادہ ہیں''۔ حضرت علی ؓ بھی بہت ذہین تھے، فوراً بول اٹھے ''نہیں نہیں بلکہ وہ جو گٹھلیوں سمیت کھا گئے ہیں''۔ یہ سن کر سب ہنس پڑے (۱۴)۔

آنحضور ﷺ بحیثیت معلم:

حضرت محمد ﷺ دنیا میں معلم بن کر تشریف لائے، آپ کا اپنا ارشادِ گرامی ہے: ''انما بعثت معلما'' (۱۵) (سوائے اس کے نہیں کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس اشارہ پر وہ لوگ جنھیں علم سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا پروانہ وار لپکے اور تحصیل علم کے لیے آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور علم حاصل کر کے بڑے بڑے عالم بن گئے۔

اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان اللّٰه وملائكته وأهل السمٰوٰت والارضين حتى النملة فى جحرها وحتى الحوت ليصلون على معلم الناس الخير'' (۱۶) (بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اور زمین و آسمان والے یہاں تک چیونٹی اپنی بل میں اور سمندر کی مچھلی بھی معلم کے لیے بھلائی کی دعا کرتے ہیں)۔

بے عمل عالم کے متعلق فرمایا: ''ان اشد الناس عذابا يوم القيٰمة عالم لم ينفعه الله بعلمه'' (۱۷) (روزِ قیامت سب سے شدید عذاب اس عالم کو دیا جائے گا جسے اللہ نے اس کے (اعمال کی وجہ سے اس کے) علم سے فائدہ نہ (اٹھانے) دیا)۔

طلباء سے مزید فرمایا: ''تواضعوا لمن تتعلمون منه'' (۱۸) (تم جس استاد سے علم حاصل کرتے ہو، اس کا ادب و احترام کرتے رہو)۔ کسی محدث کا قول ہے: ''ابوك ثلاث من ولّدكُ ومن علّمك ومن زوّجك'' (۱۹) (تمھارے تین باپ ہیں: تمھارا والد، تمھارا استاد،

تمھارا سسر)۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ بچوں کو تعلیم سے دور رکھتے تھے اور انھیں کام پر لگا دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے والدین کے فرائض میں یہ بات شامل فرمائی کہ وہ اپنی اولاد کو لکھنا، پڑھنا سکھائیں۔

رسول اللہ ﷺ کی علم سے محبت:

ایک دفعہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے، دو جماعتیں الگ الگ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک ذکرِ الٰہی میں منہمک تھی دوسری جماعت درس و تدریس میں مصروف تھی۔ آپ ﷺ کے تشریف لانے پر دونوں جماعتیں چشم براہ تھیں کہ حضرت ﷺ ہمارے ہاں قدم رنجہ فرمائیں مگر آپ ﷺ کو چونکہ درس و تدریس اور علم سے زیادہ محبت تھی اس لیے آپ ﷺ اس علمی جماعت میں تشریف لے گئے جہاں کتاب و سنت کی تعلیم دی جارہی تھی اور علمی گفتگو ہو رہی تھی (۲۰)۔

رسول اللہ ﷺ بحیثیت مصلح:

دنیا میں بڑے بڑے مصلح، بڑے بڑے ہادی، راہنما، پیشوا، لیڈر اور ریفارمر گزرے ہیں جنھوں نے قوم کی اصلاح میں اپنی عمریں خرچ کر دی تھیں مگر اس ہادیٔ عرب ﷺ نے جس خوبی اور عقلمندی سے چند ہی سالوں میں عرب جیسے جاہل اور اجڈ بدوؤں کی اصلاح کر دی تھی اور اصلاح بھی ایسی کہ آنے والی نسلوں میں بھی برابر جاری رہی ایسی اصلاح یقیناً دنیا کے کسی مصلح سے نہیں ہو سکی۔

رسمِ غلامی کی اصلاح:

مدت سے دنیا میں غلام بنانے کی رسم چلی آ رہی تھی اور کسی مذہب نے اس رسم کو معیوب قرار نہیں دیا تھا یہاں تک کہ عیسائی مذہب نے بھی اس کے متعلق کوئی قانون مرتب نہ کیا تھا، بلکہ غلاموں کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا کہ اپنے آقاؤں کی جو تمھارے جسم کے مالک اور مختار ہیں، ہمیشہ اطاعت کرو (۲۱)۔

رسول اللہ ﷺ نے حکمت بالغہ سے غلاموں کے احوال کی بتدریج اصلاح کی اور اسلام کی انسانی قدروں پر مبنی پاکیزہ تعلیمات کی بدولت غلامی کی رسم رفتہ رفتہ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس کے بارے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ”جس شخص نے ایک مومن کی گردن آزاد کرائی وہ اس کے لیے آگ

سے بچاؤ کا ذریعہ ہوگی''(۲۲)۔

لڑکیوں پر مظالم کی اصلاح:

عرب میں رواج تھا کہ جب کسی کے گھر لڑکی پیدا ہوتی تو اسے نہایت سنگدلانہ طریق پر زندہ درگور کر دیتے تاکہ اس کی تربیت اور شادی وغیرہ کے مسائل سے رہائی مل جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے آتے ہی اس رسم کو بھی جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور لڑکیوں کی تربیت اور پرورش کے متعلق وہ احکام نافذ فرمائے کہ وہی عرب نہ صرف لڑکیوں کو زندہ رکھنے پر مجبور ہوئے بلکہ ان کی تربیت اور شادی کو ثواب سمجھنے لگے اور ان کی کفالت کرنے لگے۔

عرب طلاق کے بارے میں بھی عورتوں کو کے بارے میں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا پھر طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا غرضیکہ ان کے ہاں رُجعت کی کوئی میعاد مقرر نہ تھی جس سے عورتیں سخت تنگ آئی ہوئی تھیں۔ حضور ﷺ نے مسئلہ طلاق میں بھی ان کی اصلاح کی اور احکام خلع جاری فرمائے جن سے ایک حد تک عورتوں کو بھی علیحدگی کا استحقاق حاصل ہو گیا۔

انسانیت پر ظلم کی اصلاح:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اسے تمام مخلوقات پر عزت و کرامت بخشی، مگر اس شرف انسانیت سے قریش مکہ آگاہ نہ تھے، وہ اینٹ اور پتھر کے بتوں کے آگے دست بستہ کھڑے ہوتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ دیوتاؤں کے نام کی نذر و نیاز دیتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ بزرگوں کے ان بتوں کی وجہ سے ان کی بگڑی بن جاتی اور سب مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس باطل نظریئے کی تردید فرمائی اور توحید کا اعلان فرمایا اور برملا کہا: ''**من مات وهو يعلم أنه لااله الا الله دخل الجنة**''(۲۳)(جو فوت ہوا اور وہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ جنت میں جائے گا)۔ اور فرمایا: اشرف المخلوقات ہو کر درختوں اور پتھروں کے آگے گرنا اور سجدہ ریز ہونا یوں بھی انسانیت کی توہین ہے۔ آنجناب ﷺ نے شرف انسانیت کا تحفظ فرمایا، اسے بتوں سے ہٹا کر صرف اللہ کے آگے جھکایا اور نکتہ توحید سمجھایا۔

وہ لوگ اپنی خاندانی وجاہت، حسب نسب، مال و دولت اور دنیوی باتوں میں ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس نظریے کی تردید کی اور فرمایا: " کلکم من بنی آدم و آدم من تراب" (۲۴) (تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے)۔

فرمایا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۲۵) تم میں اللہ کے ہاں زیادہ معزز و محترم وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔

عقائد کی اصلاح:

جناب رسالت مآب ﷺ نے ایمان و عقائد کی اصلاح کے لیے اساسی چیز کی معرفت کچھ اس طرح کروائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "خط رسول اللّٰه علیه وسلم خطاً وخط عن یمین ذلك، ا'خط و عن شماله خطا ثم قال هذا صراط ربك مستقیما، وهذه السبل علی کل سبیل منها شیطان یدعو إلیه. ثم قرأ وأن هذا صراطی مسقیما فاتبعوه ولاتتبع السبل فتفرق بکم عن سبیله" (۲۶) (رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا پھر آپ ﷺ نے اس سیدھے خط کے دائیں اور بائیں خط کھینچے پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے اور یہ راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے آیت مبارکہ پڑھی، اور یہ بلاشبہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو، مختلف راستوں پر نہ چلو تب تم اس (اللہ) کی راہ سے بھٹک جاؤ گے)۔

حضور ﷺ کا حلیۂ مبارک:

حضور اکرم ﷺ جس طرح سیرت میں لاجواب تھے صورت میں بھی بے مثال تھے:

تیری صورت تیری سیرت تیرا نقشہ تیرا جلوہ
تبسم گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ کا کتنا پیارا نقشہ پیش کرتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

واحسن منك لم ترقط عين   واجمل منك لم تلد النساء

خلقت مبرأ من كل عيب   كانك قد خلقت كما تشاء

(اے کونین کے تاجدار ﷺ! آپ ﷺ سے زیادہ حسین کسی آنکھ نے دیکھا ہی نہیں اور آپ ﷺ سے بڑھ کر جمیل کسی ماں نے جنا ہی نہیں۔ آپ ﷺ ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے آپؐ اپنی مرضی کے مطابق پیدا ہوئے ہیں)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شب میں بارگاہِ نبوی میں پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ آرام فرما رہے تھے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ ضوبار تھا اور جب میں نے حضور ﷺ کے رُخِ اقدس کو دیکھا تو اس سے نور کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا کہ آسمان پر بدرِ منیر ضوء ریز تھا اور زمین پر سراجِ منیر جلوہ بار تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ دونوں کے حسن کا تقابل کرنے کے بعد اپنی آزادانہ رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں: " **فهو عندی أحسن من القمر** " (۲۷) (میرا آقا! اس چاند سے کئی گنا بڑھ کر خوبصورت ہے)۔

حضور ﷺ بطورِ مبلغ:

آپ ﷺ بے شک ایک خاوند بھی تھے، ایک باپ بھی تھے، ایک امام بھی تھے، ایک حاکم بھی تھے مگر یہ سب کی سب صفتیں تبلیغی حیثیت کے تابع تھیں۔ اگر آپ ﷺ شوہر ہیں تو محض اس لیے کہ دنیا کے سامنے ایک بہترین شوہر ہونے کا اسوہ پیش کریں۔ اگر آپ امام یا حاکم تھے تو صرف اس لیے کہ دنیا کے سامنے امامت اور حکومت کا صحیح نقشہ پیش کریں۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا رسول اور پیغام بر بنایا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، زندگی کی ہر راہ میں، عمل کے ہر شعبہ میں مبلغ تھے۔ آپ ﷺ کا ذکر تبلیغ تھا۔ آپ ﷺ کی عبادت و ریاضت تبلیغ تھی، آپ ﷺ کی سپہ گری اور کشور کشائی تبلیغ تھی۔ آپ ﷺ تبلیغ کا پیکر تھے اور سراپا تبلیغ تھے۔ آپ ﷺ مبلغ پیدا ہوئے۔ مبلغ بن کر جیے اور تبلیغ کرتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

تبلیغ کے چار اہم محرکات ہیں:

1: فریضہ تبلیغ کا شدید احساس۔

۲: رضائے الٰہی کا بے پناہ شوق۔

۳: انسانیت کا سچا درد۔

۴: اُخروی کامیابی کی غیر معمولی فکر۔

یہ تمام چیزیں رسول اللہ ﷺ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

حضور ﷺ بحیثیت زاہد و عابد:

نبی کریم ﷺ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ ﷺ نے تمام عمر (مدینہ کی حکمرانی کے دوران بھی) دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ میں آ کر (جب کہ سب مسلمانوں کی حالت بہتر سے بہتر ہو چکی تھی) برابر تین دن تک گیہوں کی روٹی کبھی نہیں کھائی اور ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ جَو کی روٹی بھی متواتر دو روز تک نہیں کھائی (۲۸)۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بھوک کی شکایت کی اور دامن اٹھا کر دکھایا: ''کہ پیٹ پر پتھر باندھ رکھے ہیں''۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے ہماری تسکین کے لیے اپنا دامن اٹھایا تو ہم نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے اپنے شکم مبارک سے دو پتھر باندھے ہوئے ہیں (۲۹)۔

حضرت حفصہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا بستر جو آپ ﷺ کے گھر میں تھا، ایک ٹاٹ پر مشتمل تھا، ہم اس کو دوہرا کر دیتے تھے۔ آپ ﷺ اس پر سو رہتے تھے۔ ایک بار ہم نے اس کو آپ ﷺ کے لیے چوہرا کر دیا۔ جب آپ ﷺ نے صبح کی تو فرمایا: ''تم نے آج رات میرے نیچے کیا بچھا دیا تھا''۔ ہم نے عرض کیا وہی ٹاٹ تھا مگر اُسے چوہرا کر دیا تھا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اسے ویسے ہی کر دو جیسے پہلے تھا، کیونکہ اس کی نرمی نے آج مجھے شب کی نماز سے روک لیا'' (۳۰)۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نبی ﷺ کے ساتھ باہر کی طرف نکل گیا۔ سامنے احد پہاڑ تھا۔ آپ ﷺ نے احد پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا: ''اے ابوذر رضی اللہ عنہ! اگر میرے پاس احد جتنا سونا ہو تو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ تین دن سے زیادہ میرے پاس جمع رہے۔

ہاں اگر ایسا ہوتو اپنے قرضہ کے مطابق (جو لوگوں کو دینا ہے) رکھ لوں اور باقی سب کا سب بانٹ دوں"(۳۱)۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ آپ ﷺ کا زہد صرف اپنی ذات تک محدود نہیں تھا، بلکہ جو بھی آپ ﷺ سے محبت کرتا تھا، آپ اسے دنیوی عیش سے بے رغبتی کی ایسی ہی تعلیم فرماتے تھے۔

خصوصاً اپنے اہل و عیال کو تو ہر حالت میں اپنے ساتھ شریک رکھتے چنانچہ اکثر طور پر آپ ﷺ کی یہ دعا ہوا کرتی تھی: "اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا" (۳۲) (اے اللہ! آل محمد ﷺ کی روزی بقدر گزار (یعنی قوت لا یموت) کر دے) جس سے صرف زندگی قائم رہے۔

حضور ﷺ باوجود کثیر المشاغل ہونے کے جب عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاید عبادت کے سوا آپ ﷺ کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ دن بھر تو بوجہ دیگر مشاغل کے آپ ﷺ کو تنہائی کا موقع بہت ہی کم ملتا مگر رات کو تھوڑا سا آرام فرمانے کے بعد قریباً آپ ﷺ اپنا سارا وقت عبادت ہی میں صرف کر دیتے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ آپ اکثر گیارہ رکعت تہجد پڑھا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی یہ نماز اتنی لمبی ہوتی کہ ایک ایک سجدہ پچاس پچاس آیتوں کے برابر کرتے (۳۳)۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک رات میں نبی ﷺ کے پاس سویا۔ ابھی تھوڑی رات گزری تھی کہ حضور ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے، وضو کیا، نماز پڑھی، آپ ﷺ نے اس نماز میں اپنے قیام اور رکوع و سجود کو بہت دراز کیا۔ پھر سو گئے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے، بعد ازاں آپ ﷺ پھر اُٹھے، وضو کیا اور اسی طرح نماز پڑھی اور پڑھ کر سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُٹھے اور اسی طرح نماز پڑھی (۳۴)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو کھڑے ہوتے یہاں تک صبح ہو جاتی اور آپ ﷺ کے قدموں میں ورم آ جاتا، حضرت عائشہؓ نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اللہ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے تمام کے تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "افلا احب ان اکون عبداً شکوراً" (۳۵)۔

''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آنحضرت ﷺ کے ہم رکاب تھا۔ آپ ﷺ نے مسواک کی، وضو فرمایا اور نماز میں کھڑے ہو گئے۔ میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شریک ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ شروع کی۔ جب کوئی آیت رحمت آتی تو آپ ﷺ دیر تک رحمت کی دعا مانگتے رہتے اور جب آیت عذاب آتی تو آپ ﷺ دیر تک عذاب سے پناہ مانگتے رہتے۔ یہاں تک کہ پوری سورۃ ختم ہو جاتی پھر رکوع کرتے اور اتنا لمبا رکوع کرتے جتنی دیر قیام فرماتے تھے اور رکوع میں ''سبحان ذی الجبروت والملكوت والكبرياء والعظمة'' پڑھتے جاتے، پھر اتنا ہی لمبا سجدہ کرتے۔ پھر دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران پڑھتے اور اسی طرح ایک ایک رکعت میں ایک سورہ پڑھتے رہتے (اس طرح چار رکعت میں سوا چھ پارے پڑھتے)(۳۶)۔

حضرت ابو عبداللہ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: وہ کہتے ہیں میں نے ایک رات نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ شروع کی، میں نے خیال کیا کہ سو (۱۰۰) آیات پڑھ کر رکوع کریں گے مگر آپ ﷺ پڑھتے گئے اور سورۂ بقرہ ختم کر کے سورہ آل عمران شروع کر دی پھر میں نے خیال کیا کہ شاید یہ سورہ ختم کر کے رکوع میں جائیں گے مگر آپ ﷺ نے سورۂ آل عمران ختم کر کے سورۂ شروع کی اور اسے مکمل کیا۔ رکوع اور سجود میں بھی اطمینان کا خیال رکھتے رہے......الخ (۳۷)۔

آنحضرت ﷺ بطور بزرگ:

ایک دفعہ حضور ﷺ وضو کے لیے اُٹھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دوڑ کر آپ کے لیے پانی لے آئے۔ آپ ﷺ کو ایک بچہ کی یہ خدمت گزاری بہت اچھی معلوم ہوئی اور آپ ﷺ نے اس وقت ان کے لیے دعا کی: ''اللهم علمه الكتاب''(۳۸) (الٰہی! اسے کتاب کا علم دے)۔

اسی دعا کی برکت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بڑے مفسر، محدث اور فقیہہ ہو گئے اور دنیا نے ان کے علم کا اعتراف کیا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہو کر عرض کیا کہ ''حضور ﷺ! مجھ پر اس قدر قرض ہو گیا ہے کہ بظاہر اس کی ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ میں ہر وقت اس غم اور فکر میں کڑھتا رہتا ہوں۔ خدارا مجھے کچھ بتایئے کہ جس سے یہ فکر و اندیشہ دور ہو اور میں آرام کی زندگی بسر کر سکوں''۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''غم نہ کر میں تجھے ایک ایسا وظیفہ بتاتا ہوں جس سے تیرا قرض بھی ادا جائے گا اور اطمینان بھی حاصل ہو جائے گا''۔

چنانچہ حضور ﷺ نے اسے یہ وظیفہ صبح و شام پڑھنے کے لیے فرمایا: ''**اللھم انی اعوذبك من الھم والحزن واعوذبك من العجز والکسل والبخل والجبن وضلع الدین وغلبة الرجال**'' (۳۹) (اے اللہ! میں پریشانی، غم، درماندگی، سستی، بخیلی، بزدلی اور زیادتی قرض اور لوگوں کے غلبہ سے پناہ مانگتا ہوں)۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے اسے چند ہی روز پڑھا تو میری ساری فکر دور ہو گئی اور قرض بھی اتر گیا۔

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے مجھے ایک وظیفہ بتایا کہ جس بیمار پر سات مرتبہ پڑھ کر دم کروں، اللہ تعالیٰ اسے شفا بخشے۔ وظیفہ یہ ہے: ''**اسئال اللہ العظیم رب العرش العظیم ان یشفیك اللہ**'' (۴۰) (میں اللہ عظیم سے جو عرش عظیم کا رب ہے سوال کرتا ہوں کہ وہ تمھیں شفا سے ہم کنار فرمائے)۔

آنحضرت ﷺ بطور تاجر:

جب نبی ﷺ جوان ہوئے تو آپ ﷺ کا خیال بھی تجارت کی طرف مائل ہوا، آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام میں تجارت کے لیے گئے (۴۱)۔

آپ ﷺ نے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد بھی تجارت کا خیال نہیں چھوڑا۔ آپ ﷺ اکثر تاجروں کے ساتھ اپنا حصہ رکھ دیتے تھے۔ اپنے دوستوں کو تجارت کی ترغیب دلاتے، تجارت کے اصول بتاتے۔ تجارت کے فضائل ان کے ذہن نشین کراتے رہتے، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جو شخص آپ ﷺ سے جتنا قریب ہوتا اتنا ہی وہ تجارتی دنیا میں بھی زیادہ مشہور ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''**التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء**'' (۴۲) (وہ تاجر جو سچ بولے اور امین ہو، وہ قیامت کو نبیوں، صدیقوں اور

شہیدوں کے ساتھ ہوگا)۔

آنحضور ﷺ بطور سخی:

حضور ﷺ زاہد بھی تھے اور سخی بھی تھے، مگر زاہد ایسے کہ زہد و ورع آپ ﷺ ہی پر ختم ہیں اور سخی ایسے کہ جو آیا دے دیا، اپنے لیے کچھ بھی نہ رکھا اور نہ ہی رکھنے کا خیال کبھی آیا۔

جود و سخا کی یہ صفت جو حضور ﷺ میں پائی جاتی ہے، گو امت میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو اس سے متصف ہو سکتے ہیں، تاہم اس سے ہمیں یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ عند الضرورت جب کوئی ایسی قومی، ملکی، مذہبی خدمت پیش آ جائے تو پھر دریغ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ پوری سخاوت سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"خصلتان لا تجتمعان فی مومن، البخل وسوء الخلق"** (۴۳) (مومن میں دو خصلتیں کبھی جمع نہیں ہو سکتیں، بخل اور برے اخلاق)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے الگ الگ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی سائل نے سوال نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے اسے نفی میں جواب دیا ہو اور اسے کچھ نہ کچھ دے نہ دیا ہو، اسی لیے کسی نے کہا:

نہ رفت کلمہ "لا" برزبان او ہرگز
مگر بہ اشھد ان لا الہ الا اللہ

(حضور ﷺ کی زبان اقدس پر سوائے کلمہ شہادت کے "لا" کے کبھی "لا" نہیں آیا) مطلب یہ کہ آپ ﷺ نے کسی کو "نہ" نہیں کیا۔

صفوان بن سلیم کہتے ہیں کہ ایک دفعہ قبل از بعثت میں نے حضور ﷺ سے کچھ اونٹ مانگے، آپ ﷺ نے ایک سو اونٹ مجھے دے دیے، میں نے اور مانگے، آپ ﷺ نے سو اونٹ اور دے دیے۔ میں نے مزید کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ایک سو اور دے دیے (۴۴)۔

اس واقعہ سے جہاں حضور ﷺ کی دریا دلی کا پتہ چلتا ہے وہاں ساتھ ہی ہمیں حضور ﷺ کی دولت مندی اور مالداری کا پتہ بھی چل جاتا ہے کہ آپ ﷺ اس وقت تجارت سے کس قدر روپیہ کمایا کرتے تھے۔

گداگری کی کراہت وحرمت:

ایک دفعہ ایک سائل آپ ﷺ کے پاس آیا، وہ جوان اور تندرست آدمی تھا۔ آپ ﷺ نے اسے سمجھایا کہ ''طاقت والے کے لیے مانگنا حلال نہیں ہے جو شخص اپنی روزی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے''۔

پھر آپ ﷺ نے اس سے پوچھا ''تیرے گھر میں کچھ ہے؟''

اس نے کہا: ''ہاں ایک کمبل ہے اور ایک پیالہ''۔

فرمایا: ''جا! لے آ''۔

جب لایا تو انھیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''ان کو کون خریدتا ہے؟''

ایک شخص نے کہا: ''میں ایک درہم میں خریدتا ہوں''۔

آپ نے فرمایا: ''کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟''

ایک شخص نے کہا: ''میں دو درہم میں لیتا ہوں''۔

آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اسے دے کر دو درہم اس سے لے لیے اور سائل کو دے کر فرمایا: ''ایک درہم کی تو ضرورت کی اشیاء خرید کر گھر میں اپنے اہل وعیال کو دے دے اور دوسرے درہم کا ایک کلہاڑا خرید کر میرے پاس لے آ''۔

جب وہ کلہاڑا خرید لایا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک لکڑی اس میں ٹھونک دی اور فرمایا: ''کہ جا لکڑیاں جمع کر اور بیچ اور پندرہ دن کے بعد آنا''۔

وہ لکڑیاں جمع کرتا اور بیچتا رہا۔ جب رسول خدا ﷺ کے پاس آیا تو دس درہم اس کے پاس جمع تھے۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''اس کا تو کپڑا اور غلہ خرید لے اور آئندہ بھی اسی طرح قوت بازو سے کام لے، یہ تیرے لیے سوال کرنے سے بہت ہی بہتر ہے'' (۴۵)۔

آنحضور ﷺ کی نظافت:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ مسواک سے بہت محبت رکھتے تھے۔ جب آپ ﷺ وضو کرتے مسواک ضرور کرتے۔ ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب جبرائیل علیہ السلام آتا ہے تو

مجھے مسواک کا حکم دیتا ہے۔حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم مسواک کرو بے شک مسواک منہ کو پاک کرنے والی اور رب کی رضا کو حاصل کرنے والی ہے جب میرے پاس جبرائیلؑ آتے ہیں وہ ہمیشہ مسواک کی تاکید کرتے ہیں" (۴۶)۔

حضور ﷺ نے ہر نماز کے لیے اپنی امت کو جو وضو کی تعلیم دی ہے، اگر سوچا جائے تو روحانی فوائد کے علاوہ اس میں بہت سے طبی فوائد بھی مضمر ہیں۔

حضور ﷺ نے جسمانی پاکیزگی کو اپنی امت کے لیے ضروری ٹھہرایا۔ دن میں پانچ مرتبہ وضو اور پھر ہر جمعہ کے دن غسل واجب قرار دیتے ہوئے فرمایا:" **اذا جاء احدكم الجمعة فليغتسل**" (۴۷) (جب کوئی جمعہ کے لیے آئے تو غسل کرے)۔ پھر فرمایا:"**الغسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم وأن يستنّ وأن يمس طيباً إن وجد**" (۴۸) (ہر بالغ پر جمعہ کا غسل فرض ہے اور (چاہیے کہ وہ) مسواک کرے، اگر خوشبو میسر ہو تو وہ بھی لگائے)۔

آنحضور ﷺ بطور طبیب:

اکل و شرب کے حوالے سے تعلیمات نبوی کا خلاصہ یہ ہے کہ پر شکمی کی حالت میں دستر خوان کے قریب نہ جایا جائے اور بھوک کی حالت میں خوب سیر ہو کر نہ کھایا جائے۔ یہ تعلیم طبی حوالے سے انسانی صحت کا راز ہے۔

حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے:"**بركة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده**" (۴۹) (کھانے کی برکت یہ ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لیے جائیں اور کھانے کے بعد بھی)۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ صدر اول میں ایک بادشاہ نے مسلمانوں کی خدمت کے لیے اپنا ایک خاص طبیب بھیجا جو عرصہ تک مدینہ منورہ میں بیکار بیٹھا رہا اور اس کے پاس کبھی کوئی بیمار نہ آیا، بالآخر تنگ آ کر اس نے پوچھا:"اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے شہر میں آج تک ایک مریض بھی علاج کے لیے میرے پاس نہیں آیا"۔

اسے مسلمانوں کے طبیب اعظم ﷺ کی ان ہدایات کے بارے میں بتایا گیا۔ وہ طبیب یہ سن کر حیران رہ گیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جو قوم اپنے معدہ کی نگہداشت رکھتی ہے وہ کبھی بیمار نہیں ہو سکتی۔

اس پر وہ مدینہ منورہ چھوڑ کر چلا گیا(۵۰)۔

قوت بینائی کو بحال رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے ہمیں سرمہ استعمال کرنے کی تلقین فرمائی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:"عن جابر ؓ: قال قال رسول اللہ ﷺ علیکم بالاثمد فانه یجلوا البصر وینبت الشّعر" (۵۱)(حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اثمد سرمہ ضرور ڈالا کرو وہ نگاہ کو روشن بھی کرتا ہے اور پلکیں بھی اگاتا ہے)۔

"عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ ....وان خیر أ کحالکم الإثمد،یجلو البصر،وینبت الشعر" (۵۲)(ابن عباس ؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا رسول اللہؐ نے فرمایا بہترین سرمہ اثمد ہے جو نگاہ کو روشن کرتا ہے اور پلکیں بھی اُگاتا ہے)۔

حضور ﷺ شہد کو بہت پسند فرماتے تھے اور اکثر اس کا استعمال کیا کرتے تھے۔ بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تندرست آدمی مہینے میں تین دفعہ بقدر اشتہاء شہد استعمال کر لیا کرے تو ہمیشہ ہی تندرست رہ سکتا ہے اور جملہ امراض کے حملوں سے بچ سکتا ہے(۵۳)۔

حضرت اُم قیسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:"تم اپنے بچوں کو انگلی سے حلق دبا کر کیوں تکلیف دیتی ہو عود ہندی لو اس میں سات بیماریوں کی دوا ہے۔(۵۴)

بخار کا ذکر ہو رہا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا(صفراوی یا وبائی)"بخار دوزخ کی گرمی ہے۔ اسے پانی سے سرد کرو"(۵۵)۔

آنحضرت ﷺ بطور منصف:

کئی ایک چھوٹے چھوٹے مقدموں کے علاوہ حجرِ اسود جیسا اہم مقدمہ بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھوں فیصل ہوا۔قبائل میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس معاملے پر وہ جنگ و جدل ہوتا کہ خون کی ندیاں بہہ جاتیں،مگر جب انھوں نے حضور ﷺ پر یہ فیصلہ ڈال دیا تو آپ ﷺ نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر اس خوبی سے اس جھگڑے کو چکا دیا کہ مخالفین بھی اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک دفعہ ایک یہودی اور مسلمان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔یہودی نے کہا:"چلو محمد ﷺ سے اس کا فیصلہ کرا لیں"۔چونکہ یہود جانتے تھے کہ آپ ﷺ اعلیٰ درجہ کے منصف ہیں اس لیے وہ اپنے اکثر

مقدمات حضور ﷺ ہی کے پاس لایا کرتے تھے جبکہ وہ نام نہاد مسلمان چونکہ جھوٹا (منافق) تھا اس لیے وہ حضور ﷺ کے سامنے آنے سے ہچکچاتا تھا۔ کہنے لگا:

''چلو تمھارے یہودی سردار کعب بن اشرف کے پاس مقدمہ لے چلیں، وہ قریب بھی ہے اور تمھارا ہم مذہب بھی ہے''۔

یہودی جانتا تھا کہ وہ رشوت خور ہے جو زیادہ رشوت دیتا ہے وہ اسی کے حق میں فیصلہ صادر کرتا ہے اس لیے اس نے حضور ﷺ ہی کے پاس مقدمہ لے جانے پر اصرار کیا۔ چنانچہ مجبوراً مسلمان کو ماننا پڑا، مقدمہ پیش ہوا، شہادتیں لی گئیں اور حضور ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

باہر نکل کر اس ''منافق مسلمان'' نے یہودی سے کہا ''آخر حضور ﷺ بھی تو انسان ہی ہیں، ممکن ہے کہ غلطی کھا گئے ہوں۔ چلو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کچہری بھی راستہ ہی میں ہے، ان سے بھی فیصلہ لیتے چلیں''۔

جب وہاں پہنچے اور مقدمہ پیش ہوا تو یہودی نے پچھلی سرگزشت سنا دی اور کہا: ''بڑی کچہری کا فیصلہ میرے حق میں ہو چکا ہے اور چونکہ اسے اس سے اطمینان نہیں ہے، اس لیے اب یہ جناب کی طرف مقدمہ لایا ہے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے، اندر گئے اور تلوار لا کر اس منافق کا سرتن سے جدا کر دیا اور فرمایا: جسے حضور ﷺ کے فیصلے پر اعتماد نہیں ہے اس کی سزا یہی ہے، یعنی وہ واجب القتل ہے اور مرتد کے حکم میں ہے۔ یہ ایک آئینی غلطی تھی جو اس منافق سے ہوئی کہ عدالت اعلیٰ کی اپیل ماتحت عدالت میں کی، اس گستاخی کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب اس قتل کی اطلاع حضور ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''تم نے یہ کیا کیا''۔

اتنے میں وحی الٰہی آئی جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی تصدیق کی گئی اور اس دن سے آپ کو ''فاروق'' کا عظیم لقب عطا ہوا (۵۶)۔

حضرت اُسید رضی اللہ عنہ بن عمیر کہتے ہیں کہ وہ ایک روز آنحضرت ﷺ کے سامنے رنگین کپڑا پہن کر گئے۔ آنحضرت ﷺ نے چھڑی سے ان کے شکم میں ٹھوکا دیا۔ میں نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ میں تو قصاص لوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے جھٹ سے اپنا شکم برہنہ کر کے میرے سامنے کر دیا'' (۵۷)۔

ایک دفعہ شرفائے قریش کی ایک عورت فاطمہ بنت الاسود چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ مقدمہ پیش ہوا، ثبوت بہم پہنچ جانے پر حضور ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا۔ عمائدین قریش نے شرافتِ نسب کی وجہ سے اس سزا کو باعث عار سمجھ کر کوشش کی کہ کسی طرح آپ ﷺ فاطمہ کو بری کر دیں۔ اس کام کی تکمیل کے لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید کو آپ ﷺ کے پاس سفارشی بنا کر بھیجا گیا۔ حضور ﷺ نے خفگی کے لہجہ میں اُسامہ رضی اللہ عنہ (جن سے حضور ﷺ بہت محبت فرمایا کرتے تھے) سے فرمایا: ''اے اسامہ! اللہ کی مقرر کردہ سزا میں سفارش کو دخل دیتے ہو! خبردار! آئندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کرنا''۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ سب کو مسجد میں جمع کرو، جب لوگ آ گئے تو آپ ﷺ نے ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ایک حصہ یہ تھا ''تم سے پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوگئیں کہ جب کوئی بڑا جرم کا ارتکاب کرتا تو اسے رہا کر دیتے اور غریبوں کو سزا دیا کرتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر فاطمہؓ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جاتا'' (۵۸)۔

کیا عدل وانصاف اور مساوات کی ایسی مثالیں کوئی دوسرا جج بھی پیش کرسکتا ہے؟ یقیناً تاریخ عالم ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔

رسول اللہ ﷺ بطور سپہ سالار:

غزوہ بدر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ ۳۱۳ صحابہ رضی اللہ عنہم کا لشکر تھا اور مخالفین ابوجہل کی سرکردگی میں ایک ہزار کی تعداد میں جمع تھے، حضور ﷺ کی فنون جنگ میں کمال مہارت کی وجہ سے دشمن کو سہ چند ہونے کے باوجود شکست فاش ہوئی۔ مسلمان صرف ۱۴ شہید ہوئے۔ نہ کوئی زخمی ہوا نہ اسیر ہوا اور دشمن ۷۰ کی تعداد میں مقتول اور ۷۰ کی تعداد میں اسیر ہوئے (۵۹)۔

غزوہ فتح مکہ میں حضور ﷺ کے زیر کمان دس ہزار قدوسی تھے (۶۰) قریش مکہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکے، حضور ﷺ نے لشکر کو حکم دے دیا کہ مختلف راستوں سے شہر میں داخل ہوں اور جب تک کوئی مسلح دستہ مزاحم نہ ہو، ہتھیار کا استعمال نہ کیا جائے صرف ایک دستہ کی مزاحمت ہوئی اور مکہ بہ امن وامان فتح ہوگیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب کبھی گھمسان کا رن پڑتا، اور لڑنے والوں کی آنکھوں

میں خون اتر آتا تو اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے اور ہم سب سے آگے دشمن کی جانب نبی ﷺ ہی ہوتے تھے(۶۱)۔

رسول اللہ ﷺ بطور فاتح:

غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے ایک شاعر تھا، جو عام مجمع میں حضور ﷺ کے خلاف نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! اس کے دو نچلے دانت اکھڑوا دیجیے تاکہ پھر اچھی طرح بول نہ سکے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آج ہم اس کے عضو بگاڑیں گے تو خدا ہمارے عضو بگاڑ دے گا''۔ یعنی سرورِ کونین ﷺ نے دشمنوں پر زیادتی کرنے کی اجازت نہ دی۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (مجلس شوریٰ) سے مشورہ لیا کہ ''ان قیدیوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے''۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''فدیہ لے کر سب کو رہا کر دینا چاہیے'' (۶۲)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ لوگ کفر و شرک کے امام ہیں۔ خدا نے ہم کو ان پر غلبہ دیا ہے، اس لیے مسلمانوں کے خون کا اور ان پر انھوں نے جو جو ظلم کیے تھے، ان کا قصاص و انتقام لینا چاہیے اور ان کی گردنیں اڑا دینی چاہئیں۔ حضور ﷺ نے جو آئینہ رحمت تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو پسند فرمایا اور سب سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا (۶۳)۔

اسیران جنگ بدر کے بعد غزوہ بنی مصطلق میں چھ سو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، مگر ان سب کو حضور ﷺ نے بلا کسی فدیہ اور معاوضہ کے رہا کر دیا۔ ان قیدیوں کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے ہمارے ساتھ بچوں کا سا سلوک کیا جس طرح بچوں کی راحت و آرام کا لحاظ رکھا جاتا ہے، ویسا ہی ہمارے آرام کا خیال رکھا گیا (۶۴)۔

رسول اللہ ﷺ بطور حکمران:

رسول اللہ ﷺ نے عنان سلطنت کو ہاتھ میں لیتے ہی جو کام کیے وہ ملوک عالم سے اور کوئی حکمران بھی سرانجام نہیں دے سکا۔ آپ ﷺ نے عرب کی حکومت ہاتھ میں کیا لی، عرب کی کایا پلٹ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا بے نظیر انقلاب برپا ہوا کہ دنیا حیران رہ گئی۔

آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں عرب کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس کی تاریکی اور جہالت کو نور علم سے بدل دیا۔ باطل پرستی کو حق پرستی، نفس پروری اور خود غرضی کو ہمدردی سے، ظلم کو عدل و انکسار سے، گستاخی و سرکشی کو ادب و اطاعت سے، اور فاقہ کشی کو آسائش و خوش حالی سے تبدیل کر دیا۔ جہاں انسان انسان سے محفوظ نہ تھا، وہاں شیر بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پینے لگے۔ جہاں انسانی خون کی کوئی قدر نہ تھی وہاں چرند پرند کی حفاظت فرض ہوگئی۔ جہاں غلام کوڑی کوڑی کو بک کر نشانہ ظلم بنتا تھا وہاں غلاموں کو سرداری کا مرتبہ ملا، جہاں عورت باعث عار تھی، وہاں باعث رحمت اور محبوب ترین چیز ہو کر مقام ناز پر کھڑی کی گئی۔ جہاں مسافر لوٹے جاتے تھے، وہاں مسافر مہمان کے لیے اپنے پیٹ کی روٹی وقف کی جانے لگی۔

حالت مظلومیت میں جو فرمایا تھا: ''صنعا سے حضر موت تک ایک عورت اکیلی سفر کرے گی۔ اور اسے سوائے خدا کے کسی کا ڈر نہ ہوگا اور قادسیہ سے اکیلی عورت سونا اچھالتی ہوئی کعبہ کو آئے گی اور اس کا کوئی بال بیکا نہ کر سکے گا'' (۶۵)۔

یہ قول اس وقت کے حالات کے تحت ناممکن تھا، مگر چند ہی سالوں میں جن کے کانوں نے یہ آواز سنی تھی ان کی آنکھوں نے یہ نظارے بھی دیکھ لیے۔

رسول اللہ ﷺ کے حکومتوں سے معاہدے:

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر اپنی سیاسی زندگی میں سب سے پہلے یہ مناسب خیال فرمایا کہ جملہ اقوام سے ایک معاہدہ بین الاقوامی اصول پر کیا جائے تاکہ نسل اور مذہب کا اختلاف قومیت کی وحدت سے مبدّل ہو جائے اور سب کو تمدن و تہذیب میں ایک دوسرے سے مدد ملتی رہے۔ ''رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی'' میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

آپ ﷺ کی سادگی:

شاہ عرب نہیں، شاہ دو جہاں ہونے کے باوجود بھی نبی ﷺ کی طبیعت اس قدر سادہ تھی کہ جب آپ ﷺ صحابہ کرام ؓ کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ ان میں بادشاہ کون ہے اور دربان کون؟ آپ ﷺ نے دربارِ عام میں بیٹھنے کے لیے کوئی خاص نشست گاہ نہ بنا رکھی تھی کہ جس سے

امتیاز ہوسکتا۔ نہ تخت نہ کرسی تھی، نہ پلنگ تھا نہ چٹائی تھی بلکہ عام طور پر رسول اللہ ﷺ فرش ہی پر تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔

رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ مخالفین جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے تو کانپ جاتے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ جھجک سا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اسے دیکھا تو فرمایا ''ڈر نہیں! میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھیں'' (٦٦)۔

غیر مسلموں کی میزبانی:

غیر مسلم مہمانوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس بات کا اندازہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بیان سے ہوتا ہے جس میں آپؓ فرماتے ہیں کہ جب وہ کافر تھے تو مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر مہمان رہے اور رات کو تمام بکریوں کا دودھ پی گئے جبکہ گھر والوں نے فاقہ کیا (٦٧)۔

اس سے جہاں رسول اللہ ﷺ کی مہمان نوازی کا علم ہوتا ہے، وہیں ان آفاقی انسانی قدروں کا بھی پتہ چلتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ایک عام انسان ہونے کے ناطے دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔

ایک دفعہ حبش کے بھیجے ہوئے سفیر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ بذات خود ان کی مہمانی اور مدارات میں مصروف ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''آپ ﷺ تشریف رکھیں ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب مسلمان حبش گئے تھے تو ان لوگوں نے ان کی خدمت کی تھی۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں بھی ان کی خدمت کروں'' (٦٨)۔

ہمسایوں کی خبر گیری:

آپ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے ابوذر رضی اللہ عنہ! جب تو شوربا پکائے تو اس میں پانی زیادہ ڈال دے تاکہ اپنے ہمسایوں کو بھی اس میں سے کچھ دے سکے'' (٦٩)۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک شہری ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اگر کوئی بدوی یا دیہاتی آدمی شہر میں آ جائے تو خرید و فروخت میں اس کی معاونت کرنی چاہیے۔ کئی بدوی ایسے تھے جن کا

رسول اللہ ﷺ سے دوستانہ تھا، وہ جب آتے تو گاؤں کی کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کے لیے بطور تحفہ لے آتے اور آپ ﷺ واپسی پر انھیں شہر کی کوئی نہ کوئی چیز بطور تحفہ دے دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ بعض دیہاتی لوگ اس خیال سے کہ دکان دار ہمیں دھوکا نہ دے جب کچھ خریدنا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ لے لیتے۔ آپ ﷺ بازار جا کر ان کو سودا خرید دیتے۔ اگر انھوں نے فروخت کرنا ہوتا تب بھی رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ جاتے اور مال فروخت کروا دیتے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دارالعلم، بیروت) ۲/ ۷۵۸۔

۲۔ المنافقون: ۹۔

۳۔ حالی، الطاف حسین، کلیات نظم حالی (مجلس ترقی ادب، لاہور) ۱/ ۱۲۸۔

۴۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور ۱۹۹۱ء) ۲/ ۱۴۳۔

۵۔ ابن القیم، ابوعبداللہ محمد بن بکر، زاد المعاد (اردو مترجم: رئیس احمد جعفری) (نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۵ء، طبع دوم) ۳/ ۲۷۵۔

۶۔ الخطیب التبریزی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (دارالفکر، بیروت ۱۹۹۱ء، الطبعۃ الاولیٰ) ۳/ ۲۷، حدیث نمبر ۴۷۴۸۔

۷۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۲۳۴۔

۸۔ الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، السنن (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، الطبعۃ الاولیٰ) ص ۴۶۰، حدیث نمبر ۱۹۹۰۔

۹۔ الترمذی، السنن، ص ۴۶۰، حدیث نمبر ۱۹۹۱؛ الترمذی، الشمائل المحمدیہ (دارالمطبوعات الحدیثۃ، جدہ ۱۹۸۸ء، الطبعۃ الثالثۃ) ص ۱۴۲۔۱۴۳، حدیث ۲۲۸۔

۱۰۔ الواقعہ: ۳۵-۳۶۔

۱۱۔ الترمذی، الشمائل المحمدیہ، ص ۱۴۳-۱۴۴، حدیث نمبر ۲۳۰۔

۱۲۔ عبدالشکور، حافظ، رسول اللہ ﷺ کی مسکراہٹیں (مقبول بک سٹال، شیخوپورہ) ص ۱۴۲۔

۱۳ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث السجستانی، السنن، (دار السلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، الطبعۃ الاولیٰ) ص ۷۰۴، حدیث نمبر ۵۰۰۲۔

۱۴۔ عبدالشکور، حافظ، رسول اللہ ﷺ کی مسکراہٹیں، ص ۱۴۳۔

۱۵۔ ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف، التمہید (المکتبہ التجاریہ مصطفیٰ احمد الباز، مکہ المکرمہ ۱۹۷۶ء) ۵/ ۱۱۸۔

۱۶۔ الترمذی، السنن، ص ۶۰۹، حدیث نمبر: ۲۶۸۵۔

۱۷۔ المتقی الہندی، علاء الدین علی، کنز العمال (مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۵ء) ۱۰/ ۲۰۸، حدیث نمبر ۲۹۰۹۹۔

۱۸۔ السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن، الجامع الصغیر (مکتبہ اسلامیہ، لائل پور ۱۳۹۴ھ) ۱/ ۱۳۲۔

۱۹۔ آلوسی، شہاب الدین، تفسیر روح المعانی (دارالکتب العربیہ، بیروت) ۲۳/ ۱۳۔

۲۰۔ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، السنن، (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، الطبعۃ الاولیٰ) ص ۳۵، حدیث نمبر ۲۲۹۔

۲۱۔ انجیل متی، باب نمبر ۱۰، آیت نمبر ۲۴-۲۵۔

۲۲۔ ابوداؤد، السنن، ص۵۶۲، حدیث نمبر۳۹۶۶۔
۲۳۔ مسلم، ابن حجاج القشیری، الجامع الصحیح (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۸ء، الطبعۃ الاولیٰ) ص۳۴، حدیث نمبر ۱۳۶۔
۲۴۔ نثار احمد، ڈاکٹر، خطبہ حجۃ الوداع (انسٹی ٹیوٹ آف سیرت اسٹڈیز، بیت الحکمت، لاہور) ص۱۷۴۔
۲۵۔ الحجرات: ۱۳۔
۲۶۔ الحاکم ابوعبداللہ محمد النیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین (دارالکتاب العربی، بیروت) ۲/ ۲۳۹۔
۲۷۔ الترمذی، الشمائل المحمدیہ، ص۲۴، حدیث نمبر۹۔
۲۸۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص۱۱۲۰، حدیث نمبر۶۴۵۴؛ الترمذی، الشمائل المحمدیہ، ص۱۰۰، حدیث نمبر۱۴۱۔
۲۹۔ الترمذی، السنن، ص۵۴۰، حدیث نمبر۲۳۷۱۔
۳۰۔ الترمذی، الشمائل المحمدیہ، ص۱۸۸، حدیث نمبر۳۱۲۔
۳۱۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص۲۲۷، حدیث نمبر۱۴۰۸۔
۳۲۔ الترمذی، السنن، ص۵۳۷، حدیث نمبر: ۲۳۶۱۔
۳۳۔ البخاری، الجامع الصحیح (مکتبہ دارالسلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص۱۸۰، حدیث نمبر۱۱۲۳۔
۳۴۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص۳۱۱، حدیث نمبر۱۷۹۶۔
۳۵۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص۸۵۶، حدیث نمبر۴۸۳۷۔
۳۶۔ ابوداؤد، السنن، (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص۱۳۵، حدیث نمبر۸۷۳۔
۳۷۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص۳۱۵، حدیث نمبر۱۸۱۴۔
۳۸۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص۶۳۱، حدیث نمبر۳۷۵۶۔
۳۹۔ مشکوٰۃ المصابیح ۲/ ۶۲، حدیث نمبر۲۴۵۸۔
۴۰۔ ابوداؤد، السنن، ص۴۵۵، حدیث نمبر۳۱۰۶۔
۴۱۔ مبارک پوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم (المکتبہ السلفیہ، لاہور) ص۱۰۷۔
۴۲۔ مشکوٰۃ المصابیح ۲/ ۱۳۶، حدیث نمبر۲۷۹۶۔
۴۳۔ الترمذی، السنن، ص۴۵۵۔۴۵۶، حدیث نمبر۱۹۶۲۔
۴۴۔ صالح بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن محمد، موسوعۃ نضرۃ النعیم فی مکارم اخلاق الرسول الکریم ﷺ (دارالوسیلہ، جدۃ المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء) ۴/ ۵۱۱۔
۴۵۔ مشکوٰۃ المصابیح ۱/ ۵۱۳، حدیث نمبر۱۸۵۱۔
۴۶۔ ابن ماجہ، السنن، ص۴۴، حدیث نمبر۲۸۹۔

۴۷۔ البخاری، الجامع الصحیح ،ص ۱۴۱،حدیث نمبر ۸۷۷۔
۴۸۔ ایضاً ص ۱۴۲، حدیث نمبر ۸۸۰۔
۴۹۔ بخاری، الجامع الصحیح ،ص ۴۳۴،حدیث نمبر ۱۸۴۶۔
۵۰۔ چغتائی، طارق محمود، سنت نبوی ﷺ اور جدید سائنس (دار المطالعہ حاصل پور، ضلع بہاولپور) ص ۱/ ۱۰۷۔
۵۱۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۵۰۳، حدیث نمبر ۳۴۹۵۔
۵۲۔ ابوداؤد، السنن، ص ۵۵۱، حدیث نمبر ۳۸۷۸۔
۵۳۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۴۹۷۔۴۹۸، حدیث نمبر ۳۴۵۰۔
۵۴۔ البخاری، الجامع الصحیح ،ص ۱۰۱۰، حدیث نمبر ۵۷۱۳۔
۵۵۔ الترمذی، السنن، ص ۴۷۷، حدیث نمبر ۲۰۷۴۔
۵۶۔ محمد رضا، الخلفاء الرشدون (دار الکتاب العربی، بیروت ۲۰۰۴ء) ص ۱۰۵-۱۰۷۔
۵۷۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۳۳، حدیث نمبر ۵۲۲۴۔
۵۸۔ البخاری، الجامع الصحیح ،ص ۱۱۷۰، حدیث نمبر ۶۷۸۸۔
۵۹۔ وارثی، محمد عنایت اللہ، غزوات مقدس (مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور) ص ۵۰۔
۶۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ (مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی ،مصر) ۴/ ۶۳۔
۶۱۔ احمد بن حنبل، المسند (دار الفکر، بیروت) ۱/ ۱۲۶۔
۶۲۔ شبلی، سیرۃ النبیؐ، ۱/ ۲۰۳، (بحوالہ طبری، ۱۳۱۴)۔
۶۳۔ ایضاً۔
۶۴۔ وارثی، محمد عنایت اللہ، غزوات مقدس، ۱۳۰۔
۶۵۔ الخطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ۳/ ۹۷۲ حدیث نمبر: ۵۸۵۸۔
۶۶۔ الحاکم، ابوعبداللہ، المستدرک، ۳/ ۴۸۔
۶۷۔ احمد، المسند، ۶/ ۳۹۷۔
۶۸۔ علوی، خالد، انسان کامل (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۷ء) ص ۲۰۴۔
۶۹۔ مسلم، الجامع الصحیح ،ص ۔۱۱۴۵، حدیث نمبر ۲۶۸۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم اخلاق

اٹھارویں صدی عیسوی کے صنعتی اور معاشی انقلاب کا نتیجہ انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کی شکل میں سامنے آیا جس کے باعث آج اکیسویں صدی عیسوی میں اخوت، ہمدردی اور باہمی محبت کی باتیں قصۂ پارینہ بن گئی ہیں۔انسانی جذبات واحساسات پر مشینوں کا زنگ چڑھ گیا ہے۔میڈیا کی برق رفتاری اور جدید ٹیکنالوجی نے زمینی فاصلے کم کرتے ہوئے ایک طرف لاکھوں میل دور بیٹھے انسانوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تو دوسری طرف اخلاقی تنزل کا شکار کرتے ہوئے انسانی اقدار سے عاری کردیا۔اخلاقی انحطاط کی قیمت پر ہونے والی مادی ترقی کے نتیجہ میں انسان پریشانیوں،مسائل اور مصائب کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔رذائل اخلاق عام ہو چکے ہیں،ان کو ختم کرنے کے لیے اور معاشرے میں اخلاقِ حسنہ کی ترویج کرنے کے لیے ہمیں پیغمبرِ اسلام ومعلّمِ اخلاق ﷺ کے اخلاقی کردار کو عملی اور فکری طور پر عام کرنا چاہیے تاکہ آج کے اس پریشان حال انسان کو رہنمائی میسر آسکے کہ مجسم اخلاقِ حسنہ، ہادیٔ برحق ﷺ کی تعلیمات ہی فلاحِ دارین اور امنِ عالم کی ضامن ہیں۔

اخلاق کا مفہوم:

لغت میں خُلق کا مطلب طبیعت یا طبعی خصلت،مروت و عادت ہے نیز علم الاخلاق حکمت عملیہ کی ایک قسم ہے جس کا نام حکمت خلقیہ ہے(۱)۔

ابن منظور اپنی کتاب ''لسان العرب'' میں اخلاق کی تعریف بایں الفاظ کرتے ہیں:

''الخُلق، بضم اللام وسكونها وهو الدين والطبع والسجية، وحقيقته انّه لصورة الإنسان الباطنة،وهي نفسه وأوصافها ومعانيها المختصّة بها بمنزلة الخلق لصورته الظاهرة وأوصافها ومعانيها، ولهما أوصاف حسنة وقبيحة والثواب والعقاب يتعلقان بأوصاف الصورة الباطنة اكثر مما يتعلقان باوصاف الصورة الظاهرة''(۲)

(الخلق لام کے ضمہ کے ساتھ اور اس کے سکون کے ساتھ یعنی خُلق اور خْلق۔اس سے مراد دین،

طبیعت اور عادت ہے اور اس کی حقیقت انسان کی باطنی حالت ہے اور وہ اس کا نفس ہوتا ہے اور اوصاف اور اس کے خاص معنی اس کی ظاہری صورت کے قائم مقام ہوتے ہیں اور اس کے ظاہری اور باطنی، اچھے اور بُرے اوصاف ہوتے ہیں اور انھی پر جزا و سزا کا تعلق ہے جو کہ زیادہ تر اس کے باطنی اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہری اوصاف سے ان کا تعلق باطنی سے کم ہوتا ہے)۔

انسان کی باطنی صورت کو اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کے ساتھ خلق کہتے ہیں جس طرح اس کی ظاہری شکل و صورت کو خلق کہا جاتا ہے۔ لیکن امام غزالی نے خلق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''الخلق عبارة عن هيئة فى النفس راسخة عنها تصدر الافعال بسهولة ويسر من غير حاجة الى الفكر ورؤية'' (۳) (خلق نفس کی اس راسخ کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں۔ ان کے انجام دینے کے لیے غور و فکر کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی)۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ تعریف بڑی جامع اور مانع ہے۔ اس کی رو سے وہ اعمال جو کسی شخص سے اتفاقاً صادر ہوں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ظہور میں آئیں خواہ وہ اعمال کتنے ہی اعلیٰ اور عمدہ ہوں انھیں اخلاق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اخلاق کا اطلاق انھی عادات و خصائل پر ہوگا جن کی جڑیں قلب و روح میں پیوست ہوں اور انھی غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی یا دوسرے لفظوں میں اخلاقی زندگی کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وقتی جذبہ اور جوش میں آ کر غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے تو اسے سخی نہیں کہا جا سکتا۔ نیک اور عمدہ خصائص کو پیدا کرنا پھر ان کو قلب کی گہرائیوں میں پختہ کرنا تاکہ مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو جس طرح چشمہ سے پانی جاری ہوتا ہے، یہ نہایت کٹھن اور مشکل کام ہے۔ اس مشکل مہم کو سر کرنے کے لیے حکماء، علماء نیز ماہرینِ اخلاقیات نے بڑی کوششیں کی ہیں لیکن ان کی نظریاتی و فکری کشمکش نے ان کی تمام کوششوں کو بے نتیجہ کر دیا۔ وہ خیر و شر اور اچھے اور برے کا معیار ہی طے کرتے کرتے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اسی بات کو علامہ اقبال نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت (۴)

اخلاق کی اقسام:

عمومی طور پر اخلاق کو دو اقسام کے تحت بیان کیا جاتا ہے جو کہ حسب ذیل ہیں:

ایک معمولی اخلاق اور دوسرے اعلیٰ اخلاق۔ پہلی قسم یہ کہ آدمی کا اخلاق جوابی ہو۔ یعنی جو مجھ سے جیسا کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں گا۔ یہ عام اخلاق ہے۔ اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ کی پروا کیے بغیر اپنا اخلاق متعین کرے۔ اس کا اخلاق اصولی ہو جوابی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی نے کہا میں اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا سلوک کرتا ہوں وہ قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں وہ میرے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں اور وہ میرے ساتھ نادانی سے پیش آتے ہیں اور میں ان سے درگزر کرتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اسی طرح سے ہے جیسے تو کہتا ہے تو گویا کہ آپ ان کو ریت کھلاتے ہیں اور اللہ کی طرف سے آپ کے لیے مدد ضرور شامل حال رہے گی اگر آپ اسی حال میں رہے (۱-۴)۔ اعلیٰ اخلاقیات ایک مسلمان کا عمومی رویہ ہونا چاہیے جس کو وہ اپنی پوری زندگی میں برت کر دکھائے خواہ معاملہ دشمن کے ساتھ ہو یا دوست کے ساتھ ہو۔ وہ صلہ رحمی کا خوگر ہو حتیٰ کہ اس سے بھی صلہ رحمی کرے جو اِس سے قطع رحمی کرے۔ وہ برے کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا اور ظالم کے ظلم کو نظر انداز کرنے والا ہو۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ کی مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجد (جو آپ ﷺ کے دشمن تھے) کی طرف ایک فوجی دستہ بھیجا۔ یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال ان کو راستے میں مل گئے۔ انھوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں لے آئے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے اس کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ بعد ازاں رسول اللہ ﷺ نے اس کی رہائی کا حکم فرما دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں نہایت عجیب وغریب تھا کیونکہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن

کے ہاتھ آ جانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا اور وہ یہ کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا، مگر اپنے اخلاقی سلوک سے اس کی روح کو فتح کر لیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجدِ نبویؐ میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ دوبارہ کس لیے یہاں آیا ہے، لیکن جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ کر دراصل ہمیشہ کے لیے اس کو اسیر کر لیا تھا۔ اس کے بعد ثمامہ عمرہ کے لیے مکہ گیا۔ جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام لانے کا علم ہوا تو انھوں نے کہا: ''تم بے دین ہو گئے ہو''۔ ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے خدا کے رسولؐ کے دین کو اختیار کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ثمامہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانے میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی، ان میں یمامہ کا ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے مکہ والوں سے کہا: ''سن لو، محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمھارے یہاں نہیں آئے گا''۔

مکہ وادی غیر ذی زرع ہے۔ اس میں کوئی چیز پیدا نہ ہوتی تھی اور اناج یمامہ سے آتا تھا۔ یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثالؓ جب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور انھوں نے مکہ مکرمہ کی طرف غلہ کی برآمد بند کر دی تو مکہ والے فاقوں مرنے لگے۔ اس بندش سے قریش میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف ایک سراسیمگی کا عالم تھا۔ انھوں نے سخت اضطراب اور بدحواسی کے عالم میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی طرف رجوع کیا اور درخواست کی کہ یمامہ کے حاکم کو حکم فرمایا جائے کہ وہ اناج کی بندش کو اٹھا لے۔ کوئی اور ہوتا تو انھیں ان کے مظالم یاد کراتا اور کہتا کہ آج تم کون سا منہ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ تم نے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا کہ آج میں تمھارے ساتھ کوئی نیکی کروں۔ لیکن وہ تو تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے تھے، مکہ والوں پر اپنا دامنِ رحمت کیوں نہ پھیلاتے۔ آپ ﷺ نے اسی وقت حاکم یمامہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ اناج کی بندش اٹھا لے، اور اناج مکہ پہنچنے لگا۔ حالانکہ یہ وہی اہل مکہ تھے جنھوں نے تمام بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں نظر بند کیے رکھا تھا اور مسلسل تین سال آپ کے خاندان والوں کے ساتھ ایسا مقاطعہ کیا تھا کہ اناج کا ایک دانہ بھی ان تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ بنو

ہاشم کے بچے بھوک سے تڑپتے اور بلبلاتے تھے لیکن ان ظالموں کے پتھر سے زیادہ سخت دل کسی طرح نہ پسیجتے تھے بلکہ یہ بچوں کا رونا سن کر قہقہے لگاتے۔ سرکارِ دو عالمﷺ نے ان کی ان سب باتوں سے درگزر فرما کر ان کے لیے اناج کی بندش ختم کرا دی (۵)۔

سرکارِ دو عالمﷺ کے اس اخلاقی جذبہ ترحم کا مظاہرہ میدان جنگ میں بھی ہوتا رہتا تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ سرکارِ دو عالمﷺ کے ساتھیوں نے میدان بدر میں پانی کا ایک حوض اپنی ضرورت کے لیے تیار کیا تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل قریش مکہ کی فوج کے آدمی اس حوض پر پانی پینے آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے انھیں پانی لینے سے روکنا چاہا۔ جنگی حکمت عملی کا تقاضا یہی تھا کہ انھیں پانی نہ لینے دیا جاتا اور دشمن پر ہر قسم کی خوراک کی بندش کر دی جاتی لیکن حضورﷺ نے فرمایا: ''انھیں پانی لینے اور پینے سے منع نہ کرو'' (۶)۔ کیا تاریخ عالم اخلاق کی کوئی ایسی اعلیٰ مثال پیش کر سکتی ہے؟

اخلاق کی اہمیت:

دنیا کے تمام مذاہب نے اپنی بنیاد اخلاق پر رکھی ہے لیکن ان کے مقابلہ میں اسلام نے اخلاق کو اتنی اہمیت دی کہ اس کو عبادات سے بھی بڑھا دیا اور باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض میں کوتاہی کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی بلکہ ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی جن کے حق میں کوتاہی ہوئی۔ پھر ایمان کی مضبوطی کو اخلاق کی مضبوطی پر منحصر رکھا۔ اخلاق اچھے تو ایمان مضبوط، ایمان مضبوط تو عبادت مقبول، گویا ان تینوں چیزوں کا آپس میں ایسا ناطہ اور تعلق رکھا کہ اگرچہ کوئی شخص کتنا ہی عبادت گزار کیوں نہ ہو، اگر اس کے اخلاق اچھے نہیں تو نگاہِ اسلام میں اس کی عبادت کی کوئی قیمت نہیں۔ جانوروں سے بھی اگر اس کے اخلاق اچھے نہیں اور انسانوں سے معاشرتی تعلق میں حسن نہیں تو اللہ کے ہاں اس کی عبادت کی حیثیت ایک بے روح جسد کی سی ہے اور اس کا ایمان اس کے نفس کی گہرائیوں میں نہیں اترا کیونکہ اخلاق ہی ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہے۔ اسی لیے اخلاق حسنہ کے بارے میں اس قدر احادیث ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ سارے دین کی بنیاد ہی اخلاق حسنہ پر استوار ہے۔ معلم اخلاقﷺ نے فرمایا:

''انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے سے

ملتا ہے''(۷)۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے:

''قیامت کے دن حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی''(۸)۔

اخلاقی انحطاط ضعف ایمان اور اعلیٰ اخلاق ازیادِ ایمان کا باعث:

ایمان اور حسنِ خلق ایسے عناصر ہیں جو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔ ایمان ایک ایسی صفت ہے جو دنیاوی رذائل سے بچاتی اور عمدہ اخلاق کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ جب بھی اپنے بندوں کو خیر کی طرف بلاتے ہیں اور شر سے نفرت دلاتے ہیں تو اسے اُس ایمان کا تقاضا قرار دیتے ہیں جو ان کے دلوں میں موجود ہے۔ قرآنِ پاک میں کتنے ہی فرامین ہیں جن میں ''اے ایمان والو'' کے الفاظ سے تقویٰ اور صدق وغیرہ کے احکامات دیے گئے ہیں۔ آنجناب ﷺ کی ہدایات سے مترشح ہوتا ہے کہ مضبوط ایمان سے ہی اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور اخلاق کی کمزوری ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ جس قدر اخلاق کم یا زیادہ ہوگا اسی تناسب سے ایمان میں کمی یا زیادتی پائی جائے گی۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ فلاں عورت کی نماز، روزے اور صدقہ خیرات کی کثرت کا بہت چرچا ہے لیکن اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے تکلیف میں رکھتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ اسی طرح دوسری عورت کا ذکر کیا گیا جو کہ نماز اور روزہ وغیرہ صرف فرائض کی حد تک پورا کرتی تھی لیکن اعلیٰ اخلاق کی مالک تھی۔ آپ نے اس کی تعریف فرمائی اور اسے جنت کی بشارت دی(۹)۔

آپ ﷺ نے ایک دفعہ ایک یہودی سے قرضہ لیا، اس نے میعاد مقررہ سے قبل ہی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ایک دن تو اس کا مطالبہ حد سے بڑھ گیا اور اس نے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ کر سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میعاد مقررہ میں تین دن باقی ہیں''۔

اتنی دیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اس یہودی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روکا اور فرمایا: ''عمر تمھارا حق نہ تھا کہ اسے مارتے ہاں اتنا

کہہ سکتے تھے کہ بھئی میعادِ مقررہ سے پہلے مطالبہ صحیح نہیں ہے اور مجھے یہ کہتے کہ آپ ﷺ جہاں تک ہو سکے جلد ادائیگی قرض کی فکر کریں'' (۱۰) مکارمِ اخلاق کا یہ مظاہرہ دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت کرتے ہیں ''رأيته يأمر بمكارمِ الأخلاق'' (میں نے نبی ﷺ کو دیکھا وہ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے تھے) (۱۱)

''عن مسروق قال: كنّا جلوسا مع عبدالله بن عمرو يحدّثنا إذ قال. لم يكن رسول الله ﷺ فاحشاً ولا متفحّشاً، وإنه كان يقول: إنّ خياركم أحسنكم أخلاقا'' (مسروقؒ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں ہم عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے۔ اس وقت انھوں نے کہا نبی اکرم ﷺ نہ فحش گو تھے اور نہ ہی فحاشی کو پسند کرتے تھے، آپ ﷺ کہا کرتے تھے تم میں بہترین وہ ہے جس کا اخلاق تم میں سے بہتر ہے) (۱۲)۔

''عن انس بن مالك رضى الله عنه قال: لم يكن النبيّ ﷺ سبّابا ولا فحّاشاً ولا لعّانا. كان يقول لأحدنا عند المعتبة: ما له؟ ترب جبينه '' (۱۳) (حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نہ گالی دینے والے تھے، اور نہ ہی فحش گو اور نہ ہی لعن طعن کرنے والے تھے، غصّے کے وقت وہ ہم میں سے کسی کو (مخاطب ہوتے تو) کہتے، اسے کیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو)۔

''وقال أنس رضى الله عنه: خدمتُ النبيّ ﷺ عشر سنين فما قال لي: أف، ولا لم صنعت؟ ولا ألا صنعت؟'' (۱۴) (حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم ﷺ کی دس سال خدمت کی آپ ﷺ نے مجھے کبھی اف تک نہ کہا اور نہ ہی یہ کہا ''تم نے یہ کیوں کیا'' اور نہ ہی یہ کہا ''تو نے یہ کیوں نہ کیا)''۔

''عن عائشة رضى الله عنها: أنّ يهود أتوا النّبيّ ﷺ فقالوا: السّام عليكم، فقالت عائشة: عليكم ولعنكم الله وغضب الله عليكم، قال: مهلاً يا عائشة، عليك بالرّفق، وإيّاك والعنف والفحش، قالت: أو لم تسمع ما قالوا؟ قال: أو لم تسمعي ما قلت؟ رددتُ عليهم فيستجابُ لي فيهم، ولا يستجابُ لهم فيّ'' (۱۵) (حضرت عائشہؓ

سے روایت ہے یہود نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے انھوں نے کہا السام علیکم۔حضرت عائشہؓ نے کہا تم پر اللہ کی لعنت اور اللہ کا غضب ہو۔آپ ﷺ نے کہا ٹھہرو! عائشہ! تجھ پر نرمی لازم ہے اور تو سختی اور فحش گوئی سے بچ۔آپؓ کہنے لگیں کیا آپ ﷺ نے سنا نہیں جو انھوں نے کہا۔آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا جو میں نے کہا، میں نے ان کو لوٹا دیا (وہی کلمات کہہ دیئے) ان کے بارے میں میری دعا قبول ہوتی ہے۔ان کی دعا میرے متعلق قبول نہیں ہوتی)۔

اخلاق کی غرض وغایت:

قرآن اور احادیث نبویہ ﷺ کی رُو سے اخلاق کا تعلق ایمان باللہ سے ہے۔اس لیے اخلاق کی غرض وغایت رضائے الٰہی کا حصول ہے۔حسنِ خلق کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین بھی اسی سے ہوتا ہے کہ انسان اخلاقی رویہ اپناتے ہوئے رضائے الٰہی مدنظر رکھتا ہے یا نہیں کیونکہ انسان کی بڑی سے بڑی قربانی اس کے بغیر اپنی تاثیر کھودیتی ہے۔تمام نیکیوں کی بنیاد رضائے الٰہی کا حصول ہے اور تمام عبادتیں اس کے بغیر بیکار ہو جاتی ہیں۔آنجناب ﷺ کے بعض ارشادات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کوئی شخص اس لیے لڑتا ہے کہ مالِ غنیمت ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلوائے، کوئی اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو تو ان میں سے کون ہے جس کا عمل جہاد فی سبیل اللہ متصور ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا وهو في سبيل الله'' (۱۶) (جو اس لیے لڑتا ہو اللہ کی بات بلند ہو وہی اللہ کی راہ میں ہے)۔

اخلاق کی چند شرائط:

شرط اوّل:

اخلاق کا ماخذ صرف اور صرف حکم خداوندی ہے۔خالق کائنات نے اپنے اخلاقی احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا اور اپنے بندوں کی فطرت اور طبیعت میں اس کو ودیعت بھی کر دیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے طبیعت اور فطرت خاموش رہے تو احکامِ الٰہی اور فرمانِ خداوندی کی آواز اس کو پکار کر ہوشیار اور خبردار کر دے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مظلوم کی امداد اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے اور انسانی فطرت کے اندر بھی اس کو ودیعت کیا گیا ہے اور ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اس کام کی تحسین کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا فطرت، ضمیر، جذبات اور وجدان کو ایک حکم دیتا ہے، اور ہماری خود پسندی اور مصلحت شناس عقل وخرد دوسری طرف جا رہی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے قابل اصلاح ہے اور شریعت کی نظر میں وہ عقل نہیں حماقت ہے، علم نہیں جہالت ہے۔

شرط دوم:

دوسری شرط اخلاص اور بے غرضی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں حسنِ خلق دوسرے اعمال کی طرح ایک عبادت ہے۔ اس لیے دوسرے اعمال کی طرح اس کی غرض وغایت بھی اخلاص پر مبنی ہونا ضروری ہے نہ کہ دنیوی، نفسانی اور ذاتی اغراض اس میں شامل ہوں۔ ایسا اخلاق جس سے اعمال میں اخلاص اور بے غرضی کی صفات پیدا نہیں ہوتیں تو ایسے اعمال کا کوئی ثواب مرتب نہیں ہوگا۔

شرط سوم:

تیسری شرط نیت ہے آنجناب ﷺ نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے اور بُرے کام کی بنیاد قرار دیا اگر نیت اچھی نہیں تو اعمال کی اچھائی کی روح بھی پرواز کر جاتی ہے۔ آپ ایک اچھے سے اچھا عمل لے لیں۔ اگر آپ اس کو خراب نیت سے کریں گے تو وہ اچھا عمل بھی خراب ہو جائے گا۔ اسی لیے اسلام میں ہر عمل کے لیے نیت کی درستی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں حکم خداوندی ہے:

''وما امروا الاّ لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین ''(۱۷) (اور انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں)۔

حدیث میں ہے: '' انّما الاعمال بالنّیات وانما لکل امرئ ما نویٰ ''(۱۸) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی ہے)۔

اسی طرح نیت کی اہمیت کے متعلق بہت زیادہ احادیث موجود ہیں۔ دراصل روحانی حیثیت

سے کوئی کام اپنے نتیجے کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کے اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

قبل از اسلام عربوں کی اخلاقی حالت:

حضورﷺ کی آمد سے قبل عربوں کی اخلاقی حالت نہایت بھیانک تھی۔ اچھے بُرے کی تمیز مفقود تھی نیز کوئی اخلاقی برائی نہ تھی جو ان کے اندر موجود نہ ہو۔ قتل و غارت، جھوٹ بولنا، بدعہدی کرنا، بہتان طرازی، جھوٹی قسم کھانا، خیانت، اسراف، دھوکہ دہی، چوری ڈاکہ، یتیم کا مال ہڑپ کرنا، بیوہ پر زیادتی، سوتیلی ماں سے نکاح کرنا، بے کسوں کو ستانا، اپنی معصوم بچیوں کو جھوٹی شرم اور خیالی ننگ و عار سے بچنے کے لیے ایک خود ساختہ تخیل اور ایک ظالمانہ روایت کی بنا پر اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر دینا نیز دیگر ہر قسم کے اخلاقی جرائم عام تھے۔ شراب نوشی، عیش پرستی، حقوق کی پامالی، قمار بازی، ہوس رانی، ظلم، معاشی استحصال، ظالمانہ طور طریقوں اور غیر منصفانہ روّیوں کا بول بالا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ معاشرہ آگ کا ایک سمندر ہے یا ایک نہایت ہی مہیب خندق ہے جس کی کوئی گہرائی نہیں اور انسان اس میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار کھڑا ہے (۱۹)۔

بعثت سے قبل داعیٔ برحق کا اخلاق:

نبوت سے پہلے چالیس سال کا یہ لمبا دور آپﷺ نے کس طرح گزارا؟ حضورﷺ کو چالیس سال کے بعد معلم اخلاق ہو کر نمودار ہونا تھا۔ اس لیے اس چالیس سالہ دور میں خدا تعالیٰ نے آپ کو نہایت بلند اخلاقی کردار پر قائم فرمایا۔ اس دور میں آپﷺ کے اخلاق میں صداقت، امانت، شرافت اور خدمت کے اوصاف اس قدر نمایاں ہوئے کہ آپﷺ پوری قوم میں ایک غیر معمولی انسان نظر آنے لگے۔ جب آنحضورﷺ بطنِ مادر میں آئے تو ان کی قوم قحط اور خشک سالی کا شکار تھی۔ آپ کی برکت کی وجہ سے مکہ کی خشک زمین سرسبز و شاداب ہو گئی (۲۰)۔

معلّمِ اخلاقؐ کا بچپن اپنے اندر غیر معمولی برکت رکھنے کی وجہ سے اپنے ماحول میں منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے اور ان کی جوانی، قوت، امانت اور خدمت کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے سبب ان کی صداقت کا

کھلا نشان بنتی ہے اور آپؐ منصبِ نبوت پر سرفراز ہو کر اپنے اسی اعلیٰ کردار کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

نبوت و رسالت کی پچھلی تاریخ میں جوانی کے دو کردار بہت مشہور ہیں، ایک کردار حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور دوسرا حضرت یوسف علیہ السلام کا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اخلاقی کردار امانت اور خدمت میں نمایاں شہرت رکھتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایک صاحبِ جمال نوجوان ہیں اور ایک صاحبِ جمال مصری خاتون (زلیخا) کے گھر میں ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں، اور اس عورت کے ممنونِ احسان ہیں مگر جب وہ عورت اپنے اس پروردہ غلام کو دعوتِ عیش دیتی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام معاذ اللہ کہہ کر اس اخلاقی برائی سے اپنے دامن کو بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجہ میں جیل خانہ کی مشقت کا دور آ جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں نہایت صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہاں دعوتِ حق پھیلاتے ہیں۔ یہ امانت، شرافت اور خدمت کے اعلیٰ کردار کا نمونہ ہے۔

دوسرا اخلاقی کردار جسے قرآنِ کریم نے نمایاں کر کے پیش کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ یہ قوت، امانت اور خدمت کی تینوں صفات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس بادشاہ کی گود میں پلے ہیں اپنی قوم کے اوپر اس بادشاہ کے مظالم دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں اور ایک موقع پر ایک قبطی کو طمانچہ مار کر بے جان کر دیتے ہیں۔ یہ قوت اور جوش و جلال تھا پھر اس جوشِ حق کی پاداش میں وطن سے نکالے جاتے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی اس مصری جوان کو کنویں پر پانی پلاتا دیکھ کر باپ سے کہتی ہے:

"یا ابت استاجره انّ خیر مَن استاجرت القویّ الاَمین" (۲۱) (اے ابا جان! اسے ملازم رکھ لیں، بلا شبہ جسے آپ ملازم رکھیں گے وہ طاقت ور اور امانت دار ہے)۔

یہ نوجوان شعیب علیہ السلام کے گھر کی خدمت انجام دینے پر مقرر ہو جاتا ہے اور اس طرح پیغمبر کی تربیت میں رہ کر اپنے اخلاقی کردار کو پختہ کرتا ہے۔

اب مکہ کے اخلاقی برائیوں میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں پروان چڑھنے والے ہاشمی النسب نوجوان کا کردار ملاحظہ ہو! یہ کس ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے؟ ایک تاریک ماحول ہے، چوری،

شراب اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، قومی شاعر اپنی بہنوں سے عشق بازی کرتے ہیں اور اس پر شاعری کرتے ہیں: بیٹا اپنی سوتیلی بیوہ ماں سے شادی کرتا ہے (۲۲)۔ اس گندے معاشرہ میں یہ ہاشمی نوجوان طاقت اور حسن و جمال کا پیکر اور تہذیب و شائستگی کا مجسم نمونہ ہے۔ اس کا دل، اس کی نگاہ اور اس کے جذبات بے داغ ہیں۔ اس کا بہترین مشغلہ خلقِ خدا کی خدمت اور تلاشِ حق ہے۔

یوسف علیہ السلام کی شرافت اور موسیٰ علیہ السلام کا جلال اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار پر قربان ہیں۔ قوم اسے ''الامین'' کہہ کر پکارنے لگتی ہے اور اس کے اعلیٰ اخلاقی کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے (۲۳)۔

مکہ کے بے حیا معاشرہ میں جہاں لوگ کعبہ کے اندر بھی ننگے ہو کر طواف کرنے کو عبادت شمار کرتے ہیں، لیکن ہمارے معلم اخلاق بچپن ہی سے کس قدر حیادار طبیعت رکھتے تھے۔ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر آپؐ اپنے بزرگوں کے ساتھ سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، نرم و نازک جسم پر آپؐ کے چچا عباسؓ کو ترس آیا کہ کہیں اس جسم نازک پر خراش نہ آ جائے، اس خیال سے تہبند کھول کر آپؐ کے سر پر باندھ دیا تاکہ سر کی حفاظت رہے، بس کیا تھا، ستر کھلتے ہی آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے، آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں، چند لمحوں کے بعد ہوش آیا تو آنکھیں کھولتے ہی فرمایا، میرا تہبند، میرا تہبند، چچا دوڑے اور بھتیجے کے تہبند باندھ دیا (۲۴)۔

رسول اکرم ﷺ نے جوانی میں نفسانی خواہش پر ضبط کی جو مثال قائم کی وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی سے زیادہ حیرت انگیز ہے جنھیں صرف ایک بار برائی کی دعوت ملی جبکہ آپ ﷺ نے قدم قدم پر برائی کے کھلے مواقع سے اپنے دامن کو داغ دار ہونے سے بچا لیا۔ ۲۵ سال کی عمر تک کا زمانہ جوانی کی رنگین اُمنگوں اور حسین ولولوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ سارا دور آپؐ نے مجرد گزارا اور اخلاقی کردار اس قدر پاکیزہ رکھا کہ کسی دشمن کو اُنگلی اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ نبوت کے بعد ابوجہل اور اس کے گروہ نے سخت سے سخت مخالفت کی۔ دیوانگی، جنون اور کہانت کے بے بنیاد الزامات لگائے مگر آپ کے صاف ستھرے اخلاق پر طعن کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی۔ حضور ﷺ کے چال چلن پر اگر یہ مخالف ذرا سا بھی داغ پا لیتے تو آپ ﷺ کے شخصی وقار کو گرانے کے لیے تنکے کا شہتیر بنا دیتے لیکن جہاں آپؐ کی جوانی چاند سورج سے زیادہ روشن، پھولوں سے زیادہ پاکیزہ اور معطر تھی وہاں دشمن زبان کھولتے تو کس

طرح۔

۲۵ سال اس طرح پاک بازی کے ساتھ گزار کر یہ نوجوان کسی دوشیزہ لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بیوہ عورت (حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ) سے نکاح کرتا ہے جس کی عمر چالیس سال ہے۔ یہ دو دفعہ بیوگی کے داغ سہہ چکی ہے۔ ہاں اس کا کردار عرب کے گندے ماحول میں نہایت بلند ہے۔ قوم اس بیوہ کو ''طاہرہ'' کے لقب سے پکارتی ہے اور اسی خوبی کو یہ طاہر و طیب نوجوان پسند کرتا ہے۔ خود اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہے اور اپنی رفیقہ حیات کے لیے ایک نمونہ اخلاق خاتون کا انتخاب کرتا ہے (۲۵)۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے ساتھ حضور ﷺ نے زندگی کے ۲۸ سال گزارے، نبوت سے پہلے ۱۵ سال میں زیادہ وقت تجارت، خدمتِ خلق اور علیحدگی میں تلاشِ خدا میں صرف کیا اور ۱۳ سال نبوت کے بعد تبلیغ و دعوت کی بے پناہ سختیوں میں بسر ہوئے۔

یہ سارا دور نہایت محبت اور خوش گوار انداز میں گزرا۔ ایک دن بھی کِل کِل اور بدمزگی نہ ہوئی، شکوہ و شکایت کی جگہ باہمی تعاون قائم رہا (۲۶)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (۲۷) کہہ کر آپ ﷺ کے بلند ترین مقام کو بھی ظاہر کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ آپ ﷺ اخلاق حسنہ کے جس اعلیٰ درجہ پر فائز تھے کوئی شخص اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ رسول کریم ﷺ کے اخلاق کی تصویر حضرت عائشہ ؓ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے: ''كانَ خُلُقه القرآن'' (۲۸) یعنی آپ ﷺ کا خلق قرآن مجید ہے۔

قرآن مجید میں شروع سے آخر تک خدا اور اس کی صفات کا تذکرہ پایا جاتا اور باقی ماندہ موضوعات اور بیانات ان صفات خداوندی کی تائید میں مندرج ہوئے ہیں۔ حضرت عائشہ ؓ کے الفاظ ''كان خلقه القرآن'' کا بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کہ آپ ﷺ کے اخلاق صفاتِ الٰہی کا پرتو تھے۔ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو دنیا کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے لیے نمونہ ہو۔ جس شخص نے مختلف حوادثِ حیات کا تجربہ نہیں کیا وہ دوسروں کے لیے عملی نمونہ نہیں بن سکتا۔ ہر اخلاقی صفت کے اظہار کے لیے مخصوص حالات کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک کوئی ان حالات سے دو چار نہ ہوا ہو وہ شخص ان صفات سے متصف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ کی زندگی میں ہر قسم کے حالات رونما

ہوئے اس لیے آپ ﷺ کو مختلف صفات اور اخلاق کے اظہار کا موقع ملا، چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی ہر شخص کے لیے نمونہ ہے۔ یتیم، تاجر، ہمسایہ، بیٹا، خاوند، مہاجر، فاتح، قاضی، مقنن، جنگ آزما سپہ سالار، مدبر، مرشد، ہادی، غرض کہ تمام حالاتِ مختلفہ میں آپ ﷺ کی زندگی ہر قسم کے لوگوں کے لیے کامل اسوہ ہے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ تاریخ عالم میں فرد فرید ہیں، دنیا کا کوئی آدمی بھی اپنے مذہب کے بانی کو اس حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا کہ اس کی زندگی تمام لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ بن سکتی ہو۔ اگر کسی شخص کی زندگی میں شان عالمگیریت نہیں پائی جاتی وہ عالمگیر اسوہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کی زندگی تمام انبیاء علیہم السلام سے ممتاز نظر آتی ہے اور آپ ﷺ ان تمام اخلاق فاضلہ کے جامع ہیں جو انبیاء علیہم السلام میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں (۲۹)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی کھلی اور واضح زندگی:

مسلمانوں کی یہ خوش بختی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی مکمل زندگی از پیدائش تا وفات ان کے سامنے ہے۔ بلکہ زندگی کا معمولی سے معمولی گوشہ بھی آج پوری دنیا کے سامنے ہے جس کی راتیں بھی روز روشن کی طرح عیاں ہیں "لیلها کنهارها"۔ اسی وجہ سے موجودہ دنیا کے بہت بڑے مؤرخ کو یہ لکھنا پڑا کہ:

Muhammad was born in the full light of history.

(محمد ﷺ تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے)۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ اخفاء میں نہیں۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہے گویا کہ آپ ﷺ خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ بائبل کے پیغمبروں میں سے کون سا ایسا پیغمبر ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب ہو۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صرف آخری تین سالوں کا حال معلوم ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے مطابق:

Any attemp to write a "Life of Juses" should be frankly abondoned. The material for it certainly does not exist. It has been calculated that the total number of days in his life regarding which we have any

record does not exceed 50 days."(۳۰)

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ایران، ہندوستان اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں پر ناواقفیت کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ کیسے تھے۔ اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ آج دنیا کے سامنے نہیں۔ اور جو کچھ بیان کیا جاتا ہے تاریخ کے رپورٹر اس کی تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ صرف اسلام ہی کے معلّمِ اخلاق ؐ کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کے سامنے عیاں ہے اور سیرتِ محمدی ؐ کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ۔ محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو کچھ مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو۔ جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو۔ تاکہ دنیا اس سے باخبر ہو۔ لوگ تو اپنی اندرونی باتوں کو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں لیکن پیغمبر خدا ﷺ کا حکم تھا کہ میری اندرونی باتوں کو بھی ہر ایک تک پہنچاؤ۔ گویا آپ ؐ کا ظاہر و باطن ایک تھا فرمایا: ''**الا فلیبلغ الشاهد الغائب**'' (۳۱)۔

اس حکم کے تحت شمعِ نبوت کے پروانوں نے آپ ﷺ کے احوال و اخبار اور شمائل و فضائل ہی نہیں، زندگی کی ہر ہر ادا کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا۔ یوں آنے والی نسلوں کے لیے اعلیٰ اخلاق کا عملی نمونہ چھوڑ گئے۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ قوم ہدایت کے اس آفتاب عالم تاب کی حیات بخش شعاعوں سے فرار اختیار کرتی ہے اور اندھیروں کی وادی میں فروزاں چمکیلی مگر زہریلی روشنیوں کی طرف لپکتی ہے اور ان اذیت ناک ناسوروں سے بے خبر ہے جو اندر ہی اندر ان مسموم شعاعوں میں پک رہے ہیں۔ ہدایت کی صدائے جرس برابر سنائی دے رہی ہے مگر کچھ کان بہرے ہو چکے ہیں، کچھ اسے پہچانتے نہیں، کچھ سن تو رہے ہیں لیکن زبان کو لبیک کا یارا نہیں۔ بیمار روحوں اور مفلوج جسموں میں حرارت زیست ختم ہو چکی ہے اور طبیبِ یثرب ؐ کے قدموں میں پہنچنے کا داعیہ ان کی رگ و پے سے ختم ہو چکا ہے۔ جہاں دوا بھی ہے اور شفا بھی۔ حرارت بھی ہے اور زیست بھی۔ سب کچھ ہے لیکن انھیں کچھ نظر نہیں آتا ہے کیونکہ آنکھوں میں بینائی کا یارا نہیں کہ اس طبیب یثرب کے کمالات و فضائل سے آشنا ہو سکیں (۳۲)۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی اخلاقی زندگی کا عملی پہلو:

دنیا میں دو قسم کے لوگوں نے اخلاق کا پرچار کیا۔ ایک تو علمائے اخلاقیین نے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے۔ لیکن ان دونوں کے پرچار میں بُعد المشرقین ہے۔ علمائے اخلاق نے اخلاق پر بڑی ضخیم کتابیں لکھیں، لیکن آج دنیا میں اگر آپ کو اخلاق کی کوئی رمق اور اس نور کی کوئی شعاع نظر آئے گی تو وہ نتیجہ ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ علمائے اخلاق نے اگرچہ اخلاق پر موٹی موٹی کتابیں لکھیں لیکن ان کی کتاب عمل کے اوراق بالکل صاف اور سفید تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں یہ تو لکھا کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے لیکن وہ اپنی عملی زندگی میں خود جھوٹ بولتے تھے۔ انھوں نے ان ضخیم کتابوں میں یہ تو لکھا کہ بیکسوں کی دستگیری کرنا چاہیے لیکن خود انھوں نے کسی بے کس کی دستگیری نہ کی بلکہ بعض دفعہ مظلوموں پر اور ظلم و ستم کیا۔ اس لیے ان کی اخلاقی تعلیم لوگوں کے دلوں میں جگہ نہ پا سکی۔ ان کے مقابلہ میں انبیاء کرام علیہم السلام نے اگر لوگوں کو یہ کہا کہ جھوٹ نہ بولو تو خود ان کی زبان نے تمام زندگی میں ایک مرتبہ بھی غلط بیانی نہ کی۔ یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کے لیے ان کی زبان سے بعد میں نکالیکن پہلے انھوں نے ہر مظلوم و بے کس کی مدد کی۔ دوسرے لفظوں میں ان کی کتاب علم اور کتاب عمل میں باہم مطابقت تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے اس سے زیادہ اس پر عمل کر کے دکھاتے تھے۔ لہٰذا ان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتی تھی۔ ان کے عمل کا عکس جب لوگوں کے دلوں پر پڑتا تو انھیں بھی عمل کی توفیق ملتی۔ اس لیے علمائے اخلاق کی بات کے مقابلے میں ان کے قول کی زیادہ اہمیت ہوتی تھی۔ اخلاقی احکام تو ہر جگہ ملتے ہیں اور قریباً ہر مذہب کا اپنا مقصد بھی انسان کو اخلاق کا وعظ سنانا ہے، لیکن اصلی شے تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ نے جو کچھ کہا اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی۔ اس بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ جملہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ: ''انسان کی روح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتح مند ہو سکتی ہے جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو'' (۳۳)۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو جو کچھ قرآن حکیم میں الفاظ

کی صورت میں ہے، آپ ﷺ کی زندگی میں وہ عملی شکل میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک تحریری قرآن ہے تو دوسرا عملی قرآن ہے۔ ایک تھیوری ہے تو دوسرا پریکٹیکل۔ ایک قرآن کاغذوں میں لفظوں کی صورت میں ہے تو دوسرا رسول اللہ ﷺ کی شکل میں عملی صورت میں۔

زندگی کی متضاد حالتوں میں بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے خلق عظیم کا مظاہرہ کیا حالانکہ ان حالتوں میں نظام اخلاق دفعتاً بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی ذات میں نہایت رحم دل ہے لیکن جونہی وہ میدان جنگ میں جاتا ہے تو اس کی زندگی کا یہ نقطۂ نظر بالکل تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ رحم دلی سے یکا یک بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص امن و صلح کے زمانہ میں نہایت حلیم الطبع، معاملات میں صادق اور عہد کا پابند ہوتا ہے لیکن زمانہ جنگ میں اس کی یہ تمام صفات مفقود ہو جاتی ہیں اور وہ عہد شکن اور درشت طبیعت بن جاتا ہے۔ یہ تو افراد کا حال ہے۔ لیکن ایک پوری قوم کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ زمانۂ امن میں وہ انسانیت کا بہترین نمونہ ہوتی ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں وہ وحشی اور درندوں سے زیادہ خونخوار ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حکماء نے کہا کہ: "سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی"۔ لیکن دنیا میں صرف اور صرف پیغمبر اسلام ﷺ ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو اپنے پہلو میں نرم و نازک دل بھی رکھتی ہے اور نہ تبدیل ہونے والی اخلاقی قوت بھی۔ ان پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح زمانہ امن میں گداز دل رکھتا ہے، اسی طرح کا گداز دل وہ زمانہ جنگ میں بھی رکھتا ہے۔ اور اسلام نے جو قوم تیار کی وہ بھی "رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز" کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کی تعلیمات ہر شعبہ حیات پر حاوی تھیں۔ حق و صداقت کی اس داستان حیات میں غربت و مظلومی بھی تھی اور اتمام و تکمیل کی فتح مندی اور کامرانی کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت بھی۔ دنیا میں امن و صلح کے ساتھ جنگ میں معاہدوں کو اکثر توڑا جاتا ہے اور نہایت شرمناک طریقے سے عہد و پیمان میں تاویلیں کر کے ان کی خلاف ورزی کی جاتی ہے لیکن نبی کریمؐ کی پوری زندگی میں ایک موقع بھی ڈھونڈھے سے نہیں ملتا جب آپ ﷺ نے اپنا کیا ہوا کوئی معاہدہ توڑا ہو۔ بلکہ جن قوموں اور قبیلوں نے معاہدات کو توڑا، موقع ملنے پر آپ ﷺ نے ان سے بھی نہ صرف حسن سلوک کیا بلکہ معاف کر دیا۔ آپ ﷺ نے شخصی حالتوں میں وفائے عہد کا جو معیار اخلاق قائم کیا تھا میدان جنگ

میں بھی اس کو قائم رکھا۔ شخصی حالت میں عہد و پیمان کی پابندی کے بارے میں امام ابوداؤد نے عبداللہ بن الحمساءؓ سے نقل کیا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے میں نے ایک چیز آپؐ کے ہاتھ فروخت کی جس کا کچھ حصہ آپ ﷺ کے حوالے نہیں کیا تھا اور میں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ آپ ٹھہریے میں باقی حصہ اسی جگہ لے کر آتا ہوں۔ لیکن جب میں وہ حصہ لینے کے لیے گھر آیا تو میں بھول گیا اور مجھے تین روز کے بعد اپنا وعدہ یاد آیا۔ جب میں وہاں آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اسی جگہ کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر صرف اتنا فرمایا کہ تم نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ میں نے تین دن اسی جگہ تمھارا انتظار کیا (۳۴)۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے صحابہ کرامؓ کو عہد و پیمان کی پابندی کی تعلیم دی۔ خیبر کی ایک یہودی عورت نے آپ ﷺ کو زہر دے دیا لیکن آپ ﷺ نے اس سے کوئی انتقام نہ لیا۔ پھر آنحضرت ﷺ پر ایک یہودی نے اپنی دانست میں جادو کیا لیکن آپ ﷺ نے معاہدہ کی بنا پر اسے معاف فرما دیا (۳۵)۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں اور کافروں کے مابین میل جول ہو گیا، سیدنا سلمہؓ کا بیان ہے کہ اس میں حالت میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ اتفاق سے میرے پاس چار مشرک آ گئے۔ آتے ہی انھوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی مذمت کی اور ہجو گوئی شروع کر دی۔ میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں ان کے ہجو یہ کلمات نہ سن سکا اور اٹھ کر دوسرے درخت کے سایہ کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ وہ سب اس درخت کی شاخوں میں اپنے ہتھیار لٹکا کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شور سا مچا کہ ابن زنیم قتل کر دیا گیا۔ میں نے یہ شور سن کر تلوار نیام سے نکال لی اور سوتے میں ان چاروں پر حملہ کر دیا۔ پہلے ان کے ہتھیاروں پر اچھی طرح قبضہ کر لیا۔ پھر ان سے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا ہے تم میں سے جو شخص بھی اپنا سر اٹھائے گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔ پھر ایک طرف سے میں ان چاروں کو اور دوسری طرف سے میرے چچا عامر ایک دوسرے کافر کو جس کا نام مکرز تھا گھسیٹتے ہوئے جنابِ ختمی مرتبت ﷺ کے پاس لائے۔ لیکن رحمت عالم ﷺ نے ان سب کو معاف فرما دیا اور ہمیں فرمایا: ''انھیں چھوڑ دو۔ برائی کی ابتدا انھی کی طرف سے ہونی چاہیے'' (۳۶)۔

دنیا کے کسی دستور میں انھیں چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر آپ انھیں قتل کر دیتے تو درحقیقت

بدعہدی اور نقضِ پیمان کے ذمہ دار وہی لوگ ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے نقضِ عہد کی اس ظاہری شکل کو بھی گوارا نہ کیا جو ان کے قتل سے پیدا ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کے خلق عظیم کے تمام ابوابِ اخلاق میں سب سے زیادہ نمایاں باب یہ ہے کہ:

''لم ینتقم لنفسه'' (۳۷) (آپؐ اپنی ذات کے لیے کسی سے کبھی انتقام نہیں لیا)۔

ایسا کرنے میں اگرچہ حقیقی طور پر نقضِ عہد نہیں ہوسکتا تھا تاہم بظاہر نقضِ عہد کا شبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ اسلام آپ کے صاف وشفاف دامن پر اس قسم کا معمولی سا ظاہری دھبہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اخلاقِ نبوی ﷺ کی خصوصیات:

اخلاقِ نبوی کی سب سے بڑی خصوصیت ہمہ گیریت و عالم گیریت ہے اور اس میں تمام اچھائیوں اور برائیوں کے بارے میں جزئیات تک کی احاطہ بندی کی گئی ہے نیز زمان ومکان کی قید سے ماوراء ہے۔ جبکہ دوسرے اخلاقی معلموں نے اپنی اخلاقی تعلیمات صرف ایک قوم یا ایک زمانہ کی اصلاح تک محدود رکھیں۔

اخلاقِ نبوی کی دوسری بڑی خصوصیت جو اسے دوسرے مکاتبِ اخلاق سے ممتاز کرتی ہے وہ آپ ﷺ کا عظیم الشان اسلوبِ تعلیم ہے۔ جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں مفقود ہے۔ آپ ﷺ نے قول کے ساتھ عمل کو اتنے مکمل طریقے پر لایا کہ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک قرآنِ مجید کی جیتی جاگتی زندہ و تابندہ تفسیر بن گئی۔

اخلاقِ نبویؐ کی تعلیم میں افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اپنانے کو کہا گیا ہے جس سے مسیحی فلسفہ اخلاق نے منہ پھیر لیا تھا جب تک protestism نے اس رہبانی اخلاقیات کے خلاف بغاوت کر کے نفس کے ان اجزاء کو تمدن اور اخلاق میں مناسب جگہ نہ دی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے ذہن پر ایک طرح کا جمود چھایا رہا۔ اصل میں انھی میں سے شجاعت، حوصلہ مندی، پامردی، محبت اور دوسری اچھائیاں جنم لیتی ہیں اور برائی ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے جبکہ اخلاقِ نبوی ﷺ نے ان اوصاف حمیدہ کی تعلیمات پر سب سے زیادہ زور دیا (۳۸)۔

اب ہم وہ اخلاقی اقدار بیان کریں گے جن پر آنجناب علیہ السلام نے خود عمل کیا اور دوسروں

کو عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

ایفائے عہد:

ایفائے عہد ایک بنیادی اخلاقی وصف ہے اور اسے صدق ہی کی قسم سمجھنا چاہیے کیونکہ وعدے کا لحاظ انسان کی صداقت کا مظہر ہے۔ انسانی شخصیت کے عیوب میں سے ایک بدعہدی ہے۔ قرآن و حدیث نے اس فضیلت کو بھی اخلاق الٰہی کے حوالے سے بیان کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾ (۳۹) (اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں)۔ ایک اور جگہ پر ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً﴾ (۴۰) (اور عہد کو پورا کرو کیونکہ ہر عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا)۔

ایفائے عہد کے متعلق کئی احادیث موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

"عن ابی سعید ان النبی ﷺ قال لکل غادرٍ لواءٌ یوم القیامة یرفع له بقدر غدر ألا غادر اعظم غدراً من امیرٍ" (۴۱) (حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر ایک وعدہ شکن کے لیے قیامت کے دن ایک نشان ہوگا جو اس کی وعدہ شکنی کی مقدار کے مطابق بلند کیا جائے گا اور یاد رکھو کہ سب سے بڑا وعدہ شکن وہ شخص ہے جو قوم کا سردار ہو کر وعدہ شکنی کرے)۔

غزوۂ بدر کے موقع پر حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور ابو جمیل رضی اللہ عنہ دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے۔ راستہ میں کفار نے ان کو روک لیا کہ محمد ﷺ کے پاس جا رہے ہیں۔ انھوں نے انکار کیا آخر اس شرط پر رہائی دی کہ وہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو ماجرا سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم دونوں واپس جاؤ، ہم بہر حال وعدہ وفا کریں گے۔ ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے (۴۲)۔ دشمن کے مقابل اپنے سپاہ کی کمی کے باوجود ایسی اعلیٰ مثال پیش کرنا صرف نبوی خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔

صدق:

انسان کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں تو اس کا نام صدق یا سچائی ہے۔ صدق صفاتِ الٰہی میں سے ایک بڑی صفت اور سب نیکیوں کی جڑ ہے۔ صدق بھی

ایک بنیادی اخلاقی وصف ہے۔ انسانی شخصیت کے عیوب میں سے ایک جھوٹ ہے۔ اس وجہ سے قرآن اور حدیث میں اس کی بہت مذمت کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہے ﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثاً﴾ (۴۳) (اللہ سے کون بات میں زیادہ سچا ہے) ﴿وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (۴۴) (اللہ نے وعدہ سچ کیا اور اللہ سے کون بات میں زیادہ سچا ہے) ﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُواْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً﴾ (۴۵) (کہہ (اے پیغمبر ﷺ) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو)۔

آپ ﷺ نے خود بھی سچ پر عمل کیا اور ہمیشہ اپنے رفقائے کار کو بھی سچ بولنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ سطور ذیل میں سچ اور راست بازی کے متعلق آنحضرت ﷺ کی چند احادیث مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:

"عن عبداللّٰہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ان الصدق یھدی الی البر وان البر یھدی الی الجنۃ وان الرجل لیصدق حتی یکون صدیقا وان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار وان الرجل لیکذب حتی یکتب عنداللّٰہ کذابا" (۴۶) (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سچ بولنا نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی بہشت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ خدا کے نزدیک صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بولنا بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری دوزخ کی طرف لے جاتی ہے آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے)۔

"عن ابی ھریرہ ان رسول اللّٰہ ﷺ قال ایۃ المنافق ثلاث اذاحدث کذب واذا وعدا خلف واذا اتمن خان" (۴۷) (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے)۔

"عن صفوان بن سلیم انہ قال قیل لرسول اللّٰہ ﷺ ایکون المومن جبانا؟

فقال (نعم) فقيل له ايكون المؤمن بخيلاً فقال (نعم) فقيل له ايكون المؤمن كذاباً؟ فقال لا "(۴۸) (حضرت صفوان بن سلیمؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے، فرمایا ہاں پھر اس شخص نے پوچھا کہ مسلمان بخیل ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں لیکن جب اس شخص نے پوچھا کیا مسلمان جھوٹا ہوسکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں)۔

"عن ام معبد قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول: اللهم طهر لساني من الكذب و قلبي من النفاق و عملي من الريا ولساني من الكذب، و عيني من الخيانة، فإنك تعلم خائنة الاعين وما تخفي الصدور" (۴۹) (حضرت ام معبدؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ دعا کرتے سنا کہ "میرے اللہ میری زبان کو جھوٹ سے پاک رکھ۔ اور دل کو نفاق سے، عمل کو ریا سے، زبان کو جھوٹ سے، اور آنکھ کو خیانت سے پاک فرما، بے شک آنکھوں کی خیانت اور سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو تو ہی جانتا ہے")۔

"عن ابی هريره قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لايكلمهم الله يوم القيامة ولا يزكيهم قال ابو معاوية ولا ينظر اليهم ولهم عذاب اليم شيخ زان وملك كذاب وعائل مستكبر" (۵۰) (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تین شخص ہیں جن کے ساتھ خداوند کریم قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا (حضرت معاویہؓ کہتے ہیں) نہ ان کی طرف دیکھے گا اور ان کے لیے سخت عذاب ہے ایک پیر فرتوت زانی، دوسرا بادشاہ جھوٹ بولنے والا اور فقیر متکبر)۔

رسول کریم ﷺ کی سچائی سارے عرب میں مشہور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ نے دعویٰ نبوت کیا تو کفار میں جو لوگ آپ ﷺ سے واقف تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو کاذب نہیں کہا بلکہ آپ ﷺ کو مجنون، ساحر اور شاعر کہتے رہے (نعوذ باللہ)۔

آپ ﷺ کے شدید دشمن ابوجہل کا اعتراف تاریخ کے صفحات میں موجود ہے جب اس نے رسول کریم ﷺ سے کہا کہ ہم آپ ﷺ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس پیغام کو جھوٹا کہتے ہیں جو آپ ﷺ لائے ہیں (۵۱)۔

ایک روز روسائے قریش بیٹھے ہوئے رسول کریم ﷺ کے خلاف مشورہ کرنے لگے تو نضیر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاں دیدہ تھا کہا کہ محمد تمھارے سامنے بچہ جوان ہوا، وہ تم میں

سے سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا اور جب وہ بوڑھا ہو گیا اور تمھارے پاس پیغام لایا تو تم اسے ساحر، کاہن، شاعر اور مجنوں کہتے ہو۔ خدا کی قسم وہ ساحر نہیں (۵۲)۔

جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا یا معشر القریش! جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر جرار آ رہا ہے تو کیا تم یقین کر لو گے؟'' سب نے کہا ہاں کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا (۵۳)۔

قیصر روم نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمھارے ہاں ایک رسول نے دعویٰ نبوت کیا ہے، اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں (۵۴)۔

حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں سچائی کی چھ اقسام بیان کی ہیں اور قرآن اور حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ ۱۔ بات کی سچائی ۲۔ ارادہ اور نیت میں سچائی ۳۔ عزم میں سچائی ۴۔ عزم کو پورا کرنے میں سچائی ۵۔ عمل میں سچائی ۶۔ دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔ اگر صدق کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے اور اس کے معنی و مفہوم کو وسعت دیں تو صدق کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

عدل و انصاف:

عدل ایک ایسا جوہر ہے جس سے نظامِ حیات قائم ہے۔ اس کے بغیر فرد اور معاشرہ فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔

عدل کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا، برابر کرنا، توازن قائم رکھنا، افراط اور تفریط سے بچنا۔ جب کسی بوجھ کو دو پلڑوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں بھی ذرا کمی بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری ترمیم الفاظ سے ''عدل'' کا مفہوم واضح یا متعین ہوا یا نہیں۔ لیکن اس تغیر لفظی کے بغیر اس جملے میں دیکھیں کہ آخر کیا کہا گیا ہے۔ (مصنف شبیر قمر)

عدل کی اہمیت کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾(۵۵) (اللہ تمھیں عدل واحسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے اور وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو)۔

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوْا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا ﴾(۵٦) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ انصاف پر قائم ہونے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اگر چہ معاملہ تمھاری ذات یا ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمھاری نسبت) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو)۔

دوسری جگہ یوں فرمایا: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾(۵۷) (اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو)۔

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی لوگوں کے معاملات عدل وانصاف کے ساتھ طے کرنے کی ذمہ داری آپ ﷺ پر آ پڑی تھی۔ آپ ﷺ جن مصائب اور مشکلات کے مراحل سے گزرے تھے ان کا فطری تقاضا تو یہ تھا کہ آپ ﷺ منتقم ہوتے، مخالفین کو حد سے بڑھ کر سزا دیتے اور دوستوں اور دشمنوں کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل میں ہمیشہ دوستوں کا ساتھ دیتے۔ لیکن آپ ﷺ نے معاملات کے فیصلوں میں عدل وانصاف کی شاندار مثالیں قائم کیں۔ کتب سیرت و حدیث میں آپ کے فیصلوں اور آپ کے معاملات کی جو تفصیلات موجود ہیں ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی عدل وانصاف کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔

معاشی عدل اس بات کا متقاضی ہے کہ ملک کے ہر فرد کو قومی ذرائع اور دولت سے برابر کے

استفادہ کا حق حاصل ہو اور ایسے اصول وضع کر دیے جائیں جن کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہو سکے۔

اسلام نے دنیا و مافیہا کی ہر چیز کو اللہ کی امانت قرار دیا ہے اور اس امانت کو انسان کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ اس سے اللہ کے قانون کے تحت فائدہ اُٹھائے۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾ (۵۸) (اور ہم نے تمھیں زمین پر آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے ہیں)۔

﴿وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۵۹) (آسمانوں اور زمینوں کے خزانے اللہ کے لیے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ان خزانوں سے ہر شخص کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾ (۶۰) (جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کے فضل (رزق) کی تلاش میں زمین پر پھیل جاؤ)۔

رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ ثم قرأ فأما من اعطىٰ واتقى وصدّق بالحسنىٰ'' (۶۱) (دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اسے ملے گی پھر آپؐ نے یہ آیت مبارکہ پڑھی: ''فاما من اعطىٰ واتقى وصدق بالحسنىٰ'')۔

ایک طرف اسلام نے معاشرہ کے تمام افراد کو روزی حاصل کرنے کے یکساں مواقع دیے ہیں تاکہ اقتصادی عدل وانصاف قائم رہے۔ دوسری طرف ناجائز ذرائع سے دولت کمانے پر پابندی عائد کی ہے تاکہ دولت کے وسائل پر محدود چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو جائے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿یایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل﴾ (۶۲) (اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ)۔

آپ ﷺ انصاف کے اس ارفع مقام پر فائز تھے کہ دشمن اور دوست میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ خاندان بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید کو رسول کریم ﷺ کے پاس

سفارش کے لیے بھیجا۔ آپ ﷺ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اس کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے درگزر کرتے تھے (٦٣)۔ اپنی وفات سے چند روز پہلے آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ اگر آپ ﷺ کے ذمے کسی کا کچھ آتا ہے تو طلب کرے سبھی جماعت خاموش رہی ایک شخص چند درہم کا متقاضی ہوا فوراً وہ رقم ادا کر دی گئی (٦٤)۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک جماعت آپ ﷺ کے گرد تھی۔ ایک شخص نے اپنے بدن کا سارا بوجھ آپ ﷺ پر ڈال دیا، آپ ﷺ نے پتلی سی چھڑی سے اسے ہٹا دیا لیکن چھڑی کی نوک سے اس کے چہرے پر خفیف سی خراش آ گئی، آپ ﷺ نے فوراً اس سے فرمایا، مجھ سے انتقام لے سکتے ہو۔ اس نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! میں نے بطیب خاطر آپ ﷺ کو معاف فرما دیا (٦٥)۔

ایثار:

ایثار حقیقت میں فیاضی ہی کا آخری درجہ ہے۔ آنجناب علیہ السلام کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کے اندر یہ جوہر پیدا کر دیا کہ وہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلاتے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہجرتِ رسولؐ کے موقع پر جو مناظر سامنے آئے وہ عالمِ ارض کی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتے۔ انصارِ مدینہ نے مہاجرینِ مکہ کو جس طرح خوش آمدید کہا اور جس طرح سہولتوں کی پیشکش کی ان کی نظیر نہیں ملتی (٦٦)۔

اللہ تعالیٰ نے ایثار کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (٦٧) (اور وہ اپنے آپ پر انھیں مقدم رکھتے ہیں گو انھیں تنگی ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے)۔

﴿إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا﴾ (٦٨) (ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ)۔

انصار کا یہ ایثار دراصل اس تاثیر کا نتیجہ تھا جو دعوتِ اسلامی اور خلقِ محمدیؐ نے پیدا کی۔ کتب

حدیث میں آپ ﷺ کے ایثار کے جو واقعات منقول ہیں ان میں سے چند ایک پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ ترغیب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اخلاقی رویوں کا منبع و مصدر معلوم ہو۔

آپ ﷺ کو اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی جب کبھی حضرت فاطمہ ؓ آپ ﷺ سے ملنے آتی تھیں تو آپ ﷺ فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پیشانی پر بوسہ دیتے تھے، تاہم حضرت فاطمہ ؓ کی عسرت اور تنگ دستی کا حال یہ تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہیں تھی۔ خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ ایک دن بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئیں لیکن اپنی تکلیف بیان کرنے کی جرأت و ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی ؓ نے گھر کی صورت حال عرض کی اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ سے جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔

آپ ﷺ نے فرمایا اصحاب صفہ کے لیے کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکا، جب تک اس طرف سے اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک کسی طرف میں توجہ نہیں کر سکتا (۶۹)۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے ایک چادر آپ ﷺ کو تحفے کے طور پر پیش کی اور آپ ﷺ نے قبول فرمالی۔ ایک شخص نے اسی چادر کا سوال کیا۔ آپ ﷺ کو اس چادر کی اشد ضرورت تھی لیکن آپ ﷺ نے اتار کر اس کو دے دی۔ لوگوں نے ملامت کی اور کہا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے کبھی سائل کے سوال کو رد نہیں کیا۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جواب دیا ہاں میں یہ دونوں باتیں جانتا ہوں لیکن میں نے حصولِ برکت کی غرض سے ایسا کیا ہے میں وصیت کر جاؤں گا کہ مرنے کے بعد اس چادر کا مجھ کو کفن دیا جائے اور اس میں دفن کیا جائے (۷۰)۔

ایک صحابی ؓ نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ ؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ صحابی گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ گھر میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا (۷۱)۔

ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا۔ رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا۔ وہ آپ ﷺ نے مہمان کو دے دیا اور آپ ﷺ نے تمام رات فاقہ میں بسر کی۔ حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی آپ ﷺ فاقہ میں تھے (۷۲)۔

مہمان نوازی:

مہمان نوازی جودوسخا یا جذبۂ اخوت وشفقت اور اعلیٰ ظرفی کا اظہار ہے۔حضور ﷺ نے مہمان نوازی کی طرف خصوصی توجہ دی۔اسلام کے دائرہ اثر وسیع ہونے کی وجہ سے اطراف و جوانب سے مہمانوں کی آمد رہتی۔آپ ﷺ کے یہ مہمان مسجدِ نبویؐ میں اتارے جاتے۔اسی طرح بعض گھروں میں تواضع کی جاتی۔رملہ ایک صحابیہ تھیں ان کا گھر دارالضیوف تھا(۷۳)۔

مہمان نوازی کی یہ صفت رسول کریم ﷺ میں کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔مہمان نوازی میں کافر ومومن میں کوئی امتیاز نہ تھا۔

مہمانوں کا آپ ﷺ اتنا خیال رکھتے کہ اس کا اندازہ حضرت ابوذر غفاری ؓ کے بیان سے ہوسکتا ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ کافر تھے تو مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس آکر مہمان رہے اور رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے اور رات بھر تمام اہل بیت نبوی ﷺ بھوکے رہے(۷۴)۔

کتب حدیث میں آپ ﷺ کی مہمان نوازی سے متعلق چند ایک احادیث نمونہ کے طور پر پیش ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:''من کان یومن باللّٰہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفهٗ جائزته قالوا: وما جائزة؟ یا رسول اللّٰہ قال یوم ولیلةٌ والضیافة: ثلاثة ایام فما کان وراء ذالك فھو صدقة علیہا'' (۷۵)(رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مدت تکلف میں مہمان کی خاص تعظیم کرے جب پوچھا گیا کہ مدت تکلف کتنی ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور فرمایا کہ مہمان تین دن تک ہے۔اس کے بعد مہمانی نہیں صدقہ ہے)۔

''قال رسول اللّٰہ ﷺ ان من السنة ان یخرج الرجل مع ضیفه الی باب الدار'' (۷۶)(رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ فطرت سلیمہ کی رو سے آدمی کو چاہیے کہ اپنے مہمان کے ساتھ گھر کے دروازے تک جائے)۔

فرمایا:''جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت

کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے (۷۷)۔

ایک دفعہ ایک کافر مہمان ہوا۔ آپ ﷺ نے بکری کا دودھ پلایا...... وہ سارے کا سارا پی گیا آپ ﷺ نے دوسری بکری کا دودھ پلایا وہ بھی پی گیا۔ غرض سات بکریوں کا دودھ پلایا۔ جب تک وہ سیر نہ ہوا آپ ﷺ پلاتے چلے گئے (۷۸)۔

جود و سخا:

بنی نوع انسان سے ہمدردی، شفقت و محبت انفاق فی سبیل اللہ کا اظہار ہے۔ آپ ﷺ اس وصف سے بدرجۂ اتم متصف تھے۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ ﴾ (۷۹) (جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)۔ ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنفِقُوْا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُم﴾ (۸۰) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو)۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ﴾ (۸۱) (لیکن بڑا نیک وہ ہے کہ جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں کو آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے)۔

﴿مَن ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً﴾ (۸۲) (کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے)۔

﴿مَن ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ (۸۳) (کوئی شخص ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس شخص کے لیے بڑھاتا چلا جائے اور اس کو بہت اچھا بدلہ دیا جائے گا)۔

﴿الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرّاً وَعَلاَنِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ﴾ (۸۴) (جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن خرچ کرتے ہیں پوشیدہ طور پر یا علانیہ طور پر تو ان کے

لیے ان کے رب کے پاس اس کا بدلہ ہے)۔

﴿فَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (۸۵)(سو قریبی کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی)۔

مذکورہ تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رزقِ خداوندی میں سے اپنے ضرورت مند بھائی بندوں کے لیے خرچ کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے اور ضرورت مند انسانوں کی ضرورت کو پورا کرنا گویا خدا کو قرض دینا ہے اور اللہ ہی اس کا بدلہ دے گا۔

"عن جابر قال ما سئل النبی ﷺ عن شیء قط فقال لا" (۸۶)(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ ﷺ نے فرمایا ہو کہ نہیں)۔

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ خصلتان لاتجمعان فی مومن البخل وسوء الخلق" (۸۷)(حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل اور دوسری بد خلقی)۔

"عن انس قال کان النبی ﷺ یقول اللھم انی اعوذبک من البخل" (۸۸)(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے میرے خدا میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں)۔

"عن عبداللہ بن حبشی ان النبی ﷺ سئل فای الصدقة افضل قال جهد المقل" (۸۹)(حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نادار کا صدقہ جو وہ کوشش کر کے دے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ سخی تھے۔ رمضان کے مہینے میں بہت ہی سخی ہو جاتے تھے۔

"عن انس قال کان رسول اللہ ﷺ احسن الناس واجود الناس واشجع الناس" (۹۰)(حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ حسین اور

سب سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ بہادر تھے)۔

ایک شخص نے بارگاہ نبوت میں آکر سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں تم میرے نام پر قرض لے لو۔ میں پھر اسے اتار دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا نے آپ ﷺ کو یہ تکلیف نہیں دی کہ طاقت سے بڑھ کر کام کریں۔ آپ ﷺ خاموش رہے کہ ایک انصاری نے پاس سے کہہ دیا یا رسول اللہ ﷺ! خوب داد و دہش کیجیے رب العرش مالک ہے۔ عسرت کا کیا ڈر ہے آپ ﷺ ہنس پڑے اور رُوئے مبارک پر خوشی وانبساط کی لہر دوڑ گئی اور فرمایا ہاں مجھے بھی یہی حکم ملا ہے۔(۹۱)۔

ایک دفعہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ دور تک آپ ﷺ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے، اس نے درخواست کی، آپ ﷺ نے سب کی سب دے دیں۔ اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کر لو، محمد ﷺ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے (۹۲)۔

ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلاف معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے، لوگوں کو تعجب ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں ہے گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور سونا گھر میں پڑا رہ جائے اس لیے اس کو خیرات کر دیا ہے (۹۳)۔

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت ﷺ اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے۔ راہ میں بدوؤں کو خبر ہوئی کہ ادھر سے آپ ﷺ کا گزر ہونے والا ہے، آس پاس سے وہ لوگ دوڑ دوڑ کر آئے اور آپ ﷺ لپٹ گئے کہ ہمیں عنایت ہو۔ آپ ﷺ بھیڑ سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انھوں نے چادر تھام لی۔ بالآخر اس کشاکش میں چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میری چادر دے دو، خدا کی قسم ان جنگلی درختوں کے برابر بھی میرے پاس ہوتا تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل پاتے نہ دروغ گو نہ نامرد (۹۴)۔

"عن انس ان رسول اللّٰه کان لایدخر شیئًا لغد" (۹۵) (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کل کے لیے کوئی چیز نہ اٹھا رکھتے تھے)۔

شرم وحیا:

شرم و حیا وہ اخلاقی وصف ہے جس سے کئی دوسری اخلاقی اوصاف کی آبیاری ہوتی ہے۔ عفت و پاکبازی کی صفات اسی کی بدولت پروان چڑھتی اور محفوظ رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مروت وچشم پوشی اسی کے باعث پیدا ہوتی ہے اور بہت سے گناہوں سے بچے رہنا حیا کی برکت سے ہوتا ہے۔ اور آنجناب ﷺ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد شرم و حیا کا مجسم پیکر تھے۔ آپ ﷺ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ ربانی ہدایت سے محروم تھا اور تہذیبی قدروں کے لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ ان کے قبائلی نظام میں صرف چند قدریں تھیں جن کا وہ لحاظ سے کرتے تھے۔

قرآن مجید میں شرم وحیا پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (۹٦) (اور بے شرمی کی باتیں کھلی ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ پھٹکو)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے واسطہ پڑا۔ جب آپ نے ان کے مویشیوں کو پانی پلانے میں مدد کی تو انھوں نے اپنے والد سے اس نوجوان کا ذکر کیا۔ والد نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے بھیجا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ﴾ (۹۷) (نوجوان دولڑکیوں میں سے ایک شرماتی ہوئی ان کے پاس آئی)۔

اس آیت میں شرم وحیا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کی تعریف کی۔

رسول کریم ﷺ کے اس وصف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ﴾ (۹۸) (تمھاری اس بات سے رسولؐ کو ایذا پہنچتی ہے تو تم سے وہ شرماتے ہیں)۔

یہ وصف اللہ کی طرف بھی منسوب ہوا ہے ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۹۹) (اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتا چاہے وہ مثال مچھر کی ہو یا اس سے بڑھ کر کسی اور حقیر چیز کی ہے)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے شرم و حیا کے متعلق کئی ارشادات ہیں: "عن عمران بن حصین

قال قال رسول اللہ ﷺ الحیا لا یاتی الا بخیر" (۱۰۰) (حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حیا یقیناً بھلائی (خیر) کا موجب ہوتی ہے)۔

"عن عبداللّٰہ بن عمر ان النبی ﷺ مر علی رجل من الانصار وھو یعظ اخاہ فی الحیاء. قال رسول اللّٰہ ﷺ دعہ فان الحیاء من الایمان" (۱۰۱) (حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ انصار میں سے ایک شخص کے پاس سے گزرے، وہ اپنے بھائی کو حیاء کی نصیحت کر رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا اسے کچھ نہ کہو بے شک حیا ایمان کا جزو ہے)۔

"عن انس قال قال رسول اللّٰہ ان لکل دین خلقا و خلق الاسلام الحیا" (۱۰۲) (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر ایک دین کا ایک خاص وصف ہے اور اسلام کا خاص وصف حیا ہے)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی برہنگی کو کبھی نہیں دیکھا (۱۰۳)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ میں پردہ نشین لڑکی سے بڑھ کر حیا تھی۔ (۱۰۴) جب آپ ﷺ کسی بات کو دیکھتے جسے ناپسند فرماتے تو ہم یہ بات آپ کے چہرے سے معلوم کر لیتے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰۵) (حضرت محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں اور لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے حق میں سخت اور آپس میں رحم دل ہیں)۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (۱۰۶) (اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سمو لیا ہے)۔

﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (۱۰۷) (وہی رحم کرنے والا مہربان ہے)۔

﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (۱۰۸) (اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسی وصف کے ساتھ رسول کریم ﷺ کو متصف فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۱۰۹) (لوگو! تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک رسولؐ آئے ہیں، تمھاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے اور تمھاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں مسلمانوں پر بہت شفیق اور رحیم ہیں)۔

حدیث میں ہے کہ: ''خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑا اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے (۱۱۰)۔

''عن ابی هريره قال سمعت ابا القاسم ﷺ يقول لا تنزع الرحمة الا من شقي'' (۱۱۱) (حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جس شخص کے دل میں سے رحم ہٹا یا جاتا ہے وہ یقیناً بد بخت ہوتا ہے)۔

''عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا اهل الارض يرحمكم من في السماء'' (۱۱۲) (حضرت عبداللہؓ بن عمرو سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر خدائے رحیم رحم کرتا ہے۔ زمین کے رہنے والوں پر رحم کرو تا کہ آسمان پر رہنے والا تم پر رحم کرے)۔

''عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله ﷺ انما يرحم الله من عبادهِ الرحماء'' (۱۱۳) (حضرت اسامہؓ بن زید سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو (خود) رحم کرنے والے ہوتے ہیں)۔

فرمایا: ''لا يرحم الله من لا يرحم الناس'' (۱۱۴) (جو شخص بندوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا)۔

اس حدیث میں تمام مخلوق پر رحم کھانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کے جذبۂ رحمت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کا بوسہ لیا۔ اقرعؓ بن حابس جو پاس بیٹھے

ہوئے تھے بولے کہ میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'' (۱۱۵)۔

ایک اور بدو نے آپ ﷺ سے کہا کہ لوگ بچوں کو چومتے ہیں لیکن ہم لوگ نہیں چومتے۔ ارشاد ہوا کہ ''خدا نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے'' (۱۱۶)۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے پھر دونوں زانوؤں کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں (۱۱۷)۔

عزم واستقلال:

مشکل اور کٹھن حالات میں حق وصداقت پر ڈٹے رہنے کا نام عزم واستقلال اور استقامت ہے۔ ماہرین اخلاق اس کو شجاعت کا لازمہ سمجھتے ہیں کیونکہ استقامت اور استقلال کا نہ ہونا بزدلی کی دلیل ہے۔ یہ وصف قوموں کی ترقی کا باعث ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا۟ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا۟ وَاذْكُرُوا۟ اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۱۱۸) (اے مسلمانو! جب تم کافروں کے کسی گروہ سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن تَنصُرُوا اللّٰهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (۱۱۹) (اے مسلمانو! اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدموں کو ثابت رکھے گا)۔

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَمَّا بَرَزُوا۟ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ قَالُوا۟ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (۱۲۰) (جب وہ (طالوت کے پیروکار) جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم پر استقلال نازل فرما۔ ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں ان کافروں پر غالب کر)۔

آپ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک کارنامہ آپ ﷺ کے عزم استقلال کا مظہر ہے۔عرب کے ماحول میں ایک بے یار و مددگار شخص دعوت اسلام کی آواز بلند کرتا ہے۔اپنے اور بیگانے حق کی آواز کو دبانے کے لیے تل جاتے ہیں۔لیکن اس انتہائی کٹھن اور مشکل مرحلے میں بھی آپ ﷺ کے عزم استقلال میں لغزش پیدا نہ ہوسکی۔مکہ کے ارباب اقتدار نے آپ ﷺ کو حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسین سے حسین بیوی کی پیش کش کی لیکن آپ ﷺ نے حقارت سے تمام پیشکشوں کو ٹھکرا دیا۔پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب آپ ﷺ کے ہمدرد چچا نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا (۱۲۱)۔یہ عزم واستقلال کا آخری امتحان تھا۔اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے میرے پیارے چچا اگر قریش میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں۔تب بھی توحید کی منادی کرنے سے باز نہ آؤں گا)(۱۲۲)۔

شجاعت:

لغت میں شجاعت کا مفہوم بہادری ہے لیکن ماہرین اخلاق کی اصطلاح میں قوت غضبی کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کا نام شجاعت ہے۔

وصف شجاعت آپ ﷺ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اس وصف کا اظہار میدان جنگ میں یا مصائب و آلام کے وقت ہوتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (۱۲۳) (جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو لیکن زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والے کو ناپسند کرتا ہے)۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ (۱۲۴) (اے مسلمانو! ہمت نہ ہارو اور نہ تم غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم کامل مومن ہو)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ﴾ (۱۲۵) (اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو تم پیٹھ نہ پھیرو)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾ (۱۲۶) (اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو)۔

ایک مومن کی تعریف بھی قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کافروں کی وقت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ارشاد الٰہی ہے: ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (۱۲۷) (وہ کافروں پر زور آور ہیں)۔

علم الاخلاق کی کتب میں لکھا ہے کہ اخلاق فاضلہ دراصل چار ہیں۔حکمت،شجاعت،عفت اور عدالت۔پھر ان میں سے ہر ایک کی بہت سی قسمیں ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شجاعت ایک نہایت اعلیٰ وصف ہے اور رسول کریم ﷺ علی وجہ الکمال اس خلق سے متصف تھے۔جس کی گواہی حالات و واقعات دیتے ہیں۔

آپ ﷺ نے تمام دوستوں کو مکہ سے رخصت کر کے پھر خود ہجرت کی۔ جب غزوات پیش آئے تو آپ ﷺ نے سب سے بڑھ کر بہادری کا ثبوت دیا (۱۲۸)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگ آپ ﷺ کی آڑ میں پناہ لیے ہوئے تھے۔آپ ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔مشرکین کی صف سے اس دن آپ ﷺ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا (۱۲۹)۔

انکسار و تواضع:

کبریائی اللہ تعالیٰ کی ہی صفت ہے۔جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱۳۰)

(آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے)۔

بندوں کی شان نہیں کہ وہ اللہ کی صفت کبریائی میں شریک ہوں اور اظہار کبریائی کریں۔ بندوں کی شان یہی ہے وہ تواضع اور انکسار اختیار کریں اور یہی اللہ کو پسند ہے۔تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جس شخص نے تکبر اور کبریائی کا اظہار کیا وہ خدا کی گرفت میں آ گیا۔اس ضمن میں نمرود اور فرعون کی ہلاکت کا ذکر قرآن میں آتا ہے کہ انھوں نے تکبر کا اظہار کیا اور عتاب الٰہی کے مستوجب ٹھہرے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۳۱) (اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکا دے)۔

دوسری جگہ آتا ہے: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۳۲) (اور

اپنا بازو جھکا رکھ ان مومنوں کے لیے جنھوں نے تیری پیروی کی ہے)۔

﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (۱۳۳) (رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی وانکسار سے چلتے ہیں)۔

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (۱۳۴) (اور لوگوں کے لیے تکبر سے اپنا گال مت پھلا اور زمین میں اتراتے ہوئے مت چلو، اللہ تعالیٰ ہر اترانے والے تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا)۔

"عن انس قال جآء رجل الی النبی ﷺ فقال یا خیر البریة فقال رسول اللّٰه ﷺ ذاك ابراهیم علیه السلام" (۱۳۵) (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا اے بہترین مخلوق تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہیں یہ وصف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے)۔

"قال رسول اللّٰه ﷺ لا تطرونی کما اطری عیسیٰ ابن مریم وقولوا عبداللّٰه ورسولهٗ" (۱۳۶) (رسول کریم ﷺ نے فرمایا میری مدح میں مبالغہ نہ کرنا جس طرح نصاریٰ کی طرف سے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی مدح میں مبالغہ کیا گیا، میں تو خدا کا ایک بندہ ہوں اور اس لیے تم مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ کہو)۔

"عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال مانقصت صدقة من مال ومازاد اللّٰه عبداً بعفو الا عزا وما تواضع احد للّٰه الا رفعه اللّٰه" (۱۳۷) (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور کسی کا قصور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ عزت بڑھاتا ہے اور اگر کوئی شخص خداوند تعالیٰ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کرے تو خدا اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے)۔

باوجود صاحب اقتدار ہونے کے مریضوں کی عیادت فرماتے، جنازوں میں شریک ہوتے، غلاموں کی دعوت قبول فرماتے اور اپنے جوتوں کو مرمت خود ہی کر لیتے۔ کپڑوں پر پیوند خود ہی لگا لیتے اور گھر میں ازواج کے ساتھ مل کر خانگی فرائض ادا کر دیتے (۱۳۸)۔

ایک دفعہ ایک شخص کو صحابہ ﷺ آپ ﷺ کے پاس لائے، وہ خوفزدہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا خوف مت کرو میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی (۱۳۹)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جوتی کو خود پیوند لگاتے اور اپنا کپڑا خود سیتے، اپنے گھر میں ویسا ہی کام کاج کرتے جیسا تم میں سے ہر ایک شخص اپنے گھروں میں کام کاج کرتا ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپؐ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے، کپڑوں کی جوئیں آپ چنتے اور اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنا کام آپ کرتے (۱۴۰)۔

رفق ولطف:

لغت میں لطیف کا ایک معانی یہ کہ اپنے بندوں پر نرمی کرنا اور رفق ولطف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق ولطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے۔

﴿اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ﴾ (۱۴۱) (اللہ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا ہے جس کو چاہتا رزق دیتا ہے۔ وہی قوت والا اور غالب ہے)۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاھِیْمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیْمٌ﴾ (۱۴۲) (بے شک ابراہیمؑ نرم دل وبردبار ہے)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس صفت خلق کی مدح میں قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاھِیْمَ لَحَلِیْمٌ أَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ﴾ (۱۴۳) (بے شک ابراہیمؑ بردبار نرم دل حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے)۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنتَ لَھُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۱۴۴) (تو اللہ کی رحمت کے سبب سے ان کے لیے نرم دل ہوئے اور تند مزاج اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے دوڑ گئے ہوتے)۔

آنجناب علیہ السلام نے اپنے صحابہ کو بھی ان اوصاف کریمہ کی بہت زیادہ ترغیب دلائی۔

ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو رفق ونرمی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا

"ان الرفق لایکون فی شیء الا زانه ولا ینزع من شیء الا شانه" (۱۴۵) (نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے وہ جس سے الگ کرلی جاتی ہے تو اس کو بدنما کردیتی ہے)۔

"عن جریر عن النبی ﷺ قال من یحرم الرفق یحرم الخیر" (۱۴۶) (حضرت

جریرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص نرمی سے محروم کیا گیا وہ ہر ایک نیکی سے محروم کیا گیا)۔

"عن عبداللّٰہ بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ ﷺ الا اخبرکم بمن یحرم علی النار وبمن تحرم علیه النار علیٰ کل هین لین قریب سهل" (۱۴۷)(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمھیں وہ شخص نہ بتاؤں جو دوزخ کی آگ پر حرام ہے اور جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ ہر آہستہ رو، نرم مزاج اور نرم خوئی کے ساتھ ہم نشینی کرنے والے پر آتش دوزخ حرام ہے)۔

"کنان رسول اللّٰہ ﷺ رحیما رقیقا" (۱۴۸)(رسول کریم ﷺ رحم مزاج اور نرم طبیعت تھے)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا نرم خو ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر یا اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا)(۱۴۹)۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ جب احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی جاتی تو اس کو سزا دیتے (۱۵۰)۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم پر (معاذ اللہ) موت آئے۔ حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں اور انھوں نے جواب میں کہا: "وعلیکم السام واللعنة" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ رسول کریم ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ عائشہؓ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ بولیں یا رسول اللہ ﷺ انھوں نے جو کچھ کہا کیا آپؐ نے نہیں سنا، اس پر آپؐ نے فرمایا میں نے بھی تو کہہ دیا کہ "علیکم" یعنی تم پر (۱۵۱)۔

زہد و قناعت و استغنا:

اِن تینوں الفاظ کے معنی ایک ہی ہیں یعنی دنیا سے بے رغبتی، سیر چشمی اور بے نیازی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت غنی کا پرتو ہے اور انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی تمام دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ اور سورۂ فاتحہ کی آیت ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (۱۵۲)(ہم تیری عبادت

کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں) میں اسی صفت بے نیازی کی تعلیم دی ہے۔اس صفت میں رسول کریم ﷺ درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہی ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی حاجات اسی ایک حقیقی داتا کے سامنے ہی پیش کریں اور غیروں کے مال ومنال کی طرف لالچ اور حرص کی نگاہ سے مت دیکھیں۔ارشادالٰہی ہے: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ﴾ (۱۵۳)(اوراپنی آنکھوں سے طمع کے ساتھ ان چیزوں کی طرف مت دیکھیے جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا)۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (۱۵۴)(اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی۔م تو اس کی ہوس مت کرو)

چنانچہ کتب سیرت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کے گھر متواتر دو دو ماہ تک آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن زبیر ؓ نے پوچھا کہ آخر کس چیز پر گزارا فرماتے تھے۔ بولیں پانی اور کھجور البتہ کبھی کبھی ہمسائے والے بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیتے تھے(۱۵۵)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ ﷺ نے کبھی دو وقت سیر ہوکر روٹی نہیں کھائی(۱۵۶)۔

ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ان کا سوال پورا کر دیا،لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا،آپ ﷺ نے پھر ان کا سوال پورا کیا،جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا جو شخص خود داری چاہتا ہے خدا اس کو خود دار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے(۱۵۷)۔

حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ ﷺ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم! یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا

ہے، خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا، ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ قبول نہیں کیا (۱۵۸)۔

امانت و دیانت:

امانت کا لفظ جامع ہے ان تمام امانتوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ نے یا معاشرے نے یا افراد نے کسی شخص کو سپرد کی ہوں۔ آپس کے لین دین کے معاملات میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ امانت اور دیانت ہے۔ یہی وہ خلق ہے جس کی وجہ سے معاشرتی امن قائم ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾ (۱۵۹) (اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس رکھتے ہیں)۔

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ﴾ (۱۶۰) (پس جو امین بنایا گیا ہے اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار سے ڈرے)۔

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَخُونُواْ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُونُواْ أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (۱۶۱) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو)۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ (۱۶۲) (بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کر دو)۔

"**عن انس قال ما خطبنا نبی اللّٰہ ﷺ الا قال لا ایمان لمن لا امانة له و لا دین لمن لا عهد لهٗ**" (۱۶۳) (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بہت کم ایسا خطبہ سنایا جس میں یہ نہ فرمایا ہو جو امانت دار نہیں اس کا ایمان نہیں، جس نے عہد کا پاس نہیں کیا اس کا دین نہیں)۔

"**عن ابی هريرة قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اية المنافق ثلاث، اذا حدث كذب و اذا وعد اخلف و اذا اوتمن خان**" (۱۶۴) (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں اگر چہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور اپنے تئیں مسلمان سمجھے، جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے)۔

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا ضیعت الامانۃ فانتظر الساعۃ قیل و کیف اضاعتھا قال اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہٖ" (۱۶۵) (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ کسی نے عرض کیا اس کے ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے۔ آپؐ نے فرمایا جب حکومت نالائق کو سپرد کی جائے)۔

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اد الامانۃ الیٰ من ائتمنک ولا تخن من خانک" (۱۶۶) (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تیرے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کر اور جس نے تیری خیانت کی تو اس کی خیانت نہ کر)۔

جب رسول کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف جانے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کو اہل مکہ کی امانتیں دیں اور کہا کہ میرے پلنگ پر سو جاؤ، صبح کو سب کی امانتیں واپس کر دینا (۱۶۷)۔

حجۃ الوداع کے موقع پر لاکھوں آدمیوں سے یہ اقرار لیا کہ جو امانت (احکام الٰہی) اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی تھی کیا میں نے اس کو پہنچا دیا ہے۔ تو سب لوگوں نے یہ اقرار کیا کہ ہاں آپؐ نے خدا کی امانت (رسالت پیغام الٰہی) ہم تک پہنچا دی ہے (۱۶۸)۔ اہلِ مکہ بھی آپ ﷺ کو امین کے لقب سے پکارتے تھے۔

نیز کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول کریم ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو (یہ مشورہ بطور) امانت سپرد کی جاتی ہے (۱۶۹)۔

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے اس کو چاہیے کہ رائے ایمان داری سے دے۔ ایک اور حدیث ہے آپؐ نے فرمایا: "المجالس بالامانۃ" (۱۷۰) (مجالس امانت کے ساتھ ہیں) اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو۔ وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے(۱۷۱)۔

احسان:

احسان، حسن سے مشتق ہے، جس کے معنی خوبی اور رعنائی کے ہیں۔ اسلام میں لفظ احسان حقوق اللہ اور حقوق العباد کو نہایت ہی خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ ادا کرنے پر بولا گیا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے احسان کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: **"ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراك"** (۱۷۲)(احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھتا ہے، اگر تو نہیں اسے دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے)۔

۱۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى﴾(۱۷۳)(اللہ انصاف کا اور احسان کرنے کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے)۔

۲۔ ﴿وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾(۱۷۴)(اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی دوسروں کے ساتھ احسان کر)۔

۳۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾(۱۷۵)(بے شک خدا احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا)۔

۴۔ ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ﴾(۱۷۶)(طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے)۔

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ جب کسی پر احسان کرتے ہیں تو بعد میں اس کو جتاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھا ہے۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ نیکی محض رضاءِ الٰہی کے لیے کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لَا تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالأَذٰى كَالَّذِىْ يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْداً لَّا يَقْدِرُونَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُواْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى

الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ﴾ (۱۷۷) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر باطل نہ کرو۔ اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا، سو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے۔ اس میں سے کچھ بھی نہ پاسکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا)۔

مطالعۂ سیرت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنا احتساب کریں اور دیکھیں کہ ہم نے سیرت پیغمبر ﷺ کی کہاں تک اتباع کی اور اخلاق نبوی ﷺ کی تمام صفات سے اپنے اخلاق کو کس قدر مزین کیا۔ کیا سیرت طیبہ کی پاکیزہ تعلیمات کو فقط زبانی تذکرے تک رکھا یا پھر انھیں اپنے قلب ونظر اور دل ودماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی اتارا۔ اپنے معاشرے میں ان کو کہاں تک لاگو کیا۔ کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت صرف نمازوں میں مصروف رہنے والے عابدوں اور جنگلوں میں ریاضت کرنے والے زاہدوں کے لیے ہی نہیں بلکہ معاشرے میں جکڑے ہوئے لوگوں کے لیے قدم قدم پر مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام نے ہمارے وجود کے گرد حقوق کے جس قدر بندھن باندھے ہیں ان سب کی ادائیگی کے طریقے اس طرح سکھائے کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہماری نجی اور اجتماعی زندگی دونوں کی عافیت کے لیے نہایت اعلیٰ اخلاقی اصول بتائے۔ جن پر عمل کر کے ایک عام اور خاص انسان راحت اور آسائش اور خوشی ومسرت کی زندگی بسر کر سکے۔

اخلاقِ حسنہ کے اثرات:

دلوں کو صرف اخلاقِ حسنہ سے ہی فتح کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ نماز اور روزہ سے تو آدمی اس وقت متاثر ہوگا جب کسی کے قریب آئے گا اور قریب لانے والی چیز اخلاق ہے۔ آپ ﷺ اگرچہ پیغمبر انقلاب بھی ہیں لیکن آپؐ نے یہ انقلاب اپنے اخلاق حسنہ سے دنیا میں برپا کیا۔ جس زمانہ میں مکہ کی سرزمین باوجود اپنی وسعت کے قریش مکہ کی ستم رانیوں کی وجہ سے آپؐ پر تنگ کر دی گئی تھی، اس وقت لوگوں کی اکثریت آپؐ کے اخلاقِ جمیلہ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئی تھی۔ ابوسفیان اور اس کی بیوی ہند، ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اور دوسرے بڑے بڑے اساطینِ کفر آپؐ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر

دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ جس زمانہ میں آپ ﷺ مدینہ طیبہ کے واحد حکمران تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم آپ ﷺ کے ایک اشارۂ ابرو پر اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار تھے، اس وقت بھی آپ ﷺ میں کوئی رعونت نہ تھی۔ نہایت سادہ زندگی تھی اور جدھر بھی آپؐ تشریف لے جاتے آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کی ضیا باریوں سے لوگ اپنے اخلاق کی راہیں روشن کرتے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب کیمیائے سعادت میں آپ ﷺ کے خلق عظیم کی ایک نہایت اجمالی تصویر پیش کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کے اخلاق حسنہ کی نوعیت کیا تھی اور کس طرح آپؐ گھر کے معمولی کام اپنے ہاتھوں سے کرلیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''آپؐ مویشیوں کو خود چارہ ڈالتے، گھر میں جھاڑو دے لیتے، بکری کا دودھ دھو لیتے، خادموں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے۔ جب کبھی ضرورت ہوتی بازار سے سودا خود خرید لاتے۔ چھوٹے بڑے کو پہلے خود سلام کرتے۔ اگر کوئی ساتھ ہوتا تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے (تا کہ بڑائی کا شائبہ نہ ہو) غلام و آقا، کالے اور گورے، حبشی و تُرک میں کوئی امتیاز نہ برتتے۔ رات دن کا لباس ایک ہی ہوتا۔ کیسا ہی چھوٹا اور حقیر شخص دعوت دیتا فوراً قبول فرماتے۔ جس قسم کا کھانا بھی سامنے رکھ دیا جاتا نہایت رغبت اور خوش دلی سے کھا لیتے۔ رات کے کھانے سے صبح کے لیے اور صبح کے کھانے سے رات کے لیے کچھ اٹھا نہ رکھتے۔ نیک مزاج، نرم خو، کشادہ رو اور خندہ جبیں تھے۔ گویا ''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، تھے۔ کبھی پوری زندگی قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے۔ اندوہ گیں تھے مگر ترش رُو نہ تھے۔ سخی تھے مگر فضول خرچ نہ تھے'' (۱۷۸)۔

آپ ﷺ ان تمام خوبیوں سے آراستہ، ان تمام فضائل سے مزین اور ان تمام اوصاف حمیدہ کے جامع تھے۔ سکینت ان کا لباس، نیکی ان کا شعار، تقویٰ ان کا خمیر، حکمت ان کا کلام، عدل ان کی سیرۃ، راستی ان کی شریعت اور ہدایت ان کی راہ نما تھی۔

محمد ﷺ کا اخلاق مستشرقین کی نظر میں:

آپ ﷺ کے ان اخلاق حسنہ اور سادگی پر یگانوں ہی نے نہیں بلکہ بیگانوں نے بھی مدح سرائی کی ہے اور آپ ﷺ پر تحسین وستائش کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ گناف وائل ہو یا واشنگٹن ارونگ،

تھامس کارلائل ہو یا ایڈورڈ گبن ہر ایک آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کا معترف ہے۔ ایڈورڈ گبن نے تو یہاں تک لکھا:

''آپ خندہ رو اور نرم خو تھے۔ سخت مزاج اور سنگ دل نہ تھے۔ نہ تو کوئی برا کلمہ زبان سے نکالتے اور نہ شور وغل کرتے جیسا کہ عام لوگوں کی عادت ہے۔ نہ عیب جو تھے اور نہ سخت گیر تھے۔ اگر کبھی کوئی بات طبیعت پر ناگوار گزرتی تو اغماض فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے یہ تین باتیں اپنے نفس سے بالکل ہی نکال دی تھیں (۱) بے ضرورت بات کرنا، (۲) بحث ومباحثہ کرنا اور (۳) بے مطلب کسی کی بات میں دخل اندازی کرنا۔ اور دوسرے لوگوں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز فرماتے تھے۔ (۱) کسی کو برا کہنا، (۲) کسی کی عیب جوئی کرنا اور (۳) کسی کی ٹوہ میں لگنا۔ دوسروں کے منہ سے اپنی مدح و ستائش سننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ فیاضی ان کی گھٹی میں تھی، راست گوئی ان کی سرشت اور نرمی ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ نہایت خوش صحبت تھے۔ جلال اور ہیبت اتنی تھی کہ اگر کوئی دفعتاً سامنے آ جاتا تو مرعوب ہو جاتا تھا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا'' (۱۷۹)۔

یہ ایک عیسائی کے جذبات ہیں جنھوں نے الفاظ کا روپ دھارا ہے۔ آپؐ کی انھی صفاتِ حسنہ کی وجہ سے ایک امریکی دانشور مائیکل ہارٹ (Micheal Hart) نے اپنی کتاب (The Hundred) میں تاریخ کا دھارا بدلنے والی سو ہستیوں میں سے سرکارِ دو عالم ﷺ کو پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

He was the only man in history who was supremely successful on both the religion and secular levels.(180)

(آپ تاریخ (انسانی) کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے، مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی)۔

تھامس کارلائل نے آپ ﷺ کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا اور مائیکل ہارٹ نے آپ ﷺ کو انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا۔ اس سے آپ ﷺ کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ساری عظمت کے اعتراف کے پس پشت آپ ﷺ کے پیغمبرانہ اخلاق ہیں جن میں ایک توازن اور اعتدال

تھا۔ نہ تو شریعت موسوی کا صرف جلال اور نہ شریعت عیسوی کا صرف جمال کہ جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے بایاں بھی اس کے سامنے کر دے۔ واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) کا یہ بیان پڑھنے کے قابل ہے:

''اپنے انتہائی قوت و اقتدار کے دور میں بھی آپؐ نے اپنی وضع قطع اور اخلاق و عادات میں وہی سادگی قائم رکھی جو پریشانی اور بے طاقتی کے زمانہ میں آپؐ کے ساتھ کچھ خصوصیت کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ بھی آپ کو سخت ناگوار ہوتا تھا'' (۱۸۱)۔

معروف عرب عیسائی نجیب آفندی نصار نے آنحضور ﷺ سے متعلق اپنے تاثرات یوں رقم طراز کیے ہیں:

''حضرت محمد ﷺ تمام عرب کے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی سب کے برابر کے ہیرو ہیں، اگر مسلمان عربوں کے وہ قومی اور مذہبی ہیرو ہیں تو عیسائی عربوں کے بھی وہ قومی ہیرو ہیں۔ انھوں نے عرب قوم کو ذلت و خواری سے اٹھا کر رفعت و سر بلندی کے آسمان تک پہنچا دیا۔ اس کو ایرانیوں اور رومیوں کی غلامی سے آزاد کرا دیا۔ مزید لکھتے ہیں:

''ہاں اگر حضرت محمدؐ کے اخلاق بڑے نہ ہوتے تو ان کے ماحول کے اخلاق و عادات قومی تعصبات اور کھلی گمراہی اور بداخلاقی خود ان پر مسلط ہو جاتی۔

اگر حضرت محمد ﷺ کے اخلاق مضبوط نہ ہوتے تو مشکلات کے پہاڑوں کے آگے وہ اپنا سر جھکا دیتے اور اپنی ہار مان لیتے اور اپنے ماحول کے اقتضاء کے مطابق وہ بھی چلنے پر مجبور ہو جاتے اور وہ عظیم الشان انقلاب پیدا نہ کر سکتے۔ انھوں نے گمراہی کو ہدایت سے، جہالت کو علم سے، وحشت کو اس تمدن سے بدل دیا جس کی بنیاد اخلاقِ حسنہ پر تھی۔

ہاں اگر حضرت محمد ﷺ کے اخلاق عظیم نہ ہوتے تو کوئی ان کے پاس نہ جاتا، کوئی ان کی بات نہ سنتا اور عرب کو ایرانیوں اور رومیوں کی غلامی سے آزادی نہ ہوتی، نہ عربوں کا نظام استوار ہوتا، نہ ان کی سلطنت قائم ہوتی، نہ ان کا تمدن پھلتا پھولتا، نہ ان کے ہاتھوں علوم و فنون کو ترقی ہوتی اور نہ ان کے پیروؤں کو جو ان پر درود و سلام پڑھتے ہیں ان کو کروڑوں کی تعداد میں دیکھتے'' (۱۸۲)۔

گولڈزیہر آپ ﷺ کی مدح سرائی ان الفاظ میں کرتا ہے:

''اگر حضرت محمد ﷺ کے مذہبی کارناموں اور کامرانی کے کسی حصے کو انوکھا کہا جا سکتا ہے تو وہ ان کی نبوت کا وہ حصہ ہے جس نے عرب کی سابقہ حالت کو بدل دیا تھا۔ انھوں نے بُت پرست عربوں کی سوسائٹی اور پرستش کی تمام وحشیانہ نفرتوں، ان کی قبائلی رنجشوں اور ان کے تصورِ دنیا کا خاتمہ کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اسلامی اطوار کی مخالف اس وحشت و بربریت کا قلع قمع کر دیا جس کو قرآن جاہلیہ (حالت) سے تعبیر کرتا ہے (۱۸۳)۔

ایڈورڈ گبن آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہے:

''زندگی کے عام معمولات میں حضرت محمد ﷺ نے اپنے ملک کی اہم اور رسمی خوش اخلاقی کی پابندی کی تھی۔ امیر اور طاقتور لوگوں کی طرف احترام آمیز توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مکہ کے غریب ترین انسانوں کے ساتھ بھی محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے۔ اس چیز نے ان کی شخصیت کو باوقار بنا دیا تھا۔ وہ ذہن رسا، غضب کی یادداشت، بلاتکلف سماجی ظرافت، شاندار تخیل، واضح فوری اور فیصلہ کُن عدل کے مالک تھے۔ علاوہ ازیں وہ فکر و عمل کی جرأت بھی رکھتے تھے'' (۱۸۴)۔

تھامس کارلائل (Thomas Carlyle) اپنی کتاب (On Heroes, Hero Worship and the Heroic in History) میں آپ ﷺ کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے:

''اُن کا گھرانہ سب سے زیادہ کفایت شعار تھا۔ ان کی عام خوراک جَو کی روٹی اور پانی پر مشتمل ہوتی تھی۔ بعض اوقات ان کے چولہے میں کئی ماہ تک آگ روشن نہیں ہوتی تھی۔ ان کے سوانح نگاروں کا فخریہ کہنا ہے کہ وہ خود اپنے جوتوں کی مرمت کرتے اور اپنے لبادے میں پیوند لگایا کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ غریب، محنتی اور بے ساز و سامان انسان تھے...... میری رائے میں اگر وہ اعلیٰ صفات کے مالک نہ ہوتے تو عرب کے وحشی، ان کے سامنے آپس میں لڑنے جھگڑنے والے اور ہمیشہ اُن سے تیئیس سال تک گہرا ربط رکھنے والے کبھی اُن کی تعظیم نہ کرتے۔ ایسے لوگوں کو کوئی شخص اپنی صحیح قدر و قیمت اور مردانگی کے بغیر اپنا مطیع نہیں بنا سکتا تھا...... کسی شہنشاہ نے اپنے تاج اور شاہی کلاہ کے باوجود اپنی اتنی اطاعت نہیں کروائی جتنی کہ پیوند لگے ہوئے جُبہ پوش اس شخص کی ہوتی ہے۔ اُن کی تیئیس

سالہ زندگی مشقت اور حقیقی آزمائشوں میں گزری۔ مجھے تو اُن میں اپنے لیے ایک حقیقی ہیرو کی خوبیاں نظر آتی ہیں“(۱۸۵)۔

ڈبلیو منٹگمری واٹ (W. Montgomary Watt) اپنی کتاب ”Muhammad at Mecca“ میں آنحضور ﷺ کی مدح سرائی ان الفاظ میں کرتا ہے:

”اپنے عقائد کی خاطر ظلم وستم کو برداشت کرنے کے لیے حضرت محمد ﷺ کی خوشنودی، ان میں ایمان لانے اور انھیں اپنا لیڈر تسلیم کرنے والے آدمیوں کا اعلیٰ اخلاق اور اُن کی آخری کامیابی کی عظمت حضرت محمد ﷺ کی بنیادی دیانت داری پر دلالت کرتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کو سچا نبی نہ ماننے سے لاتعداد مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی طرح تاریخ کی دیگر عظیم شخصیات میں سے کسی کی بھی مغربی ملکوں میں اتنی بے قدری نہیں کی گئی۔ اگر ہم انھیں سمجھنا ہی چاہتے ہیں اور اگر ہمیں ماضی سے ورثہ میں ملنے والی غلطیوں کو درست کرنا ہے تو پھر ہمیں ہر خاص حالت میں اُن کے خلوص اور ان کے مقصد کی دیانتداری کے عقیدے میں بہت زیادہ اعتماد کرنا ہوگا(۱۸۶)۔

(اس مقالے کی تیاری میں ذکر کردہ مصادر کے علاوہ خصوصی طور پر حافظ زاہد علی کی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے)۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات (قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی) ص ۲۱۷۔
۲۔ ابن منظور، لسان العرب (دار صادر، بیروت تحت مادہ)۔
۳۔ غزالی، امام، احیاء علوم الدین (دارالاشاعت، اردو بازار کراچی ۱۹۷۸ء) ۲/۱۴۳۔
۴۔ اقبال، ڈاکٹر، ضربِ کلیم، ایک فلسفہ زدہ سیدزادہ کے نام، ص ۲، ۱۱، ۱۲۔
۱-۴۔ احمد المسند، (دارالفکر القاہرہ) ۲/۴۰۲۔۴۱۲۔
۵۔ ابن الاثیر، ابوالحسن علی، اسدالغابہ فی معرفۃ الصحابہ (داراحیاء التراث العربی بیروت) ۱/۲۴۶۔۲۴۸۔
۶۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور) ۱/۱۹۷۔
۷۔ ابوداؤد، السنن، (دارالسلام الریاض) ص ۶۷۸، رقم ۴۷۹۸۔
۸۔ الخطیب التمریزی، (دارالفکر القاہرہ) مشکوٰۃ، ۳/۸۷ حدیث نمبر ۵۰۸۱۔
۹۔ محمد الغزالی، فقہ السیرۃ (دارالحدیث القاہرہ، الطبعۃ السابعۃ ۱۹۷۶ء) ص ۹-۱۲۔
۱۰۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ ۲/۱۳۴۔
۱۱۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۲۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۵۔
۱۳۔ ایضاً ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۱۔
۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۵۵، حدیث نمبر ۶۰۳۸۔
۱۵۔ ایضاً ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۰۔
۱۶۔ ایضاً ص ۴۶۶، حدیث نمبر ۲۸۱۰۔
۱۷۔ البیّنۃ، ۵۔
۱۸۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱، حدیث نمبر ۱۔
۱۹۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۳۱۔
۲۰۔ الازہری، پیر کرم شاہ، ضیاء النبی، (ضیاء القرآن پبلشرز لاہور) ۱/۴۸۰۔
۲۱۔ بخاری، الجامع الصحیح (نور محمد، اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی) ۱/۲۱۵۔
۲۲۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۲۳۔
۲۳۔ قاسمی، اخلاق حسین، اخلاقِ رسول (ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک کراچی) ص ۲۴-۲۵۔
۲۴۔ القصص، آیت ۲۶

۲۵۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۳۱۔

۲۶۔ قاسمی، مولانا اخلاق حسین، اخلاقِ رسول ﷺ، ص ۲۴-۲۷۔

۲۷۔ القلم، آیت ۴۔

۲۸۔ مسلم، الجامع الصحیح، (دارالسلام الریاض) ص ۳۰۱، حدیث نمبر ۱۷۳۹۔

۲۹۔ پروفیسر چوہدری غلام رسول چیمہ، سیرۃ سیّد البشر ﷺ (علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور) ص ۴۴۸-۴۴۹۔

30.Encyclopaedia of Britanica (1958) Vo.31, p 16-17.

۳۱۔ زاہد علی، حافظ، پیغمبر اسلام اور اخلاق حسنہ (راحت پبلیشرز اردو بازار لاہور ۲۰۰۰ء) ص ۳۶-۳۷۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، تذکرہ (ارشد بک سیلرز، علامہ اقبال روڈ، میر پور آزاد کشمیر) ص ۷۶-۸۰۔

۳۴۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۰۳، حدیث نمبر ۴۹۹۶۔

۳۵۔ ابن قیم، زاد المعاد، (نفیس اکیڈمی کراچی) ۳/۲۷۵۔

۳۶۔ زاہد علی، حافظ، پیغمبر اسلام اور اخلاق حسنہ، ص ۵۹۔

۳۷۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۱۷۰، حدیث نمبر ۶۷۸۶۔

۳۸۔ قدوائی، آصف، مقالات سیرت (مجلس نشریات اسلام کراچی) ص ۱۳۱-۱۳۳۔

۳۹۔ المؤمنون: ۲۳/۸۔

۴۰۔ بنی اسرائیل: ۱۷/۳۴۔

۴۱۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۸۸۰، حدیث نمبر ۴۵۳۸۔

۴۲۔ ایضاً ص ۷۹۷، حدیث نمبر ۴۶۳۹۔

۴۳۔ النساء: ۸۷۔

۴۴۔ النساء: ۱۲۲۔

۴۵۔ آل عمران: ۹۵

۴۶۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۰۶۳، حدیث نمبر ۶۰۹۴۔

۴۷۔ ایضاً ص ۹، حدیث نمبر ۳۳۔

۴۸۔ مالک، امام، مؤطا (داراحیاء العلوم بیروت) ص ۷۵۳، حدیث نمبر ۱۸۶۲۔

۴۹۔ التبریزی، محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکاۃ المصابیح، ۲/۸۰، حدیث نمبر ۲۵۰۱،۔

۵۰۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۶۰، حدیث نمبر ۲۹۶۔

۵۱۔ ترمذی ابوعیسی محمد بن عیسی، السنن، ص ۶۹۰، حدیث نمبر ۳۰۶۴۔
۵۲۔ طہٰ حسین، ڈاکٹر، نقوشِ سیرت، مصنف، مترجم حافظ سید بشیر احمد (نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی) ص ۱۴۹۔
۵۳۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی، ۱/ ۱۳۷۔
۵۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۶، حدیث نمبر ۷۔
۵۵۔ النحل: ۹۰۔
۵۶۔ النساء: ۱۳۵۔
۵۷۔ المائدہ: ۸۔
۵۸۔ الاعراف: ۱۰۔
۵۹۔ المنافقون: ۷۔
۶۰۔ الجمعہ: ۱۰۔
۶۱۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۱۵۳، حدیث نمبر ۶۸۳۳۔
۶۲۔ النساء: ۲۹۔
۶۳۔ ترمذی، السنن، ص ۱۴۳۰، حدیث نمبر ۳۴۳۶۔
۶۴۔ ابن کثیر، عماد الدین حافظ، السیرۃ النبویۃ ۴/ ۴۵۷۔
۶۵۔ ابوداؤد، السنن، ص ۴۳۶، حدیث نمبر ۴۵۳۶۔
۶۶۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۶۳۴ - ۶۳۵، حدیث نمبر ۳۷۷۹ تا ۳۷۸۶۔
۶۷۔ الحشر: ۹۔
۶۸۔ الدھر ۸۔
۶۹۔ احمد، المسند، ۱/ ۱۰۷۔
۷۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۴۔۱۰۵۵، حدیث ۶۰۳۶۔
۷۱۔ مسند احمد، ۶/ ۲۹۷۔
۷۲۔ مسند احمد، ۶/ ۳۹۷۔
۷۳۔ علوی، ڈاکٹر خالد، انسانِ کامل (الفیصل ناشران و تاجران، لاہور) ص ۲۰۴۔
۷۴۔ احمد المسند: ۶/ ۳۹۷۔
۷۵۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۷۶۶، حدیث نمبر ۴۵۱۳۔
۷۶۔ ابن ماجہ، السنن (دارالسلام الریاض) ص ۴۸۶ حدیث نمبر ۳۳۵۸۔

۷۷۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۶۹، حدیث نمبر ۶۱۳۵۔

۷۸۔ ترمذی، السنن، ص ۴۲۹، حدیث نمبر ۱۸۱۹۔

۷۹۔ البقرہ: ۳۔

۸۰۔ البقرہ: ۲۶۷۔

۸۱۔ البقرہ: ۱۷۷۔

۸۲۔ البقرہ: ۲۴۵۔

۸۳۔ الحدید: ۱۱۔

۸۴۔ البقرہ: ۲۷۴۔

۸۵۔ الروم: ۳۸۔

۸۶۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۴۔

۸۷۔ ترمذی، السنن، ص ۴۵۵-۴۵۶، حدیث نمبر ۱۹۶۲۔

۸۸۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۱۰۹، حدیث نمبر ۶۳۹۰۔

۸۹۔ نسائی، السنن، ص ۳۴۹، حدیث نمبر ۲۵۲۷۔

۹۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۳۔

۹۱۔ منصور پوری، قاضی محمد سلمان، رحمۃ اللعالمین (الفیصل ناشران وتاجران لاہور) ۱/۲۶۱۔

۹۲۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۰۲۱، حدیث نمبر ۶۰۲۰۔

۹۳۔ بخاری، الجامع الصحیح ۲/۶۴۔

۹۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، (دار صادر بیروت) ۲/۱۵۲-۱۵۳۔

۹۵۔ ترمذی، السنن، ص ۵۳۸، حدیث نمبر ۲۳۶۲۔

۹۶۔ الانعام: ۱۵۱۔

۹۷۔ القصص: ۲۵۔

۹۸۔ الاحزاب: ۵۳۔

۹۹۔ البقرہ: ۲۶۔

۱۰۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۶۶، حدیث نمبر ۶۱۱۷۔

۱۰۱۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۷، حدیث نمبر ۲۴۔

۱۰۲۔ مالک، امام، مؤطا ص ۶۹۴، حدیث نمبر ۱۲۷۸۔

۱۰۳۔ کاندھلوی، محمد زکریا، شرح شمائل ترمذی (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور) ص ۳۸۰۔

۱۰۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۶۸، حدیث ۶۱۱۹۔

۱۰۵۔ الفتح: ۲۹۔

۱۰۶۔ المومن: ۷۔

۱۰۷۔ الحشر: ۲۲۔

۱۰۸۔ المؤمنون: ۱۰۹

۱۰۹۔ التوبہ: ۱۲۸

۱۱۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۰، حدیث نمبر ۶۰۰۰۔

۱۱۱۔ ترمذی، السنن ص ۴۴۸، حدیث نمبر ۱۹۲۳۔

۱۱۲۔ ابوداؤد، السنن ص ۴۴۸، حدیث نمبر ۱۹۲۴۔

۱۱۳۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۳۷۱، حدیث نمبر ۲۱۳۵۔

۱۱۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۲۶۹، حدیث نمبر ۸۳۸۶۔

۱۱۵۔ ایضاً ص ۱۰۴۹، حدیث نمبر ۵۹۹۷۔

۱۱۶۔ ایضاً ص ۱۰۴۹، حدیث نمبر ۵۹۹۸۔

۱۱۷۔ ایضاً ص ۱۰۵۰، حدیث نمبر ۶۰۰۳۔

۱۱۸۔ الانفال: ۴۵۔

۱۱۹۔ محمد: ۷۔

۱۲۰۔ البقرہ: ۲۵۰۔

۱۲۱۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۴۳۔

۱۲۲۔ ایضاً۔

۱۲۳۔ البقرہ: ۱۹۰۔

۱۲۴۔ آل عمران: ۱۳۹۔

۱۲۵۔ الانفال: ۱۵

۱۲۶۔ الانفال: ۴۵۔

۱۲۷۔ الفتح: ۲۹۔

۱۲۸۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۶۸۔

۱۲۹۔ احمد، المسند ،۱/ ۱۲۶۔

۱۳۰۔ الجاثیہ: ۳۷

۱۳۱۔ الحجر: ۸۸

۱۳۲۔ الشعراء: ۲۱۵

۱۳۳۔ الفرقان: ۶۳

۱۳۴۔ لقمان: ۱۸

۱۳۵۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۰۴۰-۱۰۴۱، حدیث نمبر ۶۱۳۸۔

۱۳۶۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۱۷۷، حدیث نمبر ۶۸۳۰۔

۱۳۷۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۳۱، حدیث نمبر ۶۵۹۲۔

۱۳۸۔ کاندھلوی محمد زکریا، شرح شمائل ترمذی، ص ۳۹۹۔

۱۳۹۔ حاکم، امام، المستدرک، ۳/ ۴۸۔

۱۴۰۔ محمد زکریا، شرح شمائل ترمذی، ص ۳۵۴۔

۱۴۱۔ الشوریٰ. ۱۹۔

۱۴۲۔ التوبہ: ۱۱۴۔

۱۴۳۔ ھود: ۷۵۔

۱۴۴۔ آل عمران: ۱۵۹۔

۱۴۵۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۳۳، حدیث نمبر ۶۶۰۲۔

۱۴۶۔ ایضاً ص ۱۱۳۲، حدیث نمبر ۹۸۶۵۔

۱۴۷۔ ترمذی، السنن ص ۵۶۶، حدیث نمبر ۲۴۸۸۔

۱۴۸۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۳، حدیث نمبر ۶۲۸۔

۱۴۹۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۳۳، حدیث نمبر ۶۶۰۱۔

۱۵۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۶۸، حدیث نمبر ۲۶۶۱۔

۱۵۱۔ ایضاً ص ۱۰۵۳، حدیث نمبر ۱۰۲۴۔

۱۵۲۔ الفاتحہ، ۵۔

۱۵۳۔ طٰہٰ: ۱۳۱۔

۱۵۴۔ النساء: ۳۲۔

۱۵۵۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۱۲۱، حدیث نمبر ۶۴۵۹۔

۱۵۶۔ ترمذی، السنن ص ۵۳۸، حدیث نمبر ۲۳۵۷۔

۱۵۷۔ ابوداؤد، السنن ص ۲۴۴، حدیث نمبر ۱۶۴۴۔

۱۵۸۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۲۳۹، حدیث نمبر ۱۴۷۴۔

۱۵۹۔ مومنون: ۸۔

۱۶۰۔ البقرہ: ۲۸۳۔

۱۶۱۔ الانفال: ۲۷۔

۱۶۲۔ النساء: ۵۸۔

۱۶۳۔ احمد، المسند، ۳/۱۳۵۔

۱۶۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۴۵۴، حدیث نمبر ۲۷۳۹۔

۱۶۵۔ ایضاً ص ۱۱۲۶، حدیث نمبر ۶۴۹۶۔

۱۶۶۔ ترمذی، السنن ص ۳۰۸، حدیث نمبر ۱۲۶۴۔

۱۶۷۔ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۱/۱۷۰۔

۱۶۸۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۵۱۳-۵۱۴، حدیث نمبر ۲۹۵۰۔

۱۶۹۔ البخاری، الادب المفرد (مکتبۃ المعارف الریاض ۱۹۹۸ء) ۱/۱۳۵-۱۳۶۔

۱۷۰۔ ابوداؤد، السنن ص ۶۸۷، حدیث نمبر ۴۸۹۶۔

۱۷۱۔ ایضاً ص ۶۸۷، حدیث نمبر ۴۸۶۸۔

۱۷۲۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۳۵، حدیث نمبر ۹۷۔

۱۷۳۔ النمل: ۹۰۔

۱۷۴۔ القصص: ۷۵۔

۱۷۵۔ التوبہ: ۲۰۔

۱۷۶۔ البقرہ: ۲۲۹۔

۱۷۷۔ البقرہ: ۲۶۴۔

۱۷۸۔ غزالی، امام، کیمیائے سعادت، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور) ص ۵۲۶-۵۴۶۔

۱۷۹۔ شریف بقاء، پروفیسر، رسول اکرم ﷺ مغربی اہل دانش کی نظر میں (مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور) ص ۴۵

180. Dr. Michael H. Hart, The Hundred, N.Y.1978.

۱۸۱۔ شریف بقاء، پروفیسر، رسول اکرم ﷺ مغربی اہل دانش کی نظر میں ص ۲۷۰۔

۱۸۲۔ سید سلیمان ندوی، معارف، مضمون (مجلس دارالمصنفین اعظم گڑھ) ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ، نومبر ۱۹۲۶ء۔

۱۸۳۔ اسلامی الٰہیات اور قانون کا تعارف، ترجمہ از اینڈرس اور روتھ، امریکہ (۱۹۸۱ء)، ص ۱۳۔

۱۸۴۔ رومی سلطنت کے زوال کی تاریخ، لندن ۱۹۳۸ء، ص ۳۳۵۔

۱۸۵۔ تھامس کارلائل ہیروز، ہیرو ورشپ اور تاریخی بہادر، ۱۸۸۸ء، ص ۶۱۔

۱۸۶۔ واٹ، منٹگمری، حضرت محمد مکہ میں (آکسفورڈ ۱۹۵۳ء) ص ۵۲۔

❁❁❁❁

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت خاتم النّبیینؐ

ختمِ نبوت قرآن کی رُو سے:

حضرت محمد ﷺ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبوت ختم کردی اور اسلام کو بحیثیت دین مکمل کردیا اور اس کو اپنے لیے اور تمام انسانوں کے لیے محبوب اور پسندیدہ قرار دیا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس پر قرونِ اولیٰ سے آج تک تمام امّت کا اجماع ہے اور امتِ محمدیہ کا کوئی گروہ ایسا نہیں جو حضور نبی کریم ﷺ کو آخری نبی نہ مانتا ہو۔ قرآنِ کریم سے یہ عقیدہ واضح طور پر ثابت ہے کہ کسی طرح کا کوئی نبی یا رسول اب قیامت تک نہیں آ سکتا۔ امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص نبوت ورسالت کا دعویٰ کرے گا تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔ اس سلسلے میں ہم چند آیات قرآن کریم سے نقل کرتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً﴾(۱)(ہم نے آپؐ کو سارے ہی انسانوں کے لیے 'پیغمبر بنا کر' بھیجا ہے بطور خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے کے)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ تمام نوع بشر کی طرف رسول مبعوث ہوئے ہیں اور یہ شرف آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو حاصل نہیں ہوا۔

﴿تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً﴾(۲)(وہ ذات بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر کلام مجید اُتارا تاکہ تمام کائنات انسانی کے لیے وہ ڈرانے والا ہو)۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے انجام بد سے باخبر کرنے والے اور ڈرانے والے ہیں اور سارے جہانوں کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کو قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن کریم ہی اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً﴾(۳)(کہہ دیجیے اے لوگو! بے شک میں تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔

دوسری آیت میں ہے:﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾(۴)(ہم نے آپ ﷺ کو تمام

لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

ان آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں اور تمام جہانوں کے لیے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ ﷺ ہی تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور جب آپ ﷺ سارے انسانوں کے لیے رسول رحمت ہیں تو پھر دوسرا اپنے آنے کی کیا دلیل پیش کر سکتا ہے؟ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ درج ذیل آیت میں حکم دے رہا ہے کہ میرا آخری رسول جب آئے گا تو گذشتہ شریعتیں منسوخ ہو جائیں گی۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾ (۵) (اور اے پیغمبر ﷺ ان لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے اقرار لیا (یا ہر ایک پیغمبر سے) کہ میں جو تم کو کتاب اور شریعت دوں تو اگر کوئی رسول ایسا آئے جو تمھاری کتاب کو سچ بتائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا، فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) کیا تم نے یہ اقرار کیا اور میرے اس عہد کو قبول کیا (یہ بوجھ اپنے ذمے لیا) انھوں نے عرض کیا ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا (دیکھو) گواہ رہو (ایک دوسرے پر یا فرشتو! تم گواہ رہو) میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں)۔

یہ آیت ملاحظہ کیجیے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (۶) (آج میں نے تمھارے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تمام کر دیا ہے اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے)۔

یہ آیت کریمہ ناطق ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات مکمل اور بے عیب ہیں اور جس دین اسلام کا بیان اس قرآن میں ہے وہی اور صرف وہی دین ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ومحبوب ہے۔ اس دین کے لانے والے نبی کے بعد کسی اور نبی کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی کسی اور نبی کے آنے کی کوئی عقلی دلیل ہے۔

چنانچہ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ یہی دین غالب آئے گا اور فی الواقع وہ جزیرۃ العرب میں

غالب آیا۔فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾(۷)(وہی ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس 'دین' کو 'دنیا کے' تمام دینوں پر غالب کرے اگر چہ کافر ناخوش ہی کیوں نہ ہوں)۔

دوسری جگہ ملاحظہ کیجیے۔ارشاد ہوتا ہے:﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾(۸)(ہم نے اس ذکر (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔

یہ دعویٰ کسی اور نبی کی کتاب کے بارے میں نہیں آیا اور یہی وجہ ہے وہ کتابیں صحیح حالت میں محفوظ نہ رہ سکیں اور قرآن کریم آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور قیامت تک ان شاءاللہ رہے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے۔اس لیے کسی اور شریعت یا کتاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔پھر قرآن کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی بھی ضمانت دی ہے کہ اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَإِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ. لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾(۹)(بے شک یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ (کتاب) ہے)۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَاتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ﴾(۱۰)(تیرے رب کی کتاب جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے اس کی تلاوت کر،کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں)۔

مزید فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ. أُوْلٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(۱۱)(جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (وحی) اور جو وحی تم سے پہلے نازل کی گئی تھی ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے

ہیں)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ﷺ کی طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اور جو پہلے نازل ہو چکی ہیں ان پر ایمان لانے والے ہدایت یافتہ اور فلاح پانے والے ہوں گے۔ یہاں ''وما انزل من قبلك '' کے ساتھ اگر ''ما ینزل من بعدك '' بھی ہوتا تب تو کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ پہلوں کے ساتھ بعد والوں کا ذکر بھی ہے اور وحی کا سلسلہ بھی جاری رہ سکتا ہے مگر اس سارے احتمال کو رب کریم نے بالکل ختم کر دیا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص رسول کریم ﷺ کے بعد نبوت اور قرآن کریم کے بعد کسی کتاب پر ایمان لانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

آخر میں ختم نبوت کو بہت واضح طور پر ثابت کرنے والی مشہور آیت بھی ملاحظہ کیجیے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ (۱۲) (محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النّبیین ہیں)۔

یہ آیت اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے تکمیل رسالت ہو چکی ہے اور آئندہ کسی مرسل رسول یا نبی تشریعی یا غیر تشریعی کی آمد و بعثت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

ختم نبوت کا جو ذکر سورۂ احزاب میں آیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا۔ منہ بولے باپ کی بیوی اور بیٹوں سے اس طرح ملاپ رکھتا تھا جس طرح ماں بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہوا کرتا ہے اور متبنّٰی بن جانے کے بعد وہ ساری حرمتیں اس کے اور منہ بولے بیٹے کے درمیان قائم ہو جاتی تھیں جو نسبی رشتے کی بنا پر قائم ہوا کرتی تھیں۔ اللہ اس رسم کو توڑنا چاہتے تھے۔ اس نے پہلے حکم دیا کہ منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی بیٹا نہیں ہو جاتا۔ (۱۳)

لیکن دلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حرمت کا جو تخیل بیٹھا ہوا تھا وہ آسانی سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو عملاً توڑ دیا جائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ واقعہ

پیش آ گیا کہ حضرت زید ﷺ نے (جو نبی ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینبؓ کو (جو ان کے نکاح میں تھیں) طلاق دے دی۔ نبی ﷺ نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اس سخت قسم کی جاہلی رسم کو توڑنے کا۔ جب تک آپ ﷺ خود اپنے متبنّیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے اس وقت تک متبنّیٰ کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیل نہ مٹ سکے گا۔ لیکن آپ ﷺ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطراف مدینہ کے یہود اور مکہ کے کفار اس فعل پر ایک طوفان عظیم برپا کر دیں گے اور آپ ﷺ کو بدنام کرنے اور اسلام کو رُسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس لیے آپ ﷺ عملی اقدام کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود ہچکچا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا اور آپ ﷺ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا، اعتراضات اور بہتان طرازی اور افترا پردازی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ انھی اعتراضات اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے سورۂ احزاب کی آیات (۴۰-۴۷) نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مومنوں کے لیے اپنے متبنّٰی لڑکوں کی بیوہ اور مطلقہ سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم بجا لانے میں وہ کسی کے خوف سے ہچکچائے۔ اس کے بعد اس بحث کو اس بات پر ختم فرماتا ہے کہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ﴾ (۱۴) (محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النّبیین ہیں)۔

اس موقع پر آیت کے اس ٹکڑے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معترضین کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے۔ اس ایک فقرے میں ان تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی ﷺ کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

ان کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالاں کہ آپ ﷺ کی

اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ نکاح بجائے خود قابل اعتراض نہیں ہے کیونکہ جس شخص کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا گیا ہے وہ محمد ﷺ کا واقعی بیٹا نہ تھا اور آپؐ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔اس لیے فرمایا: ''محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں''۔یعنی جس شخص کی مطلقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا ہی کب کہ اس کی مطلقہ سے نکاح حرام ہوتا۔ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد ﷺ سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے، تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہوسکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضروری تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا مگر وہ اللہ کے رسول ہیں'' یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمھاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے۔اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حلّت کے معاملے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

تیسرا یہ کہ یہ کام اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ محمد ﷺ محض نبی نہیں بلکہ آخری نبی ہیں اس لیے مزید تاکید کے لیے فرمایا ''اور وہ خاتم النّبیین ہیں'' یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار کوئی نبی تک بھی آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح ان کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے۔لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسم جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں، کیونکہ اب اگر آپ ﷺ کے ہاتھوں میں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپ ﷺ سے چھوٹ جائے اسے وہ آ کر پورا کر دے۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ''اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے'' یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد ﷺ کے ہاتھوں اس رسم جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔لہٰذا اگر اپنے آخری نبی ﷺ کے ذریعہ سے اس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرا دیا تو پھر کوئی دوسری ہستی دنیا میں ایسی نہ ہو گی، جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مصلحین اگر

اسے توڑیں گے بھی تو ان میں کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالمگیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدس کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہت کے ہر تصور کا قلع قمع کر دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تاویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس لیے ختم نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم پوری وضاحت سے مسئلہ ختم نبوت بیان کرتے ہیں (۱۵)۔

خاتم کے معنی کے بارے میں مغالطے:

نبوت کے بعض جھوٹے دعوے دار خاتم کا معنی مہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد ﷺ اگرچہ خاتم النّبیین ہیں مگر آخری نبی ﷺ یا نبیوں کے ختم کرنے والے نہیں بلکہ مہر لگانے والے ہیں۔ جس پر مہر لگادیں گے وہ نبی بن جائے گا۔

اگرچہ اہل علم اور اہل لغت خوب جانتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے تاہم قرآن و سنت، لغت اور اجماع امت نے خاتم کا جو مفہوم و معانی متعین کیے ہیں وہ بھی پیش خدمت ہیں:

ایک گروہ جس نے اس دور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے۔ آیت: ﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ﴾ ((لوگو) محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے) کے لفظ خاتم النّبیین کے معنی نبیوں کی مہر کیا ہے، اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد جو انبیاء بھی آئیں گے وہ آپ ﷺ کی مہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظ دیگر جب تک کسی کی نبوت پر آپ ﷺ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلہ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر اس کے معنی یہ ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کی کیا گنجائش ہے کہ اوپر سے تو نکاح زینبؓ پر

معترضین کے اعتراضات اوران کے پیدا کیے ہوئے شکوک وشبہات کا جواب دیا جارہا ہواور یکا یک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمد نبیوں کی مہر ہیں۔

آئندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مہر لگ کر بنے گا۔اس سیاق وسباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے بنیاد ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال الٹا کمزور ہو جاتا ہے جواوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آرہا ہے۔اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ یہ کام اس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔اس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت تھی تو آپ ﷺ کے بعد آپ کی مہر لگ کر جوانبیائے آتے رہیں گے ان میں سے کوئی اسے مٹادے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ ''خاتم النّبیین'' کے معنی افضل النّبیین کے ہیں، یعنی نبوّت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، البتہ کمالات نبوّت حضور ﷺ پر ختم ہو گئے ہیں۔لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔سیاق وسباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔کفار ومنافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت، کم تر درجے کے ہی سہی، بہر حال آپؐ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔پھر کیا ضروری تھا کہ اس رسم کو بھی آپؐ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

خاتم النّبیین کے لغوی معنی:

پس جہاں تک سیاق وسباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النّبیین کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے۔لغت بھی اس معنی کی مقتضی ہے۔عربی لغت اور محاورے کی رُو سے ''ختم'' کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

''**ختم العمل**'' کے معنی ہیں ''**فروغ من العمل**'' کام سے فارغ ہو گیا۔

ختم الاناء کے معنی ہیں ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگادی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو''۔

ختم الکتاب کے معنی ہیں ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تا کہ خط محفوظ ہو جائے''۔

ختم علی القلب ''دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے''۔

خِتَام کل مشروب ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے''۔

خاتمہ کل شیء عاقبتہ و آخرتہ ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت''۔

ختم الشیء، بلغ آخرہ ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا'' اس معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خاتم القوم آخرھم ''خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی'' (۱۶)۔

ختمِ نبوت حدیث کی رُو سے:

نبی کریم ﷺ نے وضاحت کے ساتھ کئی مثالیں دے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کو بتلایا کہ میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو۔ ہم یہاں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں، آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آئے گا اور نہ ہی کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت ہے۔

حدیث ۱: حضرت ثوبان ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی اللہ و انا خاتم النبیین لا نبی بعدی'' (۱۷) (اور بے شک میری امت میں تیس بڑے بڑے جھوٹے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں حالانکہ میں خاتم النّبیین ہوں اور میرے بعد اور کوئی نبی نہیں)۔

حدیث ۲: حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا کہ:

''انا قائد المرسلین ولا فخر وانا خاتم النبیین ولا فخر وانا اوّل شافع ومشفع ولا فخر'' (۱۸) (میں رسولوں کا قائد ہوں اور اس پر کوئی فخر نہیں اور میں خاتم النّبیین ہوں اور اس پر کوئی فخر نہیں اور میں پہلا وہ شخص ہوں جو شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت قبول ہو گی اور اس پر فخر نہیں)۔

حدیث ۳: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری اور دیگر انبیاء کرام کی مثال ایک محل کی سی ہے۔ جو بہت ہی عمدہ طریقہ سے بنایا گیا ہو۔ لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہو۔ گھومنے والے اس کے ارد گرد گھومتے ہیں اور اس کی بناوٹ پر تعجب اور حیرت کرتے ہیں۔ مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:

"**فانا اللبنه وانا خاتم النبیین**" (۱۹) (میں وہ (آخری) اینٹ ہوں اور میں نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ (متوفی ۷۴ھ) کی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ:

"**قال رسول اللہ ﷺ فانا موضع اللبنه جئت فختمت الانبیاء**" (۲۰)

(آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (قصر نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں نے (یعنی میری آمد نے) نبیوں کا خاتمہ کر دیا ہے)۔

ایک اور روایت میں اس طرح آیا ہے کہ:

"**فانا موضع اللبنه ختم بی الانبیاء**" (۲۱) (اس اینٹ کی جگہ میں میں نے پُر کر دی ہے اور انبیاء کی آمد مجھ پر ختم اور منقطع ہو گئی ہے)۔

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی آمد سے قصرِ نبوت مکمل ہو گیا ہے، خالی اینٹ کی جگہ پُر ہو گئی ہے اور سلسلۂ نبوت و رسالت ہر طرح سے بالکل ختم ہو چکا ہے۔

حدیث ٤: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حضرات انبیاء کرام علیہ السلام پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے:

۱: مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے ہیں اور

۲: رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے۔

۳: میرے لیے غنیمتوں کا مال حلال کیا گیا ہے۔

۴: میرے لیے زمین کو مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

۵: مجھے تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

۶: اور مجھ پر نبیوں کو ختم کر دیا گیا ہے(۲۲)۔

اور ان کی ایک اور روایت میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی سیاست حضرات انبیاء کرام کیا کرتے تھے جب ایک نبی دنیا سے رخصت ہو جاتا اور اس کے بعد اور آ جاتا۔

"وانہ لا نبی بعدی وستکون خلفاء" (۲۳) (اور میرے بعد نبی نہیں بلکہ خلفاء ہوں گے)۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ پر نبوت ورسالت ختم ہوگئی ہے۔

حدیث ۵: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قال رسول اللہ ﷺ ان الرسالہ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی" (۲۴) (آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بے شک رسالت اور نبوت ختم اور منقطع ہو چکی سو میرے بعد نہ تو کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی)۔

حدیث ۶: حضرت عرباض رضی اللہ عنہ بن ساریہ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"وانّی عند اللہ مکتوب خاتم النّبیین وان آدم لمنجدل فی طینتہ" (۲۵) (بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک 'تقدیر میں' خاتم النّبیین لکھا گیا تھا۔ جب کہ حضرت آدم علیہ السلام گوندھی ہوئی مٹی کی صورت میں تھے)۔

اور دوسرے مقام پر الفاظ یہ بھی ہیں:

"انّی عبداللہ وخاتم النبیین وابی منجدل فی طینہ" (۲۶) (بے شک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور خاتم النّبیین ہوں 'اس وقت سے' جب کہ میرے باپ حضرت آدم علیہ السلام اپنے گوندھے ہوئے گارے میں تھے)۔

حدیث ۷: حضرت مطعم رضی اللہ عنہ بن عدی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انا محمّد وانا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی وانا العاقب"، والعاقب: الّذی لیس بعدہ نبی (۲۷) (میں محمد ﷺ ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں جس کے ساتھ کفر مٹایا جاتا ہے اور میں حاشر ہوں جس کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے گا اور میں عاقب ہوں اور عاقب سے مراد یہ ہے کہ جس کے بعد کوئی نبی

نہ ہوگا)۔

حدیث ۸: ”قال النبی ﷺ لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب“ (۲۸)(اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب ہوتا)

حدیث ۹: ”کانت بنو اسرائیل تسؤسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفه و انّه لا نبیّ بعدی وسیکون خلفا فیکثرون“ (۲۹)(بنی اسرائیل کی عنانِ سیاست انبیاء کے ہاتھوں میں رہی جب ایک نبی فوت ہوتا تو اس کا جانشین نبی ہی ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ عنقریب خلفاء کا سلسلہ شروع ہوگا پس خلفاء بکثرت ہوں گے)۔

حدیث ۱۰: آنحضرت ﷺ جب رجب سنہ ۹ ھ میں مجاہدین اسلام کو لے کر غزوۂ تبوک کے سفر پر روانہ ہونے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل خانہ کی حفاظت ونگرانی کے لیے مدینہ منورہ میں آپ ﷺ نے اپنا خلیفہ بنایا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رومیوں کے خلاف لڑنے کے بڑے مشتاق تھے۔ دل میں کچھ غمگین ہوئے اور فرمایا کہ آپ ﷺ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑتے ہیں؟

اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”الا ترضی ان تکون منّی بمنزله ھارون من موسی الاّ انه لیس بعدی نبی“ (۳۰)(اس روایت میں بھی اس کی تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی اور نہ کوئی نبی آسکتا ہے)۔

حدیث ۱۱: ”عن انس رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ بعثت انا و السّاعه کھاتین“ (۳۱)(حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ میں اور قیامت دونوں اس طرح ملے ہوئے بھیجے گئے ہیں جس طرح یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں)۔

باتفاق علمائے حدیث اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اور قیامت کے درمیان کوئی نیا نبی پیدا نہ ہوگا اور قیامت آپ ﷺ کے ساتھ ملی ہوئی آنے سے یہی مراد ہو سکتی ہے ورنہ حدیث کا خلاف واقعہ ہونا لازم آتا ہے۔

حدیث ۱۲: ”ولو کان موسی حیّا ما وسعه الاّ اتباعی“ (اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو وہ بھی میری

پیروی اور اتباع کرتے)۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:"لو اتاکم یوسف فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم"(۳۲)(اگر یوسف علیہ السلام بھی آ جائیں اور تم ان کی اتباع کرو اور میری پیروی چھوڑ دو تو البتہ ضرور گمراہ ہو جاؤ گے)۔

مطلب صاف ہے کہ اگر آپ ﷺ کے بعد یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی نبی آئے تو بھی اس کی تابعداری گمراہی کا باعث ہے۔لہٰذا آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی نیا نبی آ سکتا ہے۔

حدیث ۱۳ : آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں قریباً ایک لاکھ ۴۴ ہزار نفوس قدسیہ کے سامنے فرمایا:

"یایھا الناس انہ لا نبی بعدی ولا امّۃ بعدکم....." بعد میں فرمایا" وانتم تسئالون عنّی" (۳۳)(اے لوگو خبردار رہنا اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا کیونکہ میں آخری نبی ہوں اور تمھارے بعد کوئی امت نہ ہوگی کیونکہ تم آخری امت ہو اور تم کو قیامت کے دن میری نسبت ہی سوال ہوگا کسی اور کی نسبت نہیں پوچھا جائے گا)۔

گویا آپ ﷺ نے آخری وصیت بھی فرما دی کہ میرے بعد کسی کو نبی نہ بنانا جو بنائے وہ آپ ﷺ کی آخری وصیت کا بھی منکر ہے۔

حدیث ۱۴ : "عن ابی ذرّ قال قال رسول اللہ ﷺ یا ابا ذرّ اوّل الرسل آدم واخرھم محمد"(۳۴)(حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب انبیاء میں پہلے آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر میں محمد ﷺ ہیں)۔

روایت کیا اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں نیز اپنی تاریخ میں ۱۰ھ کے احوال کے تحت اور ابونعیم نے "حلیہ" میں اور ابن عساکر و حکیم ترمذی وغیرہ نے بھی اس طرح روایت کیا۔

حدیث ۱۵ : "عن ابی موسیٰ الاشعری قال: کان رسول اللہ ﷺ یسمّی لنا نفسہ اسماء فقال: انا محمّد واحمد والمقفی" (۳۵)(حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنے اسمائے شریفہ ہم سے بیان فرمایا کرتے۔چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں اور احمد اور مقفّی بھی ہوں (مقفّی کے معنی آخری کے ہیں)۔

حدیث ۱۶: آپ ﷺ نے فرمایا:

"فانی آخر الانبیاء وان مسجدی آخر المساجد" (۳۶) (کہ میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے)

دوسری روایت میں تفصیل ہے:

"انا خاتم الانبیاء ومسجدی خاتم مساجد الانبیاء" (۳۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (میں خاتم الانبیاء ہوں اور میری مسجد مساجد انبیاء کی خاتم ہے)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نہ آپ کے بعد کوئی نبی ہوگا اور نہ کسی نبی کی مسجد بنے گی جس کو مسجد نبوی کہا جائے۔

حدیث ۱۷: "عن ضحّاك بن نوفل قال قال رسول الله ﷺ لا نبی بعدی ولا امّة بعد امّتی" (۳۸) (حضرت ضحاک بن نوفل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں ہوگی)۔ ایک روایت میں "ولا امة بعدکم" کے الفاظ ہیں۔

حدیث ۱۸: "عن ابی هریرہ مرفوعاً انّه لیس یبقی بعدی من النبوّة الاّ الرّؤیاً الصّالحه" (۳۹) (حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد سوائے رویائے صالحہ کے نبوت میں سے کوئی جزو باقی نہیں رہے گا)۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبوت کی کوئی قسم تشریعی یا غیر تشریعی یا ظلی یا بروزی وغیرہ آنحضرت ﷺ کے بعد باقی نہیں رہ سکتی۔

حدیث ۱۹: "عن ابی امامة الباهلیؓ عن النبی ﷺ فی حدیث طویل انا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم" (۴۰) (حضرت ابوامامہ باہلیؓ نے ایک طویل حدیث کے ذیل میں روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں آخرالانبیاء ہوں اور تم سب آخری امت ہو)۔

ختم نبوت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع:

قرآن وسنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع کی

ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ کے وصال مبارک کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوّت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابہ کرام ؓ نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اس سلسلے میں خصوصیّت کے ساتھ مُسیلمہ کذّاب کا معاملہ قابل ذکر ہے۔ یہ شخص نبی ﷺ کی نبوّت کا منکر نہیں تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے حضور ﷺ کے ساتھ شریک بنایا گیا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپ ﷺ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"من مسیلمة رسول اللہ الی محمدٍ رسول اللہ سلام علیك فانی اشرکت فی الامر معك" (۴۱) (مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ نبوّت میں شریک کیا گیا ہوں)۔

علاوہ ازیں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ مسیلمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی اس میں اشھد انّ محمّد رسول اللہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرار رسالتِ محمدی ﷺ کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملّت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ (In Good Faith) اس پر ایمان لائے تھے اور انھیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو خود شریک رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو ان کے سامنے مسیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینہ طیبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا (۴۲)۔

اس کے باوجود صحابہ کرام ؓ نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ صحابہ ؓ نے ان کے خلاف ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رُو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیران جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار ذمّی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکر ؓ نے اعلان فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا

گیا، چنانچہ انھی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصّے میں آئی جس کے بطن سے تاریخ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حنفیہ نے جنم لیا(۴۳)۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جُرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جُرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوّت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضور ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت ابو بکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اجماع صحابہ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

ختم نبوت پر علمائے اُمت کا اجماع:

اجماع صحابہؓ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائل دین میں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ دورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے امّت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پُوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ جو بھی آپ ﷺ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر اور خارج از ملت اسلام ہے۔ اس سلسلہ کے بھی چند شواہد ملاحظہ ہوں:

۱۔ امام ابوحنیفہ (۸۰ھ-۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا: ''مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں'' اس پر امام اعظم نے فرمایا کہ: ''جو شخص اس سے نبوّت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں کہ ''لا نبی بعدی'' (۴۴)۔

۲۔ علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ-۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت: ''لٰکن رّسول اللہ و خاتم النبیین'' کا مطلب بیان کرتے ہیں:

''الّذی ختم النبوۃ فطبع علیھا فلا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعہ'' (۴۵)

(جس نے نبوّت کو ختم کر دیا اور اس پر مہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا)۔

۳۔ امام طحاوی (۲۳۹ھ-۳۲۱ھ) اپنی کتاب ''العقیدہ السّلفیہ'' میں سلف صالحین اور خصوصاً امام

ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوّت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت محمد ﷺ اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسُول ہیں، وہ خاتم الانبیاء، سید المرسلین اور حبیب ربّ العالمین ہیں، ان کے بعد نبوّت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے'' (۴۶)۔

۴۔ علامہ ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ-۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: ''یقیناً وحی کا سلسلہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّ وجل فرما چکا ہے کہ محمد ﷺ نہیں ہیں تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں'' (۴۷)۔

۵۔ محی السنہ بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) اپنی تفسیر ''معالم التنزیل'' میں لکھتے ہیں: ''اللہ نے آپ ﷺ کے ذریعہ سے نبوّت کو ختم کیا، پس آپ ﷺ انبیاء کے خاتم ہیں .... اور ابن عباس ؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) یہ فیصلہ دیا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا'' (۴۸)۔

۶۔ علامہ زمخشری (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: ''اگر میں کہوں گا کہ آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیہ کے پیرو اور آپ ﷺ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے، گویا کہ وہ آپ ہی کی امّت کے ایک فرد ہیں'' (۴۹)۔

۷۔ علامہ شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب ''الملل والنحل'' میں لکھتے ہیں: 'اور اسی طرح جو کہے...... کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسیٰ علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے'' (۵۰)۔

۸۔ امام رازی (۵۴۳ھ-۶۰۶ھ) اپنی تفسیر کبیر میں آیت خاتم النّبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس سلسلہ بیان میں ''وخاتم النبیین'' اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہو وہ اگر نصیحت اور توضیح احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اسے پورا کرسکتا

ہے۔مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی امّت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی اور سرپرست اس کے بعد نہیں ہے''(۵۱)۔

۹۔ علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر''انوار التنزیل ''میں لکھتے ہیں: آپ ﷺ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر مہر کر دی گئی اور عیسیٰ کا آپ ﷺ کے بعد نازل ہونا اس ختم نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ﷺ ہی کے دین پر ہوں گے''(۵۲)۔

۱۰۔ علامہ علاؤالدین بغدادی (متوفی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر''خازن''میں لکھتے ہیں:''وخاتم النبیین ''یعنی اللہ نے آپ ﷺ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپ ﷺ کے بعد کوئی اس میں شریک...... وکان اللہ بکلّ شیء علیماً۔یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں''(۵۳)۔

۱۱۔ علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں:''یہ آیت اس باب میں نصِ صریح ہے کہ نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپ ﷺ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجہ اولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا..... حضور ﷺ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے خواہ وہ کیسے ہی خرق عادت، شعبدے، جادو، طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے.....یہی حیثیت ہر اس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدعی ہو''(۵۴)۔

۱۲۔ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)''تفسیر جلالین''میں لکھتے ہیں:''وکان اللہ بکلّ شیء علیماً ''یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو آپ ﷺ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے''(۵۵)۔

۱۳۔ علامہ ابن نُجیم (متوفی ۹۷۰ھ) اصول فقہ کی مشہور کتاب''الاشباہ والنظائر''کتاب السیر، باب الرّدہ میں لکھتے ہیں:''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد ﷺ آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں

میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریات دین میں سے ہے"(۵۶)۔

۱۴۔ ملاّ علی قاری (متوفی ۱۰۱۶ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبی ﷺ کے بعد نبوّت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے"(۵۷)۔

۱۵۔ شیخ اسماعیل حقی (متوفی ۱۱۳۷ھ) "تفسیر رُوح البیان" میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عاصم نے لفظ خاتم "ت" کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں آلہ ختم کے جس سے مہر کی جاتی ہے جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جائے۔ مُراد یہ ہے کہ نبی ﷺ انبیاء میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعہ سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے "مہر پیغمبران" کہیں گے، یعنی آپ ﷺ سے نبوّت کا دروازہ سربمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے "ت" کے زیر کے ساتھ خاتم پڑھا ہے، یعنی آپ ﷺ مہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اسے "مہر کنندہ پیغمبراں" کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتم کا ہم معنی ہی ہے...... اب آپ کی امّت کے علماء آپ ﷺ سے صرف ولایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپ ﷺ کی ختمیّت کے باعث ختم ہو چکی اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ ﷺ کے بعد نازل ہونا آپ ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے میں قادح نہیں ہے کیونکہ خاتم النّبیین ہونے کے معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا...... اور عیسیٰ علیہ السلام آپ ﷺ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے بلکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہوں گے ...... اور اہل سنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا "ولٰکن رسُول اللہ و خاتم النّبیین" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا لا نبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے نص کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجت نے حق کو باطل سے ممیّز کر دیا ہے اور جو حضرت شخص محمد ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا"(۵۸)۔

۱۶۔ فتاویٰ عالمگیری، جسے بارہویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان

کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، میں لکھا ہے: ''اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد ﷺ آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی'' (۵۹)۔

۱۷۔ علامہ شوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں لکھتے ہیں: ''جمہور نے لفظ خاتم کو 'ت' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ؛ پہلی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے انبیاء کو ختم کیا، اور دوسری قرأت کے معنی یہ ہیں کہ آپ ان کے لیے مہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعے سے ان کا سلسلہ سربمہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزیّن ہوا (۶۰)۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

''یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اندلس تک، اور ترکی سے لے کر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علماء و فقہاء اور محدثین و مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سنین ولادت و وفات بھی دے دیے ہیں جن سے ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اُن میں شامل ہیں، اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انہیں اس لیے چھوڑ دیا کہ اُن کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس دور کے مدعی نبوّت کی ضد میں ختم نبوت کے یہ معنی بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے علماء کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ ان تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام متفقہ طور پر ''خاتم النبیین'' کے معنی آخری نبی ہی سمجھتی رہی ہے، حضور ﷺ کے بعد نبوّت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد ﷺ کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعوے کو مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحب عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النّبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی ﷺ نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابہ کرام ؓ کا اجماع ہے، اور جسے صحابہ کرام ؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان

بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدعی کے لیے نبوّت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے باب نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب، حریم نبوت میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوّت پر ایمان بھی لے آئے ہیں''(۶۱)۔

ختم نبوّت کے عقلی دلائل:

پہلی بات یہ ہے کہ نبوّت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی مبہم انداز کی بدرجہ اولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اُس کی تصریح فرماتا، رسُول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اُس کا کھلا کھلا اعلان کراتا اور حضور ﷺ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امّت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمھیں اُن کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضور ﷺ کے بعد نبوّت کا دروازہ تو کھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امّت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

''اب اگر بفرضِ محال نبوّت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پُرس ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس رسول کی سنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا لیکن اگر نبوّت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی

مدعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقلمند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے"۔

کیا نئے نبی کی ضرورت ہے؟

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیاء پر انبیاء نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء مبعوث ہوئے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آنے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بُھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہوگئی ہو اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی ﷺ کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضور ﷺ کو تمام دُنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دُنیا

کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ ﷺ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء کے آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپ ﷺ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپ ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہوگئی۔

پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیل دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہوگئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے جس کے لیے آپ ﷺ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اُس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنتِ نبوی ﷺ کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے کہ نہ انبیاء کی۔

''تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہوگا۔ جو اُس کو مانیں گے وہ ایک امت قرار پائیں گے اور جو اُس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ

دوسری امت ہوں گے۔ ان دونوں امتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہوگا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو انھیں اس وقت تک مجتمع و متحد نہ ہونے دے گا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنّت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختم نبوت امّت مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اس اُمّت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ہر ایسے بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہوسکتا ہو۔ اب جو شخص بھی حضرت محمد ﷺ کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہوسکتا ہے یہ وحدت اس امّت کو کبھی نصیب نہ ہوسکتی تھی اگر نبوّت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا کیونکہ ہر نئے نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوّت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے تاکہ اُس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دنیا میں ہمیشہ کے لیے اہل ایمان کی ایک ہی امّت بن سکے اور بلا ضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس امّت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہو۔ نبی خواہ ''ظلّی'' ہو یا ''بروزی'' ''امّتی'' ہو یا صاحب شریعت اور صاحب کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک امّت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو، مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے

بندوں کو کفر وایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک امّت نہ بننے دے۔لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اجماع سے ثابت ہے عقل بھی اس کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوّت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے''۔(۶۲)

(دیگر کتب کے علاوہ اس مقالے کی تیاری میں خصوصا مولانا مودودی کی سیرت سرورِ عالم ﷺ سے استفادہ کیا گیا ہے)۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ السباء:۲۸۔

۲۔ الفرقان:۱۔

۳۔ الاعراف:۱۵۸۔

۴۔ الانبیاء:۱۰۷۔

۵۔ آل عمران:۸۱۔

۶۔ المائدۃ:۳۔

۷۔ التوبہ:۳۳۔

۸۔ الحجر:۹۔

۹۔ حم السجدۃ:۴۱-۴۲۔

۱۰۔ الکہف:۲۷۔

۱۱۔ البقرہ:۴-۵۔

۱۲۔ الاحزاب:۴۰۔

۱۳۔ ایضاً:۴-۵۔

۱۴۔ ایضاً:۴۰۔

۱۵۔ مودودی،ابوالاعلیٰ،سید،سیرت سرور عالم ﷺ(ادارہ ترجمان القرآن،لاہور،طبع ششم ۱۹۹۴ء)۱/۱۹۱-۱۹۳۔

۱۶۔ لسان العرب،القاموس المحیط،اقرب الموارد،سید مودودی،سیرت سرور عالم،۱/۱۹۵-۱۹۶:

یہاں پر مولانا فرماتے ہیں ہم نے لغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔لیکن بات انھی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔عربی زبان کی کوئی معتبر لغت اُٹھا کر دیکھ لی جائے،اس میں لفظ خاتم کی یہی تشریح ملے گی لیکن منکرین ختم نبوت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعراء یا خاتم الفقہاء یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اس شخص پر ختم ہو گئے۔حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنی ہرگز نہیں رکھتا کہ لغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنی ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور آخری کے معنی میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پائے۔یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنی میں بولا

جا تا ہو تو وہی معنی اس کے اصل معنی بن جائیں اور لغت کی رُو سے جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ "جاء خاتم القوم" تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آ گیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پورا پورا قبیلہ آ گیا ہے حتیٰ کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آ گیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتم الشعراء، خاتم الفقہاء اور خاتم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعتراف کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں صفت اس پر ختم ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعراء کہہ دیا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہو سکتا تھا، اور اس نے جسے خاتم النّبیین کہہ دیا، ناممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النّبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعراء اور خاتم الفقہاء وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجہ میں کیسے ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن، ۲/ ۲۲۸؛ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، السنن، ۲/ ۴۵؛ الخطیب التبریزی، محمد بن عبداللہ، مشکاۃ المصابیح، ۳/ ۱۵۹، حدیث نمبر ۵۴۰۶۔

۱۸۔ دارمی، ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن، السنن، ۱/ ۳۱، (طبع المدینۃ المنورہ)؛ مشکاۃ المصابیح، ۳/ ۵ ۷ ۲، حدیث نمبر ۵۷۶۴۔

۱۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، ۱/ ۵۰۱؛ القشیری، مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، ۲/ ۲۴۸؛ مشکوٰۃ المصابیح، ۲/ ۵۱۱۔

۲۰۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۱۰۱۳، حدیث نمبر ۵۹۶۳۔

۲۱۔ ابوداؤد الطیالسی، المسند، ص ۲۴۷۔

۲۲۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۲۱۳، حدیث نمبر ۱۱۶۷؛ ابوعوانہ، المسند، ۱/ ۳۹۵؛ مشکاۃ المصابیح، ۲/ ۵۱۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۸۲۷، حدیث نمبر ۴۷۷۳۔

۲۴۔ ترمذی، السنن، ص ۵۲۲، حدیث نمبر ۲۲۷۲۔

۲۵۔ احمد، المسند، (دارالفکر، القاہرہ) ۴/ ۱۲۸۔

۲۶۔ الحاکم، ابوعبداللہ محمد، المستدرک، ۲/ ۴۱۸۔

۲۷۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۱۰۳۴، حدیث نمبر ۶۱۰۵۔

۲۸۔ الطبرانی، سلیمان بن احمد، (موسسۃ الکتب الثقافۃ، بیروت ۱۹۸۶ء) المعجم الکبیر، ۱۷/ ۱۸۰؛ ملاعلی قاری،

الاسرار المرفوعہ فی الاحادیث الموضوعہ، ص ۲۸۵۔

۲۹۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۸۲۷، حدیث نمبر ۴۷۷۳۔

۳۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۷۴۹، حدیث نمبر ۴۴۱۶۔

۳۱۔ احمد، المسند ، ۳/۱۲۴؛ ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری، ۱۰/ ۴۳۶؛ الطبرانی، المعجم الکبیر، ۲/ ۲۰۷؛ المتقی الہندی، کنز العمال، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۵ء) ۱۴/۱۹۶ (حدیث نمبر ۳۸۳۴۸)۔

۳۲۔ ملا علی قاری، الاسرار المرفوعہ، ۲۸۵۔

۳۳۔ احمد، المسند ، ۲/ ۳۹۱۔

۳۴۔ المتقی الہندی، کنز العمال، ۱۱/ ۴۸۰، حدیث نمبر ۳۲۲۶۹۔

۳۵۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۰۳۵، حدیث نمبر ۶۱۰۸۔

۳۶۔ ایضاً ص ۵۸۳، حدیث نمبر ۳۳۷۶۔

۳۷۔ المتقی الہندی، کنز العمال، ۱۲/ ۲۷۰، حدیث نمبر ۳۴۹۹۹۔

۳۸۔ البیہقی، السنن، ۱۸/ ۱۴۴؛ المعجم الکبیر، ۸/ ۱۶۳؛ کنز العمال، ۱۵/ ۹۴۷، حدیث نمبر ۴۳۶۳۷۔

۳۹۔ فتح الباری، ۱۱/ ۳۲۱؛ ابوداؤد، السنن، ص ۷۰۶، حدیث نمبر ۵۰۱۷

۴۰۔ ابو بکر عمر بن ابی عاصم، کتاب السنہ، ۱/ ۱۷۱؛ ابن عساکر، ابو القاسم علی بن الحسن، تہذیب تاریخ دمشق، (دار المجرۃ، بیروت ۱۳۹۹ھ) ۱/ ۱۹۱۔

۴۱۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک (مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت) ۲/ ۳۹۹۔

۴۲۔ ابن کثیر، عماد الدین، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، البدایہ والنہایہ (دار الفکر، بیروت ۱۹۷۸ء) ۵/ ۵۱۔

۴۳۔ ایضاً، البدایہ والنہایہ، ۶/ ۳۱۶-۳۲۵۔

۴۴۔ المکی، ابن احمد، مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ (مجلس دائرۃ المعارف، النظامیہ الکائنۃ) ۱/ ۱۶۱۔

۴۵۔ طبری، محمد ابن جریر، تفسیر جامع البیان عن تاویل آی القرآن، (مکتبۃ ومطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۸۸ھ) ۲۳/ ۱۲۔

۴۶۔ الطحاوی، ابو جعفر، شرح الطحاویہ فی العقیدہ السلفیہ (المکتبۃ الاسلامی، بیروت ۱۹۹۲ء) صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲۔

۴۷۔ ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد، المحلی (دار الآفاق الجدیدہ، بیروت) ۱/ ۲۶۔

۴۸۔ البغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود، معالم التنزیل، (بمبئی) ۳/ ۱۷۸۔

۴۹۔ الزمخشری، ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل،

(مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۴۸ء) ۲/ ۵۴۱-۵۴۲۔

۵۰۔ الشہرستانی، عبدالکریم، الملل والنحل (مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر) ۳/ ۲۴۹۔

۵۱۔ الرازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر، ۲۵/ ۲۱۴۔

۵۲۔ البیضاوی، عبداللہ بن عمر، ابوالخیر، تفسیر بیضاوی (مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۶۸ھ) ۲/ ۲۷۴۔

۵۳۔ خازن، علاء الدین علی بن محمد، لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف تفسیر خازن (مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۵ء) ۵/ ۲۶۵۔

۵۴۔ ابن کثیر، عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (دارالسلام، الریاض) ۳/ ۶۵۰-۶۵۳۔

۵۵۔ السیوطی والمحلی، جلال الدین، تفسیر جلالین (سراج الدین اینڈ سنز، لاہور) ص ۳۵۵۔

۵۶۔ ابن نجیم، زین الدین ابراہیم، کتاب الاشباہ والنظائر (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی ۱۴۰۵ھ) ص ۱۹۶۔

۵۷۔ ملا علی قاری، شرح فقہ الاکبر (مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۲۵ھ) ص ۲۰۲۔

۵۸۔ اسماعیل حقی، البروسوی، تفسیر روح البیان (دارالاحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۵ء) ۷/ ۱۸۷-۱۸۸۔

۵۹۔ علامہ نظام و جماعہ، فتاویٰ عالمگیری، ۲/ ۲۶۳۔

۶۰۔ شوکانی، محمد بن علی، تفسیر فتح القدیر (مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر) ۴/ ۲۷۵۔

۶۱۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، سیرت سرورِ عالم ﷺ (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور) ۱/ ۲۰۸-۲۰۹۔

۶۲۔ ایضاً، ۱/ ۲۰۱-۲۱۲ (مکمل سیرت سرورِ عالم سے لیا گیا ہے)۔

❀❀❀❀

باب سوم

سیرت نبوی ﷺ اور معاشرت

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں معاشرتی زندگی کی تشکیل

معاشرہ:

معاشرہ کا مادہ عشر ہے۔اس سے مراد مل جُل کر رہنا ہے۔اسی مادے سے ''معشر'' ہے۔ ''معشر'' اس جماعت کو کہا جاتا ہے، جس کے مابین اتفاق رائے ہو جیسے ''معشر المسلمین'' اور ''معشر المشرکین''۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ﴾ (۱) (اے جنوں و انسانوں کے گروہ)۔

معاشرہ لفظ ''عاشر'' سے نکلا ہے جس کے معنی زندگی گزارنا ہے ﴿ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ (۲) (اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے انداز میں زندگی بسر کرو)۔انسان بنیادی طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔چنانچہ الگ تھلک رہ کر اور دوسرے افراد کا تعاون اور اشتراک حاصل کیے بغیر کسی فرد کا زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔گویا معاشرہ (Society) ایک ایسے گروہ کا نام ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔معاشرہ حشرات اور حیوانات کا بھی ہوتا ہے۔شہد کی مکھیاں، دیمک اور چیونٹیاں بھی جداگانہ معاشروں کی مالک ہیں۔

معاشرے کا ارتقا:

معاشرے کا قیام کوئی حادثاتی امر نہیں بلکہ اس کے پیچھے انسان کے ارتقا کی پوری تاریخ ہے۔ ابتدا میں انسان موسموں، بیماریوں اور جنگلی جانوروں کے ہاتھوں اتنا بے بس تھا کہ اُسے مجبوراً دوسرے انسانوں کی طرف دست تعاون دراز کرنا پڑا۔اُسے احساس تھا کہ الگ تھلگ رہنے سے نہ صرف یہ کہ اُس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں بلکہ خود اس کا وجود بھی خطرے میں ہے۔اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے، والدین، بہن بھائیوں اور اولاد کی فطری محبت بھی اُنھیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر آمادہ کرتی۔چنانچہ آہستہ آہستہ افراد میں ہمدردی، یگانگت اور وحدت کا احساس پیدا ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا گیا اور اس طرح معاشرہ وجود میں آ گیا۔

جب بنی نوع انسان کی تعداد بڑھ گئی تو اُن میں گروہ بندیاں اور مخاصمتیں بھی بڑھ گئیں۔ طبائع کے اختلاف نے اپنا رنگ دکھایا اور عالمگیر معاشرے کے بجائے رنگ، نسل اور جغرافیائی حد بندیوں اور اندازِ فکر کی بنا پر بہت سے گروہ وجود میں آ گئے جو آپس میں برسرِ پیکار رہنے لگے۔ چنانچہ کئی معاشروں کا قیام حفاظتِ خود اختیاری کے تحت عمل میں آ گیا۔ تعاون اور ہمدردی کے علاوہ دشمنوں سے بچاؤ کا جذبہ بھی معاشرے کے قیام کا محرک بنا۔ انسانوں نے آپس میں عمرانی معاہدہ کر لیا اور اکٹھے مل جل کر زندگی بسر کرنے لگے۔

محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بے شمار معاشرے وجود میں آئے اگرچہ ان تمام معاشروں کے نقوش آج ہمارے سامنے پوری طرح واضح نہیں لیکن قرآن کی اس شہادت کے بعد ان کے وجود سے متعلق کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴾ (۳) (اور نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے خبیر وبصیر ہونے کے لیے کافی ہے)۔

بعثت نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے انبیاء کی ایک کثیر تعداد اصلاح الناس کے لیے مبعوث ہوتی رہی۔ اور ہر دور میں ایک جماعت نے حق کی آواز پر لبیک کہا اور دوسری جماعت نے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ یقیناً انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنے والوں نے انبیاء کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی معاشرتی شیرازہ بندی کی ہوگی اور الٰہی اصولوں کے مطابق اعلیٰ معاشرتی قدروں کو تحفظ دیا ہوگا۔ ہمارے پیش نظر عرب اور بالخصوص سرزمین مکہ ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بالعموم اعلیٰ معاشرتی قدروں کو تحفظ حاصل نہیں تھا۔ تاہم یہاں دین ابراہیمی کی کہیں نہ کہیں کوئی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جو دین حق کی تلاش میں تھے اور آخری پیغمبر کی بعثت کے منتظر تھے، ورقہ بن نوفل کی مثال موجود ہے، سرزمین مکہ کے معاشرتی حالات پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یقیناً ایک ایسا معاشرتی ڈھانچا نظر آتا ہے، جو غیر مہذب، حدود سے متجاوز اور بعض مقامات پر اوصاف حمیدہ سے نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی اصلاح کے لیے اپنے آخری نبی ﷺ کو بھیجا جس نے اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ظلمتوں کو روشنی سے بدل دیا اور انسانی معاشرے کی تمام خرابیوں کو دور کر دیا۔

نبی کریم ﷺ کے ظہور سے پہلے کی دنیا کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جس میں اہلِ عرب مبتلا نہ ہوں۔ سارا معاشرہ بگڑ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے معاشرہ کی اصلاح وتطہیر کے لیے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنھوں نے بہت قلیل عرصے میں سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا، جس تک آپ ﷺ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ اس سلسلہ میں معاشرے کی اصلاح کی خاطر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن تمام مصیبتیں سہنے کے باوجود بھی آپ ﷺ نے معاشرے کی اصلاح کا کام جاری رکھا اور عمر مبارک کے کسی مرحلے میں بھی یہ مقصد آپ ﷺ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا اور آپ ﷺ کی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں تئیس سال کی مختصری مدت میں ایک ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آ گیا، جس کی نظیر دنیا آج تک پیش نہ کر سکی۔

رسول اللہ ﷺ کی معاشرتی زندگی:

تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے نظام تعلیم وتربیت میں اخلاق ظاہری اور اخلاق باطنی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی اصلاح پر بھی توجہ دی جاتی ہے کیونکہ تزکیۂ نفس کے بغیر نہ ظاہری اصلاح ہوتی ہے نہ قلب وروح میں تازگی پیدا ہوتی ہے، اہل ایمان کے دو ہی مقام ومرتبے ہیں جنھیں حدیث احسان میں بیان کیا گیا ہے، پہلا مقام ''**کانك تراه**'' جہاں اہل ایمان کو مشاہدہ حق اور دوسرا مقام جہاں ''**فانه یراك**'' حضوری کی کیفیت محسوس ہو۔ ان صورتوں میں یہ ممکن نہیں کہ انسان اخلاق واعمال کے بلند ترین مقام سے نیچے آ سکے۔ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ہی ایسا معاشرہ ہوگا جس میں افراد کو حصولِ کمال ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز عقیدہ کی تعلیم وتربیت سے فرمایا، دین کی عملی شکل و

صورت اور ایک مہذب ومتمدن معاشرہ کا نمونہ اسی وقت نمایاں ہوتا ہے جب عقیدہ دل ودماغ میں راسخ ہو جاتا ہے۔عقیدہ انسان کی ذہنی وفکری اصلاح کرتا ہے اور اس کی عملی زندگی میں نظم اور باقاعدگی بھی پیدا کرتا ہے۔

توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ محض تصورات نہیں بلکہ حقائق ہیں۔ان سب کا علم انسانوں کو وحی الٰہی کے ذریعہ سے ہوا ہے:

﴿ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴾ (۴)

(اس وحی الٰہی میں باطل کا کوئی عمل دخل کسی جانب سے نہیں، یہ حکیم وحمید کی نازل کردہ کتاب ہے)

عہدِ رسالت میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان وعقیدہ کی تربیت اس طرح فرماتے تھے کہ یہ عمل اہلِ ایمان کے لیے تزکیہ نفس کا ذریعہ بن جائے اور ان کے قلوب میں طاقتور احساس پیدا ہو جائے۔قرآن حکیم نے ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔جب ایمان کے سوتے قلب سے پھوٹتے ہیں تو عملی زندگی خود بخود ایمان کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔مومن وہی عمل کرتا ہے جس میں اللہ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے۔قرآن کریم میں کئی مقامات پر ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ہے۔مثلاً: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴾ (۵) (اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے کہ ان کی مغفرت بھی فرمائے گا اور ان کے لیے اجر عظیم بھی ہے)۔

ایمان وعقیدہ کی تعلیم وتربیت کا اثر صحابہ کرام ﷺ کی عملی زندگی میں بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ حضرت مصعب ؓ بن عمیر جن کی قبل از اسلام بہت عیش وآرام کی زندگی تھی، قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنی ساری زندگی دعوت اور جہاد میں گزاری۔مدینہ منورہ کے پہلے معلم ہونے کا شرف بھی اُن کو ملا۔غزوہ احد میں حضرت مصعب بن عمیر ؓ شہید ہوئے تو اُن کے کفن کے لیے بھی پورا کپڑا نہیں تھا، سر ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور جب پاؤں ڈھانپتے تو سر کھلا رہ جاتا۔اسلام لانے سے قبل لوگوں نے ان کو بہت قیمتی لباس میں دیکھا تھا (۶)۔لیکن اسلام کے بعد دنیا کی زندگی پر آخرت کی زندگی کو ترجیح دی۔اسی طرح تمام صحابہ کرام ؓ کی زندگی تھی۔حضرت عمر کی انگوٹھی پر لکھا ہوا تھا: "کفی بالموت

واعظایاعمرؓ"(۷)۔

رسول اللہ ﷺ کے تیار کردہ معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجحان، دنیا کی بے رغبتی، آپس میں محبت و پیار اور جاں نثاری کی صفات تھیں۔ان تمام چیزوں کے ساتھ آپس کی ملاقات، مساجد میں آنا جانا، سرِ راہ ملاقات پر سلام کہنا، شادی بیاہ کی تقریبات پر محبت سے ملنا، اولاد اور والدین کی محبت، استاد اور شاگرد کی محبت جیسی چیزیں شامل تھیں۔جنھوں نے اس معاشرے کو مثالی معاشرہ بنادیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح عقیدہ کے ذریعے معاشرہ کی تربیت کی۔اسلام کے بنیادی عقائد و افکار، اسلامی تہذیب و معاشرت اور اخلاقی اقدار میں گہرا ربط و تعلق قائم ہوا۔یہ ربط اس قدر گہرا اور مضبوط تھا کہ بعد میں ہونے والی علمی ترقی اور تہذیبی و تمدنی ارتقاء کے سوتے صدیوں تک اسلامی فکر و عقیدہ ہی سے پھوٹتے رہے۔دیگر تہذیبوں سے اگر کبھی کوئی چیز لی گئی تو وہ بھی اسلامی اقدار اور رنگ میں ڈھل کر ہی ہماری تہذیب کا حصہ بن گئی۔اسلامی فکر سے مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کر کے اس میں اسلامی روح کو اجاگر کیا گیا پھر اسے اسلامی معاشرہ میں قبول کیا گیا۔

قرآن حکیم میں امت مسلمہ کے تمام افراد کو خواہ وہ کوئی زبان بولتے ہوں، کسی بھی خطہ یا علاقہ میں رہائش پذیر ہوں، کسی بھی نسل یا خاندان سے تعلق رکھتے ہوں، سب کو ایک جماعت اور ایک ملت قرار دیا گیا ہے۔دنیا بھر کے وہ تمام افراد جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر عقیدہ رکھتے ہوں اور ختم الرسل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی رسالت اور تمام تعلیمات پر ایمان رکھتے ہوں ایک ہی اُمت کے ارکان تسلیم کیے گئے ہیں۔یہ اَرکان باہم مل کر علاقائی، جغرافیائی اور لسانی عصبیتوں اور تنگ نظریوں سے بلندتر ہو کر ایک عالمگیر اور آفاقی امت کی تشکیل کرتے ہیں جس کی بنیاد اسلام ہے۔

سورۃ الحجرات میں صحابہ کرامؓ کے کردار کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ. فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (۸)(مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمھارے لیے دل پسند بنادیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کردیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم

ہے) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کا شوق و محبت کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے، ان کے دل منور ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں کفر، فسق، رذائل اخلاق اور عصیان سے سخت نفرت ہے۔ صحابہ کرام ؓ کی ان اعلیٰ صفات کو قرآن حکیم بتاتا ہے کہ ان صفات و کردار کے حامل افراد ہی ہدایت یافتہ ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر بڑا فضل و انعام ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں قرآن کریم تاکید کے ساتھ کہتا ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (۹) (یقیناً اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان مصالحت کراؤ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)۔

رسول اکرم ﷺ کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اوس و خزرج کے جو قبائل ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اخوت و محبت کے رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾ (۱۰) (اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے)۔

رسول اللہ ﷺ کے خلق عظیم کی مکمل کتاب ہونے کی حیثیت سے جہاں قرآن کو صحیفۂ سیرت النبی ہونے کا اعزاز حاصل ہے، وہاں پر ایمان والوں کے لیے منبع رشد و ہدایت اور سامان رحمت و بشارت ہو کر تمام تر ضروریات دین کی وضاحت و بیان بھی اسی کتاب مبارک کا عظیم کارنامہ ہیں۔ پھر ان ہر دو خصوصیات کی بنیاد پر قرآن زندگی کے لیے جو راستہ تجویز کرتا ہے وہ اس قدر سیدھا اور صاف ہے اور جس پر چلنے والا اپنے رب کی جانب سے واضح نصب العین پر فائز ہو کر یقین کامل کے ساتھ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے دستور زندگی اور نظم معاشرت کے بارے میں جو ضابطے انسانوں کو عطا کیے ہیں وہ سراسر حکمت کے عناصر پر مشتمل ہیں اور پختہ حقائق اور ٹھوس دلائل پر مبنی ہونے کی بنا پر فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں۔ اس لیے سورۂ بنی اسرائیل میں جس مقام پر انسان کے لیے معاشرتی ضابطوں کی تفصیل بیان فرمائی وہیں آخر میں اعلان کیا: ﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ

الْحِكْمَةِ ﴾ (۱۱) یہ سب باتیں ہیں جو تمھارے رب نے حکمت کے خزانوں میں سے تمھاری جانب وحی فرمائی ہیں جب کہ آغاز بیان میں فرمایا: ﴿ إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً كَبِيراً ﴾ (۱۲) (بے شک یہ قرآن اس راستے کی راہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے (اللہ کے ہاں) بڑا اجر وثواب ہے)۔

اس بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشرتی آداب کی صورت میں زندگی کا جو قرینہ مختص فرمایا ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عقائد میں سے اصول ثلاثہ کو ایک مسلمان کے ذہن وفکر کی بنیاد قرار نہیں دیا جاتا اور توحید ورسالت اور آخرت کی ایمانیاتی مثلث مسلمانوں کے جملہ معاشرتی ضابطوں کی روح اور جان نہیں بن جاتی۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾ (۱۳) (ان پر کیا مشکل ہے اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئیں)۔

حیاتِ انسانی ایک وحدت ہے، لیکن انسان نے اپنے ارادہ واختیار اور فکر وعمل کی آزادی سے اسے گونا گوں، مگر علیحدہ علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پیچیدہ اور دشوار بن گئی ہے۔ اسلام حیاتِ انسانی کی وحدت اور کثرت دونوں کو تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ حیاتِ انسانی کو ایک نامیاتی کُل اور اس کے تمام شعبوں کو مربوط اور غیر منفک سمجھتا ہے، جنھیں ایک دوسرے سے جُدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ اس سے فکر وعمل کی گمراہی لازم آتی ہے (۱۴)۔

اسلامی زندگی کے ہر زاویہ میں فکر صحیح کو عمل صحیح کی جڑ اور بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ نیز مخلوقات کے ساتھ حسن معاملہ اور حسن معاشرت کے سارے سلسلے مکمل طور پر عقیدے پر ہی منحصر ہیں۔ جس کے لیے نیت اور ارادے کا خالص ہونا از حد ضروری ہے اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء مانوی" (۱۵) (دراصل تمام عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص وہی کچھ پائے گا جس کی اس نے نیت کی)۔

رسول اللہ ﷺ نے معاشرے میں ایسا ماحول مہیا کرنے کا اہتمام کیا جس میں خلوص نیت کے

حصول کی تربیت ہو اپنے گردوپیش میں جب وہ اپنی آزادانہ رائے کو خیر کے انتخاب کے لیے استعمال کرنے کی مسلسل اور بار بار مشق کرتا ہے تو پھر یہ عادت اس کی طبیعت میں راسخ ہو جاتی ہے اور یوں فطرت ثانیہ بن جاتی ہے کہ بالآخر اپنے رب کے فضل و کرم سے وہ شر کے انتخاب کا اہل ہی نہیں رہتا اور تعلیم و تربیت سے اللہ کا محبوب بندہ اور مردِ صالح بن جاتا ہے۔

معاشرتی مسائل:

معاشرتی نظام میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، عربوں میں بھی اس معاشرتی بنیاد کا تصور پوری طرح موجود تھا بلکہ خاندانی تفاخر ان کی معاشرت کا حصہ تھا۔ خاندان کی بنیاد پر اکثر شادی بیاہ ہوتے تھے اور اس کے لیے نکاح کو بنیادی اہمیت حاصل تھی عربوں کے ہاں نسب کے لیے صرف نکاح ہی شرط نہیں تھا بلکہ سفاح سے بھی نسب ثابت ہو جاتا تھا۔ دورِ جاہلیت میں نکاح و طلاق کے معاشرتی بندھن بھی مروج تھے، ان کے ہاں نکاح کی جو قسمیں پائی جاتی تھیں ان میں درج ذیل نکاح بھی پائے جاتے تھے۔

۱: نکاح شغار ۲: موقت

۳: دو بہنوں سے بیک وقت نکاح وغیرہ

اسی طرح شادی کے بعد علیحدگی کے سلسلہ میں بعض طریقوں کو اسلامی شریعت نے قبول کیا اور بعض کو رد کر دیا۔ ان میں ''طلاق'' کا طریقہ مروج تھا لیکن اس کی تعداد مقرر نہیں تھی، اور اس طرح خواتین کے ساتھ زیادتی کا یہ عمل یوں جاری رہتا کہ طلاق دی، پھر رجوع کر لیا، پھر طلاق پھر رجوع، حتی کہ عدت گزارنے کے بعد بھی مرد کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اسے اپنے پاس روک لے۔ اسلامی شریعت نے طلاق کے اصول کو باقی رکھا، لیکن اسے محدود کرتے ہوئے شوہر کو تین طلاق دینے کا حق دیا اور اس کی تکمیل کے ساتھ زوجین کی تفریق بھی مکمل کر دی، ارشاد ہے: ﴿ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَن يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ﴾ (۱۶) (طلاق دو بار، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے

کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ البتہ یہ صورت مستثنٰی ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو)۔

خلع کا اصول عربوں کے ہاں مروج تھا، اسلام نے بھی اسے قائم رکھا۔ اسی طرح وہ ایلاء کو طلاق تصور کرتے تھے، جو ایلاء کی عدت گزر جانے کے بعد واقع ہوتی تھی۔ اور اس کی مدت ایک سے دو سال تک کر دیتے تھے، اسلام نے ایلاء کو بھی باقی رکھا۔ لیکن اس کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی۔

عدت گزارنے میں حکمت یہ ہے کہ اختلاط نسب کو روکنے کے لیے اس بات کا پورا یقین کر لیا جائے کہ عورت کے رحم میں بچہ تو نہیں ہے، عربوں کے ہاں بھی یہ رواج تھا کہ طلاق اور موت کے سبب شوہر عورت سے علیحدہ ہو جاتا تو اس کے لیے ان کے ہاں عدت کی مدت کامل ایک سال مقرر تھی۔ اسلامی شریعت نے عدت کے نظام کو قائم رکھا اور عورتوں کے مختلف حالات کے لحاظ سے عدت کی مقدار کا تعین کیا، طلاق کے بعد حیض والی عورتوں کے لیے تین حیض یا طہر مقرر کیے۔ جس عورت کے خاوند کا انتقال ہو گیا ہو اس کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کی۔ حاملہ عورت کے لیے وضع حمل تک کی مدت مقرر کی۔ جس عورت کو کم عمری یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو اس کے لیے تین ماہ مقرر کیے جس عورت کے ساتھ خاوند نے صحبت نہ کی ہو اس پر کوئی عدت نہیں رکھی۔

عرب معاشرہ میں وصیت اور میراث کا سلسلہ بھی جاری تھا، وہ وارث اور دوسروں کو وصیت کی اجازت دیتے تھے لیکن ان کے ہاں اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں تھی۔ اسلام نے وصیت کے اصول کو قائم رکھا اور وصیت کرنے والے کے ترکہ میں تہائی حصہ وصیت کرنے کی حد مقرر کی۔ وصیت کی اجازت صرف ان لوگوں کے حق میں دی جن کو میراث میں سے حصہ نہیں ملتا، وارث کے حق میں وصیت کو دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف رکھا (۱۷)۔

عرب معاشرہ میں معاملات کی بہت سی اقسام مروج تھیں۔ جن میں سے کچھ کو اسلام نے قائم رکھا اور کچھ کی ممانعت کر دی مثلاً عقد شرکت، عقد مضاربت، عقد سلم کو اسلام نے قائم رکھا اور ربا کو خلاف اسلام قرار دیا۔

عرب میں خرید و فروخت کے جو طریقے رائج تھے، اسلام نے ان میں سے ان طریقوں کو باقی

رکھا جو درست تھے اور فریقین کی رضامندی سے طے پاتے تھے۔لیکن جن طریقوں میں دھوکا یا دھوکے کا احتمال تھا اسلام نے انھیں باطل قرار دیا۔مثلاً بیع منابذہ، ملامسہ، بیع حصاۃ اور بیع نجش وغیرہ کو خلاف اسلام اور ناجائز قرار دیا۔

معاشرے کے لیے قانون ضروری ہے بالکل اسی طرح جیسے انسان کے لیے معاشرہ ضروری ہے اس لیے کوئی معاشرہ قانون اور ضابطوں سے خالی نہیں رہا یعنی ایسے قواعد اور ضوابط رسم ورواج اور عرف سے عبارت ہوتے ہیں جن کے مطابق لوگوں کے تمام کام سرانجام پاتے ہیں اور لڑائی جھگڑے کی صورت میں انھی کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔دور جاہلیت میں عربوں کا یہی قانون تھا لیکن اس رسم و رواج کے قانون میں بعض چیزیں ایسی تھیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے باقی و قائم رکھا اور بعض میں ترمیم واضافہ کیا۔مثلاً قتل کی صورت میں مجرم سے قصاص لینے پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان کی نظر میں پورا قبیلہ اس جرم کا ذمہ دار ہوتا تھا۔اسلام نے اس ذمہ داری کی حد بندی کی اور اس کو صرف قاتل تک محدود کر دیا۔ چنانچہ اسلام نے حکم دیا کہ قصاص صرف قاتل سے ہی لیا جائے گا: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى ﴾ (۱۸) کا واضح اصول دے دیا گیا۔ دیت یعنی خون بہا کا نظام بھی عربوں میں رائج تھا، اسلام نے اس نظام کو قائم رکھا البتہ قتل خطاء کی صورت میں دیت کی ذمہ داری عاقلہ پر ڈالی۔مضبوط قبائلی نظام کے تحت قاتل کے قبیلہ کے مرد، عصبات اس دیت کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے۔اس کو وہ تین سال کی مدت میں ادا کر سکتے تھے۔اگر مقتول کے وارث راضی ہوں تو اسلام نے قتل عمد کی صورت میں بھی دیت مقرر کر دی لیکن اس صورت میں تنہا قاتل ہی کو یہ دیت ادا کرنا ہوگی۔

رسول اکرم ﷺ نے ''قسامہ'' کے اصول کو اسی صورت میں باقی رکھا جس طرح وہ جاہلی دور میں تھا، قسامہ سے مراد قسمیں ہیں۔اگر کسی آبادی یا محلّہ میں مقتول کی لاش پائی جاتی اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو تو لاش کا اس آبادی میں پایا جانا اس شک وشبہ کا متقاضی ہے کہ قاتل اسی آبادی یا محلّہ کا کوئی شخص ہوگا۔اس لیے مقتول کے ورثاء کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس محلّہ کے پچاس آدمیوں سے اس بات کی پچاس قسمیں لیں کہ نہ ہم نے اسے قتل کیا اور نہ ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے (۱۹)۔اگر وہ قسم کھالیں تو ان کے ذمہ دیت واجب نہ ہوگی اور اگر وہ قسم کھانے سے انکار کریں تو ان کو اس وقت تک قید میں رکھا

جائے گا جب تک وہ قسم نہ کھائیں یا اقرار نہ کریں یا دیت ادا نہ کریں (۲۰)۔

اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ مدعی اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت پیش کرتا تھا اگر ثبوت پیش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا تو وہ مدعی علیہ سے قسم لیتا تھا۔ اسلام نے بھی اس اصول کو قائم رکھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''البینة علی المدعی ، والیمین علی من انکر ''(۲۱) (مدعی کے ذمہ ثبوت ہے اور مدعا علیہ کے ذمہ قسم ہے)۔

علاوہ ازیں غلامی کا تصور، بندہ و آقا کی تمیز، نسلی و نسبی تفاخر وغیرہ یہ تصورات عرب معاشرہ میں بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ اسلام نے انسان کی اپنی پیدا کردہ تفریقات کو ختم کر کے انھیں وحدت نسل انسانی کا درس دیا اور یہ پیغام الٰہی سنایا: ﴿ یَآ أَیُّھَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُم مِّن ذَکَرٍ وَأُنثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِندَ اللّٰہِ أَتْقَاکُمْ ﴾ (۲۲) (اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، پھر تمھیں قبائل اور گروہوں میں تقسیم کیا تاکہ تم تعارف حاصل کر سکو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک عزت و احترام کا مالک وہی ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے)۔

آپ ﷺ نے عرب رسم و رواج کو جہاں ختم کرنا ضروری تھا وہاں انھیں ختم کیا اور جہاں ان میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت تھی وہاں ترمیم و اضافہ کر دیا، محاسن کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ان اصولوں و قانونی ترمیمات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسلام کا معاشرتی ڈھانچا تشکیل دیا جو تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ مثالی اور فلاحی معاشرہ قرار پایا۔

عہد نبوی ﷺ کے مسلم معاشرہ کی چند امتیازی خصوصیات:

۱: مساوات:

اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں بحیثیت انسان سب کے سب برابر ہیں۔ وحدت انسانیت کا تصور وحدت خداوندی کے تصور سے خود بخود لازم آتا ہے۔ خدا کی ہدایت قدرتی طور پر ہمیں انسانیت کی وحدت کی طرف لے جاتی ہے، خالص توحید کا تصور اس وقت تک بے معنی ہے جب تک یہ سارے انسانوں کی مساوات کو احاطہ نہ کرے۔ عملاً توحید کے جوہر میں مساوات، اخوت اور آزادی داخل ہیں، قانون کے نفاذ میں کسی امتیاز

کوملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنی شخصی وانفرادی ترقی کے لیے ہر شخص کو برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ قابلیت معیار ہے، رنگ ونسل کے امتیازات معیار نہیں۔ اسلام میں رہبانیت یا پاپائیت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، خدا کی نظر میں محبوب ترین انسان وہ ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے، قرآن مجید واضح لفظوں میں کہتا ہے: ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ (۲۳) (خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) دوسری جگہ ارشاد باری ہے: ﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾ (۲۴) (ہر ایک کے لیے درجے ہیں جو انھوں نے عمل کیے، تاکہ خدا ان کو ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا)۔ دنیا میں نیک بن کر زندگی گزارنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ اسلام کی اسی مساوات کا تصور تھا جس سے ان غلاموں نے جن کے ساتھ بے جان مشینوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، ایسی ترقی کی کہ ریاست کے حاکم تک بن گئے۔ عورتوں کی حیثیت قابل خرید وفروخت اشیاء کی سی تھی اوران کو مال منقولہ سمجھا جاتا تھا انھیں ایک محترم مقام حاصل ہوگیا۔ ماں ہونے کے لحاظ سے اس کی خدمت میں جنت کا حصول ممکن بنایا۔

۲: آزادی:

ایک مسلمان کو اس بارے میں پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ سوائے خدا کے کسی کی اطاعت نہ کرے۔ قانون الٰہی اور نظام الٰہی کے سامنے جھک جانا ایک فرد کو ہر ایک کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ آزادی کا مقصد شتر بے مہار ہونا نہیں ہے اسلام میں ہر فرد کو اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی اس حد تک آزادی ہے کہ وہ شریعت کی مقرر کردہ حدود میں رہے۔ اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے خدا کا حکم اس کے ضمیر کے لیے معاشرہ سے بلند تر نگران کی حیثیت رکھتا ہے اپنے تمام اعمال کا وہ خود ذمہ دار ہے قرآن مجید صاف صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى ﴾(۲۵)۔

۳: اخوت:

بھائی چارہ اسلام کا جوہر ہے قرآن مجید میں ہے: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ (۲۶) (مسلمان بھائی بھائی ہیں)۔

مسلمان ایک ہی برادری کے ارکان ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کے اعتبار سے ان میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا، وہ عقیدہ کی بنیاد پر رشتہ اخوت میں پرو دیے گئے ہیں۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''إن المؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً'' (۲۷) (ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے کہ جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کیا اور کفار کے تمام معاشروں کے برعکس اسے ایک الگ امت قرار دیا۔اس اسلامی معاشرہ میں غیر مسلم اقلیت کو مکمل حقوق دینے کے باوجود ایک مسلمان کی شہریت دوسرے غیر مسلم رشتہ داروں سے الگ سمجھی گئی۔یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے باپ اور بیٹوں کے خلاف جنگ کی اور آنحضرت ﷺ نے اپنے وطن مکہ پر حملہ کیا۔ اپنے عزیز و رشتہ داروں کے خلاف جہاد کیا۔ کیونکہ وہ روحانی رشتہ میں الگ تھے۔

اسلامی اخوت اس وقت پھلی پھولی جب آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار کا آپس میں بھائی چارہ قائم کر دیا اور وہ بھائیوں کی طرح آپس میں مل کر زندگی گزارنے لگے۔اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر عالمگیر ہے۔اور اسلام ایک عالمگیر اسلامی اخوت قائم کرنا چاہتا ہے۔

۴: عدل:

یہ اجتماعی عدل ہی تھا، جس کے لیے آنحضرت ﷺ انتہائی فکرمند تھے اس لیے ابتدائی اور مکی سورتوں میں عدل کا کثرت سے ذکر ہے۔

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتیں ملاحظہ ہوں:

۱: ﴿ قُلْ أَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ﴾ (۲۸) (کہو کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے)۔

۲: ﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (۲۹) (اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو)۔

۳: ﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ (۳۰) (بے شک ہم نے اپنے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ

کتاب اور میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ انصاف کو قائم کریں)۔

۴: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ﴾ (۳۱) (بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے)۔

۵: ﴿ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا ﴾ (۳۲) (جب تم کچھ کہو تو انصاف سے کام لو)۔

عدل، برابر اور غیر جانب داری کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ کسی شخص کی عزت و احترام کا اس میں لحاظ نہ رکھا جائے۔ عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کی حفاظت کی جائے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جرائم کو روکا جائے۔ مظلومین کو حقوق دلائے جائیں اور مفسدین کو سزا دی جائے۔ اسلام خدا کی حکومت زمین پر قائم کرنا چاہتا ہے اور انسان پر انسان کے ظلم کو روکتا ہے اور انسانوں کے ساتھ انسانیت دشمنی کو ختم کرتا ہے، فلاح عامہ کے لیے انصاف انتہائی ضروری ہے۔

۵: رواداری:

اسلامی حکومت میں اسلام ہر مذہب و فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کے ضمیر اور عبادت کی آزادی کا ضامن ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت: ﴿ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ (۳۳) (دین میں کوئی جبر نہیں) یہ آیت اس رواداری کا اصول بیان کر رہی ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت تمام مذاہب اسلام کے ساتھ مکمل آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ اسلامی نظام فکر دوسرے مذاہب کو نہ صرف مکمل آزادی دیتا ہے بلکہ اجتماعی و سیاسی حدود میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اسلام انسانیت کو رواداری کی بنیاد پر متحد کرنے کے لیے قوی ترین عامل ہے۔ اسلام خلاف عقل عداوتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام امن کی ایک دعوت ہے۔ اسلام غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداری کے درجہ سے آگے بڑھ کر ''ذمہ داری'' کا فریضہ عائد کرتا ہے۔

معاشرتی مقاصد کی تکمیل کے ادارے:

رسول اللہ ﷺ کے دور میں اسلام کے معاشرتی مقاصد کے حصول کے لیے درج ذیل ادارے تھے:

۱: عبادات ۲: اسلامی ریاست (نظام سیاست)

۳: نظام معیشت ۴: قانون شریعت

ا۔عبادات:

اسلامی معاشرہ کی امتیازی خصوصیت عبادات ہیں۔کلمۂ شہادت کے بعد مندرجہ ذیل عبادات بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱: نماز۔ ۲: رمضان کے روزے۔

۳: زکوٰۃ۔ ۴: حج بیت اللہ۔

اُمت اسلامیہ کے ڈھانچے میں عبادات کی حیثیت ایک بنیادی پتھر کی سی ہے اس لیے ان کو بجاطور پر اسلام کے پانچ ستونوں میں سے شمار کیا جاتا ہے۔تزکیہ نفس اور روحانی فوائد کے علاوہ عبادات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک قوی عامل ہیں،اور معاشرہ میں ان سے وحدت،استحکام اور قوت پیدا ہوتی ہے،نمازوں سے اخلاقی چال چلن بہتر بنانے،مشکلات پر قابو پانے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے میں مدد ملتی ہے۔روزہ سے انسان اعلیٰ درجہ کی تہذیب نفس حاصل کرتا ہے اور خود پر قابو پانا سیکھتا ہے۔زکوٰۃ ایک لازمی اجتماعی بھلائی کی اسکیم کا کام کرتی ہے اور چند ہاتھوں میں دولت جمع ہونے سے روکتی ہے۔حج بیت اللہ سے خالص اسلامیت اور عالمگیر اسلامی برادری کے قیام میں مدد ملتی ہے۔عبادات تقویٰ کا سنگ بنیاد ہیں جو اسلام کی کسوٹی ہے۔

رضائے الٰہی کا حامل اوصاف حمیدہ سے مزین معاشرہ فرد کے اخلاق و عادات کی تربیت اور اجتماعی تنظیم کا مرکز ہے۔قرآن مجید افراد خاندان کو مسلسل ان کے فرائض یاد دلاتا ہے۔عائلی زندگی میں محبت،ہم آہنگی اور انصاف جیسی صفات ناگزیر ہیں۔خاندان کے ساتھ رحم کا سلوک،عورتوں کے ساتھ مہربانی وشفقت اور یتیموں،حاجت مندوں،ذمیوں اور غلاموں کے ساتھ انسانی برتاؤ کرنا اسلامی معاشرہ کی خصوصیات ہیں۔جنسی روابط شریعت کی حدود میں رکھے جائیں۔مرد کے ذمہ خاندان کے لیے کمانا اور روزی کا انتظام کرنا،جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔اس لیے اسلام نے مرد کو عورت پر فوقیت دی ہے۔قانون میراث اور شہادت کے بعض مواقع میں ایک مرد

کو دو عورتوں کے برابر سمجھا گیا ہے۔لیکن اس کمی کو دوسرے ذرائع سے پورا کیا گیا۔مثلاً عورت کی کفالت مرد کے کندھوں پر ڈال دی گئی، بیٹی کی حیثیت سے والد پر، بیوی کی حیثیت سے خاوند پر، ماں کی حیثیت سے بیٹے پر اور بہن کی حیثیت سے بھائی پر یا کسی اور ذمہ دار رشتہ دار پر اور لاوارث ہونے کی صورت میں معاشرہ اور ریاست پر اس کی کفالت کا ذمہ ہے۔ان چار حیثیتوں کے علاوہ اسلام میں عورت کی کوئی اور حیثیت نہیں ہے۔علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات میں ایک خاتون کو گھریلو معاملات اور دیگر معاملات میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔اسلام کے عادلانہ نظام میں اگر کہیں فطری اصول کے تحت عورت و مرد کے معاملات میں فرق کیا گیا ہے تو ان کے علاوہ باقی معاملات میں مرد عورت کے حقوق و فرائض میں برابری عطا کی گئی ہے۔عبادات سے یہ تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں۔

۲۔اسلامی ریاست (نظام سیاست):

اسلامی ریاست میں سارا اقتدار خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کے تابع ہوتا ہے۔اسلام دنیا اور آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔مظہر الدین صدیقی لکھتے ہیں:

''اسلام میں ریاست اور مذہبی امورِ عبادات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں امتیاز اس وقت سے اُٹھ گیا جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور آئندہ آنے والے نظام کا تعین ہوا'' (۳۴)۔

اسلامی ریاست کا نظام اہلیت ،شورائیت،امانت و دیانت،قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف جیسے فطری اصولوں کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔اسلامی ریاست میں جمہوریت کی لامحدود آزادی، عوام کی جاہلانہ حکمرانی اور حکمرانوں کی مفاد پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اسی طرح اسلامی ریاست میں اشتراکی جبر اور پاپائیت کی ناانصافیوں کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

قانونِ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اسلام کو سیاسی اقتدار کی ضرورت ہے۔بلکہ یہ نظام فطری،اخلاقی،قانونی اور عادلانہ حیثیتوں سے ایک بے مثال نظام ہے۔جس کی خصوصیات دنیا کے کسی وضعی نظام کے ذریعے حاصل کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔اسلامی ریاست کے شہریوں کی محبت والفت اور تعلقات مثالی ہوتے ہیں۔ان کے تمام حقوق کا تحفظ اسلامی ریاست کرتی ہے۔

۳۔نظام معیشت:

اقتصادی امور کو باضابطہ بنانے کے لیے اسلام نے واضح افادی اور مساویانہ اصول ومعیار مقرر کیے ہیں۔اسلام انفرادی ملکیت، کسب معاش کے لیے بھرپور کوشش، زکوٰۃ، صدقات اور اجرت کی فوری ادائیگی کے حق میں ہے جبکہ دولت کے ارتکاز، سود، مال کو گراں فروشی کی نیت سے روکنے اور زمین کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ہے۔زکوٰۃ ایک اجتماعی فلاحی نظام ہے۔غریب اور امیر آپس میں بھائی بھائی ہیں جو ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔

۴۔شریعت:

اسلام کے لفظی معنی خدا کے حکم کے سامنے جھک جانا ہے۔یہاں خدا کے حکم سے مراد شریعت ہے۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:''مغرب میں قانون اقتدار اعلیٰ کی منشاء کا نام ہے لیکن اسلامی ملکوں میں قانون خدا کی مرضی کا نام ہے''(۳۵)۔

شریعت احکام وفرائض کے مجموعہ یا مسلمانوں کے لیے ایک مثالی لائحہ عمل کو کہتے ہیں جس میں ان کی زندگی کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی۔ڈاکٹر فضل الرحمٰن لکھتے ہیں:''شریعت امت مسلمہ کا دستور ہے''(۳۶)۔

متاخر دور کے بعض علماء نے اِجتہاد کے دروازے کو باوجود مسلسل ترقی وتمدن کے بند کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی قانون کے متحرک مزاج کو نہایت فاضلانہ انداز میں اپنی کتاب''فکر اسلامی کی تشکیل نو''میں پیش کیا ہے۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلامی قانون کے غیر متبدل پہلو کو اس طرح بیان کرتے ہیں:''تمام اسلامی ملکوں میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ شریعت کے تبدیلی پذیر حصہ میں بہت تغیر کی ضرورت ہے اور اس کا وہ حصہ جس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی، تعبیر نو چاہتا ہے''(۳۷)۔

اسلامی قانون بنیادی طور پر بلاشبہ مکمل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔جیسا ماضی میں تھا وہی آج ہے اور آئندہ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔لیکن اس کی تعبیر انسان اپنی نیتوں اپنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے پیش نظر کرتے رہیں گے۔اسلام ایک ایسا راستہ ہے جو افراد میں اخلاقی اقدار کے لیے ردعمل پیدا کرتا ہے۔یہ ردعمل حالات کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے اور یہ دائمی رہنے والا

قانون تبدیل ہونے والے حالات میں مریض انسانیت کی صحت کے لیے کام کرتا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ جو صدیوں سے بند ہے، اس کو کھولنے کے لیے اخلاقی کوشش کی ضرورت ہے جو وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں بہبود عامہ کا تصور:

بہبود عامہ اسلامی معاشرتی تنظیم کی بنیاد اور محور ہے۔ اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حسین امتزاج ہے۔ اسلام میں نماز سب سے بڑی عبادت ہے لیکن قرآن حکیم نے ایسے نمازیوں کو ہلاکت کی وعید سنائی ہے جو نماز کو محض قیام، رکوع، سجود تک محدود رکھتے ہیں اور اذہان وقلوب میں للہیت وخشیت پیدا کر کے دکھی انسانیت کو اس کے مصائب وآلام سے نجات نہیں دلاتے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ. الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ. الَّذِينَ هُمْ يُرَآؤُونَ. وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴾ (۳۸) (ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے، جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور اشیائے ضرورت کو روکتے ہیں)۔

معاشرتی بہبود کا مقصد معاشرے کے محتاجوں، بیکسوں، معذوروں، بیماروں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی فلاح و بہبود ہے، یہ مقصد بہتر طور پر اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی ضرورت اور معذوری دور کر کے معاشرے میں تمول واحتیاج اور دولت وضرورت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ جو لوگ ملک سے غربت وافلاس اور ضرورت واحتیاج دور کرنے کے لیے اپنا مال ودولت خرچ کرتے ہیں، ان کو اللہ اس بات کی ضمانت بھی دیتے ہیں کہ اس کی ادائیگی کے وقت اسے دوگنا کردیا جائے گا۔ مزید یہ کہ اللہ کو قرض دینے والوں کو اجر عظیم عطا ہوگا: ﴿ إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴾ (۳۹) (جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے ہیں، ان کو بڑھا چڑھا کر ادا کیا جائے گا اور ان کے لیے اجر کریم ہے)۔

مخلص اور نیک دل انسان اپنا مال ودولت بے غرض اور بے لوث خرچ کرتے ہیں۔ اس میں وہ اتنے نیک نیت ہوتے ہیں کہ وہ اس خرچ کے عوض محتاجوں اور بیکسوں سے کسی قسم کے بدلہ اور جزاء

کے خواست گار نہیں ہوتے بلکہ وہ کہتے ہیں: ﴿ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوْرًا ﴾ (۴۰) (ہم جو تمھیں کھلاتے ہیں خالص اللہ کے لیے ایسا کرتے ہیں، ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری)۔

مگر جو مال دار اور دولت مند اپنے مال و دولت کو معاشرتی بہبود پر خرچ نہیں کرتے اور اپنا مال عیش و عشرت پر لٹاتے ہیں اور بینکوں اور خزانوں میں جمع کر کے ملکی دولت کو منجمد کرتے ہیں وہ اللہ کے غیظ و غضب کو دعوت دیتے ہیں اور دولت و کنز جمع کرنے کے عوض جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ خریدتے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ. يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (۴۱) (جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں اس دن کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ جس دن وہ دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو)۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا خیال بالخصوص رکھا گیا، مصیبت زدہ، مفلوک الحال اور مفلس محتاج لوگوں کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا آپ کی بعثت کے اعلیٰ مقاصد میں شامل تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''الساعی علی الأرملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰه او کالذی یصوم النهار ویقوم اللیل (الصائم النهار)) (۴۲) (بیواؤں اور مسکینوں کی مصیبتوں کو دور کرنے میں کوشاں شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہد کی طرح ہے یا پھر ایسے شخص کی مانند جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور قیام اللیل کرنے والا ہے)۔

دوسری روایت میں ہے: ''میں اور یتیم و بے کس کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہوں گے، جس طرح انگشت شہادت اور درمیان کی انگلی ایک دوسرے کے ساتھ ہیں'' (۴۳)۔

بے کسوں، مفلسوں اور محتاجوں پر رحم نہ کرنے والے رحمۃ للعالمین ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوں گے۔ رحمت دو عالم ﷺ نے ایسے انسانوں کو اپنی امت سے خارج فرمادیا ہے جو بچوں پر رحم نہیں کرتے اور بڑوں کی عزت نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا" (۴۴) (وہ لوگ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتے اور بڑوں کی عزت نہیں کرتے)۔

آنحضرت ﷺ قبل از نبوت مکہ کے ظالمانہ ماحول میں بھی سخت اور نامساعد حالات کے باوجود چالیس برس تک مسلسل غرباء وفقراء اور محروم ومعدوم کی خدمت میں مصروف رہے اور اپنی بساط کے مطابق ان کی امداد فرماتے رہے۔ بعد از نبوت آپ ﷺ نے اس معاملے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کے لائحہ عمل اور سیرت وکردار کی جو مستندترین روایت ہم تک پہنچی ہے اگر مسلمان اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنالیں تو نہ صرف اسلامی دنیا جنت نظیر بن سکتی ہے بلکہ پوری دنیا آنحضرت ﷺ کو صحیح معنوں میں رحمت دو عالم ماننے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ مؤلف "اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل" رقم طراز ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی قبل از نبوت معاشرتی بہبود کی حکمت عملی کا تذکرہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس روایت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ غارِ حراء میں تشریف فرما تھے، جبرائیل امینؑ آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو وحی ونبوت سے سرفراز فرمایا۔ اس واقعہ سے متاثر آپ ﷺ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنی حیرت وپریشانی کا ذکر فرمایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بڑی عقل مند اور بالغ نظر خاتون تھیں۔ تجارت ودیگر دنیوی امور میں تجربہ ومہارت کے سبب ان کو معاشرت ومعیشت، تہذیب وتمدن اور مذہب وسیاست کے مطالعے کا کافی موقع ملا تھا۔ آنحضرت ﷺ سے حیرت وپریشانی کا ذکر سن کر آپ نے آنحضرت ﷺ کی سابقہ زندگی کے حالات پر جو تبصرہ کیا وہ تاریخ عالم میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے، یہی تبصرہ حضور ﷺ کی معاشرتی بہبود کی حکمت عملی کا تذکرہ ہے (۴۵)۔ بخاری شریف کی کتاب الوحی میں اسے ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے: "فقال لخدیجة

واخبرها الخبر لقد خشيت علی نفسی فقالت خدیجة کلا واللّٰه ما یخزیك اللّٰه ابدا. انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق" (۴۶) (آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو واقعہ کی خبر سُنائی اور کہا کہ مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ تو حضرت خدیجہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا، ہرگز نہیں، خدا کی قسم! اللہ آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا کیونکہ

- آپ ﷺ رشتہ داروں کے تعلقات جوڑتے ہیں۔
- ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔
- جو چیز دوسروں کے پاس نہیں آپ ﷺ انھیں کما کر دیتے ہیں۔
- مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔
- حادثات کے شکار لوگوں کے حقوق دلانے میں مدد کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی رُو سے صرف اسلامی ریاست میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے معاشروں کی تشکیل کی جائے تو پوری دنیا امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ الرحمٰن:۳۳۔

۲۔ النساء:۱۹۔

۳۔ بنی اسرائیل:۱۷۔

۴۔ حم سجدہ:۴۲۔

۵۔ المائدہ:۹۔

۶۔ ابن سعد،محمد،الطبقات الکبریٰ (دارصادر بیروت،۱۹۸۵ء)۳/۱۱۶۔۱۱۷

۷۔ ابن عبدالبر،ابوعمر یوسف،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (مع الاصابہ)(داراحیاء التراث العربی،بیروت ۱۳۲۸ھ)۲/۴۶۰۔

۸۔ الحجرات:۷-۸۔

۹۔ ایضاً:۱۰۔

۱۰۔ آل عمران:۱۰۳۔

۱۱۔ بنی اسرائیل:۳۹۔

۱۲۔ ایضاً:۹۔

۱۳۔ النساء:۳۹۔

۱۴۔ ناصر نصیر احمد،ڈاکٹر،پیغمبر اعظم وآخر(فیروزسنز،لاہور)ص۳۹۲۔

۱۵۔ البخاری،محمد بن اسماعیل،الجامع الصحیح (دارالسلام،الریاض ۱۹۹۹ء)ص ۱،حدیث نمبر۱۔

۱۶۔ البقرہ:۲۲۹۔

۱۷۔ جصاص،ابوبکر احمد،احکام القرآن (احیاء القرآن التراث العربی،بیروت)۱/۱۹۸-۱۹۹۔

۱۸۔ بنی اسرائیل:۱۵۔

۱۹۔ مسلم بن حجاج،القشیری،الجامع الصحیح (دارالسلام،الریاض)ص ۷۳۶-۷۳۷،حدیث نمبر۴۳۴۲؛
ابوداؤد،سلیمان بن اشعث،السنن (دارالسلام،الریاض)ص ۲۳۹،حدیث نمبر۴۵۲۰-۴۵۲۱۔

۲۰۔ شوکانی،محمد بن علی،نیل الاوطار (مصطفی الباز،مکہ المکرمہ)۷/۳۷-۳۸۔

۲۱۔ ترمذی،ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ،السنن (دارالسلام الریاض،۱۹۹۹ء)ص ۳۲۴،حدیث نمبر۱۳۴۱۔

۲۲۔ الحجرات:۱۳۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ الاحقاف:۱۹۔

۲۵۔ بنی اسرائیل:۱۵۔

۲۶۔ الحجرات:۱۰۔

۲۷۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص۸۳،حدیث نمبر۴۸۱۔

۲۸۔ الاعراف:۲۹۔

۲۹۔ الانعام:۱۵۲۔

۳۰۔ الحدید:۲۵۔

۳۱۔ النحل:۹۰۔

۳۲۔ الانعام:۱۵۲۔

۳۳۔ البقرہ:۲۵۶۔

۳۴۔ صدیقی،مظہرالدین،اسلام اینڈ تھیوکریسی(ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور۱۹۷۸ء)،ص۳۱۔

۳۵۔ قریشی،اشتیاق حسین،ڈاکٹر،سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت(شعبہ تصنیف وتالیف کراچی یونیورسٹی)ص۴۲-۴۳۔

۳۶۔ ہزاروی،فضل الرحمٰن،فضائل سیدالمرسلینؐ(تحریکِ اصلاحِ امت،گوجرانوالہ)،ص۴۲۴۔

۳۷۔ سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت،ص۵۰۔

۳۸۔ الماعون:۴-۷۔

۳۹۔ الحدید:۱۸۔

۴۰۔ الدھر:۹۔

۴۱۔ التوبہ:۳۴-۳۵۔

۴۲۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص۹۵۶،حدیث نمبر۵۳۵۳۔

۴۳۔ ایضاً،ص۱۰۵۰،حدیث نمبر۶۰۰۵۔

۴۴۔ الترمذی،محمد بن عیسیٰ،السنن،(دارالسلام،الریاض،۱۹۹۹ء)ص۴۴۸،حدیث نمبر۱۹۲۰۔

۴۵۔ ساجدالرحمٰن،صاحبزادہ،اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل(ادارہ تحقیقات اسلامی،اسلام آباد)ص۵۵۔

۴۶۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص۱،حدیث نمبر۳۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خواتین کا سماجی اور ثقافتی مقام و مرتبہ

مرد وزن کے اس جہان میں عورت دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی پر مشتمل ہے۔ اسلام نے عورت کو بہت زیادہ حقوق دیے ہیں۔ اسلام نے ماں کی حیثیت سے عورت کے قدموں تلے جنت قرار دی ہے۔ بیوی کو سکون کا باعث قرار دیا ہے۔ اولاد ہو تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ علم وعمل کے معاملہ میں عورت کو مرد سے پیچھے نہیں رکھا گیا ہے۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کا شمار روایتِ حدیث کے لحاظ سے مکثرین صحابہ ؓ میں ہوتا ہے۔ صحابہ کرام ؓ بہت سے مسائل، حضرت عائشہؓ سے پوچھتے تھے بلکہ بعض مسائل میں حضرت عائشہؓ نے صحابہ ؓ پر استدراک کیا۔ چنانچہ امام زرکشی نے ایسے مسائل پر ایک رسالہ بنام "الاصابہ فیما استدرکته عائشة على الصحابة" مرتب کیا ہے۔ مولانا سید سلمان ندویؒ نے اپنی تصنیف "سیرت عائشہؓ" کے آخر میں بھی یہ رسالہ شامل کر کے شائع کیا ہے۔

اہل مغرب اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے عورتوں کے حقوق سلب کر کے ان پر بڑی زیادتی کی ہے۔ حالانکہ عورت کے حقوق، آزادی اور مساوات کا راگ الاپنے والوں کے ہاں عورت کا وہ تصور نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ بائبل میں ہے کہ "حوا نے فریب کھایا اور آدم کو پھسلایا" (۱)، ان کے ہاں عورت کا درجہ بس یہ ہے کہ وہ حضرت مریمؑ کی طرح راہبہ بن جائے ورنہ وہ گناہ کا سبب وموجب ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک مدت تک یہ بحث ہوتی رہی کہ عورت کے اندر روح بھی ہے یا نہیں، بالآخر فیصلہ ہوا کہ اس کے اندر روح تو ہے مگر بڑی گھٹیا قسم کی، اب بھی مغربی معاشرے میں عورت کو بازار کی جنس سمجھا جاتا ہے اور اسلام کی طرح خاوند اور بیوی کے رشتہ محبت والفت کا ذریعہ نہیں خیال کیا جاتا، اسی لیے مغربی معاشرے کی عورتیں مسلمان عورتوں پر رشک کرتی ہیں، پی ایچ ڈی کے سلسلے میں میرے قیام برطانیہ کے دوران ایک عیسائی طالب علم اکثر میرے پاس آتا جاتا تھا، اس کی بہن لندن سے گلاسگو صرف اس سے ملنے آئی تو اس نے بتایا کہ دونوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور الگ الگ ادائیگی کی، میں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ چار پانچ سو میل دور سے آپ کی بہن آپ سے ملنے آئی اور آپ اسے کھانا تک نہ کھلا سکے لیکن ان کے نزدیک یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اپنے معاشرتی پس منظر کے باعث میرے لیے یہ بات بہت تعجب کا باعث تھی۔

قبل از اسلام عربوں میں عورت کی حالت اور بھی بدتر تھی۔ لڑکی کی پیدائش موجب ذلت سمجھی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ. يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ (۲) (جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے)۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا جس کا ذکر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ. بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ﴾ (۳) (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی؟)۔ اسلام نے عورت کو اس قعر مذلت سے نکال کر اوج ثریا تک پہنچایا۔

اسلام نے عورت کو جو حقوق بخشے ہیں وہ ان سے چھینے نہیں جا سکتے، اس لیے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ عورت کے حقوق غصب کرے، یہاں ہم ان کی کسی قدر تفصیل بیان کرتے ہیں:

حیا و شرم مسلمان عورت کی زینت ہے جو اس کو سلب کر کے اس کے جمال و زینت کو ختم کرنا چاہے تو یہ ظلم ہوگا، اولاد (بیٹے، بیٹی) کی پیدائش عورت کے حقوق میں ہے جو اس کو روکنے کی کوشش کرے وہ ظالم ہے، عصمت و عفت بھی اس کا حق ہے جس کو کوئی مرد سلب نہیں کر سکتا، بہ حیثیت ماں بیٹے پر، بہ حیثیت بہن بھائی پر، بہ حیثیت بیٹی باپ پر اور بہ حیثیت بیوی خاوند پر مال خرچ کرنا عورت کا حق ہے، یہ ان کو ادا کرنا ہوگا، خاوند سے اس کی حیثیت کے مطابق زیب و زینت کا سامان لینا عورت کا حق ہے، پھر اس سامان کو خاوند کے لیے پہننا عورت کا فرض ہے، دینی اور دنیاوی تعلیم کا حصول عورت کا حق ہے، تا کہ وہ دنیا و آخرت میں فلاح و نجات حاصل کر سکے۔

عورت کا علاج معالجہ کے لیے اپنے خاوند یا محرم کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا اس کا حق ہے اور اس سے روکنا ظلم اور زیادتی ہے۔ اگر عورت بیوہ ہو اور اس کے پاس یتیموں کی کفالت اور ذاتی اخراجات کے لیے مال نہ ہو تو حصول معاش کے لیے کام کرنا اس کا حق ہے۔ اسلام میں اس کو روکا نہیں جا سکتا ہاں اگر اس حق کو حکومت ادا کرے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح عورت کا اپنے خاوند کی اجازت سے

اپنے عزیز واقارب سے ملنا اس کا حق ہے اور نماز کے لیے عورت کا مسجد میں جانا اس کا حق ہے۔

اس طرح اگر مسلمان عورت کو اس کا خاوند تنگ کرے تو اس کو حق حاصل ہے کہ وہ خلع کا مطالبہ کرے۔ عورت کا حق ہے کہ اس کے ولی (والدین، بھائی) اس کے نکاح کے لیے اس کی رضامندی لیں۔ عورت کا صالح اعمال کر کے اور برے اعمال کو چھوڑ کر اپنے رب کا قرب حاصل کرنا اس کے حقوق میں سے ہے اور جو اس سے روکے وہ ظالم ہے، اگر عورت مال کی مالک ہو تو اس میں سے فضول خرچی اور معصیت کے بغیر خرچ کرنا اس کا حق ہے۔

دراصل اسلام نے عورت کو اس قدر حقوق دیے ہیں جن کا تصور بھی دوسرے مذاہب میں نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد بھی جو لوگ اسے عورتوں کے حقوق کا غاصب قرار دیتے ہیں تو یہ ان کی شرارت اور دانستہ سازش ہے۔ جس سے ان کے متعصّبانہ ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں بطور مثال نیک عورتوں کی تعریف یوں کی گئی ہے:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا امْرَأَةَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ. وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ﴾ (۴) (اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جب کہ اس نے دعا کی: ''اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے'' اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی)۔

اسلام میں عورت کو پیدائشی گناہ گار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ عمل صالح میں مرد کے ساتھ عورت کو بھی شامل کیا گیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَن يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلٰٓـئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلاَ يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ (۵) (جو کوئی مرد ہو یا عورت نیک کام کریں گے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا) اور فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ

ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾(٦) (جو کوئی مرد یا عورت نیک عمل کرے اور وہ مومن ہو۔تو ہم ان کو پاکیزہ زندگی دیں گے اور ہم ان کے اعمال کا بھی اچھا بدلہ دیں گے)۔

اس طرح پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا اسّی درّے مقرر کی گئی ہے:﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَداً وَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾(٧) (جو کوئی پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی اسّی درے لگاؤ اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو یہی لوگ خود فاسق ہیں)۔

قرآن مجید میں حقوق نسواں کے متعلق ارشاد ہے:﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾(٨) (عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق ہیں،مردوں کو ان پر برتری حاصل ہے)۔

اب ذرا دیکھیے کہ خود اسلام پر عورتوں کے حقوق کی پامالی کی تہمت عائد کرنے والے مغربی ممالک کا کیا حال ہے، ان ممالک میں تو عورتوں کی ذات ہی کو ختم کر دیا گیا، اسے بازار کی جنس سمجھ کر پیش کیا جاتا اور ہر بزم و محفل میں اسے کھڑا کر دیا جاتا ہے، آزادی کے نام پر اس کی عصمت دری کی جاتی ہے، اگر وہ خود عصمت فروشی کرے تو جرم ہے لیکن اگر عورت دوستی Boy Friend کے بھیس میں اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو وہ Love (محبت) کہتے ہیں اور اس سے روکنا اس کی آزادی پر قدغن ہے۔عام طور پر اس بات کی اجازت ہے کہ مرضی سے بالغ لڑکی جس کے پاس چاہے جا سکتی ہے۔جس کے ساتھ چاہے رہ سکتی ہے۔مغربی ممالک میں نسل انسانی کی عفت و عصمت اور نسل کی پاکیزگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔شرم و حیا کا نام و نشان تک نہیں، خاوند اور بیوی میں باہمی اعتماد مفقود ہے، دونوں کے بینک اکاؤنٹ الگ الگ ہوتے ہیں۔آزادی اور بے راہ روی کی وجہ سے ہر چوتھی شادی طلاق کی زد میں ہے بلکہ شادی کی بجائے Girl Friend پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ بے حیائی پورے مغربی معاشرے میں معیوب نہیں سمجھی جاتی، اولاد ۱۶ سال کے بعد بھاگ جاتی ہے اور والدین سے کبھی ملنے نہیں آتی۔عورتیں مردوں سے زیادہ پریشان ہیں، انھیں قابلِ بھروسا مرد ہی نہیں ملتے جو اس صنف نازک کو زندگی بھر سہارا

دے سکیں بلکہ اس لحاظ سے بعض مغربی خواتین مسلمان عورتوں کی زندگی پر رشک کرتی ہیں۔ طلاق کے واقعات عام ہیں لیکن اپنی اس خفت کو مٹانے کے لیے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں: کہ "مسلمان عورتوں کے حقوق سلب کرتے ہیں، ان پر ظلم کرتے ہیں" وہ عورت کی مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شادی میں مساوات کے نام پر مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ عمل دراصل عورت کی آزادی اور مساوات کا مظہر نہیں بلکہ اس کی عصمت وعفت شرف انسانی اور عزت نفس کے خلاف اور غیرت کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اس کو کوئی مسلمان کیسے پسند کرسکتا ہے۔

اسلام میں اس کی اجازت تو ہے کہ آدمی جس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اسے دیکھ لے لیکن اس کے تنہائی میں کچھ مدّت گزارنے اور عورت کو عریاں اور نیم عریاں حالت میں گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب آیئے دیکھیے اسلام نے عورتوں کو کن باتوں کی اجازت دی ہے:

اسلام میں عورت تعلیم حاصل کرسکتی ہے عورت کے لیے کتابت کی بھی اجازت ہے بعض لوگ اس کی ممانعت کے لیے ایک حدیث پیش کرتے ہیں: "**عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ: لا تسكنوهن الغرف، ولا تعلموهن الكتابة، وعلموهن المغزل، وسورة النور**"(۹) (عورتوں کو بلند عمارتوں میں نہ رکھو، نہ ان کو کتابت سکھاؤ اور ان کو سوئی کا استعمال (دھاگہ) سکھاؤ اور سورۃ النور سکھاؤ) اس میں راوی محمد بن ابراہیم الشامی منکر الحدیث ہے۔ اس پر مولانا شمس الحق ڈیانوی نے مفصل بحث کی ہے(۱۰)۔

اس کے برعکس جن احادیث میں کتابت کی اجازت دی گئی ہے وہ صحیح ہیں۔ حضرت شفاء بنت عبداللہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ میرے پاس آئے، میں حضرت حفصہؓ کے پاس تھی تو آنحضرت ﷺ نے مجھے فرمایا: "**الا تعلمين هذه رقية النملة، كما علمتها الكتابة**" (۱۱) (آپ ان کو چیونٹی کا دم نہیں سکھاتیں جیسے آپ نے ان کو کتابت سکھائی ہے) اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں (۱۲)۔

اس طرح شادی کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "**لا تنكح الايم حتى تستامر ولا تنكح البكر حتى تستاذن قالوا يا رسول الله وكيف اذنها قال ان تسكت**" (۱۳)(بیوہ

کا نکاح اس کے مشورہ کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح اس کے اذن (اجازت) کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہ ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اذن کیا ہے؟ فرمایا: اس کا خاموش رہنا ہی اذن ہے)۔

دوسری روایت میں ہے: ''**عن عبداللہ بن بریدة قال جاء ت امراة الی عائشة رضی اللہ عنھا فقالت ان ابی زوجنی ابن اخیه لیرفع بھا خسیسه وانی کرھت ذلك فقالت عائشة رضی اللہ عنھا اقعدی حتی یاتی رسول اللہ ﷺ فاذکر ذلك له فجاء نبی اللہ ﷺ فذکرت ذلك له فارسل النبی ﷺ الی ابیھا فلما جاء أبوھا جعل أمرھا إلیھا فلما رأت أن الأمر قد جعل إلیھا قالت: انی قداجزت ما صنع والدی انما أردت ان أعلم ھل للنساء من الامر شیء ام لا؟**'' (۱۴)۔

(عبداللہ بن بریدہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی حضرت عائشہؓ کے پاس آئی اور عرض کیا میرے باپ نے اپنے بھتیجے سے میرا نکاح کر دیا تاکہ اس کے پست مقام کو قدرے بلند کرے۔ حضرت عائشہؓ نے اسے کہا کہ میرے پاس بیٹھ جاؤ کہ رسول اللہ ﷺ آئیں اور میں ان سے ذکر کروں۔ جب رسول اللہ ﷺ گھر واپس آئے تو حضرت عائشہؓ نے آپ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے اس کے باپ کو بلالیا اور لڑکی کو اس (نکاح کے برقرار رکھنے یا نہ رکھنے) کے متعلق اختیار دے دیا۔ لڑکی نے جب دیکھا کہ معاملہ اس کے حق میں ہے تو اس نے کہا: میں اپنے باپ کے اقدام کی تائید کرتی ہوں پھر کہا کہ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ (باپ جو جبراً بیٹیوں کا نکاح کر دیتے ہیں) عورتوں کا اس معاملے میں کوئی حق ہے یا نہیں)۔

حضرت انس ؓ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''**حبب الی من الدنیا النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلوٰة**'' (۱۵) (دنیا کی چیزوں میں سے مجھے عورت اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اس طرح حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''**خیرکم خیرکم لاھله وانا خیرکم لاھلی**'' (۱۶) (آپ میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے آپ سے بہتر ہوں)۔

آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات سے محبت کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے حضرت عمرو بن

العاصؓ نے پوچھا آپ ﷺ کولوگوں میں سے کون زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہؓ! پھر پوچھا، مردوں میں سے؟ تو فرمایا: ابوبکرؓ، پھر پوچھا تو فرمایا: عمرؓ اور پھر متعدد لوگوں کے نام لیے (۱۷)۔

آپ ﷺ کی سیرت نے ہم پر واضح کیا کہ عورت اس لیے پیدا نہیں کی گئی کہ اسے دھتکارا جائے اور شاہراہِ حیات سے کانٹے کی طرح ہٹا دیا جائے کیونکہ جس طرح مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی عورتوں کے حقوق ہیں ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۱۸) (عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان کے فرائض ہیں)۔

اس سلسلے میں درج ذیل نکات سے مزید وضاحت ہوتی ہے:

۱: دنیوی رشتوں میں والدین اور اولاد کے بعد اہم رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ ان کے تعلقات کی خوشگواری کا اثر گھر کو رشک جنت بنا دیتا ہے اور اگر بدقسمتی سے میاں اور بیوی کے درمیان نت نئی کشیدگی ہو یا تعلقات خوش گوار نہ ہوں تو وہ گھر جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ زوجین کے تعلقات سے نہ صرف اولاد بلکہ پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ ان کشیدہ تعلقات کی بنا پر بچوں کی مناسب تربیت کا انتظام و انصرام نہیں ہو پاتا اور اس طرح ان کا چمکتا دمکتا روشن مستقبل اندھیروں اور تاریکیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (۱۹) (اس نے تم کو ایک جان (آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے)۔

انسانیت کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی اور ان کی بے رنگ و بے کیف حیات کو تکمیل کے سارے رنگ دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ ہی کی ایک پسلی سے اماں حواؑ کو تخلیق فرمایا: ﴿وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا﴾ (۲۰) (اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس آرام کرتا رہے)۔

۳: قرآن پاک میں مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کی عائلی زندگی اور شادی شدہ ہونے کے بارے میں ارشادات موجود ہیں۔

سورۃ الرعد میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً ﴾(۲۱) (آپ ﷺ سے قبل ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا)۔

۴: خود انسان کامل، سرورِ عالم حضرت محمد ﷺ نے ان ذمہ داریوں کے بارے میں اکثر اوقات ارشادات فرمائے جو احادیث کی کتب میں محفوظ و مرقوم ہیں۔ صحیح احادیث میں سرورِ کائنات کا ارشاد ہے: ''من استطاع الباءة فليتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فانه له وجاء ''(۲۲) (جو آدمی مہر ونفقہ کی استطاعت رکھتا ہو وہ نکاح کرے کیونکہ اس سے نگاہ پاک رہتی ہے اور اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے، جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزے رکھے یہ اس کے لیے شہوت کو کم کرنا ہے)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذا تزوّج العبد فقد استكمل نصف الدين فليتق الله فى النصف الباقى'' (۲۳) (جس نے نکاح کیا اس نے اپنے نصف دین کی تکمیل کر لی، اب اس کو چاہیے کہ باقی آدھے دین کی بابت خدا سے ڈرتا رہے)۔ گویا ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ بقائے نسل کے لیے اس رشتے کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔

۵: قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾(۲۴) (تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو اگر وہ غریب ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے)۔

۶: نکاح کا مقصد صرف دو انسانوں کو یکجا کرنا ہی نہیں بلکہ درحقیقت مناسب رفیق حیات کی تلاش اور جستجو فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے اخلاص و محبت کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴾(۲۵) (اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے

بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت و رحمت پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں)۔

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ثقافتِ انسانی کو پاکیزہ دیکھنا چاہتا ہے، اس کے لیے ایسے آداب سکھائے ہیں جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ثقافت کے حسن کے لیے ناگزیر ہیں۔

بیویوں کے حقوق:

ظہور اسلام کے بعد بھی بعض لوگوں نے عورت کو بے قدری کی نگاہ سے دیکھا اس بے قدری کی ایک شکل یہ تھی کہ عبادت و ریاضت میں اتنے محو ہوتے کہ بیویوں کی کوئی خبر نہیں لیتے تھے۔ بعض صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو شکایت پہنچی کہ کثرت عبادت کی بناء پر وہ اپنی بیویوں کی خبر گیری نہیں کرتے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو سے دریافت کیا: "الم اخبر انك تقوم الليل وتصوم النهار؟ قلت: بلى، قال فلا تفعل، قم ونم وصم وافطر، فانّ لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقاً وان لزورك عليك حقاً وان لزوجك عليك حقاً وانك عسىٰ ان يطول بك عمر" (۲۶) (کیا یہ میری خبر صحیح ہے کہ تم رات بھر عبادت کرتے رہتے ہو اور دن میں روزے رکھتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں کہ یہ صحیح ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کرو، عبادت بھی کر اور سو بھی، روزے بھی رکھ اور بلا روزے بھی رہ کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ تمھاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تم سے ملاقات کے لیے آنے والوں کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ امید ہے کہ تمھاری عمر لمبی ہوگی)۔

چنانچہ اس حق کی تفصیل یہ ہے کہ مرد صاف ستھرا رہے، لباس میں، وضع قطع میں تا کہ اس کو دیکھ کر بیوی کو مسرت ہو۔ جس طرح شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی صاف ستھری رہے چنانچہ مردوں کا یہ بھی فرض بنتا ہے کہ بیوی کو ایسے سامان فراہم کرے جس سے وہ نظافت کا خیال رکھ سکے اور اپنے آپ کو مزین کر سکے۔ مختصراً بیوی کے حقوق اور مرد کے فرائض حسب ذیل ہیں:

۱: حسن سلوک:

عورت کی بیماری یا ناگہاں پریشانی میں اس کی دلجوئی اور دلداری کرے، بیوی کے جذبات کا

پاس کرے، زیادہ دیر پردیس میں نہ رہے۔ اگر مجبوراً رہنا پڑے تو اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھے اور بیوی کو والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت بھی دے۔

آنحضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

(آپؐ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ) لوگو! عورتوں کے بارے میں میری وصیت قبول کرو، وہ تمھاری زیرنگیں ہیں، تم نے ان کو اللہ کے عہد پر اپنی رفاقت میں لیا ہے اور ان کے جسموں کو اللہ ہی کے قانون کے تحت اپنے تصرف میں لیا ہے۔ تمھارا ان پر یہ حق ہے کہ گھر میں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمھیں ناگوار ہے۔ اگر ایسا کریں تو تم ان کو ہلکی ہلکی مار مار سکتے ہو اور تم پر ان کو کھلانا اور پلانا فرض ہے" (۲۷)۔

"الا وان لكم على نسائكم حقا ،ولنسائكم عليكم حقا،فأما حقكم على نسائكم فلا يوطئن فرشكم من تكرهون،ولا يؤذن في بيوتكم لمن تكرهون.الاوان حقهن عليكم ان تحسنو اليهن في كسوتهن وطعامهن "(۲۸) (بے شک تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمھارا حق تمھاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ پاک دامن رہیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ غیر محرم کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں اور عورتوں کا تم پر حق یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں کمی نہ کرو)۔

"عن حكيم بن معاويه عن ابيه ان رجلا سئل النبي ﷺ :ما حق المراة على الزوج؟قال:ان يطعمها اذا طعم وان يكسوها اذا اكتسى ولا يضرب الوجه ولا يقبح ولا يهجر الا في البيت "(۲۹) (حضرت حکیم بن معاویہ ؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ایک صحابی ؓ نے آکر دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے؟ فرمایا، "جیسے خود کھائے اور پہنے ویسا ہی اسے کھلائے اور پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ سزا کے طور پر اس کو گھر سے نکالے)۔ خود آنحضور ﷺ کی گھریلو زندگی ایک بہترین نمونہ تھی۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنے اہلِ خانہ سے محبت و پیار کا سلوک کرتے تھے۔

۲: حق مہر:

یہ وہ رقم ہے جو حق زوجیت کے عوض عورت کو ادا کی جاتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَآتُوا

النَّسَآءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْساً فَكُلُوهُ هَنِيئاً مَّرِيئًا ﴾(۳۰) (عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو، ہاں اگر وہ خوشی سے اس میں کچھ تمھیں معاف کر دیں تو اسے مزے سے کھا سکتے ہو)۔

﴿ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾ (۳۱) ((محرم اور شوہر والی عورتوں) کے سوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے مال کے ذریعے حاصل کرنا تمھارے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ حصار میں ان کو محفوظ کرو نہ یہ کہ آزادانہ شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو تم ان سے ازدواجی زندگی کا لطف اٹھاؤ، اس کے بدلے ان کو فرض کے طور پر مہر ادا کرو)۔

مہر کی ادائیگی بہر حال ضروری ہے، یہ کوئی متعین رقم نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت کے لحاظ سے بوقت نکاح جو طے پا جائے وہ مرد کو ادا کرنی پڑتی ہے اور مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ حیلے بہانے سے اِس رقم کو ہضم کرے، یا اس کا کچھ حصّہ اڑا لے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ تھی کہ مہر ادا نہیں کرے گا، وہ دراصل زانی ہے اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ تھی کہ وہ قرض ادا نہیں کرے گا، وہ دراصل چور ہے'' (۳۲)۔ تاہم بیوی کو معاف کرنے کا حق ہے، چاہے کچھ معاف کرے یا پورا معاف کرے۔ مگر یہ اس کا معاف کرنا اپنی آزادانہ مرضی سے ہو، اگر جبر سے معاف کرایا جائے تو محدثین کے نزدیک شوہر اس کو ادا کرنے کا پابند ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''احق ما اوفیتم من الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج'' (۳۳) (سب سے زیادہ پوری کرنے کے لائق وہ شرط ہے جس کے ذریعے عورتوں کی عصمت کو تم نے اپنے لیے حلال بنایا ہے یعنی مہر)۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تھوڑے یا زیادہ جس قدر مہر پر بھی کسی عورت سے نکاح کیا اور اندر سے تہیہ کر لیا کہ بیوی کے اس حق کو ادا نہ کرے گا تو یہ اس کے ساتھ دھوکا کرنا ہوگا۔ اور اگر اس نے اس حق کو ادا نہ کیا اور مر گیا تو قیامت کے روز خدا کے سامنے زنا کار کے روپ میں پیش ہوگا (۳۴)۔

۳: نان ونفقہ:

شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کی تمام ضروریاتِ زندگی پوری کرے، اپنی حیثیت کے مطابق جیسا خود پہنے ویسے ہی اس کو پہنائے اور جیسا خود کھائے ویسا ہی اس کو کھلائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعاً بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۳۵) (خوشحال آدمی اپنی استطاعت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی استطاعت کے مطابق معروف طریقے سے نفقہ دے، یہ نیک لوگوں پر حق ہے)۔

اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو نفقہ نہیں دیتا یا تو وہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتا یا پھر وہ استطاعت کے باوجود نہیں دیتا۔ استطاعت نہ رکھنے کی صورت میں مختلف فقہی نظریات ہیں، لیکن امام مالک کا مسلک اقرب الی الصواب نظر آتا ہے کہ ایک ماہ یا دو ماہ یا کچھ مناسب مدت مرد کو مہلت دی جائے۔ لیکن اگر وہ پھر بھی نفقہ کا بندوبست نہ کر سکے، تو پھر زوجین میں علیحدگی کرا دی جائے اور جو شخص استطاعت رکھنے کے باوجود عورت کو نفقہ نہیں دیتا تو یہ ظلم ہے۔ قاضی کا فرض ہے کہ وہ عورت کو نفقہ دینے پر مرد کو مجبور کرے۔ اگر شوہر پھر بھی حاکم کے حکم کی تعمیل نہ کرے تو امام مالک کے نزدیک قاضی ان میں علیحدگی کرا دے، کیونکہ قرآن کی رُو سے نفقہ عورت کا حق ہے اور جب کوئی مرد استطاعت کے باوجود عورت کو خرچہ نہیں دیتا تو عورت کا اس مرد سے بندھے رہنا بہت سے فسادات کا باعث ہو سکتا ہے۔

۴: عدل وانصاف:

اسلام چونکہ زنا کو انسانی معاشرے کے لیے دینی، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی وتمدنی لحاظ سے مہلک سمجھتا ہے اور جہاں اس کی سزا شادی شدہ مرد یا عورت کے لیے رجم (پتھر مار مار کر ختم کر دینا) رکھی ہے، وہاں اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر جن کا فیصلہ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق خود کرتا ہے اگر کوئی ضرورت محسوس کرے تو اسے بیک وقت چار بیویوں تک رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس میں یہ کڑی شرط عائد کر دی گئی کہ ان بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں عدل کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ وہ بیوی کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرے اور اگر بیویاں ایک سے زائد ہوں تو ان میں مساوات کے اصول پر گامزن رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ (۳۶) (اگر تمھیں

اندیشہ ہو کہ (ایک سے زائد بیویوں کے درمیان) انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کافی ہے)۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (۳۷) (اور تمھارے بس میں نہیں کہ عورتوں میں انصاف کر سکو، اگر چہ تم ایسا چاہتے ہو تو پھر ایک بیوی کی طرف ہی پورا نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو بالکل بے سہارا لٹکتی ہوئی چھوڑ دو اور اگر تم اپنے طرزِ عمل کو درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

دونوں بیویاں ہر لحاظ سے ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔ ایک معمولی صورت والی ہے دوسری خوش شکل، ایک بیمار ہے دوسری تندرست، ایک جوان ہے دوسری معمر، ایک بدمزاج ہے دوسری خوش مزاج، اس طرح دونوں کے مزاجوں میں کئی فرق ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے طبعاً آدمی کی طبیعت ایک کی طرف زیادہ اور دوسری کی طرف کم مائل ہو سکتی ہے، مگر اس کے باوجود ضروری ہے کہ تم دوسری طرف بھی کم از کم تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بالکل معلق ہو کر نہ رہ جائے، گویا اس کا کوئی شوہر ہے ہی نہیں اور اس کا نان نفقہ بہرحال تمھیں دینا ہوگا۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں پورا پورا انصاف فرماتے اور ساتھ دعا فرمایا کرتے: ''كان يقسم بين نساء فيعدل ويقول اللهم هذه قسمتي فيما املك ولا تلمني فيما تملك ولا املك'' (۳۸) (اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے، ان چیزوں میں جن پر میرا اختیار ہے اور مجھے اس چیز پر ملامت نہ کر، جو خالص تیرے قبضے میں ہے اور میرے قبضے میں نہیں یعنی طبعی میلان!) اس سلسلے میں بہترین نمونہ خود نبی کریم ﷺ نے پیش فرمایا۔ آپ ﷺ نے ہفتے کے دن اپنی ازواج مطہراتؓ میں تقسیم کر رکھے تھے اور جس دن جس بیوی کے ہاں ٹھہرنے کی باری ہوتی اس دن اگر ضرورت ہوتی تو بھی اس کی اجازت کے بغیر کہیں اور نہ جاتے، اگر سفر پر جانا ہوتا تو قرعہ کے ذریعے فیصلہ فرماتے کہ کس زوجہ مطہرہ کو ساتھ جانا ہے (۳۹)۔

۵: غیر شرعی حکم کی عدم تعمیل:

اگر چہ مرد کو عورت پر ایک زائد درجہ حاصل ہے اور عورت کو مرد کی فرمانبرداری کرنے کا حکم

ہے،مگراس کے باوجوددونوں کا اصل مقصودتو رضائے الٰہی اور اللہ اور رسولؐ کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہے اس لیے مرد عورت کو کوئی غیر شرعی حکم دینے کا مجاز نہیں ہے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر عورت کو اس کی بات نہیں ماننی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''**لا طاعة لمخلوقٍ فی معصیة الخالق**''(۴۰) (خالق کی نافرمانی کی شکل میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی)۔

۶: ایذا رسانی اور زیادتی کی ممانعت:

خاوند کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کو بلاوجہ تکلیف نہ دے، اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو پسند نہ کرتا ہو تو اس کا اخلاقی فرض ہے کہ ایذا رسانی اور ظلم وتشدد کی بجائے شرفاء کے طریقے سے اسے رخصت کر دے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿**وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا**﴾(۴۱) (اور عورتوں کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بنالو)۔

ستانے اور زیادتی کرنے میں روحانی، ذہنی اور جسمانی اذیتیں اور زیادتیاں شامل ہیں جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار کرے، وہ اپنی جائز حدود سے تجاوز کرتا ہے اور ایسی صورت میں عورت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

۷: صبر اور ضبط:

ایک گھر میں زندگی بسر کرتے ہوئے اختلاف رائے کا پیدا ہو جانا اور ناگوار چیزوں کا سامنے آنا ناگزیر امر ہے۔ ان حالات میں مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صبر سے کام لے اور معاملات کو الجھانے کی بجائے سلجھانے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو زیادہ ہمت اور حوصلہ دیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت فطری طور پر نسبتاً جذباتی ہے اور اسی میں اس کا حسن ہے۔ اس لیے فطری طور پر مرد کو چاہیے کہ زیادہ حلم اور حوصلے سے کام لے اور جذبات کی رو میں نہ بہہ نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہوئی ہے۔ تم اسے سیدھا نہیں کر سکتے۔ چاہو تو اس کے ٹیڑھ کے باوجود اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ تم اسے زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی''(۴۲)۔

۸: حقِ خلع:

نکاح ایک اہم معاشرتی ضرورت ہے کیونکہ یہ خاندان کی اور خاندان معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں لیکن اگر میاں بیوی میں محبت نہ رہے اور ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور مصالحت نہ ہو سکے اور اگر خاوند کے ظلم و زیادتی، ناجائز ایذا رسانی، اس کی بد اخلاقی، ناقابل برداشت حد تک بدصورتی یا کسی اور معقول وجہ کی بنا پر میاں بیوی کا اکٹھے زندگی گزارنا ممکن نہ ہو اور خاوند طلاق دینے کے لیے آمادہ بھی نہ ہو تو خاندانی زندگی کے مفاد کے پیشِ نظر اسلام میں بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ عدالت کی طرف رجوع کرے اور حاکم باقاعدہ تحقیق کر کے معاملہ نپٹائے۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیویاں جمیلہ بنت ابی سلول اور حبیبہ بنت سہل انصاریہ حضور ﷺ کے پاس اپنے مقدمات لائیں اور حضور ﷺ نے دونوں دفعہ حضرت ثابت کو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دیں (۴۳)۔ اسلام نے طلاق اور خلع دونوں صورتوں میں احسن طریقے سے علیحدگی کو پسند کیا ہے۔ یہ بات بہت قابل ذکر ہے کہ ازدواجی زندگی کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام طلاق اور خلع کو ناگزیر برائی کے طور پر قبول کرتا ہے۔ اس کو پسند نہیں کرتا، اس کے متعلق بہت سی احادیث ہیں۔

۹: حقِ وراثت:

اسلامی شریعت نے بیوی کو خاوند کی جائیداد میں وارث بنایا ہے اور اس کے تفصیلی احکام قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ (۴۴) (اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو تمھاری بیویوں کے لیے چوتھائی حصّہ ہے اور اگر اولاد ہو تو پھر آٹھواں حصّہ ہے، اس مال میں جو تم چھوڑ دو۔ قرض کی ادائیگی اور وصیت کے مطابق عمل کرنے کے بعد)۔

۱۰: عورتوں کی اصلاح و تربیت کے لیے سعی و فکر:

مرد گھر کا قوام و نگران ہے، جہاں اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی بچوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کے ذمّے یہ بات بھی ڈالی کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی تربیت احسن انداز میں کرے، ان کے لیے تعلیم و تفریح اور کام کاج کا ایسا ماحول مہیا کرے اور ان

کے سامنے اپنا عملی نمونہ ایسا پیش کرے کہ وہ اللہ کی رضا کے حق دار بن سکیں اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ارشاد ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً﴾(۴۵)(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس دین میں بیوی کو اس قدر حقوق دیے گئے ہوں اور اس کی تمام ضروریات زندگی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو وہی دین بہتر تہذیب وثقافت کی ضمانت دے سکتا ہے۔اس لیے کہ بیوی کے بغیر مکمل خاندانی یونٹ کا تصور ممکن نہیں، ایک اچھے مطمئن اور خوشحال خاندان کا دارومدار ایک تعلیم یافتہ، مہذب ومطمئن بیوی پر ہے۔تہذیب واقدار کے سوتے اس کی آغوش سے پھوٹتے ہیں۔اسی کی گود سب سے پہلا اور سب سے مؤثر مکتب ہوتا ہے۔اس کی زیر نگرانی تربیت یافتہ نسل ہی اپنا تعمیری اور تخلیقی کردار ادا کرتی ہے۔لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی روایات و اقدار کے تحفظ میں عورت کا کردار ہمیشہ بنیادی رہا ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ بائبل (مطبعہ المرسلین الیسوعیین، بیروت ۱۸۹۷ء) سفر التکوین، باب ۳، ۷-۸۔

۲۔ النحل: ۵۸-۵۹۔

۳۔ التکویر: ۸-۹۔

۴۔ التحریم: ۱۱-۱۲۔

۵۔ النساء: ۱۲۴۔

۶۔ النحل: ۹۷۔

۷۔ النور: ۴۔

۸۔ البقرہ: ۲۲۸۔

۹۔ ابن حبان، محمد، کتاب الضعفاء والمجروحین من المحدثین (دارالوعی، حلب ۱۳۹۶ھ، الطبعہ الاولیٰ) ۲/۳۰۲۔

۱۰۔ عظیم آبادی، ابوالطیب شمس الحق، عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابت للنسواں (موسسہ المجمع العلمی حدیث اکادمی کراتشی، الطبعہ الاولیٰ، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء) ص ۲۲۔

۱۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السنن (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۵۵۲، حدیث نمبر ۳۸۸۷۔

۱۲۔ عظیم آبادی، عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابت للنسواں، ص ۲۶۔

۱۳۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (مطبعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، الطبعہ الثانیہ، ۱۹۶۱ء) ۲/۷۷۱؛ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، السنن (قرآن محل، کراچی) ۱/۱۶۴

۱۴۔ البیہقی، احمد بن الحسین، السنن الکبریٰ (مطبعہ نشر السنہ ملتان) ۷/ ۱۱۸۔

۱۵۔ نسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، السنن (المکتبۃ السلفیہ لاہور، الطبعہ الثالثہ، ۱۹۷۶ء) ۲/۸۳؛ احمد بن حنبل، المسند (دارالفکر، القاہرہ) ۳/۱۹۹

۱۶۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، السنن (ادارہ احیاء السنہ النبویہ، سرگودھا، ۱۳۹۸ھ) ص ۱۴۳۔

۱۷۔ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح (نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، الطبعہ الثانیہ، ۱۹۵۶ء) ۲/۲۷۳۔

۱۸۔ البقرہ: ۲۲۸۔

۱۹۔ النساء: ۱۔

۲۰۔ الاعراف: ۱۸۹۔

۲۱۔ الرعد: ۳۸۔

۲۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۱/ ۲۵۵؛ مسلم، الجامع الصحیح ۱/ ۴۴۸-۴۴۹؛

البیہقی، شعب الایمان (مطبعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت) ۴/۳۸۰۔

۲۳۔ الخطیب تبریزی، ابوعبداللہ محمد، مشکوٰۃ المصابیح (نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی) ص ۲۶۸۔

۲۴۔ النور: ۳۲۔

۲۵۔ الروم: ۲۱۔

۲۶۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۶۹، حدیث نمبر ۶۱۳۴۔

۲۷۔ ترمذی، السنن ص ۶۹۵۔۶۹۶ حدیث نمبر ۳۰۸۷، ابواب التفسیر، سورہ التوبة، عن سلیمان بن عمرو بن الاحوص قال حدثنی ابی انه شهد حجة الوداع مع رسول اللہ ﷺ فحمد اللہ واثنی علیه وذکر وعظ ثم قال ای یوم هذا........الا واستوصوا بالنساء خیرا فانما هن عوان عندکم لیس تملکون منهن شیئا غیر ذلك الا ان یاتین بفاحشة مبینة فان فعلن فاهجروهن فی المضاجع واضربوهن ضرباً غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا ألا وان لکم علی نساء کم حقا ولنساء کم علیکم حقا فاما حقکم علی نسائکم فلا یوطئن فرشکم من تکرهون ولا یاذن فی بیوتکم لمن تکرهون الا وان حقهن علیکم ان تحسنوا الیهن فی کسوتهن وطعامهن۔

۲۸۔ ایضاً۔ ۲۹۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۲۶۵، حدیث نمبر ۱۸۵۰۔

۳۰۔ النساء: ۴۔ ۳۱۔ ایضاً: ۲۴۔

۳۲۔ ابن تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (ریاست الحرمین الشریفین، سعودی عرب) ۳۲/۱۹۳؛ الہیثمی، ابوبکر، نورالدین، مجمع الزوائد (مؤسسہ المعارف، بیروت ۱۹۸۶ء) ۴/۱۳۴۔

۳۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۲/۷۷۴۔

۳۴۔ مجمع الزوائد، ۴/۱۳۵۔ ۳۵۔ البقرہ: ۲۳۶۔

۳۶۔ النساء: ۳۔ ۳۷۔ ایضاً: ۱۲۹۔

۳۸۔ ترمذی، السنن (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۲۷۲، حدیث نمبر ۱۱۴۰۔

۳۹۔ ابوداؤد، السنن، ص ۳۰۹، حدیث نمبر ۲۱۳۸۔

۴۰۔ البغوی، شرح السنہ (المکتب الاسلامی، بیروت/ دمشق الطبعہ الاولیٰ ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۷ء) ۱۰/۴۴۔

۴۱۔ البقرۃ: ۲۳۱۔

۴۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۱/۴۶۹؛ ۲/۷۷۹

۴۳۔ ایضاً، ۲/۷۹۴۔ ۴۴۔ النساء: ۱۲۔

۴۵۔ التحریم: ۶۔

رواداری سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

لفظ رواداری کا اصطلاحی مفہوم فکری، اعتقادی، نسلی، لسانی اور بنیاد پر کسی عصبیّت کا شکار ہوئے بغیر تحمل و بردباری سے دوسرے کو برداشت کرنا ہے۔

مذہبی، دینی یا معاشرتی معاملات میں دوسروں کے ساتھ فراخ دلی یا وسیع الخیالی کا برتاؤ، کسی دوسرے کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنا، رعایت کا رویہ، تحمل، وضعداری کا اظہار، ہرکس و ناکس سے یکساں برتاؤ اور نرمی کا سلوک وغیرہ (۱)۔

اسلامی نقطۂ نظر سے رواداری کا مطلب مختلف اقوام، مختلف مذاہب، مختلف زبانوں اور رنگ ونسل کے لوگ جو اسلامی حکومت کی حدود میں قیام پذیر ہوں، کے ساتھ تعلقات اس طرز اور نہج پر استوار ہوں کہ عفوودرگزر، تحمل و برداشت سے کام لیا جائے کہ قدرت اور دسترس ہونے کے باوجود اپنے مخالف کی بات کو نظرانداز کیا جائے۔

رواداری کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہر نوع کے نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی امتیازات و اختلافات کے باوجود کوئی گورا کالے سے برتر نہ ہو اور کوئی عربی بولنے والا غیر عربی کو کمتر اور حقیر نہ جانے اور نہ علاقائی اختلاف کے جرم میں کوئی کسی کی زندگی اور خون سے ہاتھ رنگے۔

رواداری کسی کمزوری کا نام نہیں بلکہ یہ شرف انسانی کا پرتو ہے جو انسان کے جوہر اصلی کا مظہر ہے۔ رواداری خوداعتمادی کا دوسرا نام ہے، احساس کمتری کا شکار شخص کبھی بھی رواداری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رواداری اسلامی تعلیمات کا تاثر ہے۔

اسلام سے قبل جتنے بھی مذاہب دنیا میں پائے جاتے تھے ان تمام کے پیروکار دوسروں کو باطل اور خود کو حق سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں رواداری کا کوئی تصور نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید نے اس عدم رواداری کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ (۲) (یہودیوں نے کہا عیسائی کسی چیز پر نہیں اور عیسائیوں نے کہا یہودی کسی چیز پر نہیں جبکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں)۔

یہود و نصاریٰ دونوں بنی اسرائیل سے ہیں اس کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے

کے لیے تیار نہیں۔'' یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے تھے، عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے تھے حالانکہ اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری آسمانی کتابوں کے متعلق مسلمانوں کا سا ادب واحتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایک ہی قوم سے تعلق رکھنے والے ان دو مذاہب میں سے جسے بھی قوت اور اقتدار حاصل ہوا اس نے دوسرے مذہب کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۵۷۰ء میں یمن میں ذوالنواس نامی یہودی بادشاہ کی حکمرانی تھی، اس کے زمانہ میں نجران میں عیسائیت عام ہوگئی تو اس نے عیسائیوں کو تبدیلی مذہب کا حکم بھیجا۔ جب عیسائیوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کر دیا تو وہ کثیر تعداد فوج کے ہمراہ نجران پہنچا اور مقامی باشندوں (نجرانیوں) کا بڑی بے رحمی سے قتلِ عام کیا۔ اس نے بڑے بڑے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ جلائی اور انھیں زندہ اس آگ میں جھونک دیا۔

علامہ طبریؒ نے اس ظلم وستم اور عدم رواداری کی درج ذیل وجوہات لکھی ہیں۔ ذوالنواس نے یہودیت میں غلبہ اور غلو کے باعث نجرانیوں کو عیسائیت چھوڑنے اور یہودیت قبول کرنے کا حکم دیا۔

ایک یہودی کے دو بچے نجران میں مارے گئے، اس کے باپ کی شکایت پر اس نے نجرانیوں کو الٹی میٹم بھیجا۔ اس کے نتیجے میں واقعہ اصحاب الاخدود پیش آیا۔ جس میں یہودیوں نے عیسائیوں کے مذہب کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قرآن مجید کی سورۃ البروج میں اس واقعہ کی پوری تفصیل بیان کر دی گئی ﴿قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ. النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ. إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ﴾ (۳) (خندقوں والے قتل کر دیے گئے ایندھن والی آگ جب وہ اس پر بیٹھے تھے)۔ ان آیات میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

ان تاریخی حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود میں رواداری کا تصور معدوم تھا۔

اسی طرح عیسائیت بھی جذبہ رواداری سے خالی نظر آتی ہے کیونکہ عیسائیوں کو بھی جب موقع ملا انھوں نے یہود کے ساتھ ایسا ہی بہیمانہ برتاؤ کیا۔

ہرقل نے عیسائی پادریوں اور مذہبی راہ نماؤں کے ایما پر یہودیوں سے انتقامی جذبہ کے تحت بدترین انتقام لیا اور یہودی مفتوحین کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہی یہودی بچ سکے

جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپ گئے (۴)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، مجھے باقی دنیا سے تعلق نہیں" (۵)۔

ڈاکٹر حمید اللہ اپنی رائے کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں اور مذہبی مبلغوں کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ چار دانگ عالم میں تو جائیں لیکن تبلیغ عیسائیت صرف اسرائیلی گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں میں کریں۔ اس پر مستزاد یہ تصور تھا کہ عمل کی کوئی اہمیت نہیں، صرف ہم مذہبوں میں داخل ہونا ہی اتنا بڑا عمل ہے کہ وہ نجات ابدی کے لیے کافی ہے (۶)۔

عرب معاشرہ اور عدم رواداری:

اسلام سے قبل عربوں میں مرکزیت کا فقدان ہونے کی وجہ سے معمولی باتوں پر جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا اور نسل در نسل وحشیانہ جنگیں جاری رہتیں۔ ان لڑائیوں نے انتقام خون کی رسم پیدا کر دی (۷)۔

اہلِ عرب جنگ کو اونٹ سے تشبیہ دیتے تھے جو سب سے زیادہ منتقم مزاج جانور ہے (۸)۔

عرب جاہلیت کی جنگوں اور خون ریزیوں کو مؤرخین "**ایام العرب**" سے موسوم کرتے ہیں۔ جنگوں کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ ہے۔ میدانی نیشاپوری نے "**کتاب الامثال**" میں ۱۳۲ لڑائیوں کے نام گنوائے ہیں (۹)۔

تاریخ الجاھلیۃ کے مؤلف ڈاکٹر عمر فروخ عہد جاہلیت کی جنگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جاہلیت کی جنگیں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں کسی مخصوص عہد یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا" (۱۰)۔

اس کی وجہ ان کے خیال کے مطابق یہ تھی کہ عرب جاہلیت کی اقتصادی زندگی درحقیقت جنگوں کے گرد گھومتی ہے اور جنگیں مسلسل تھیں (۱۱)۔

زمانۂ جاہلیت کی ان خونریز اور وحشیانہ انسان دشمن جنگوں میں حرب بسوس اور "عبس و ذبیان" کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ مؤخر الذکر جنگ مسلسل چالیس برس جاری رہی۔ ایک عرب

سرداراس کانقشہ یوں کھینچتا ہے:

''دونوں قبیلے مٹ گئے۔ ماؤں نے اپنی اولادیں کھودیں۔ بچے یتیم ہو گئے۔ آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں''(۱۲)۔

دنیا کا قدیم ترین مذہب ہندومت بھی عدم رواداری کا شکار ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے کئی تحریکیں شروع کیں۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندو ہو جاؤ یا ہندوستان چھوڑ دو۔ اسی طرح ہندی کے علاوہ ہندوؤں کو دوسری زبان قبول نہیں۔ بلکہ ہندو ہونے کے لیے ہندوستان اور ہندو گھرانے میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ ہندومت انسانی تاریخ میں ذات پات کی تفریق کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ جس قدر معاشرتی اونچ نیچ اس معاشرہ میں نظر آتی ہے اس سلسلے میں کسی دوسرے معاشرہ میں نہیں ملتی۔ ہندوؤں میں چار ذاتیں ہیں۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

شودر شعور ہونے کے باوجود بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہے۔ عورت کو شوہر کی وفات کے بعد اس کے ہمراہ، ستی ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس کی سعادت ہے۔ سیکولرازم کے دعووں کے باوجود کبھی دوسرے مذہب کے لوگوں کو ہندوؤں نے برداشت نہیں کیا۔ اس کی مثال سکھوں کے ساتھ ہونے والے Golden Temple کے مظالم بہت معروف ہیں۔

اس کے علاوہ عدم رواداری کی سب سے بھیانک مثال ہندوستان میں آباد مسلمانوں کے ساتھ ناروا اور ہتک آمیز سلوک ہے۔ اس پر گجرات میں ہونے والے واقعات شاہد ہیں۔

کشمیری عوام کے ساتھ ڈھائے جانے والے مظالم عدم رواداری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہند میں داخل ہونے والی ہندو قوموں نے یہاں کے مفتوحین کو اچھوت قرار دیا تھا۔ ہزاروں سال سے اب تک اسی پر عمل موجود ہے اور بدھ ازم اور جین مت نے ہندوؤں کی نسلوں اور پشتوں کو تباہ کرنے میں اور شنکر اچاریہ کے قائم کیے ہوئے مت نے بدھ لوگوں کو ہندوستان سے خارج کرنے میں جو کارنامے اس ملک میں انجام دیے وہ عدم رواداری کی خونی داستان ہیں (۱۳)۔

دورِ جدید اور رواداری:

دورِ جدید ترقی اور گلوبلائزیشن کا دور ہے۔ اب پوری دنیا ایک کنبہ کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ سیٹلائٹ نے فاصلوں کی طنابیں سمیٹ کر دوریوں کو قربتوں میں بدل دیا ہے۔ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام رواداری جیسی خوبی سے عاری نظر آتی ہیں۔ اسرائیل اور فلسطین، ہندوستان اور کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور کویت عراق جنگ قوموں کے درمیان عدم رواداری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت (Super Power) امریکہ میں کالے اور گورے کا مسئلہ عدم رواداری کی بین مثال ہے حالانکہ یہ ملک رواداری کا بظاہر بہت بڑا علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

امریکی سپریم کورٹ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اعلیٰ ترین عدالت) میں تاریخ عالم کی عظیم ترین قانون دان ہستیوں کو ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں جو پتھر پر نقش ہے پیغمبر ﷺ اسلام کو ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار پکڑے دکھایا گیا ہے۔ جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مغرب کی مسیحی دنیا کے اس خودساختہ اور من گھڑت تصور کی مظہر ہے کہ اسلام اور فاتح اسلام روادار فاتح نہ تھے (۱۴)۔

لبنانی مستشرق فلپ کے ہٹی (Philip K.Hitti) دین اسلام کے بارے میں عدم رواداری اور تعصب کی بنیاد پر یہ تبصرہ کرتا ہے: ''اسلام نے ثابت کر دکھایا ہے جسے دنیا تسلیم کرتی ہے کہ یہ ایک جنگجویانہ سیاست پر مبنی دین ہے'' (۱۵)۔

مہذب اور ترقی یافتہ دور میں بھی مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کہاں کی رواداری ہے؟

عدم رواداری کی سب سے بدترین مثال مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے وحشیانہ مظالم ہیں۔

بھارت کے امن پسندی اور سیکولر ہونے کے دعوؤں کے باوجود مقبوضہ کشمیر کے مظلوم عوام پر ان کے مظالم روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ ۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء اردو ''جنگ'' کے اداریہ میں شائع ہونے والے کالم سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت عدم رواداری کا شکار ہے: ''مقبوضہ کشمیر کے علاقہ بانڈی پورہ میں عقوبت خانوں میں لے جا کر شہید کیے جانے والے مظلوم کشمیری مسلمانوں کی تین ایسی

اجتماعی قبروں کا انکشاف ہوا ہے جن سے بڑی تعداد میں خواتین، بچوں اور نوجوانوں کی لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ ان مظلوم مسلمانوں کو بھارتی فوج نے اغوا کرنے کے بعد قتل کر دیا اور ان کی لاشیں اجتماعی قبروں میں دبا دیں۔ مقبوضہ کشمیر میں اب تک بھارتی فوج کے ہاتھوں ستر ہزار سے زائد کشمیری مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔

لاہور میں آگرہ مذاکرات پر سیمینار میں متعدد بار مقررین اور حاضرین کے درمیان اختلاف رائے پر سٹیج سیکرٹری کو مداخلت کرنا پڑی اور حاضرین میں سے بعض معزز افراد نے اپنی نشست سے اُٹھ کر شرم کرو۔ شرم کرو۔ کے نعرے لگائے۔ اسی تقریب میں پنجاب کے سابق گورنر شاہد حامد نے کہا کہ ہمارے ملک میں جمہوریت اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کی رائے کو برداشت نہیں کرتے (۱۷)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اداروں کا استحکام بھی رواداری کا متقاضی ہے۔

اسلام: رواداری کا علمبردار:

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اسلام امن و امان کا دین ہے۔ اور معنوی اعتبار سے ہی سلامتی اور آشتی سے مزین ہے۔ یہ انسانی حقوق، رواداری، عفو و درگزر کا پیامبر ہے۔ اس کی نظر میں بنی نوع انسان کا ہر فرد مساوات و احترام اور اکرام کا مستحق ہے۔ اس کی تعلیمات اور پیغام رنگ و نسل کے عیوب سے پاک ہے۔

اسلام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔ مسلمانوں کا رب رحمٰن اور رحیم ہے اور جس کے ذریعے سے یہ دین پھیلا ہے وہ رحمت للعالمین ہے۔ اللہ رب العزت کی ذات جو خود نہایت روادار ہے اپنی مخلوق کی نافرمانیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود اپنی رحمت کے دروازے کھلے رکھے ہوئے ہے۔

نبی اکرم ﷺ نبیٔ رحمت ہیں۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ اور سیرت طیبہ عفو و درگزر، رحمت و رافت اور مثالی مذہبی، معاشرتی رواداری کا نمونہ ہے۔ اسلام کی روادارانہ حکمت عملی کا اندازہ قرآن کریم کی اس آیت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَآئِكَتِهِ

وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ﴾(۱۸)(پیغمبراس کتاب کو مانتے ہیں جوان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتری ہے اور مومن بھی، سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کے پیغمبروں میں سے کسی میں فرق نہیں سمجھتے)۔

اس آیت مبارکہ میں اسلام کا سابقہ انبیاء وکتب ساویہ کے متعلق رواداراناطرز عمل، پوری امت مسلمہ کا یہ اقرار ہے کہ اسلام کے پیروکار عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کی طرح نہیں کہ ایک رسول کو مان لیا اور دوسروں کا انکار کیا بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان صرف اسلام ہی کا اعجاز وکمال ہے۔

﴿قُولُواْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴾(۱۹)(تم کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس وحی پر جو ہماری طرف (رسول اکرم کے ذریعے) اتاری گئی اور جو وحی ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو کچھ بھی دوسرے نبیوں کو دیا گیا ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کے لیے فرمانبردار ہیں)۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُواْ بَيْنَ اللّهِ وَرُسُلِهِ وَيقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُواْ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلاً. أُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴾(۲۰)(بلاشبہ جولوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور یوں چاہتے ہیں کہ درمیان کی ایک راہ نکالیں وہ پکے کافر ہیں)۔

﴿وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾(۲۱)(اگر وہ صلح (امن) پر مائل ہوں تو تم بھی صلح (امن) پر مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو، بیشک وہ سب سننے والا، جاننے والا ہے)۔

پس تذبذب میں نہ پڑو اور جب کامل طور پر حاوی ہو جاؤ تو صلح کی دعوت دو۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لا يَرْجُوْنَ أَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْماً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (۲۲) (اے نبی ﷺ ایمان والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے۔ ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے): ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ ﴾ (۲۳) (اگر مشرکین میں سے کوئی آپ ﷺ سے پناہ طلب کرے تو آپ ﷺ اسے پناہ دیں)۔

مذہبی رواداری کی مثال اہل کتاب کے نام قرآن کا یہ پیغام ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلٰى كَلَمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ (۲۴) (آپ ﷺ کہہ دیں: اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم خدا کو چھوڑ کر اپنے میں سے کسی کو رب نہ بنالیں۔ اگر یہ لوگ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو اس پر سر تسلیم خم کر چکے ہیں)۔

قرآن مجید میں ایک اور موقع پر یہ پیغام اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَالَّذِيْنَ هَادُواْ وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أُجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲۵) (جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی، نصرانی، اور صابی ہیں۔ غرض جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ایسوں کو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ملے گا۔ نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

قرآن کے اس پیغام پر ڈاکٹر حمید اللہ تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''صلح کل، رواداری اور انتہائی وسعت قلبی کی اس عجیب وغریب تعلیم میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہودی، عیسائی اور صابی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کو ترک کریں بلکہ اپنے اپنے الہامی مذہب ہی کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی امور پر عمل کریں یعنی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو ماننا، مرنے کے بعد حساب کتاب کا یقین کرنا اور زندگی بھر صالح عمل کرنا یا اجر ملنے اور خوف سے بچنے کے لیے کافی ہے'' (۲۶)۔

ڈاکٹر حمید اللہ انھی آیات کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ اسلام نے مذاہب عالم کو دعوت دی اور آج بھی یہ دعوت باقی ہے کہ اپنے اصلی مذہب پر رجوع کرو بعد کے زمانہ کے حذف و اضافہ سے باز آ جاؤ اور توحید، قیامت اور عمل صالح مابہ الاشتراک امر پر انضمام نہیں تو اتفاق کر لو، ہر مذہب کی اصلی تعلیم کو مانیں تو پھر اصول کی حد اختلاف ہے ہی نہیں، اور چونکہ بلا استثناء ہر جگہ اور ہر مذہب میں ایک آخری تسکین دہندے کی بشارت و پیشین گوئی موجود ہے۔ اس لیے اپنے مذہب کی کامل تعمیل میں اس کی اطاعت بھی آ جاتی ہے۔ یوں بھی نجات کے اس طریقہ سے استدلال کے لیے نبی عربی ﷺ کو گواہی میں پیش کرنا انھی کے لیے ضروری ہوگا۔ اس طرح مذہبی تعصب کی مصیبت سے انسان کو نجات مل جاتی ہے اور ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (۲۷) (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)۔ یہ ایک ایسا سنہری اصول تھا جو اس سے پہلے کہنا چاہیے کہ سنا ہی نہیں گیا تھا (۲۸)۔

اکیسویں صدی میں رواداری اور سیرت طیبہ ﷺ

پوری انسانی تاریخ میں رواداری کے سب سے بڑے علمبردار محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ امن، انسان دوستی، سلامتی، رواداری کی خواہش مند دنیا کے لیے ''اسوۂ محمدی'' ﷺ راہِ عمل ہے۔

قومی اور عالمی سطح پر امن کے قیام اور رواداری کے فروغ کے لیے رحمت عالم کی سیرتِ مقدسہ اور حیاتِ طیبہ ہی واحد نمونہ ہے۔

اکیسویں صدی کے اس پُر آشوب دور میں ملکی (بالخصوص) اور بین الاقوامی سطح پر (بالعموم) نسلی، علاقائی، گروہی، لسانی، مذہبی اور ملکی اختلافات کے خاتمہ اور رواداری اور مکمل امن و امان کے لیے ضروری ہے کہ ہادی اعظم سید عرب و عجم حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ کاملہ پر عمل کیا جائے، یہ اس دور کی بھٹکی ہوئی انسانیت کے لیے نمونہ عمل اور راہِ نجات ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے روادارانہ طرزِ عمل پر قرآن کی شہادت:

ارشاد ربانی ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۲۹) (تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ ان پر تمھاری تکلیف شاق گزرتی ہے اور وہ تمھاری بہبود (بھلائی) کے حریص ہیں اور مسلمانوں پر نہایت

درجے شفیق اور مہربان ہیں)۔

ایک آیت میں اس طرح سے ارشاد ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۳۰) ((اے پیغمبر) یہ بھی اللہ کا بڑا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم دل ہو اگر تم مزاج کے سخت اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ کبھی کے تمھارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے)۔

فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان نے آپ کی رواداری اور صلہ رحمی کا پوری طرح اعتراف کیا۔ چنانچہ ابوسفیانؓ کے الفاظ ہیں:

"بابی انت وامّی ما احلمك واوصلك واكرمك" (۳۱) (میرے ماں باپ حضور ﷺ پر قربان ہوں آپ ﷺ کتنے بردبار، کتنے قرابت کا حق ادا کرنے والے اور کس قدر دشمنوں پر عفو وکرم کرنے والے ہیں)۔

سیرت طیبہ ﷺ اور رواداری:

محسن انسانیت محمد ﷺ نے رواداری کے عملی اقدامات تاریخ انسانی کے اس تاریک دور میں متعارف فرمائے جب لوگ رواداری کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھے۔ آزادی اور رواداری کے مفہوم و تصور سے انسانی ذہن خالی تھا۔ نہ کہیں معاشرتی رواداری نظر آتی تھی اور نہ ہی مذہبی رواداری، چھٹی صدی عیسوی جو آپ ﷺ کا زمانہ بعثت ہے اس کے اوائل میں معاشرتی رواداری کا عموماً اور مذہبی رواداری کا خصوصاً کوئی تصور نہیں تھا۔ بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

''آغاز اسلام کے وقت مذہبی تعصب (عدم رواداری) اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ہر مذہب اپنے سوا باقی تمام مذاہب کو جھوٹے اور نجات کے لیے قطعاً ناموافق سمجھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنے مذہب کے اندر کسی اجنبی کو آنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مذہب کو نسل اور پیدائش سے محدود کر دینے کی خود غرضی، ہٹ دھرمی یہودیوں میں بھی تھی اور ہندوستان میں بھی'' (۳۲)۔

اوپر بیان کردہ حالات سے بالکل برعکس اسلام اپنے بنیادی نظریہ حیات میں دوسرے تمام ادیان و مذاہب کو نہ صرف آزادی اور رواداری کا حق دیتا ہے بلکہ سیاسی، معاشرتی ماحول میں ان کی

حفاظت کی ضمانت بھی دیتا ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيراً﴾ (۳۳) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے مسمار کرڈالی جائیں)۔

کفار و مشرکین کے متعلق مسلمانوں کو دنیاوی معاملات میں اخلاق سے پیش آنے، درگذر کرنے، عدل و انصاف سے معاملہ کرنے اور رواداری کی تاکید اور تلقین کی گئی ہے حالانکہ اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے زیادہ اسلام دشمن کون ہوسکتا ہے۔

غیر مسلموں سے رواداری:

نبی اکرم ﷺ کے محاسن اور مکارم اخلاق میں سے ایک اہم شعبہ رواداری ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اخلاق کی تعلیم و تکمیل ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"انما بعثت لاتمم صالح الاخلاق" (۳۴) (مجھے اس لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں)۔

ان مکارم اخلاق کی تعلیم آپ ﷺ صحابہ رضوان اللہ اجمعین کو دیتے تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُن کے بھائی نے آپ ﷺ کے متعلق فرمایا: "رایتہ یامر بمکارم الاخلاق" (۳۵) (میں نے آپ ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے تھے)۔

رواداری، ضبط و تحمل، بردباری، درگذر، چشم پوشی، خوش خلقی، نرم دلی، نرم خوئی، خوش گفتاری، خاکساری، فروتنی، خوش کلامی، فراخدلی، فیاضی سیرت طیبہ کے نمایاں اور درخشاں پہلو ہیں، جن سے آپ ﷺ کی ذات آراستہ و پیراستہ ہے۔

آغاز اسلام اور اعلان نبوت سے آپ ﷺ کا واسطہ براہِ راست تین گروہوں سے رہا، ان میں پہلا گروہ مشرکین مکہ کا ہے دوسرا منافقین مدینہ کا اور تیسرا یثرب کے یہود کا۔ ان تینوں نے آپ ﷺ کو جس انداز سے ستایا اور مختلف تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں ان سب سے اہل علم و دانش بخوبی واقف ہیں، میں اس تمام کیفیت کا بیان صرف ایک حدیث نبوی کی صورت کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: " لقد

اوذیت فی اللہ عزوجل ومایوذی احد" (۳۶) (مجھے اللہ کی راہ میں ایسا ستایا گیا ہے کہ (انبیاء میں) کوئی نہیں ستایا گیا)۔

تکالیف اور اذیتوں کے باوجود مخالفین کے ساتھ آپ ﷺ کا برتاؤ معافی اور دعا کا ہے۔ قدرت کے باوجود کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ان کی گمراہی پر پریشان رہے، اصلاح وہدایت کے لیے جان کی بازی لگاتے رہے۔ قرآن نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (۳۷) (شاید آپ ﷺ ان کے ایمان نہ لانے پر جان دے دیں گے)۔

قریش مکہ:

قریش مکہ نے آپؐ کو نہ صرف تکالیف اور اذیتیں پہنچائیں بلکہ آپ ﷺ کو مادر وطن سے بھی نکل جانے پر مجبور کیا، اس کے باوجود آپ نے مشرکین مکہ سے رواداری اور محاسن و مکارمِ اخلاق کا مظاہرہ کیا چند امثال ملاحظہ ہوں:

۱: کوہ صفا پر قریشِ مکہ کو دعوت اسلام کے نتیجے میں ابولہب (عبد العزیٰ) نے آپ کو یہ الفاظ کہے: "تبالك لهذا جمعتنا" (۳۸) (معاذ اللہ) تم برباد ہو، اس مقصد کے لیے ہم سب کو جمع کیا ہے)۔

۲: ابولہب کے بیٹے عتبہ اور عتیبہ نے آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کو طلاق دے دی (۳۹)۔

۳: ابولہب کی بیوی ام جمیل آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی (۴۰)۔

۴: حرم میں حالت نماز میں اونٹ کی اوجڑی آپ ﷺ کی گردن پر ڈالی گئی (۴۱)۔

۵: عقبہ بن ابی معیط نے کعبۃ اللہ میں سرورکونین ﷺ کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چھڑایا (۴۲)۔

۶: مسلمانوں کو اتنا ستایا گیا کہ وہ تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت کر گئے (۴۳)۔

۷: خاندان رسول ﷺ تین سال تک (قریش مکہ کے) معاشرتی مقاطعہ کی وجہ سے گھاٹی میں محصور رہا (۴۴)۔

۸: سردارانِ قریش نے مل کر آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا (۴۵)۔

۹: ہجرت کے دوران آپ ﷺ کا پیچھا کیا اور آپ ﷺ کی گرفتاری کا انعام مقرر کیا (۴۶)۔

۱۰: صرف مکہ سے ہجرت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مدینہ میں قیام کے دوران مسلمانوں کو نہ صرف مختلف طریقوں سے تنگ کرتے رہے بلکہ طاقت اور قوت کے ذریعے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے جنگیں بھی لڑیں۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے جس رواداری اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا وہ مشرکین مکہ کی توقع سے بالکل مختلف اور برعکس تھا اس لیے کہ مشرکین مکہ کو اپنا ظلم وستم یاد تھا اور انتقام کا ڈر تھا۔

آپ ﷺ نے مشرکین مکہ میں خاص طور پر قریش کی طرف خطاب کرتے ہوئے پوچھا "یا معشر قریش "ما ترون أني فاعل فيكم؟ قالوا ! خيرا أخ كريم وابن اخ كريم قال: اذهبوا، انتم الطلقاء" (۴۷) (اے قریش کے گروہ۔ آپ لوگوں کا پھر میرے بارے میں کیا خیال ہے میں آپ لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ انھوں نے کہا تو بزرگی والا بھائی ہے اور بزرگی والے بھائی کا بیٹا ہے۔ آپ ﷺ نے کہا جاؤ تم آزاد ہو)۔

طائف والوں نے آپؐ پر پتھر برسائے آپؐ کے جوتے لہولہان ہو گئے مگر پھر بھی آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی۔ اس قوم کی سرشت میں دھوکہ دہی اور زیادتی تھی لیکن آپ ﷺ نے ان سے بھی حسن سلوک کیا۔ (۴۸)۔

یہود مدینہ

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے (۴۹)۔

خیبر میں ایک یہودی عورت نے آنحضرت ﷺ کو کھانے میں زہر دیا۔ آپ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا۔ آپ ﷺ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے اقرار کیا لیکن رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ تعرض نہیں فرمایا (۵۰)۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کبھی بھی بدعہدی نہ کی اگرچہ یہ اپنی قبیح عادت سے باز نہ آئے۔

منافقین:

مدینہ میں مسلمانوں کے خلاف سب سے زیادہ سازشیں منافقوں نے کیں، اس مقصد کے

لیے انھوں نے مسجد ضرار بھی بنائی جس کو حکم خداوندی سے گرا دیا گیا، عبداللہ بن ابی، رئیس المنافقین تھا اور عمر بھر منافق رہا۔ آنحضرت اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور اعلانیہ استخفاف کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ کفار مکہ کے ساتھ اس کی خفیہ خط و کتابت تھی۔ غزوۂ احد میں عین موقع پر تین سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ پر الزام لگانے والوں میں سب سے آگے تھا، جب وہ مرا تو آپؐ نے اس کے لیے اپنا کرتہ مبارک دیا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی (۵۱)۔

مواخات مدینہ:

مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کے لیے انصارِ مدینہ کی ہمدردی، مہمانی اور رواداری کی نظیر پوری تاریخ انسانیت میں نہیں مل سکتی۔ انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا نخلستان تھے۔ روپے پیسے تو اس زمانے میں تھے نہیں۔ انھوں نے (انصار) رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے (مہاجر) بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں مواخاۃ کا یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا (۵۲)۔

میثاقِ مدینہ: رواداری کا بہترین نمونہ:

میثاق مدینہ مسلمانوں اور مدینہ میں رہائش پذیر غیر مسلم قبائل اور اقوام کے درمیان بقائے باہمی اور رواداری کے اصولوں کی اساس پر ایک معاہدہ ہے۔ جس کی اہم دفعات درج ذیل ہیں:

"لليهود دينهم وللمسلمين دينهم، ان بينهم النصح والنصيحة والبّر دون الإثم، وان النصر للمظلوم، ان بينهم النصر على من دهم يثرب" (۵۳)۔ یہود اور مسلمانوں میں سے ہر ایک لیے اپنا اپنا دین ہے، اور ان دونوں کے درمیان خلوص، خیر خواہی اور نیکی کے تعلقات ہوں گے۔ مظلوم کی امداد اور یثرب پر چڑھائی کی صورت میں باہمی مدد لازم ہو گی۔

نامور محقق اور سیرت نگار محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں "یہ وہ تحریری معاہدہ ہے جس کی بدولت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ انسانی معاشرہ میں قائم کیا جس سے شرکاء معاہدہ میں ہر گروہ اور فرد کو عقیدہ مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوا" (۵۴)۔

صلح حدیبیہ: رواداری کی لازوال مثال:

صلح حدیبیہ چھ ہجری میں مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان ہونے والا معاہدہ ہے۔ سیاسی اور تدبیری اعتبار سے غلبہ کے باوجود آپ ﷺ نے کچھ ایسی شرائط تسلیم کریں جو بظاہر مسلمانوں کے

خلاف تھیں اور قریشِ مکہ کے نمائندے کے اصرار پر مناسب ترامیم کرنے پر رضامندی ظاہر کی جو رواداری کی لازوال مثال ہے ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اور "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کی بجائے "باسمك اللهم" اور محمد بن عبداللہ کے الفاظ تحریر کیے گئے (۵۵)۔

فتح مکہ: عفوودرگذر اور رواداری کا پیغام:

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے حسن سلوک، رواداری کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ تاہم مشہور ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن کا فتح مکہ کے موقع پر محسن انسانیت کے مثالی عفوودرگذر اور رواداری کا ذکر ضروری ہے۔

جانی دشمن کے بارے میں حضور ﷺ کی اس انتہائی کریم النفسی اور رواداری کا عہد جدید کی دعویدار تہذیب وتمدن کی حکومتوں کی ان شرمناک عیارانہ چالوں سے مقابلہ کیا جائے جو انھوں نے ۱۹۱۴ء کی عالم سوز جنگ میں ایک دوسرے کو سامان خورد ونوش سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیں تو اس کی قدر و قیمت بدرجہا بڑھ جاتی ہے (۵۶)۔

عیسائیوں کا ایک وفد نجران سے مدینہ منورہ حاضر ہوا تو آنحضور ﷺ نے ان کی مہمان نوازی فرمائی۔ انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا، ان کو ان کے اپنے طریقے پر مسجد نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت بھی دی۔ عام مسلمانوں نے انھیں ایسا کرنے سے روکنا چاہا تو آپ ﷺ نے ان مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع فرمایا (۵۷)۔

ایک مرتبہ ایک عرب دیہاتی بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ مارنے کو دوڑے، آپ ﷺ نے فرمایا اسے ابھی مت کچھ کہو پیشاب کر لینے دو۔ جب وہ پیشاب کر چکا تب نرمی سے آپ ﷺ نے اسے سمجھایا "یہ جگہ خدا کی عبادت کے لیے ہے، یہاں پیشاب پاخانہ اور گندگی نہیں ہونی چاہیے (۵۸)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ (جو کافر تھیں) اپنے بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں۔ جہالت سے آپ ﷺ کو گالیاں دیتی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تو آپ ﷺ نے ناراض ہونے کی بجائے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے (۵۹)۔

عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین غزوہ احد میں تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جب اس نے وفات پائی تو مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آنحضور ﷺ نے اپنی قمیص مبارک اسے پہنائی اور دفن کیا (۶۰)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو کوئی مجھ پر ظلم کرے میں اسے قدرتِ انتقام کے باوجود معاف کر دوں، جو مجھ سے قطع کرے میں اسے ملاؤں، جو مجھے محروم رکھے میں اسے عطا کروں، غضب اور خوشی دونوں حالتوں میں حق گوئی کو شیوہ بناؤں۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ آپ ﷺ کو مشرکین مکہ کے لیے بد دعا کے لیے درخواست کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، لوگوں کو اللہ کی رحمت سے دور کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا (۶۱)۔

مسلمانوں میں باہمی رواداری کی تعلیم و تلقین:

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مومن وہ ہے جس کی ذات سے بنی نوع انسان کی جان و مال کو خطرہ نہ ہو (۶۲)۔ تمام مومنین کی مثال ایک جسم کی مانند ہے (۶۳)۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (۶۴) (مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو مشکل کے وقت بے آسرا چھوڑتا ہے (۶۵)۔ تمھارا خون اور تمھارا مال تا قیامت اس طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے (۶۶)۔

معاشرے کے کمزور اور حقیر لوگوں سے بھی آپ ؐ نے رواداری کا سلوک فرمایا۔ غلاموں کے ساتھ محبت اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینا اور رواداری کا برتاؤ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ حضرت اسامہ بن زید ؓ جو غلام زادے تھے انھیں بھی اپنے نواسوں کی طرح نہ صرف اپنی گود میں بٹھاتے بلکہ یہ کہا کرتے تھے میں اُسامہ ؓ سے محبت کرتا ہوں اے اللہ تو بھی اس سے محبت فرما (۶۷)۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اسامہ بن زید ؓ کو اپنی اونٹنی پر سوار کر رکھا تھا (۶۸)۔

خطبہ حجۃ الوداع: باہمی رواداری کا چارٹر:

بنی نوع انسان کے لیے رواداری کا چارٹر جس میں معاشرہ کے ہر طبقہ کے لیے رواداری کا درس دیا گیا۔ ارشادات نبوی ﷺ ملاحظہ ہوں: تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، جو خود کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ جو خود پہنو ان کو بھی پہناؤ (۶۹)۔

عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو، حالانکہ اسے سبھی مذاہب میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے (۷۰)۔

لوگو: بے شک تمھارا باپ ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب (۷۱)۔

اسلامی معاشرہ میں باہمی رواداری:

رواداری کی بہترین مثال حضرت عمرؓ کے غلام وسق رومی کا واقعہ ہے، وہ خود کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کا غلام تھا، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے اگر تو اسلام قبول کرے گا تو میں تجھے مسلمانوں کی امانت کا کوئی کام سونپ دوں گا کیونکہ میرے لیے یہ روا نہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی امانت کے کام پر متعین کروں۔ مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا اس پر وہ کہا کرتے تھے ﴿لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے) (۷۲)۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت آن پہنچا تو انھوں نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا تمھارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ (۷۳)۔

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ہم کو دشمن کے ایک لشکر کی طرف بھیجا۔ انھوں نے ہماری خبر سن لی اور بھاگ گئے ایک آدمی کو ہم نے پکڑ لیا تو وہ لا الہ الا اللہ کہنے لگا مگر ہم نے اسے مار مار کر قتل کر دیا۔ یہ واقعہ میں نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا ''روز قیامت کلمہ گو کے مدمقابل تیری مدد کون کرے گا؟'' آنحضور ﷺ مسلسل یہ فرماتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اس نے اسلحہ کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر یقین حاصل کر لیا تھا کہ اس نے اسلحہ کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ آنحضور ﷺ مسلسل یہ فرماتے رہے کہ ایک کلمہ گو کے مقابلے میں کون تیری مدد کرے گا؟۔ یہاں تک کہ میں نے یہ آرزو کی کہ کاش میں نے آج ہی اسلام قبول کیا ہوتا تو اس کلمہ گو کے قتل کے گناہ سے محفوظ رہتا کیونکہ اسلام حالت کفر کے گناہوں

کودھودیتا ہے(۷۴)۔

عکرمہ بن ابوجہل فتح مکہ کے وقت بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہوگئی، وہ یمن گئیں اور انھیں تسلی دے کر واپس مکہ مکرمہ لے آئیں، آپؐ نے عکرمہ کو دیکھا تو فرط مسرت سے اٹھے آپؐ کے جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے "مرحبا بالراکب المهاجر"(۷۵)۔

آنحضورﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ ایک معاہدہ صلح کیا جس کے آخری الفاظ یہ تھے "علی ان لا تهدم لهم بيعة و لا يخرج لهم قس، و لا يفتنوا عن دينهم ما لم يحدثوا حدثا او ياكلوا الرباء"(۷۶)(اس شرط پر ان کا کوئی گرجا نہ گرایا جائے گا ان کے پادری جلاوطن نہ کیے جائیں گے۔ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ کوئی فتنہ انگیزی نہ کریں یا سود نہ کھائیں)۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اس معاہدے کی تجدید کی اور اس کے ایک ایک حرف کو قائم رکھا ان کے زمانہ میں حرہ کے ساتھ حضرت خالدؓ نے ایک اور معاہدہ کیا جس کی سب سے قابل لحاظ شرط یہ تھی کہ "جو بوڑھا شخص اس قدر محتاج ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس پر صدقہ کرنے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت بیت المال سے کی جائے گی(۷۷)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، ایک بار آپ نے بکری ذبح کی تو گھر والوں سے پوچھا کیا آپ نے ہمارے ہمسایہ یہودی کو گوشت بطور ہدیہ بھجوایا ہے کیونکہ حضرت محمدﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے جبرائیل علیہ السلام نے ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کی اس شدت کے ساتھ وصیت کی میں نے سمجھا کہ اس کو شریک وراثت نہ بنا دیں)(۷۸)۔

معاہدہ بیت المقدس: رواداری کی مثال:

عہد فاروقی کی فتوحات میں سب سے اہم فتح بیت المقدس کی ہے کیونکہ وہ انبیاء اور رسل کا مدفن اور یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ مسلمانوں کا قبلہ بھی رہا ہے۔ عیسائی مسلمانوں کے حریف تھے

اس کی فتح وکامرانی کے بعد حضرت عمرؓ نے جو حقوق دیے ان کا مختصر ذکر ذیل میں ہے:

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا کے باشندوں کو دی، یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لیے ہے۔ ان کے گرجوں میں نہ سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ گرائے جائیں گے۔ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی نہ کی جائے گی'' (۷۹)۔

مغربی مصنف ڈینی سن کا اعتراف:

مغربی مصنف ڈینی سن (Denison) اپنی تصنیف ''جذبات بحیثیت اساس تمدن'':

"EMOTIONS AS THE BASIS OF CIVILIZATION" میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے وقت دنیا کی حالت کے متعلق اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے:

''اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر پر چار ہزار سال صرف ہوئے تھے۔ منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوع انسانی پھر اسی بربّریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد وضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم وضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے انتشار اور تفرقہ، بربادی وہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آچکا تھا کہ جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔

یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کی ثقافت عرب کی سرزمین میں پیدا ہوئی جب اس کی اشد ضرورت تھی'' (۸۰)۔

یہاں یہ نکتہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، تحمل وبردباری، صبر وبرداشت کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اپنے بنیادی عقیدے سے صرف نظر کر لیا جائے، دوسروں کی خوشنودی کے لیے اپنی اقدار کو پامال کیا جائے یا کسی کو پامال کرنے کی اجازت دی جائے۔ رواداری کے مظاہرے کے لیے اپنی تہذیب وتمدن کو خیر باد کہنا ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ فرائض میں کوتاہی اور حدودِ الٰہی کی پامالی رواداری میں داخل نہیں، جہاں بھی اور جونہی حدود اللہ کی پامالی دیکھی جائے یا فرائض میں کوتاہی ہوتی نظر آئے حسب موقع اس کا سدّ باب کیا جائے۔

اس سلسلہ میں صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لائے اتنے میں ایک شخص آیا۔ اس نے نماز پڑھی اس کے بعد آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے جواب دے کر فرمایا جا کر نماز پڑھیے اس لیے کہ آپ نے نماز نہیں پڑھی۔ اس شخص نے نماز ادا کی اور حاضر ہو کر سلام کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ نماز پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس نے تین بار نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے تین بار یہی فرمایا۔ پھر اس نے عرض کیا اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اس سے بہتر کیا ہے۔ آپ مجھے سکھائیں پھر آپ ﷺ نے اسے نماز کا طریقہ سکھایا (۸۱)۔

اندازہ فرمائیے کہ آپ نے رکن اسلام کی صحیح ادائیگی کے لیے کسی قسم کی رعایت اور رواداری نہیں برتی بلکہ تین بار نماز کا اعادہ کرایا۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ قریش کی مخزومی عورت (فاطمہ بنت مخزوم) نے چوری کی جس نے قریش کو بہت غمگین کر دیا۔ انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں اس بارے میں بات کرنے کے لیے حضرت اسامہ جو رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھے بھیجا انھوں نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق بات کی۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ سے فرمایا تم حدود اللہ میں سے ایک حد میں سفارش کرتے ہو۔ پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے خطبہ پڑھا اور فرمایا:

''اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس بات سے ہلاک کیے گئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور کوئی غریب چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ اللہ کی قسم محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا'' (۸۲)۔

حضرت ابن عمرؓ بیان فرماتے ہیں۔ ایک یہودی مرد اور عورت حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لائے گئے، ان دونوں نے زنا کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تم اپنی کتاب (تورات) میں اس کے متعلق کیا حکم پاتے ہو، انھوں نے کہا ہمارے علماء نے کالا منہ کر کے گدھے پر الٹا سوار کرنا نکال رکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان سے فرمایئے تورات لائیں، چنانچہ تورات لائی گئی، ان میں سے ایک یہودی نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے پڑھنا شروع کیا۔ عبداللہؓ بن سلام نے کہا ہاتھ ہٹاؤ اس نے جونہی ہاتھ ہٹایا نیچے سے آیت رجم نکل آئی۔ آپ نے ان

دونوں (عورت ومرد) کے سنگسار کیے جانے کا حکم فرمایا چنانچہ دونوں سنگسار کیے گئے (۸۳)۔

کائنات کی عظیم ترین ہستی محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے متعلق دشنام طرازی، اور نازیبا کلمات کسی صورت بھی قابل برداشت نہیں، جو شخص اس گستاخی کا مرتکب ہوگا وہاں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نظر انداز کر دینا کمزوری ایمان کا اظہار ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ایک نابینا کی ام ولد باندی تھی جو نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیتی تھی آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتی تھی، یہ اس کو روکتا تھا مگر وہ باز نہ آتی تھی۔ یہ اسے ڈانٹتا تھا مگر وہ مانتی نہ تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات اس نے پھر نبی کریم ﷺ کو گالیاں دینی شروع کیں تو اس نابینا نے خنجر لیا اور اس کے پیٹ پر رکھ کر دبا دیا اور مار ڈالا۔ عورت کی ٹانگوں کے درمیان بچہ نکل پڑا جو کچھ وہاں تھا خون آلود ہوگیا۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ حضور ﷺ کے ہاں بیان کیا گیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کیا پھر فرمایا میں اس آدمی کو اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے جو کچھ کیا اس پر میرا حق ہے کہ وہ کھڑا ہو جائے وہ نابینا کھڑا ہوگیا، لوگوں کو پھلانگتا ہوا، کانپتا ہوا حضور ﷺ کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اسے مارنے والا ہوں۔ یہ آپ ﷺ کو گالیاں دیتی تھی اور گستاخیاں کرتی تھی، میں اسے روکتا تھا وہ باز نہیں آتی تھی، میں دھمکاتا تھا وہ ڈرتی نہ تھی۔ اس سے میرے دو بچے بھی ہیں اور وہ مجھ پر مہربان بھی تھی لیکن آج رات جب اس نے آپ ﷺ کو گالیاں بکنا اور برا بھلا کہنا شروع کیا تو میں نے خنجر لیا اس کے پیٹ پر رکھا، دبا دیا اور مار ڈالا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگو! گواہ رہو اس کے خون کا بدلہ نہیں'' (۸۴)۔

اسی طرح فتح مکہ کے دن عام معافی کا اعلان ہوا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو امان دی۔ ہر کس و ناکس کو معاف فرما دیا مگر چار افراد آپ کی شان میں گستاخی کے مرتکب تھے انھیں امان نہیں دی، وہ واجب القتل قرار پائے عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور سارہ نامی عورت شامل تھی، یہ سب قتل کیے گئے (۸۵)۔

یہودی جاہل شاعر کعب بن اشرف طائی یثربی جو مدینہ کے قریب قلعہ میں کھجوریں اور غلہ بیچتا تھا، آپ کے کنبہ قبیلہ اور مسلم خواتین کے متعلق ناروا شعر کہتا، آپ کی ہجو کرتا، اس نے جنگ بدر میں سرداران قریش کے ہلاک ہو جانے پر مرثیہ لکھا اور قریش کو انتقام پر اکسایا۔ اس لیے اس کا قتل جائز قرار دیا گیا، چنانچہ محمد بن مسلمہ انصاری نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ اسے قتل کیا اور اس کا سر جانوروں

کے توبڑہ میں ڈال دیا(۸۶)۔

اکیسویں صدی کے تقاضے اور تجاویز:

عالم اسلام اس وقت مشکل صورت حال سے دو چار ہے۔ عالمی نقشے میں شکست وریخت کا عمل حسب معمول جاری ہے اور کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اکیسویں صدی میں دنیا کی جغرافیائی شکل وصورت کیا ہوگی۔ اس صورت حال میں سب سے زیادہ خسارے میں مسلمان ہی نظر آ رہے ہیں۔ گو مختلف مسلم ممالک ان حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرت طیبہ کی روشنی میں ان حالات کے پیشِ نظر حکمت عملی تیار کی جائے تاکہ کھوئی ہوئی عزت نفس بحال ہو سکے۔

رواداری کے تقاضے اور چند تجاویز:

امت مسلمہ کو تمام تعصبات سے ہٹ کر ایک ضابطہ اخلاق مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت جو نام نہاد انسانی حقوق کی تنظیمیں N.G.O's رواداری اور انسانی حقوق کے نعرے لگا رہی ہیں اس وقت حرکت میں آتی ہیں جب حدود اللہ اور اسلام کے بنیادی نظریات وعقائد کے خلاف دشنام طرازی کرنے والوں کی گرفت کی جا رہی ہو۔ مثلاً آج کل روبینہ انصاری کی سزائے موت پر نام نہاد انسانی حقوق کے علمبردار مختلف تاثرات شائع کرر ہے ہیں جبکہ اسلام نے قاتل کے لیے سزا (قصاص) فرض کر دی ہے۔ حالانکہ تنظیموں کو ان علاقوں اور خطوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جہاں انسانی وجود کی توہین اور تذلیل ہو رہی ہے۔ عزتیں لٹ رہی ہیں، بلا جواز قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اس لیے ان نام نہاد تنظیموں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

بنیاد پرستی اور عقیدہ کی پختگی کے موقف پر استقامت کی ضرورت ہے، دوٹوک اور واضح موقف بیان کیا جائے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے سے نقصان کا احتمال ہے۔

زندگی کی تشکیل خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی سب مذہبی عقائد کے حوالے سے ہونی چاہیے عقائد، اخلاق وعبادات، قوانین ورسومات اور رواج سب ایک ہی کُل سے مربوط ہونے چاہییں ﴿یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾ (۸۷) (اے ایمان والو دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)۔

۱: مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ اور ذمہ دار افراد مشترکہ بنیادی اصول وضع کریں جس میں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ ہو۔

۲: متنازعہ مسائل کی اشاعت سے گریز کیا جائے۔

۳: پیشہ ور علماء اور مصنّفین جن کی تقریر و تحریر سے اسلامی اخوت و رواداری کو نقصان کا اندیشہ ہو کا محاسبہ کیا جائے۔

۴: نصاب تعلیم میں رواداری کا نہ صرف عنوان شامل کیا جائے بلکہ عملاً بھی اس کا مظاہرہ ہو۔

۵: سیرت طیبہ، حیات صحابہ اور اکابرین کے روادارانہ طرزِ عمل سے قوم کو آگاہ کیا جائے۔

۶: قتل و غارت پر قابو پانے کے لیے کسی قسم کی رو رعایت نہ برتی جائے۔ حدود اللہ کے نفاذ میں نرمی اختیار نہ کی جائے۔

مشرق و مغرب، ایشیاء و افریقہ دنیا کا ہر خطہ اور انسانیت کا ہر فرد رواداری انسان دوستی اور امن و سکون کا خواہاں ہے تاہم ہزار کوششوں کے باوجود روادار معاشرے کا وجود عنقا ہے۔ دنیا کی ہر سمت بدامنی، وسعت پسندی اور استعمار کے جنون میں قتل و غارت گری، نسل پرستی اور عدم رواداری کا دور دورہ ہے۔ امن و سکون، انسان دوستی کی متلاشی دنیا اگر فی الواقع اپنے مذکورہ دعوؤں میں مخلص ہے تو اسے نجات دہندہ انسانیت، پیغمبر اعظم و رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کی سیرت و تعلیمات کی روشنی میں (جو مساوات انسانی، انسان دوستی، عالمی اَمن کے قیام، رواداری کے فروغ اور انسانی فلاح و بہبود کی داعی ہے) رواداری کی خصوصیات اپنا کر اکیسویں صدی کے معاشرہ کو جو (Global Village) کا دعویدار ہے امن و آشتی اور صلح و خیر کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ مسائل افراد کے ہوں یا قومی ہوں ان کا حل صلح اور رواداری میں ہی ہے۔

مشہور فلسفی برنارڈ شا کے اس تجزیہ پر اپنی معروضات ختم کرنا چاہوں گا ''آج اگر محمد ﷺ کو حاکم مان لیا جائے تو امن قائم ہو سکتا ہے'': ؎

یہ ذاتِ مقدس تو ہے انسان کی محبوب
مسلم ہی نہیں وابستۂ دامانِ محمدؐ (۸۸)

حوالہ جات

۱۔ مہذب اللغات، ۶/۱۰۱۔

۲۔ البقرہ: ۱۱۳۔

۳۔ البروج: ۴-۶۔

۴۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (مجلس نشریات اسلام، کراچی) ص ۴۷۔

۵۔ انجیل متی (پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور)، ۱۰/۶، ۱۵/۲۵۔

۶۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی (دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی) ص ۳۲۸۔

۷۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۱ء) ۴/۱۷۹۔

۸۔ ابوالکلام آزاد، اسلام کا نظریہ جنگ (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) ص ۱۲۴۔

۹۔ سیرۃ النبی، ۴/۱۴۷۔

۱۰۔ عمر فروخ، تاریخ الجاہلیہ (دارالعلم، بیروت ۱۹۶۴ء) ص ۸۹۔

۱۱۔ ایضاً ص ۸۹۔

۱۲۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص ۴۷۔

۱۳۔ منصور پوری، قاضی سلمان، رحمۃ للعالمین (الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور) ۳/۳۷۸۔

14. The Daily Dawn, Karachi, 3March,1997.

15. P.K.Hitti, History of the Arabs(Mac Millan Co,ltd,London,1960).P.117.

۱۶۔ روز نامہ جنگ، ملتان (۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء) اداریہ: مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے وحشیانہ مظالم میں اضافہ۔

۱۷۔ ایضاً ص ۱۶۔

۱۸۔ البقرہ: ۲۸۵۔

۱۹۔ ایضاً، ۱۳۶۔

۲۰۔ النساء: ۱۵۰-۱۵۱۔

۲۱۔ الانفال: ۶۱۔

۲۲۔ الجاثیہ: ۱۴۔

۲۳۔ التوبہ: ۶۔

۲۴۔ آل عمران: ۶۴۔

۲۵۔ البقرہ: ۶۲۔

۲۶۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی (دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ایڈیشن ہفتم) ص ۳۳۰۔

۲۷۔ البقرہ: ۲۵۶۔

۲۸۔ رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی، ۳۳۱۔

۲۹۔ التوبہ: ۱۲۸۔

۳۰۔ آل عمران: ۱۵۹۔

۳۱۔ مبارکپوری، صفی الرحمن، الرحیق المختوم (المکتبہ السلفیہ، لاہور) ص ۶۴۷۔

۳۲۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبویؐ میں نظامِ حکمرانی (مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن) ص ۷۶۔

۳۳۔ الحج: ۴۰۔ ۳۴۔ احمد، المسند ۲/ ۳۸۱۔

۳۵۔ البخاری، الجامع الصحیح (باب حسن الخلق و السخا (تعليقا)) ص ۱۰۵۴، حدیث نمبر ۶۰۳۲۔

۳۶۔ احمد، المسند، ۳/ ۱۲۰۔

۳۷۔ الشعراء: ۲۰۔

۳۸۔ السیرۃ النبویۃ (مصطفیٰ البابی المصر) ۱/ ۳۱۷۔

۳۹۔ مبارکپوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، ص ۱۵۰۔

۴۰۔ ابن ھشام، السیرۃ النبویہ، ۱/ ۳۸۰۔

۴۱۔ الرحیق المختوم، ص ۱۵۳۔

۴۲۔ ایضاً ص ۱۵۵۔

۴۳۔ السیرۃ النبویۃ، ۱/ ۳۴۴؛ الرحیق المختوم، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

۴۴۔ ابن قیم، زاد المعاد (مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۸۶ء) ۳/ ۳۰۔

۴۵۔ السیرۃ النبویہ، ۲/ ۱۲۵-۱۲۶؛ الرحیق المختوم، ص ۲۶۹-۲۷۰۔

۴۶۔ السیرۃ النبویہ، ۲/ ۱۳۳-۱۳۴۔

۴۷۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ص ۱/ ۳۱۱۔

۴۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (دار صادر، بیروت، ۱۹۸۵ء) ۱/ ۲۱۲۔

۴۹۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۲۱۹۔

۵۰۔ ایضاً، ۲/ ۲۲۳۔

۵۱۔ ایضاً، ۲/ ۲۲۵۔

۵۲۔ ایضاً، ۱/ ۱۷۸۔

۵۳۔ السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۱۴۹-۱۵۰، الرحیق المختوم، ص ۳۱۹۔

۵۴۔ ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد (مطبعة النهضة العصرية، القاہرہ، ۱۹۴۷ء) ص ۲۲۷۔

۵۵۔ سیرۃ النبیؐ، ۱/ ۲۷۲۔

۵۶۔ سوامی لکشمن پرشاد، عرب کا چاند (مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور) ص ۳۵۳۔

۵۷۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۲۲۰۔

۵۸۔ آصف قدوائی، مقالات سیرت (مجلس نشریات اسلام، کراچی)، ۱۳۴۔

۵۹۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/۲۲۵۔ ۶۰۔ ایضاً۔
۶۱۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۱۱۳۷، حدیث نمبر ۲۶۱۳۔
۶۲۔ ایضاً، ص ۴۰، حدیث نمبر ۱۶۱-۱۶۲۔
۶۳۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۰۵۱، حدیث نمبر ۶۰۱۱۔
۶۴۔ الحجرات: ۱۰۔
۶۵۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۱۱۲۹، حدیث نمبر ۲۵۷۸۔
۶۶۔ ایضاً، ص ۵۱۵، حدیث نمبر ۲۹۵۰۔
۶۷۔ ترمذی، السنن (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۸۶۵، حدیث نمبر ۳۸۱۸۔
۶۸۔ سیرۃ النبیؐ، ۲/۹۷۔ ۶۹۔ ایضاً، ۲/۹۴۔
۷۰۔ ایضاً، ۲/۹۵۔ ۷۱۔ ایضاً، ۲/۹۴۔
۷۲۔ البقرہ: ۲۵۶۔
۷۳۔ ندوی، عبدالسلام، اسوۂ صحابہؓ (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد) ۲/۹۰۔
۷۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۴/ ۶۹۔
۷۵۔ سیرۃ النبیؐ، ۱/۳۱۴۔
۷۶۔ ابوداؤد، السنن، ص ۴۴۵، حدیث نمبر ۳۰۴۱۔
۷۷۔ اسوۂ صحابہؓ، ۲/۱۰۸۔
۷۸۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۲۴، حدیث نمبر ۵۱۵۲۔
۷۹۔ چراغ، محمد علی، حضرت عمر فاروق (نذیر پبلشرز لاہور) ص ۱۱۷۔
۸۰۔ ظفر علی شاہ، محسن انسانیتؐ (دعوہ اکیڈمی، اسلام آباد) ص ۶۔
۸۱۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۲۳، حدیث نمبر ۷۵۷۔
۸۲۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۷۴۸، حدیث نمبر ۴۴۱۰۔
۸۳۔ ایضاً، ص ۷۵۴، حدیث نمبر ۴۴۳۷؛ ابوداؤد، السنن، ص ۶۲۲، حدیث نمبر ۴۴۴۶۔
۸۴۔ القاضی، ابوالفضل عیاض بن موسیٰ، الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰؐ (دارالارقم بن ابی الارقم، بیروت ۲۰۰۲ء) ۲/ ۲۲۷۔
۸۵۔ سیرۃ النبیؐ، ۱/۳۱۳-۳۱۴۔ ۸۶۔ السیرۃ النبویہؐ، ۳/۵۴-۵۸۔
۸۷۔ البقرہ: ۲۰۸۔
۸۸۔ مراد آبادی، فانی، ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، ہندو شاعر شیش چندر سکسینا (سلمان کمپنی، لاہور) ص ۲۲۔

رواداری اور معاشرتی استحکام......سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

رواداری کے لغوی معنی تحمل اور برداشت کے ہیں جبکہ اصطلاحی مفہوم میں رواداری کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے: ''فکری واعتقادی، رنگ ونسل اورزبان ووطن کی بنیاد پر کسی عصبیت کا شکار ہوئے بغیر تحمل وبردباری سے دوسرے کو برداشت کرنا رواداری ہے''۔

رواداری کے مترادف لفظ Tolerance استعمال کیا جاتا ہے۔جس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

It is an attitude of respectful sympathy to the opinions and beliefs as contribution to the progress of the human spirit(1)

اسی طرح دینی رواداری سے مراد ہے کہ مذہب سے متعلق جو مختلف آراء اور نظریات ہیں ان کا احترام کیا جائے۔مذہبی، دینی یا معاشرتی معاملات میں دوسروں کے ساتھ فراخ دلی اور وسیع الخیالی کا برتاؤ، کسی دوسرے کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنا، رعایت کا رویہ، تحمل، وضعداری کا اظہار، ہر کس وناکس سے یکساں برتاؤ اور نرمی کا سلوک وغیرہ (۲)۔جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے رواداری کا مطلب ہے، مختلف اقوام، مختلف مذاہب، مختلف زبانوں اور رنگ ونسل کے وہ لوگ جو اسلامی حکومت کی حدود میں قیام پذیر ہوں، اُن کے ساتھ تعلقات اس طرز اور نہج پر استوار کرنا کہ عفو ودرگزر سے کام لیا جائے اور قدرت اور دسترس کے باوجود اپنے مخالف کی بات کو برداشت کرنا (۳)۔

تاریخ انسانی آج اپنے تہذیبی اور تمدنی سفر کے ایک بہت نازک موڑ پر کھڑی ہے۔انسانی تاریخ کا سفر جسے تاریخ دان پتھر کے دور سے شروع کرتے ہیں، اپنے ارتقائی مراحل طے کرکے جدید متمدن دور میں داخل ہو چکا ہے۔جدید دنیا کا سفر Pre-industrial، انڈسٹریل اور پوسٹ انڈسٹریل دور سے گلوبل ویلیج میں مدغم ہو رہا ہے۔جہاں انسان نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے جغرافیائی اور زمینی فاصلے کم کر دیے ہیں۔ہم چاہیں یا نہ چاہیں اس گلوبل سوسائٹی سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتے۔اس تہذیب نے جہاں جغرافیائی فاصلے اور زمینی دوریاں کم کی ہیں وہیں افراد کے باہمی فاصلے کچھ بڑھ سے گئے ہیں۔آج ہر طرف باہمی نفرت، عدم رواداری، تنازعات، خون ریزی ونسل کشی، تشدد وناروا سختی، فساد انگیزی، دل آزاری اور انتشار وفساد کے مظاہرے ہمارے سامنے ہو رہے ہیں۔

انفرادی یا اجتماعی سطح پر اس رویہ کا مظاہرہ کرنے والا کوئی ''عہد تاریک'' کا اجڈ یا وحشی نہیں بلکہ عصرِ حاضر کا سب سے مہذب و متمدن انسان ہونے کا دعویدار ہے۔ستم بالائے ستم یہ کہ گیارہ ستمبر کے واقعات نے ان فاصلوں کو مزید بڑھا دیا ہے۔اور اب بات افراد کے باہمی فاصلے ختم کرنے کی بجائے تہذیبوں کے تصادم کے نقارے بجنے تک پہنچ گئی ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نازک موڑ سے ہم واپس ازمنۂ وسطی یا پتھر کے دور میں پہنچ جائیں (۴)۔

چنانچہ ضرورت ایسے راست اقدام کی ہے جس کے ذریعے ترقی کو اس کی معراج کی طرف رواں کیا جائے خصوصاً مختلف الخیال و مختلف نظریات اور عقائد کے حامل گروہ ایک دوسرے کے لیے منافرت و مخاصمت کے جذبات کی بجائے محبت و امن اور رواداری و برداشت کے درس کو دہرائیں۔ تاریخ کے اوراق ایسے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں کہ نظریات و عقائد اور ثقافت و معاشرت کے تفاوت کے باوجود اس انسان نے بہترین سماجی امن و رواداری کا مظاہرہ کیا۔

قدیم ہندوستان کی ریاست گجرات کے راجہ یادورانا کے عہد کی بات ہے کہ ایران سے ایک قافلہ پھرتا پھراتا ریاست گجرات آ پہنچا، راجہ کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اس سے ریاست میں رہنے کی اجازت طلب کی۔راجہ نے انھیں ریاست کی شہریت دینے سے انکار کر دیا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق مہمان داری کے تقاضے کے تحت زبانی انکار کی بجائے اشاراتی زبان میں یوں جواب دیا کہ دودھ کا بھرا ہوا ایک گلاس وفد کو پیش کر دیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ امن و سکون کی شیرینی سے لبالب ہماری اس ریاست میں دوسروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔یا یوں کہہ لیں کہ شاید راجہ کو یہ اندیشہ تھا کہ زبان، نسل، مذہب اور ثقافت کے اختلاف سے ہماری سماجی وحدت اور معاشرتی استحکام میں فرق آ سکتا ہے۔

اس پر قافلے کا پیشوا آگے بڑھا اور اس دودھ سے لبالب بھرے گلاس میں کچھ شکر ڈال کر اسے راجہ کو پیش کر دیا۔گویا یہ مدعا تھا کہ اس لبالب گلاس میں ابھی مٹھاس کی گنجائش موجود ہے اور ہم اپنے رویہ سے مذہب، نسل اور ثقافتی اختلاف کے باوجود آپ کی سماجی زندگی میں تلخیاں گھولنے کی بجائے باہمی محبت و رواداری کی چاشنی سے اسے مزید دوآتشہ کر دیں گے۔اور یوں انھوں نے وہاں اپنے رہنے

کی اجازت حاصل کر لی (۵)۔

اس واقعہ میں یہ پیغام ہے کہ فکری یا نظریاتی اعتبار سے مختلف فیہ ہونے کے باوجود ایک ہی معاشرے کے فرد کی حیثیت سے ہم آپس میں محبت والفت، رواداری، امن وسکون کی مٹھاس دوسروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ معاشرتی استحکام کے لیے ایسا رویہ مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی سے ہی ممکن ہے۔

﴿لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ﴾ (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے) کے بنیادی اصول کے تحت اسلام اپنے پیروکاروں کی ایسی معاشرتی تربیت کرتا ہے کہ ہر فرد مذہبی اختلاف کے باوجود دوسرے لوگوں کے وجود کو قبول کرتا ہے اسے ایک اور پہلو سے بھی دیکھیں کہ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَالَّذِيْنَ هَادُواْ وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (۶) (یقین جانو کہ نبی عربی ؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے)۔

ڈاکٹر حمید اللہ ان آیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''صلح کل، رواداری اور انتہائی وسعت قلبی کی اس عجیب وغریب تعلیم میں کہیں نہیں کہا گیا کہ یہودی، عیسائی، صابی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کو ترک کریں بلکہ اپنے الہامی مذہب ہی کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی امور پر عمل کریں یعنی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو ماننا، مرنے کے بعد حساب کتاب کا یقین کرنا اور زندگی بھر صالح عمل کرنا یہ اجر ملنے اور خوف سے بچنے کے لیے کافی ہے (۷)

ہجرت مدینہ کے بعد مذہبی اعتبار سے نئے معاشرہ کے استحکام کے لیے ہمیں سیرت النبی ﷺ سے بہت اہم اصول میسر آتے ہیں، جن میں سے ایک اصول معاشرے میں موجود تمام گروہوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں اپنے مذہب کی آزادی دینا ہے جو رواداری کی ایک روشن مثال ہے۔ میثاق مدینہ میں بڑی صراحت سے بیان کیا گیا کہ:

ہر دو مذہبی فریق (مسلمان اور یہودی) اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں گے یعنی مسلمانوں کے

لیے مسلمانوں کا مذہب اور یہودیوں کے لیے یہودیوں کا مذہب۔

۲: یہود اور مسلمان باہم دوستانہ رکھیں گے(۸)۔

اس پر تبصرہ ملاحظہ ہو''تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کر لیجیے۔ اس سے بڑھ کر مفاہمت بین المذاہب کا وسیع عملی مظاہرہ دیکھنا کہاں نصیب ہوگا''(۹)۔

جبکہ محمد حسین ہیکل میثاق مدینہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ وہ تحریری معاہدہ ہے جس کی بدولت حضرت محمد ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ انسانی معاشرہ میں قائم کیا جس سے شرکاء معاہدہ میں سے ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوا۔ انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی''(۱۰)۔

یوں رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف دوسرے مذہب کے پیروکاروں کو ان کے معاملات میں آزادی دی گئی بلکہ ساتھ ہی معاشرتی عدم استحکام کا سبب بننے والے عوامل کی بیخ کنی بھی کی گئی۔ اس ضمن میں غیر مسلم کے ساتھ معاشرتی فاصلے پیدا کرنے کے ایک سبب کے بارے میں کہا گیا:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾(۱۱)

(اور (اہل ایمان) دشنام نہ دو ان معبودوں کو جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ (کفر وشرک کی) حد سے گزر کر از راہ جہالت اللہ (جل شانہ) کو گالیاں بکنے لگیں)۔

سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے مذہبی رواداری کے ضمن میں مسلمان کے لیے ایک قابل تقلید رویہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ دیگر اقوام یا ملل کے لوگ اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنے شخصی قانون کی پیروی کرنے میں پوری طرح آزاد ہوں گے۔

نجران سے ایک مسیحی وفد گفتگو کے لیے مدینہ منورہ آیا تو آپ ﷺ نے اس وفد کو مسجد میں نہ صرف ٹھہرایا بلکہ انھیں مسلمانوں کی اس مقدس عبادت گاہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت فرمائی۔ ان کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا جو کہ مذہبی رواداری اور سماجی آزادی کا بیّن ثبوت ہے:

''ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبى رسول الله على انفسهم وملتهم وارضهم واموالهم وغائبهم وشاهدهم وعيرهم وبعثهم. وامثلتهم لا يغير ما

كانوا عليه ولا يغير حق من حقوقهم وامثلتهم لا يُفتن اسقف من اسقفيته ولا راهب من رهبانية ولا واقه من وقاهيته على ما تحت ايديهم من قليل او كثير وليس عليهم رهق ولا دم جاهلية ولا يحشرون ولا يعشرون ولا يطأ ارضهم جيش من سأل منهم حقا فبينهم النصف غير الظالمين ولا مظلومين بنجران " (۱۲) (نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کا مال، ان کا حاضر و غائب ان کے قافلے اور ان کے قاصد اللہ اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں۔ ان کی موجودہ حالت میں تغیر نہیں کیا جائے گا نہ ان کے حقوق میں دست اندازی کی جائے گی۔ نہ کوئی اسقف راہب، نہ کوئی گرجا کا منتظم اپنے عہدے سے ہٹایا جائے گا۔ اور جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسی طرح رہے گا۔ ان کے حقوق کے مطالبہ میں ان سے انصاف کیا جائے گا، نہ ان سے فوجی خدمت لی جائے گی نہ ان کو ظلم کرنے دیا جائے گا اور نہ ہی ان پر ظلم کیا جائے گا)۔

کسی معاشرے کے استحکام کے اساسی عوامل میں عدل و انصاف بہت نمایاں ہے۔ کیونکہ ظلم و تعدی کسی بھی معاشرتی وحدت کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظلم کو اندھیرا قرار دیا ہے (۱۳) بلکہ غیر مسلم مظلوم کی طرف سے وکیل بن کر اللہ کے دربار میں اس کا مقدمہ پیش کرنے کا ذمہ لیا ہے:

"إلا من ظلم معاهداً أو كلفه فوق طاقته أو انتقصه أو أخذ منه شيئا بغير نفسه فأنا حجيجه يوم القيامة" (۱۴) (اگر کوئی شخص اس ذمہ داری اور گارنٹی کو مجروح کرے گا جو ایک غیر مسلم کو (اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے) دی گئی ہے یا اس ذمہ داری کے نتیجہ میں مسلمانوں پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو توڑے گا یا ان کی خلاف ورزی کرے گا تو میں کل قیامت کو اس غیر مسلم کی طرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوں گا اور اس مسلم سے غیر مسلم کو اس کا حق دلواؤں گا)۔

نظریاتی وحدت، سماجی ہم آہنگی، معاشرتی اتحاد و قومی یکجہتی معاشرتی استحکام کے لیے اساسی عناصر ہیں اور بردباری، برداشت، رواداری، تحمل، باہمی محبت وہ رویے ہیں جو اسے مضبوط کر سکتے ہیں اور انھی کے لیے معاشرتی روابط کو فروغ دیا گیا۔

مذہبی وسماجی ہم آہنگی کے لیے معاشرتی روابط کو فروغ دیا گیا مثلاً "اکل و شرب" کے حوالے سے مسلمان اور اہل کتاب ایک ہی دستر خوان پر اکھٹے ہو سکتے ہیں۔ مسلم افراد کو اہل کتاب سے نکاح کی اجازت دی گئی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ (۱۵) (اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، بشرط یہ کہ تم اُن کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا)۔

تاریخ گواہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ کی ان زریں تعلیمات نے معاشرتی استحکام کی ایک تابناک روایت ڈالی کیونکہ معاشرتی استحکام اور امن وسکون کی بنیاد افراد کی تعمیر کردہ پرشکوہ عالیشان عمارتوں یا تہہ خاک پوشیدہ خزائن کی مرہون منت نہیں بلکہ تحمل و برداشت، رواداری اور سماجی و مذہبی ہم آہنگی جیسی اعلیٰ روایات واقدار اس اساس و بنیاد کی مضبوطی واستحکام کی ضامن ہیں۔

رواداری انسانی تمدن کا جزو اعظم ہے اور اعلیٰ درجہ کی شائستہ ثقافت بھی۔ یہ ایک ایسا شاندار منشور ہے جسے انسانیت کے لیے مذہب نے عطا کیا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر مدّ نظر رہے کہ مذہبی رواداری اسی صورت پنپ سکتی ہے جب ہم سمجھ لیں کہ مذہب انسانوں کے درمیان دوری اور تفریق پیدا نہیں کرتا اور یہ تاثر غلط فہمی پر مبنی ہے کہ مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کرتا ہے۔ مذہب کے نام پر مذہب سے روگردانی کی صحیح تصویر کشی انیسویں صدی کے روسی ناول نگار دوستوفسکی کے ناول "The possessed" میں کی گئی ہے۔ جس میں دکھلایا گیا ہے کہ کلیسا کے نام پر محکمہ احتساب والوں پکڑ دھکڑ اور محاسبہ کرر ہے ہیں اور بے دینوں (غیر مسیحیوں/کلیسا کے

سے روگردانی کرنے والوں) کو دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں پھینکا جا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر تشریف لاتے ہیں اور ان طریقوں کی کھلی مذمت کرتے ہیں تو ان پر دین سے انحراف کا الزام لگا کر محتسب اعلیٰ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اپنے دفاع میں دلائل پیش کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ تم نہیں جانتے میں ہی مسیحی مذہب کا بانی ہوں۔ محتسب اعلیٰ اس پر مناسب تعظیم بجا لاتا ہے اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ اب مسیحیت کے معنی وہ ہیں جسے مسیحی کلیسا درست سمجھتا ہو(۱۶)۔

یہ مذہب کا غلط استعمال ہے جو ایک ہی عقیدہ کو ماننے والوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ جب کہ مذہب رواداری، معاشرتی استحکام اور بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا اعلیٰ نمونہ سیرت النبی ﷺ کی تعلیمات میں جھلکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے غیر مذہب کے پیروکاروں سے ''و لقد کرمنا بنی آدم'' کے تحت بھائی چارے اور رواداری کا سلوک کیا آپؐ جب غیر مسلم بادشاہوں کو خط لکھتے تو ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع کرتے اور ساتھ ''سلام علی من اتبع الھدی'' لکھتے (۱۷)۔

اسی طرح ایک یہودی کا جنازہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے تو صحابہ ؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ہے تو انسان (۱۸)۔

مذہب کو ''فی سبیل اللہ فساد'' بنا کر معاشرتی عدم استحکام کا ذریعہ بنانے کی بجائے اس کی مشترکہ مذہبی اقدار و روایات کے ذریعے اتحاد و اتفاق کا پلیٹ فارم بھی بنایا جا سکتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ (۱۹)

(''اے اہل کتاب'' آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے)۔

عصر حاضر میں مسائل کے حل میں ''تنازع یا مذاکرات'' میں سے مذاکرات کا پہلو زیادہ ثمر آور اور نتیجہ خیز خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں ہمیں اسلامی رویہ کا ایک بنیادی اصول ملتا ہے کہ جو مشترک ہے اس پر اتفاق کر لیں یہ جبھی ہو گا جب ہم رواداری کا اظہار کرتے ہوئے ''غیر مذہب'' کے لوگوں کے ساتھ مذاکرات پر راضی ہوں گے۔

ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ ایڈورڈ گبن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''اسلام نے کسی مذہب میں دست اندازی نہیں کی۔ کسی کو ایذا نہیں دی، کوئی مذہبی عدالت غیر مذاہب کے مخالفین کی سزا کے لیے قائم نہیں کی اور اسلام نے لوگوں کو مذہب بہ جبر تبدیل کرنے کا بھی قصد نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فاتحین کے مساوی حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق میں اور ہر ملک میں جہاں اسے وسعت حاصل ہوتی ہے وہاں دوسرے مذاہب سے عدم مزاحمت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شاعر نے ان واقعات کو دیکھ کر جن کا ذکر ہم کر رہے ہیں بارہ سو سال بعد اعلانیہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی روئے زمین پر ایک ایسی قوم ہیں جو دوسرے مذاہب والوں کو ہر قسم کی آزادی فراہم کرتے ہیں'' (۲۰)۔

مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کے لیے درج ذیل امور کی پاسداری معاشرتی استحکام میں مدد معاون ثابت ہو سکتی ہے:

- دیگر مذاہب کو خود ساختہ یا غلط تعبیر misinterpretation کے ذریعے غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے (جیسا کہ مغرب میں اسلام کی تصویر کشی کی جاتی ہے)۔
- افراد، گروہ اور حکومتی سطح پر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا مظاہرہ کیا جائے۔
- مشترک تعلیمات اور روایات پر متفق ہو کر معاشرے میں ان کی تشہیر کی جائے۔

مذہبی اور سماجی مسائل کو آداب وحدود کے اندر رہتے ہوئے علمی سطح پر زیر بحث لایا جائے اور غیر علمی امور اور متعصّبانہ روش کو ختم کیا جائے۔ ان امور کے حصول کے لیے آنحضرت ﷺ کی سیرت کا مطالعہ اور اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

اس تمام گفتگو کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ دورِ حاضر میں معاشرتی استحکام اور مذہبی رواداری کا حصول سیرۃ النبیؐ پر عمل کے بغیر ممکن نہیں۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

1. Marian Makins and others, Collins English Dictionary,(London)1620; Bernard ;New Lexicon Webster's Dictionary of the English Language,P.189.

۲۔ مہذب اللغات، ۱۰۱/۶۔

۳۔ ظفر، عبدالرؤف، ڈاکٹر، رواداری سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں (مجلّہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی ۲۰۰۵ء) ص ۱۰-۳۴۔

۴۔ ۹/۱۱ کے واقعہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے واقعات کا ردعمل ہمارے سامنے ہے۔ جب جدید دنیا کے سب سے مہذب ہونے کی دعویدار سپر پاور کی طرف سے ان کے ساتھ عدم اتفاق کی صورت میں مخاطب کو صلیبی جنگیں اور پتھر کے دور میں پہنچانے کی بازگشت سنائی دی تھی۔

۵۔ وحید الدین خاں، کتاب زندگی (دار التذکیر، لاہور) ص ۵۳۔

۶۔ البقرۃ: ۶۲۔

۷۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، رسول اللہ کی سیاسی زندگی (دار الاشاعت کراچی، ایڈیشن ہفتم) ص ۳۳۰۔

۸۔ ایضاً، الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ (دار الارشاد، بیروت، ۱۹۶۹ء) ص ۴۴۔

۹۔ ایضاً، عہد نبوی میں نظام حکمرانی (اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۱ء) ص ۲۵۱-۲۵۹۔

۱۰۔ ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد (مکتبۃ النھضۃ العصریۃ، القاہرہ، ۱۹۴۷ء) ص ۲۲۷۔

۱۱۔ الانعام: ۱۰۸۔

۱۲۔ البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان (مؤسسۃ المعارف، بیروت ۱۹۸۷ء) ص ۷۱-۷۲۔

۱۳۔ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض، ۱۹۹۸ء، طبع اول) ص ۱۱۲۹، حدیث نمبر ۶۷۵۶۔

۱۴۔ قاضی ابو یوسف، یعقوب بن ابراھیم، کتاب الخراج (المطبعۃ السلفیۃ، القاھرۃ ۱۳۹۷ھ) ص ۱۳۵-۱۳۶۔

۱۵۔ المائدہ: ۵۔

16. Foyodor Dostoevsky, The possessed, kinlage Classices USA,1995.

۱۷۔ خضری بک، محمد، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین (دار احیاء التراث، بیروت) ص ۱۸۲، ۱۸۵-۱۹۰۔

۱۸۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (مکتبہ دار السلام، الریاض، ۱۹۹۹ء، طبع ثانی) ص ۱۱۳، حدیث نمبر ۱۳۱۲۔

۱۹۔ آل عمران: ۶۴۔

۲۰۔ محمد ثانی، حافظ، ڈاکٹر، تجلیات سیرت (فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۶ء) ص ۱۱۰-۱۱۱۔

باب چہارم

سیرت نبوی ﷺ اور معیشت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است
این تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰ است

سلسلہ انبیاء کرام علیہم السلام کی آخری کڑی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ انسانِ کامل تھے۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں حضور ﷺ کی زندگی سے راہنمائی نہ ملتی ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۱) (درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ تھا)۔

عبادت اور زہد سے معاملاتِ حکومت تک کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس میں آپ ﷺ کی طرف سے ہدایت نہ ملتی ہو۔ آج کل کی اس مادی دنیا میں ہر آدمی حریص ہے، مالدار اور کروڑ پتی ہونے کے باوجود ھل من مزید کی صدا لگا رہا ہے۔ اسی طرح فقیر بھی قُوتِ لایموت پر قانع نہیں ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے تربیت یافتہ حضرات کی حالت یہ تھی:

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا (۲)

غور طلب بات تو یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے ساتھیوں کی خودداری اس درجے پر تھی تو خود آنحضور ﷺ کا کیا عالم ہوگا۔ آپ ﷺ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس میں معاشی استحکام نہیں تھا۔ غریب لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی جو بعض اوقات حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر درختوں کے پتے اور سوکھا چمڑا تک کھانے پر مجبور ہو جاتے (۳)۔ شعبِ ابی طالب میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر جو حالات گزرے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ عرب معاشرے میں غرباء کے بالمقابل امراء عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، وہ سودی کاروبار کرتے تھے۔ شراب نوشی اور جواء عام تھا۔ رقص وسرود کی محفلیں عام منعقد ہوتی تھیں۔ حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ چوری اور ڈکیتی عام تھی عورتوں کی حیثیت حیوانات کی سی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح بیل ذریعہ زراعت ہیں، اسی طرح عورت ذریعہ تسکینِ شہوت ہے اولاد کو خرچ کے ڈر سے قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ غلامی کا رواج عام تھا مگر غلاموں

کے کوئی حقوق نہ تھے بلکہ ان پر ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھا جاتا تھا۔قرآن مجید میں اس دور کے حالات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴾ (۴) (خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے)۔

زندگی مسائل سے عبارت ہے اور ان مسائل میں معاشی مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کہ ہر دور میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات معیشت کی تنگی کی وجہ سے انسان دین کا نقصان کر بیٹھتا ہے۔آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کاد الفقر ان یکون کفراً'' (۵) (ممکن ہے کہ محتاجی انسان کو کفر تک پہنچا دے)۔

رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ سے معاشی زندگی کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل کے عرب کے معاشی نظام کا مطالعہ کیا جائے۔

عرب کا نظام معیشت:

اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ عرب کے قدیم معاشی نظام کو موجودہ دور کے معاشی نظریات کے مطابق نظام قرار دے سکتے یا نہیں۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے پہلے عرب کے معاشی نظام میں تجارت، زراعت، صنعت وحرفت اور دیگر پیشے شامل تھے۔ان میں سے تجارت کو لیجیے۔عرب بحیثیت تجارت پیشہ قوم کے دیگر اقوام عالم میں مشہور تھے۔عرب میں کاشت کاری، صنعت وحرفت وغیرہ بھی رائج تھی لیکن عرب کی ریتلی اور چٹیل زمین نے عربوں کو تجارت کی طرف پھیر دیا۔

عرب کے چند علاقے طائف، یثرب (مدینہ منورہ) وغیرہ زرخیز تھے۔لیکن مکہ مکرمہ بیت اللہ کی وجہ سے مقدس خیال کیا جاتا تھا۔دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ بیت اللہ کا طواف وزیارت کرنے کے لیے آتے تھے۔ یہ روز اوّل سے محفوظ ترین مقام تصور کیا جاتا تھا۔دیگر ملکوں سے تجارتی سامان خرید کر دنیا کے مختلف حصوں میں لے جاتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ کی جائے ولادت مکہ مکرمہ ہے۔اہل مکہ سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر کرتے تھے۔موسم سرما میں یمن کا اور موسم گرما میں شام کا سفر کرتے تھے۔قریش کے ان تجارتی اسفار کو قرآن مجید

میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۔ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۔ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۔ الَّذِيْ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ﴾(۶) (چونکہ قریش مانوس ہوئے، (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے، لہٰذا اُن کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا)۔

تاریخی لحاظ سے یہ اسفار رسول اکرم ﷺ کے پردادا ہاشم سے شروع ہوتے ہیں۔ امام ابن جریرؒ نے لکھا ہے: ''ایک دفعہ قریش پر قحط پڑا تو وہ فلسطین گئے اور وہاں سے اپنی قوم کے لیے آٹا وافر مقدار میں لائے۔ جس کی روٹیاں پکوائیں اور بہت سے جانور ذبح کر کے گوشت اور شوربہ میں روٹیوں کا چورہ ڈلوا کر ثرید بنوایا۔ بھوکوں کو کھلاتے اور ان کا علاج کرتے رہتے تھے۔ اس مہمان نوازی کی وجہ سے ان کا نام ہاشم (روٹی چورنے والا) مشہور ہو گیا(۷)۔

ہاشم ہر سال شام اور فلسطین کا تجارتی سفر کرتے تھے۔ اس طرح وہ اور ان کا خاندان قریش معاشی طور پر خوش حال تھا۔ اور قریش کے لغوی معنی تجارت اور کسب کرنے والا ہے، اس طرح خاندان قریش اسم بامسمیٰ بن چکا تھا۔ قریش کے مرد و زن یکساں طور پر تجارت کیا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ مکہ کی مشہور تاجر خاتون تھیں۔

مکہ کے تاجر جنوبی یمن، ہند اور افریقہ سے خوشبوئیں اور گرم مصالحہ جات اور جڑی بوٹیاں درآمد کیا کرتے تھے اور چین سے ریشم، عدن سے قیمتی کپڑے، افریقہ سے غلام اور خصوصاً ریشم، روئی اور مخمل کے نفیس کپڑے، شام سے ہتھیار، اناج اور تیل، افریقہ سے ہاتھی دانت کی مصنوعات، سونے کی مٹی وغیرہ کی تجارت کرتے تھے(۸)۔

اس وقت طریقۂ تجارت یعنی مال کے بدلے مال یعنی (Barter System) رائج تھا۔ البتہ مختلف اقوام کے اپنے اپنے سکّے بھی تھے۔ ان میں سے زیادہ معروف درج ذیل ہیں۔

۱: دینار:

یہ سکہ سب سے زیادہ مکہ، یثرب (مدینہ منورہ) بازنطینی ریاستوں، روم، مصر، شام وغیرہ میں رائج تھا۔ قریش کے تاجر زیادہ تر انھی ملکوں میں تجارت کرتے تھے(۹)۔

❷ درہم: یہ عراق، فارس وغیرہ میں رائج تھا(۱۰)۔

تجارت کے علاوہ زراعت، صنعت وحرفت اور غارت گری وغیرہ بھی ذریعہ معاش تھے۔

آپ ﷺ کی معاشی سرگرمیاں قبل نبوت:

آپ ﷺ کی پیدائش سے قبل ہی والد فوت ہو چکے تھے۔ والد نے کوئی قابل ذکر جائیداد بھی نہیں چھوڑی تھی۔ وراثت میں پانچ اُونٹ، چند بھیڑیں اور ایک لونڈی ام ایمن تھی۔ اس طرح پیدائش کے وقت آپ ﷺ مفلس اور یتیم تھے۔ اس کی طرف قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَأَغْنٰى﴾ (۱۱) (ہم نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا)۔

اس پر مستزاد چھ سال کی عمر میں والدہ بھی فوت ہوگئی۔ ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے دادا نے لے لیا اور نہایت محبت سے پرورش شروع کی لیکن کچھ عرصہ بعد جب وہ بھی فوت ہوگئے تو پرورش کی ذمہ داری آپ ﷺ کے چچا جناب ابو طالب نے لے لی۔ بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ کے چچا زبیر نے پرورش کی تھی۔ عبدالمطلب نے ابو طالب کو حضور ﷺ کی پرورش کے متعلق وصیت کی تھی۔ ابو طالب بھی دیگر اُمراء قریش کی طرح تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک بار جب انھوں نے شام کی طرف تجارت کا قصد کیا تو حضور ﷺ نے بھی ساتھ جانے کا اشتیاق ظاہر فرمایا جس پر وہ آپ ﷺ کو بھی ساتھ لے گئے۔ اسی سفر میں ایک پڑاؤ پر بحیرا نامی ایک راہب نے آپ ﷺ کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ آپ ﷺ نبی ہیں کیونکہ ان کی کتابوں میں آخری نبی کی علامتیں لکھی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے آپ ﷺ کے چچا کو آپ ﷺ کے واپس لے جانے کا مشورہ دیا(۱۲)۔ چنانچہ وہ واپس مکہ مکرمہ لے گئے۔ آپ ﷺ نے بچپن میں حضرت حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے دوران اور بعد میں نبوت سے قبل اہل مکہ کی بکریاں بھی چرائیں۔ اور یہ بات رسول اللہ ﷺ نے دورِ نبوت میں خود بیان فرمائی اور ذرا عار محسوس نہ کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"مابعث اللّٰہ نبیاً الارعی الغنم" (۱۳)

(اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا ہے کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں)۔ آپ ﷺ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ آپ ﷺ نے بھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں چرائی ہیں۔

جب آپ ﷺ نے جوانی میں قدم رکھا تو آپ ﷺ نے بھی تجارت کو ذریعہ معاش کے طور پر اپنایا اور لوگوں کے مال سے تجارت کرنا شروع کر دی۔ تجارت آپ ﷺ کا آبائی پیشہ تھا۔ بعض تو قریش کی وجہ تسمیہ بھی ان کی تجارت ہی کو قرار دیتے ہیں، لفظ قریش قرش، یقرش سے ماخوذ ہے جس کے معنی کمانے کے ہیں (۱۴)۔ قبیلہ قریش میں جس شخص نے تجارت میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی اور روم و ایران اور دیگر ممالک کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے، وہ ہاشم تھا (۱۵)۔

عرب میں اس دور میں یہ رواج تھا کہ لوگ کسی دیانت دار آدمی کو اپنے ساتھ ملا لیتے اور یہ شرط ہوتی کہ وہ ان کا مال لے کر باہر جائے اور نفع میں شریک ہو، گویا یہ ایک تجارتی ایجنسی کی شکل تھی۔ آپ ﷺ کی دیانت اور امانت کا شہرہ بہت ہو چکا تھا اس لیے آپ ﷺ کو لوگوں کے پاس جانے کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ لوگ خود اپنا مال لا کر حضور ﷺ کے حوالے کرتے۔ زیادہ نفع اور دیانت و امانت کی بنا پر لوگوں کا رحجان آپ ﷺ کی طرف بہت بڑھ گیا، جو لوگ آنحضور ﷺ کے ساتھ شریکِ سفر ہوتے وہ آپ ﷺ کی بہت تعریف کرتے۔ ابتدا میں آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء اور حضرت قیس بن سائب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے خود بیان کیا کہ آپ ﷺ دیانت داری میں بے مثال تھے۔ ان سے لین دین کے معاملہ میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ ایک دفعہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آپ ﷺ سے کوئی معاملہ کیا اور کہا کہ میرے آنے تک آپ ﷺ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور اپنے کام میں اس حد تک مشغول ہوئے کہ اپنی بات بھول گئے [illegible] وہیں رہے اور آپ ﷺ نے وعدہ پورا کرنے کے لیے تین دن تک وہاں قیام فرمایا، وہ تین [illegible] آئے تو بہت شرمندہ ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

"لقد شققت علی انا ھٰھنا منذ ثلثٍ انتظرك" (۱۶)

(تم نے مجھے تکلیف دی ہے میں تین دن سے یہاں پر تیرا انتظار کر رہا ہوں)

آپ ﷺ کی دیانت اور شرافت سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہؓ نے جو قبیلہ قریش کی ایک مشہور بیوہ خاتون تھیں، اپنا تجارتی سامان دے کر شام بھیجا (۱۷)۔ اور دو گنا نفع طے کیا اور اپنے غلام میسرہ کو ساتھ بھیج دیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سامان کو بہت زیادہ نفع کے ساتھ نہایت دیانتداری سے فروخت

کیا۔میسرہ نے اس سفر کے تمام حالات حضرت خدیجہؓ کے گوش گزار کیے(۱۸)۔پچیس سال کی عمر تک آنحضور ﷺ تجارت ہی کرتے رہے۔آپ ﷺ نے شام، بصرہ، فلسطین، بحرین، کویت، مسقط اور عمان کے سفر کیے۔حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے ذاتی اوصاف اور تجارت میں حسن معاملہ سے متاثر ہوکر آپ ﷺ کو شادی کا پیغام بھیجا۔جسے آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کے مشورہ سے قبول فرمایا۔آپ ﷺ کا خطبہ نکاح بھی ابوطالب نے پڑھایا تھا(۱۹)۔قرآن مجید میں ہے: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَأَغْنٰى﴾(۲۰) (اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کردیا)۔بعض روایات کے مطابق اس آیت میں حضرت خدیجہؓ سے نکاح کی طرف اشارہ ہے۔شادی کے بعد تقریباً بارہ سال تک آپ تجارت کرتے رہے۔تجارت کے پیشے میں میاں بیوی کا مشترکہ کاروبار تھا(۲۱)۔بعدازاں اوروں کے ہاتھوں سامان تجارت باہر کے ممالک میں بھیجتے تھے۔ایک دفعہ آپ ﷺ نے اپنا سامان تجارت ابوسفیان بن حرب کی شراکت میں شام بھیجا اور منافع کمایا(۲۲)۔

کچھ عرصہ بعد آپؐ کی طبیعت تنہائی پسند ہوگئی۔آپ ﷺ گفتگو بہت کم فرماتے تھے اور زیادہ تر غور وفکر میں مصروف رہتے تھے۔آپ ﷺ کھانے کا کچھ سامان لے کر مکہ سے تین میل کے فاصلے پر واقع غار حراء میں تشریف لے جاتے۔سامان ختم ہوجاتا تو آپ ﷺ واپس تشریف لے آتے،کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ حضرت خدیجہؓ خود اس مشکل مقام تک آپ ﷺ کو کھانا دینے جایا کرتی تھیں۔

نبوت کے بعد آپ ﷺ کی معاشی سرگرمیاں:

اِسی غار میں چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔نزول وحی کے بعد آپ ﷺ نے تیرہ برس مکہ میں گزارے لیکن یہ دور مشکلات کا دور تھا اور کوئی خوشحالی نہ تھی۔اسی دوران آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کا اور آپ ﷺ کے خاندان والوں کا تین سال تک معاشرتی بائیکاٹ بھی کیا گیا۔یہ مدت آپ ﷺ نے ساتھیوں کے ہمراہ شعب ابی طالب میں گزاری(۲۳)۔بعد میں جب بائیکاٹ ختم ہوا تو مسلمانوں پر اور بھی ظلم وستم روا رکھے گئے۔انھی مظالم کو دیکھتے ہوئے اللہ کے حکم پر آپ ﷺ نے بالآخر مسلمانوں کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ عازمِ مدینہ ہوئے۔قرآن مجید میں ہے: ﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ

أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ﴾ (۲۴) (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کرلیں یا قتل کرڈالیں یا جلا وطن کردیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے)۔

جب آپ ﷺ مکہ سے نکلے تو آپ ﷺ کے پاس کچھ بھی نہ تھا زادِ راہ کا انتظام بھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کیا (۲۵)۔ جب مدینہ پہنچے اور مسجد بنانے کا قصد کیا تو مسجد نبویؐ کے لیے دو یتیم بچوں سے خریدی جانے والی زمین کی قیمت بھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ادا کی۔ مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے اس چھوٹی سی اسلامی ریاست کو مستحکم کرنے کی اَنتھک کوششیں فرمائیں اور اپنی معاشی حالت کی طرف کوئی توجہ نہ دی جس کی اصل وجہ آپ ﷺ کی قناعت پسندی تھی۔ دنیاوی مال و دولت کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے کبھی بھی کوشش نہ کی بلکہ آپ ﷺ کے پاس جو کچھ آتا اس کو بھی غرباء پر خرچ کرڈالتے۔ بعض اوقات گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "ما شبع آل محمد ﷺ من خبز شعیر یومین متتا بعین حتیٰ قبض رسول اللّٰہ ﷺ" (۲۶) (آلِ محمد ﷺ نے دو دن تک سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی)۔

آپ ﷺ خود یہ دُعا فرمایا کرتے: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا" (۲۷) (اے اللہ آلِ محمد ﷺ کا رزق ضرورت کے مطابق رکھ)۔ آپ ﷺ کے لباس میں بھی ہمیشہ سادگی ہوتی، خود فرمایا کرتے کہ: "انما انا عبد البس کما یلبس العبد" (۲۸) (میں تو خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں)۔

آپ ﷺ کبھی ریشمی لباس نہ پہنتے، لباس کے معاملہ میں قرآنِ مجید کی اس آیہء مبارکہ کے مطابق آپ ﷺ عمل کرتے جس میں ارشادِ خداوندی ہے کہ: ﴿ يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشاً وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ (۲۹) (اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے)۔

آپ ﷺ کسی بھی معاملہ میں نمائش کے قائل نہ تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کا خود خیال رکھتے بکریوں کا دودھ دوہ لیتے اور اسی طرح کے اور بہت سے دوسرے کام بھی کر لیتے، آپ ﷺ کی گھریلو زندگی بھی بہت سادہ تھی۔ گھر کے سامان میں ایک لکڑی کا پیالہ زیادہ تر کھانے پینے میں استعمال ہوتا اور اس پیالہ کا نام ریان تھا (۳۰) چمڑے کے گدے کا بستر جس میں کھجور کی چھال تھی، بان کی چارپائی ٹاٹ کا بستر وغیرہ جیسی چیزیں شامل تھیں۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے جسم اطہر پر نشان دیکھے تو آبدیدہ ہو گئے۔ آپ ﷺ نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپ ﷺ کا یہ حال ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**لھم الدنیا ولنا الآخرۃ**" (۳۱) (ان کے لیے دنیا ہے اور ہمارے لیے آخرت ہے)۔

آپ ﷺ ہمیشہ ہی دنیا کی زندگی کی بے وقعتی اور آخرت کی بقا کو سامنے رکھتے، ایک بار آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے لیے دعا کرتے ہوئے آخرت کا ذکر یوں کیا: "**اللھم لاعیش الا عیش الآخرہ فاغفر الانصار و المھاجرہ**" (۳۲) (اے اللہ اصل زندگی آخرت ہی کی ہے انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما)۔

اگر کوئی چیز گھر میں ہوتی تو آپ ﷺ سب سے پہلے اصحابِ صفہ کا خیال کرتے۔ اسی طرح فتوحات کی صورت میں جو مال آتا اس کو آپ ﷺ شام ہونے سے قبل تقسیم فرما دیتے چھ ھ میں جنگ خیبر ہوئی اور فدک کی زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تو آپ ﷺ اس سے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنھن کو ان کا خرچ دیتے (۳۳)۔ آپ ﷺ وفود کی مہمان نوازی کرتے اور اصحابِ صفہ کے خرچ کا خیال کرتے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو یہ سبق دیا کہ دنیا محض ایک مسافر خانہ کی مانند ہے اصل زندگی آخرت کی ہے لہٰذا اسی کے لیے ہمیں تیاری کرنی چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ (۳۴) (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اور اس کے عوض میں انھیں جنت ملے گی)۔

گویا دنیا کی تمام تکالیف کا بدل مؤمن کے لیے جنت کی صورت میں ہوگا۔ حضرت علیؓ

سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئیں تا کہ آپ ﷺ کو بتایا جائے کہ چکی پینے کی وجہ سے ان کے ہاتھ زخمی ہو گئے لہٰذا وہ آپ کو کوئی لونڈی دیں۔ ان دنوں حضور ﷺ کے پاس کچھ لونڈیاں آئی تھیں۔ آپ آنحضور ﷺ کے گھر پہنچیں تو آپ ﷺ موجود نہ تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت عائشہؓ سے اس بات کا ذکر فرمایا اور گھر واپس آ گئیں، جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ بات بتائی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے جبکہ ہم اپنے بستروں پر تھے، ہم اپنے بستروں سے اٹھنے لگے تو فرمایا اپنی جگہ پر ہی رہو پھر آپ ﷺ میرے اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان بیٹھ گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک مجھے اپنے پیٹ پر محسوس ہوئی اور فرمایا کہ کیا میں آپ دونوں کو آپ کے سوال سے بہتر چیز نہ بتاؤں جب آپ بستر پر جاؤ ۳۳ بار **سبحان اللّٰہ**، ۳۳ بار **الحمد للّٰہ** اور ۳۴ بار **اللّٰہ اکبر** کہا کرو۔ یہ تمھارے لیے خادم سے بہتر ہے (۳۵)۔

آپ ﷺ نے اپنی ذاتی جائداد کوئی نہیں چھوڑی بلکہ ایک اصول بیان فرمایا کہ: "**ولا نورث ماتر کنا صدقة**" (۳۶) (ہم وارث نہیں بناتے ہیں جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں صدقہ ہوتا ہے)۔ آپ ﷺ یہ دعا بھی فرمایا کرتے کہ:

"**اللّٰھم احیینی مسکینًا وامتنی مسکینًا واحشرنی فی زمرة المساکین یوم القیامة**" (۳۷) (اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکین ہونے کی حالت میں موت دے اور مساکین کے گروہ میں سے ہی قیامت کے دن اُٹھانا)۔

یہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کی ایک جھلک تھی۔ آپ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت اور قرآن و حدیث میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے معاشی میدان میں بہت اصلاح کی۔ رزقِ حلال کی تاکید کی اور تجارت میں دیانت، رشوت کا خاتمہ، احتکار کی مخالفت، مزدور سے حسنِ معاملہ، انفاق فی سبیل اللہ، سود کی حرمت اور افلاس کے خاتمہ کے متعلق آپ ﷺ کے چند ارشاداتِ عالیہ درج ذیل ہیں:

ا: "**طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة**" (۳۸)

(کسبِ حلال، فریضہ الٰہی کے بعد سب سے اہم فریضہ ہے)

۲: "التاجر الصدوق الامین مع النبیین و الصدیقین و الشہداءِ"(۳۹)
(امین اور سچا تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا)۔

۳: "المحتکر ملعون"(۴۰)(ذخیرہ اندوزی کرنے والا آدمی ملعون ہے)۔

۴: "خیر الکسب کسب یدی العامل اذا نصح"(۴۱)
(بہترین کمائی ہاتھ کی کمائی ہے جبکہ کرنے والا خیرخواہ ہو)۔

۵: "لعن رسول اللّٰہ الراشی والمرتشی" (۴۲)
(آنحضور ﷺ نے رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی)۔

۶: "اعطوا الاجیرا اجرہ قبل ان یجف عرقہ"(۴۳)
(مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو)۔

۷: "ادوا زکوٰۃ اموالکم"(۴۴)(اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو)۔

۸: "ان فی اموالکم حقًا سوی الزکوٰۃ"(۴۵)
(زکوٰۃ کے علاوہ بھی تمھارے مالوں میں حق ہے)۔

۹: "المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ ومن کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ" (۴۶)(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو چھوڑتا ہے، جو مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کرے گا)۔

۱۰: "لعن رسول اللّٰہ اٰکل الربا وموکلہ و کاتبہ و شاھدیہ وقال ھم سوآء" (۴۷)
(آپؐ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، (سود کی) دستاویز لکھنے والے پر اس کے دونوں گواہوں پر اور پھر فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں)۔

آج تک ہم نے آنحضور ﷺ کی زندگی سے روگردانی کر کے کیا حاصل کیا ہے؟ نہ معاشی لحاظ سے استحکام ہے اور نہ ہی معاشرتی لحاظ سے امن و سکون بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم دوسروں کے دست نگر ہو گئے ہیں۔ اور اس کا بنیادی سبب قرآن سے روگردانی ہے۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:
﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا ﴾ (۴۸)(جو اللہ کے ذکر سے اعراض کر لیگا

ہے اس کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے)۔

ہمارے تمام مسائل کا حل صرف اس چیز ہی میں ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھیں۔ صحابہ کرام ؓ کی مانند ایثار و قربانی کو اپنا وطیرہ بنائیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴾ (۴۹) (اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور برے کاموں سے بچے رہتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے لیکن انھوں نے تو جھٹلایا سو ہم نے ان کے کاموں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا)۔

اسی فرمانِ الٰہی کی تشریح حضور ﷺ کی اس حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ: "لو ان عبیدی اطاعونی لاسقیتھم المطر باللیل واطلعت علیھم الشمس بالنھار ولم اسمعھم صوت الرعد" (۵۰) (اگر میرے بندے میرے فرمانبردار بن جائیں تو میں رات کے وقت ان کی ضرورت کی بنا پر، ان پر بارش برساؤں، اور دن کے وقت سورج طلوع کر دوں، اور ان کو بجلی کی کڑک بھی نہ سناؤں)۔

یہ خدا تعالیٰ کی اپنے بندوں پر مہربانی کی انتہا ہے کہ پانی کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، اور آرام میں خلل بھی نہ واقع ہو، اور اگلے دن آرام سے اپنے کام میں بندے مصروف ہو جائیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سلسلے میں تاریخ کا ایک واقعہ بھی بیان فرمایا، ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص جنگل میں چل رہا تھا۔ اس نے بادل میں سے یہ آواز سنی "اسق حد یقۃ فلان" (فلاں آدمی کے باغ کو سیراب کرو)۔ اسی وقت بارش ہوئی اور پانی ایک طرف چل پڑا۔ وہ آدمی بھی پانی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ وہ پانی ایک باغ میں داخل ہوا۔ نام پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ اسی شخص کا باغ ہے جس کا نام اس نے بادلوں سے سنا تھا۔ اس نے اس شخص سے خدا تعالیٰ کی مہربانی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ایک حصہ مسافروں (ضرورت مندوں) کے لیے رکھتا ہے۔ ایک حصہ اپنی ضرورت کے لیے اور ایک حصہ باغ پر ہی خرچ کر دیتا ہے (۵۱)۔ اور یہی ثمر ہے آنحضور ﷺ اور خدا تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے کا۔ لیکن جو لوگ آنحضور ﷺ کی سیرت سے انحراف کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یوں متنبہ کیا

ہے: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (۵۲) (جو لوگ پیغمبر ﷺ کا حکم مانتے نہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی مصیبت ان پر نہ آن پڑے یا آخرت میں تکلیف کا عذاب ان کو پہنچے)۔

آج کے اس پُرفتن دور میں مسلمانوں کی بے راہ روی کا بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ قرآن و سنت پر ترکِ عمل ہے۔ اور یہ ترکِ عمل ہی گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم نے آنحضور ﷺ سے بے وفائی کی ہے اور غیروں کے ساتھ رسم وفا ادا کی ہے، ورنہ آج بھی خدا تعالیٰ کی رحمتیں ہماری منتظر ہیں۔ ظفر علی خانؒ نے درست فرمایا تھا:

سلیقہ مے کشی کا ہو تو کر سکتی ہے محفل میں!
نگاہِ مست ساقی مے کشی کا اعتبار اب بھی
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
سینے میں اگر دل ہو اور تڑپ اسلام ہو دل میں
اتر سکتا ہے ابر رحمت پروردگار اب بھی! (۵۳)

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ الأحزاب:۲۱۔

۲۔ علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، خطاب بہ نوجوانانِ اسلام (شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور) ص ۱۸۳۔

۳۔ السہیلی، ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ، الروض الأنف فی تفسیر السیرۃ النبویہ لابن ھشام (نشر السنۃ، ملتان) ۲/۱۸۳۔

۴۔ الروم:۴۱۔

۵۔ الخطیب التبریزی، ولی الدین ابوعبداللہ محمد، مشکوٰۃ المصابیح (نور محمد کتب خانہ اصح المطابع، کراچی) ص ۴۲۹۔

۶۔ قریش:۱-۴۔

۷۔ الطبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری (مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر) ۹/۱۰۸۔

۸۔ ڈاکٹر یوسف الدین، اسلام کے معاشی نظریے (حیدرآباد دکن ۱۹۵۰ء) ۱/۴۸-۴۹۔

۹۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان (مؤسسۃ المعارف، بیروت) ص ۴۶۷۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ الضحیٰ:۸۔

۱۲۔ ابن ھشام، السیرۃ النبویۃ (مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر) ۱/۱۹۱-۱۹۴۔

۱۳۔ البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل، الجامع الصحیح (نور محمد کتب خانہ، کراچی) ۲/۳۰۱۔

۱۴۔ الزمخشری، ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر تفسیر الکشاف (مکتبہ مصطفیٰ البابی، مصر) ۳/۳۶۰
ابن حیان اندلسی، امیرالدین محمد عبداللہ امیرالدین عبداللہ بن یوسف تفسیر البحر المحیط، (مکتبہ مطابع النصر الحدیث، مصر) ۸/۵۱۳۔

۱۵۔ آلوسی، محمود، تفسیر روح المعانی (دارالکتب العلمیہ، بیروت) ۱/۵۱۹۔

۱۶۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۰۲، حدیث نمبر ۴۹۹۶۔

۱۷۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (دارصادر، بیروت) ۱/۱۲۹۔

۱۸۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ (دارالمعرفہ، بیروت، ۱۹۷۱ء) ۱/۲۶۲۔

۱۹۔ ایضاً، ۱/۲۶۳۔

۲۰۔ الضحیٰ:۸۔

۲۱۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ، ۱/۱۸۵۔

۲۲۔ صدیقی، ڈاکٹر یٰسین مظہر، مکی اسوۂ نبوی (اسلامک فاؤنڈیشن، دہلی، ۲۰۰۵ء، طبع اوّل) ص ۱۵۷۔

۲۳۔ الطبقات الکبریٰ، ۱/ ۳۰۹۔

۲۴۔ الانفال: ۳۰۔

۲۵۔ ابن حبان البستی محمد، السیرۃ النبویۃ واخبار الخلفاء (مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۹۸۰ء) ص ۱۲۸۔۱۳۰۔

۲۶۔ مسلم، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی) ۲/ ۴۰۹۔

۲۷۔ ایضاً، ۲/ ۴۰۹۔

۲۸۔ زرقانی محمد بن عبد الباقی بن یوسف، شرح المواہب اللدنیۃ (عباس احمد الباز، مکہ مکرمہ، ۱۹۹۶ء) ۶/ ۲۸۳۔

۲۹۔ الأعراف: ۲۶۔

۳۰۔ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد مترجم، رئیس احمد جعفری (نفیس اکیڈمی، کراچی) ۱/ ۱۰۸۔

۳۱۔ مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۴۷، مسلم، الجامع الصحیح ص ۶۳۶، حدیث نمبر ۳۶۹۲ (باختلاف الفاظ)۔

۳۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ۲/ ۹۴۹۔

۳۳۔ ایضاً ۲/ ۵۷۵۔

۳۴۔ التوبہ: ۱۱۱۔

۳۵۔ البخاری، الجامع الصحیح ۲/ ۸۰۷۔۸۰۸۔

۳۶۔ ایضاً ۲/ ۵۷۵۔

۳۷۔ ترمذی، السنن (دار السلام، الریاض) ص ۵۳۷، حدیث نمبر ۲۳۵۲۔

۳۸۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین، الامام، شعب الایمان (دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۰ء) ۶/ ۴۲۰۔

۳۹۔ الترمذی، السنن، ۱/ ۱۷۹۔

۴۰۔ الدارمی، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن، السنن (دار الفکر، بیروت) ۲/ ۱۶۵۔

۴۱۔ احمد، المسند (دار الفکر، بیروت) ۲/ ۳۳۴۔

۴۲۔ الترمذی، السنن، ۱/ ۱۹۴۔

۴۳۔ ابن ماجہ، السنن (دار السلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۳۵۰، حدیث نمبر ۲۴۴۳۔

۴۴۔ احمد، المسند، ۵/ ۲۵۱۔

۴۵۔ الترمذی، السنن، ۱/ ۱۱۲۔

۴۶۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۳۹۴، حدیث نمبر ۲۴۴۲۔

۴۷۔ ایضاً ص ۶۹۷، حدیث نمبر ۴۰۹۳۔

۴۸۔ الطور: ۲۱۔

۴۹۔ الاعراف۔۹۶۔

۵۰۔ مشکوۃ المصابیح (دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء) ۳/۱۳۵، حدیث نمبر ۵۳۱۰۔

۵۱۔ ابوداؤد، السنن (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۷۰۳، حدیث نمبر ۴۹۹۶۔

۵۲۔ النور: ۶۳۔

۵۳۔ ظفر علی خان، دیوان، (کارواں پریس، لاہور) ص ۵۳۔

خدمتِ انسانیت اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

فلاح کا مفہوم:

فلاح، فلح سے ماخوذ ہے جو کہ ف ل ح کے مادہ سے ہے جس کے معانی راہ پانا، حاصل کرنا اور کامیابی حاصل کرنا ہیں (۱)۔قرآن مجید میں ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ (۲) (وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا)۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (۳) (مومن کامیابی حاصل کر گئے)۔

قرآن مجید کا پیش کردہ تصورِ فلاح اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے اور اس فلاح کا تعلق صرف دنیاوی زندگی سے ہی نہیں بلکہ اُخروی زندگی پر بھی محیط ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (۴) (جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں چلا گیا وہ کامیاب ہو گیا)۔

فلاح انسانیت کے لیے غور و تدبر:

رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''یایھا الناس قولوا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ تفلحوا) (۵) (اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو کامیاب ہو جاؤ گے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی تصور کے مطابق اصل کامیابی وہ ہے جس سے دوزخ سے نجات اور جنت کا حصول ممکن ہو۔یہی وجہ ہے کہ آیت ﴿قَدْ أُفْلَحَ مَن تَزَكَّى﴾ (۶) (وہ کامیاب ہوا جس نے تزکیہ اختیار کیا) میں کامیابی کو تزکیہ سے مشروط کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ایک منصب یزکیھم (۷) یعنی لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی ہے تاکہ وہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی حاصل کر کے دنیاوی اور اُخروی فلاح و کامیابی حاصل کر سکیں۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں انسانیت کی فلاح کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا تھا۔آپ ﷺ ہر وقت اس غور و فکر میں رہتے کہ لوگوں کی بہتری اور بھلائی کیسے ہو؟ آپ ﷺ دنیا کی عارضی زندگی پر آخرت کو ترجیح دینے کے لیے صحابہ کرام ؓ کی تربیت کرتے۔عام طور پر لوگوں کو ایمان کی ترغیب دیتے اور جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے کڑھتے

رہتے۔لوگوں کے احوال پر پریشان ہوجاتے بلکہ بعض اوقات انھی سوچوں میں راتیں گزر جاتیں۔چنانچہ حدیث میں ہے:

''قام حتی تورمت قدماہ''(۸)(آپ قیام فرماتے یہاں تک کہ آپ کے قدم مبارک سوج جاتے)۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً ﴾(۹) (شاید آپ اُن کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہوں اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے)۔

اسی طرح یہ بھی ارشاد ہے:

﴿طه.مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ.إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴾(۱۰)(طہ،ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے)۔

قبل از نبوت:

رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی مضبوط سیاسی نظام نہیں تھا۔جس کی وجہ سے ایک طرح کا سیاسی وسماجی انتشار پایا جاتا تھا۔اور لوگوں کی جان ومال محفوظ نہ تھے۔باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ذرا ذرا سی بات پر جنگ وجدال،خون ریزی اور ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہوجاتا۔اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش مشکل ہی سے ہوتی تھی۔مکہ مکرمہ جیسے دارالامن اور مرکزی شہر کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔

دورِ جاہلیت میں لوگوں پر ظلم وستم،لوگوں کا حق کھانا بہت عام تھا۔اس صورت حال کو بعض دردمند لوگوں نے بدلنا چاہا۔مشورہ کے لیے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ظلم وزیادتی کو ہر قیمت پر روکا جائے گا۔کسی بھی شخص پر چاہے وہ مکہ کا رہنے والا ہو یا باہر سے آیا ہو ظلم ہونے نہ دیا جائے گا۔ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کی جائے گی اور اسے اس کا حق دلوایا جائے گا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کی جائے گی۔رسول اللہ ﷺ بھی اس معاہدہ میں شریک تھے،یہ معاہدہ آپ ﷺ

کی بعثت سے پہلے ہوا تھا۔

آپ ﷺ کے دل میں لوگوں کی خیر خواہی، بھلائی اور مظلوم کی مدد کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ دورِ جاہلیت میں ہونے والا یہ معاہدہ "حلف الفضول" کے نام سے معروف ہے۔ جس کا ذکر سیرت کی تقریباً تمام کتب میں ہے(۱۱)۔

بعد از نبوت:

نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ نے فرمایا اس معاہدے کے مطابق آج بھی اگر کوئی مجھے بلائے تو میں حاضر ہوں(۱۲)۔ بعد از نبوت آپ ﷺ نے نہ صرف چھوٹوں، بڑوں، والدین، اولاد، عورت، مرد، غلام، نوکر، غیر مسلم بلکہ حیوانوں تک کے حقوق مقرر فرمائے۔ ان سے بھی آپ ﷺ کے جذبۂ خیر خواہی کا علم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی، ہمدردی اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ کو کسی نے دُکھ دیتے نہیں دیکھا بلکہ آپ ﷺ نے ہمیشہ ہی خیر و برکت کی باتیں کیں اور آپ ﷺ خدمت خلق کا باعث ہوئے۔

آپ ﷺ کا وجودِ مسعود ہی کائنات کے لیے رحمت تھا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَـٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱۳) (اے نبیؐ، ہم نے آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (۱۴) (دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسولؐ آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے)۔

آپ ﷺ جب اپنی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے گھر گئے تو وہاں برکات نازل ہوئیں۔ آپ ﷺ کو لے جانے والی سواری تیز ہو گئی۔ رضاعی والدہ کے ہاں آپ ﷺ دائیں طرف سے دودھ پیتے تھے۔ کبھی آپ ﷺ نے بائیں طرف سے دودھ نہ پیا کہ وہ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی کا حق تھا۔ اسی طرح ان کے گھر کی بکریاں چرنے جاتیں تو سیر ہو کر آتیں۔ آپ ﷺ سے پہلے اس طرح سے نہ تھا(۱۵)۔

آپ ﷺ کے چچا ابوطالب نے آپ ﷺ کے متعلق ٹھیک کہا:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ۰ ثمال الیتامٰی عصمة للارامل (۱٦)

(وہ سفید رنگ والے جن کے چہرے کی وجہ سے بادل سے بارش طلب کی جاتی ہے، یتیموں کے خیرخواہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں)۔ آپ ﷺ کا بچپن بھی لوگوں کی خیرخواہی میں گزرا۔

آپ ﷺ نے تجارت میں بھی لوگوں کی خیرخواہی کا پہلو سامنے رکھا۔ کبھی کسی کے سامنے جھوٹ نہیں بولا۔ کسی پر زیادتی نہ کی۔ مال میں کوئی نقص ہوتا تو بتا دیتے تھے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی تجارت کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں بھی آپ ﷺ مال کے بارے میں ہر لحاظ سے وضاحت کرتے رہے۔

جب آپ ﷺ پر وحی کا نزول ہوا تو حضرت خدیجہؓ کے خیالات آپ ﷺ کی ذات کے بارے میں یہ تھے:

''کلا واللّٰہ مایحزنك اللّٰہ ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علیٰ نوائب الحق ''(۱۷) (ہرگز نہیں اللہ کی قسم اللہ آپ کو کبھی غم زدہ نہ کرے گا بے شک آپ صلہ رحمی سے کام لیتے ہیں لوگوں کے بوجھ اُٹھاتے ہیں نادار کو کما کر دیتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں)۔

انسانی فلاح کا عملی اظہار خدمت خلق کی شکل میں رُونما ہوتا ہے اور اس بارے میں تعلیمات نبوی و سیرت طیبہ ہمارے لیے بہترین رہنمائی کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فلاح وخدمت انسانیت کے لیے سنہری اُصول متعین کیے ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''خیر الناس من ینفع الناس ''(۱۸) (تم میں سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع دے)۔

نیز فرمایا: ''الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق إلی اللّٰہ من أحسن إلیٰ عیاله ''(۱۹) (مخلوق اللہ کا عیال (کنبہ) ہے۔ پس اللہ کے نزدیک مخلوق میں سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے عیال کے لیے بہتر ہو)۔

مزید برآں اسی رویہ کو پروان چڑھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے فرمودات ہماری زندگی میں رہنمائی کرتے ہیں: ''من کان فی حاجة اخیه کان اللّٰہ له فی حاجته ''(۲۰) (جو اپنے

بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے)۔

''من کان فی عون اخیہ کان اللّٰہ لہ فی عونہ ما کان العبد فی عون اخیہ''

(۲۱) (جو اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ اس کے مدد کرتا رہے گا۔ جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے)

خدمت خلق کے یہ سنہری اصول فلاح بنی آدم کا حقیقی مظہر ہیں، جن سے قوموں کی زندگیوں میں معاشی، معاشرتی، سماجی کامیابیاں رونما ہوتی ہیں۔ خدمت خلق کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انسان کی اپنی ذات، عزیز واقارب، پڑوسی، دوست احباب، عورت، غلام، قیدی، ذمی، غیر مسلم، جانور حتیٰ کہ فصلوں تک کے حقوق متعین کر کے دراصل خدمت خلق کا درس دیا گیا ہے۔ اِس میں انفرادی اور اجتماعی فلاح کا راز مضمر ہے۔ تمام ادیان میں لوگوں کی بھلائی کا تصور ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَّيۡسَ الۡبِرَّ أَن تُوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰـكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ آمَنَ بِـاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الآخِرِ وَالۡمَلآئِكَةِ وَالۡكِتَابِ وَالنَّبِيِّيۡنَ وَآتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِيۡ الۡقُرۡبٰى وَ الۡيَتَـامٰـى وَالۡمَسَـاكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ وَالسَّآئِلِيۡنَ وَفِيۡ الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاَةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ إِذَا عَاهَدُواۡ وَالصَّابِرِيۡنَ فِيۡ الۡبَأۡسَآءِ والضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَأۡسِ أُولٰـئِكَ الَّـذِيۡـنَ صَـدَقُوا وَأُولٰـئِـكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾ (۲۲) (نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی اور مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں، یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں)۔

اب ہم فلاح انسانی کے اجتماعی اصولوں کو زیر بحث لاتے ہیں جن پر سیرت طیبہ کی روشنی میں عمل پیرا ہونے سے ہی انسانی فلاح کا متضمن ہونا ممکن ہو سکے گا۔ مثلاً ارشاد نبوی ہے:

''عن ابی هريرة قال قال رسول اللّٰہ للمؤمن علی المؤمن ست خصال يعوده اذا مرض ، و يشهد اذا مات ، و يجيبه اذا دعاه و يسلم عليه اذا لقيه و يشمته اذا

عطس و ينصح له اذا غاب او شهد" (۲۳)(حضرت ابوھریرۃ ؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کے مومن پر چھ حقوق ہیں۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو وہ اس کی عیادت کرتا ہے اور جب وہ فوت ہوتا ہے تو اس کو جنازہ میں حاضر ہوتا ہے اور جب وہ دعوت دیتا ہے تو اسے قبول کرتا ہے اور جب اسے ملتا ہے تو اس کو سلام کرتا ہے اور جب اسے چھینک آتی ہے تو اس کا جواب دیتا ہے اور اس سے خیر خواہی کرتا ہے چاہے وہ حاضر ہو یا غائب)۔

اس حدیث سے مجموعی طور پر ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا سبق ملتا ہے جس میں آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کی خیر خواہی مطلوب ہے۔ سیرت طیبہ سے ان تمام قیمتی نصائح کی تصویر یوں سامنے آتی ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''إنما الدين النصحية: قالوا لمن يا رسول اللّٰه؟ قال: للّٰه ولرسوله ولكتابه ولأئمه المسلمين وعامتهم'' (۲۴) (دین خیر خواہی کا نام ہے صحابہ کرام ؓ نے پوچھا کس کے لیے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے اور عام لوگوں کے لیے)۔

والدین کی خدمت:

دنیاوی رشتوں میں انسان کے بھلائی کرنے کے سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں۔ اسلام نے ان سے خیر خواہی اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً﴾(۲۵)

(تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ: تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو" پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں

پالا تھا'')۔قریبی رشتوں میں ماں کا درجہ سب سے بڑھ کر ہے۔

ارشاد نبوی ہے:''الجنت تحت اقدام امھات ''(۲۶)(جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے)۔والد کی اطاعت اور احترام کے متعلق ارشاد نبوی ہے:''رضا الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد ''(۲۷)(والد کی خوشی میں رب کی خوشی ہے اور والد کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے)۔

عزیز واقارب اور بے کس لوگوں کی خدمت:

اسلام میں اس طرح بے سہارا لوگوں کا خیال رکھنے کی تاکید ہے۔اسلام ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور محبت کا درس دیتا ہے۔خونی رشتہ داروں کے علاوہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔نبوت سے قبل بھی رسول اللہ ﷺ کی یہ صفت تھی۔

قرآن مجید میں ہے:﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾(۲۸)(رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق)۔

اسلام میں ہر مستحق کی خدمت ضروری ہے۔رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کے حوالے سے سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:''الصدقة علی المسکین صدقة وهی علی ذی الرحم ثنتان صدقة وصلة ''(۲۹)(کسی مسکین کو(جس سے رشتہ نہ ہو)صدقہ دینا محض ایک صدقہ ہے لیکن وہی صدقہ کسی رشتہ دار کو دیا جائے تو یہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی)۔

گویا رشتہ دار پر خرچ کرنا دوگنا ثواب کا باعث ہے۔ایک پہلو سے یہ ایک عام صدقہ ہے جس طرح دوسرے صدقات ہیں۔دوسرے پہلو سے یہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ہم معاشرتی زندگی ہمسایوں سے میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتے ان کے حقوق اور لوگوں سے زیادہ ہیں۔ہمسایہ کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ رشتہ دار۔

۲۔ جس سے صرف ہمسائیگی کا تعلق ہو۔

۳۔ جس کا اتفاق سے یا کبھی بھی ساتھ ہو جاتا ہے۔

سکول، کالج اور دفتر میں جن لوگوں کا ساتھ ہو وہ بھی ایک طرح کے ہمسایہ ہیں۔

......اسلام میں انسان کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا تھوڑی بہت دیر کے لیے بھی ساتھ ہو جائے تو اس کا حق قائم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ رفاقت مستقل ہو تو اس کا حق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ما زال جبریل یوصینی بالجار حتیٰ ظننت انه سیورثه''(۳۰) (حضرت جبریل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید فرماتے تھے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وراثت میں اس کا حصہ مقرر کر دیں گے)۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ صرف اپنوں کو ہی نہیں نوازتا بلکہ اپنے نہ ماننے والوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے۔ جس طرح ثمامہ رضی اللہ عنہ بن اثال کے ساتھ آپ ﷺ نے حسن سلوک کا مظاہرہ فرمایا تھا۔ نیز فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوسفیان کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ جب آپ ﷺ اپنے لشکروں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے تھے تو ابوسفیان جو کہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، بہت زیادہ خوف زدہ تھے، وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا کر آپ ﷺ کے سامنے پیش ہوئے۔ آپ ﷺ نے نہ صرف انھیں معاف کیا بلکہ اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لیے بھی معافی کا اعلان ہے: ''من دخل دار أبی سفیان فهو اٰمن''(۳۱) (جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اس کو امن ہوگا)۔

عام مسلمانوں کی بھلائی اور خدمت:

عام مسلمانوں کی خیر خواہی اور بھلائی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من فرج عن مسلم کربة من کربات الدنیا فرج اللّٰه عنه کربات من کربات یوم القیامة''(۳۲) (جو آدمی کسی مسلمان سے دنیا کی کسی سختی کو دور کرتا ہے تو اللہ قیامت کی سختیوں سے اس کی سختی اور پریشانی کو دور کریں گے)۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورت اور حاجت کو اپنی ضرورت اور حاجت قرار دیتے ہیں۔ ''عن ابی هریره قال قال رسول اللّٰه ﷺ: ان اللّٰه عزّ و جلّ یقول یوم

القيامة: ''يا ابن آدم! مرضت فلم تعدني ،قال: يارب !كيف عودك وأنت رب العالمين؟ قال: أما علمت أن عبدي فلاناً مرض فلم تعده، أماعلمت انك لوعدته لوجدتني عنده؟ يا ابن آدم! استطعمتك فلم تطعمني، قال: يارب!(و) كيف أطعمك وأنت رب العالمين؟ قال: أما علمت استطعمك عبدى فلان فلم تطعمه؟ أما أنك لو أطعمته لوجدت ذلك عندي؟ يا ابن آدم! استسقيتك فلم تسقني، قال يارب! كيف أسقيك وأنت رب العالمين ؟ قال استسقاك عبدي فلان فلم تسقه، أماعلمت لو اسقيته وجدت ذلك عندي ''(۳۳)(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ عزوجل فرمائے گا: اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا اے رب، میں آپ کی عیادت کیسے کرتا آپ تو سارے جہان کے رب ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا (پھر کہے گا) اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، اور تو نے مجھے کھلایا نہیں۔ وہ کہے گا اے رب! میں آپ کو کیسے کھلاتا آپ سارے جہاں کے رب ہیں۔ وہ کہے گا کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھلایا نہیں، کیا تجھ کو نہیں معلوم تھا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا (کھلانے کے بدلے) تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے پلایا نہیں۔ (بندہ کہے گا) اے رب! میں آپ کو کیسے پانی پلاتا، آپ تو سارے جہاں کے رب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا، اور تو نے اسے پلایا نہیں، کیا تجھ کو معلوم نہیں تھا کہ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو اس کی جزا میرے پاس سے پاتا)۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اوروں کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہے۔

مساکین وفقرا کی خدمت:

مسکین اور فقیر کو کھانا کھلانا بھی کارِثواب ہے۔ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ مساکین وفقرا کو اس حالت سے نکالیں اور ان کے فقر واحتیاج کو مستقل طور پر ختم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ

معاشرے میں باوقار اور اطمینان کی زندگی گزار سکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الساعی علی الأرملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰه او القائم اللیل، الصائم النهار'' (۳۴) (بیواؤں اور مسکینوں کے لیے سعی و جہد کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا رات میں قیام کرنے والے اور دن میں روزہ رکھنے والے کی مانند ہے)۔

رسول ﷺ نے یہاں تک فرمایا: ''انما ترزقون وتنصرون لضعفائکم'' (۳۵) (تمھارا رزق اور تمھاری مدد اللہ کی طرف سے ضعفاء کی وجہ سے ہوتی ہے)۔

قرآن نے اہل ایمان کی یہ صفات بیان کی ہیں:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوراً. إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوساً قَمْطَرِيرًا﴾ (۳۶) (اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ''ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا'') بلکہ اپنی ضرورتوں پر بھی ترجیح دے کر دوسرے کے ضرورت کو پورا کرنا مومن کی صفت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ (۳۷) (وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ خود فاقہ سے ہوں اور جس نے اپنے نفس کے بخل سے بچالیا سمجھو کہ وہی کامیاب ہے)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں پریشان حال اور بھوکا ہوں۔ یہ سن کر رسالت مآب ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کو اطلاع دی اور فرمایا کہ اگر کچھ کھانے کو موجود ہو تو بھیجیں۔ جواب ملا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے تمام ازواج مطہرات کے ہاں سے معلوم کیا مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کوئی ہے جو آج رات اسے اپنا مہمان بنالے؟ ایک انصاری نے کہا کہ میں اسے ساتھ لے جاتا ہوں۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ اس مہمان کو ساتھ لے کر گھر آئے اور اہلیہ سے کہا کہ کچھ ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کے

مہمان کی ضیافت کروں؟ اہلیہ نے جواب دیا کہ بچوں کا کھانا ہے، شوہر نے کہا کہ ان کو کسی طرح بہلا کر سلا دینا اور جب مہمان کھانا کھانے بیٹھے تو چراغ بجھا دینا اور یہ تاثر دینا کہ میں اس کے ساتھ کھا رہا ہوں۔ چنانچہ جب کھانا کھانے بیٹھے، مہمان نے کھانا کھا لیا اور ان دونوں نے بھوکے رہ کر رات گزاری۔ جب صبح رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم دونوں میاں بیوی نے رات جو مہمان نوازی کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بھا گئی ہے''۔ آپؐ نے اس وقت آیت ویؤثرون علی انفسھم کی تلاوت فرمائی (۳۸)۔

بیواؤں اور مسکینوں کے لیے دوڑ دھوپ میں وہ ساری کوششیں شامل ہیں جو ان کی فلاح وبہبود کے لیے کی جائیں۔ ان میں ان کی ضروریات کی تکمیل ان کے لیے روزگار فراہم کرنا اور ان کو معاشرے میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنانا وغیرہ، سب کچھ آجاتا ہے۔

خدمت خلق کا جذبہ بذریعہ تعاون:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر اور افضل عمل کون سا ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایمان باللہ وجھاد فی سبیلہ، قلت: فأی الرقاب افضل؟ قال: أغلاہ ثمنا وانفسھا عند أھلھا، قال قلت: فإن لم أفعل، قال، تعین ضائعا اوتصنع لاخرق، قال: فان لم افعل، قال: تدع الناس من الشر فانھا صدقہ تصدق بھا علی نفسك ''(۳۹)

(اللہ پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد۔ میں نے دریافت کیا کس قسم کے غلام آزاد کرانا زیادہ فضیلت کا باعث ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ غلام جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کے نزدیک زیادہ نفیس اور عمدہ ہو۔ میں نے کہا اگر میں اس کی طاقت نہ رکھتا ہوں تو فرمایا: اس شخص کی مدد کر جو ضائع ہو رہا ہو (غربت اور مفلسی کی وجہ سے) یا جو شخص اپنا کام نہ کر سکتا ہو اس کی مدد کرو۔ میں نے کہا اگر میں یہ بھی نہ کر سکتا ہوں تو فرمایا: لوگوں کو شر سے بچا یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کرو گے)۔

اس حدیث میں ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت کے بعد جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور گزران کی صورت نہ ہو اس کی مدد ضرورت کے مطابق کی جائے اور اس کی یہ

مدد اپنی حیثیت کے مطابق کی جائے۔

مظلوم کی مدد کرنا:

اسلام میں خدمت خلق یہ ہے کہ جن افراد پر ظلم ہو رہا ہو ان کی مدد کی جائے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ بن عازب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ مظلوم کی مدد کی جائے (۴۰)۔

مظلوم کی مدد کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ قانونی بھی اور اخلاقی بھی، معاشی حالت کا ٹھیک کرنا بھی اس میں داخل ہے اور نفسیاتی طور پر اسے یہ یقین دلانا بھی اس میں آتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں یکا و تنہا نہیں ہے، اس پر ظلم ہو تو اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کی مشکلات میں اس کا ساتھ دیا جائے گا۔

یتیم پروری:

اسلام سے قبل لوگ یتیموں کا مال کھا جاتے تھے۔ قرآن مجید میں یتیموں کے مال کو غصب کرنے والوں کو اس طرح تنبیہہ کی گئی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾ (۴۱) (جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے)۔ حدیث نبوی میں ہے: "كافل اليتيم لهُ أَو لِغيرِهِ انا فهو كهاتين فى الجنة يعنى السبابة و الوسطى" (۴۲)۔ (یتیم کی یا کسی غیر کی کفالت کرنے والا، میں اور وہ جنت میں ایک ساتھ ہوں گے)۔

ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انا و كافل اليتيم فى الجنة هكذا وقال باصبعه السبابة و الوسطى" (۴۳)

(میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح ہوں گے درمیانی اور شہادت کی انگلی ملا کر فرمایا)۔

قرض دینا اور قرض معاف کرنا:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

۔ ﴿مَن ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ (۴۴) (کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے)۔

حدیث مبارکہ میں تین آدمیوں کا واقعہ آتا ہے۔ جن میں سے ایک اندھا، دوسرا کوڑھ کے مرض میں مبتلا جبکہ تیسرے کے سر پر بال نہیں تھے۔ جبرائیل امین، اللہ کے حکم کے مطابق ان تینوں کے پاس تشریف لائے اور ان سے ان کی خواہش پوچھی۔ تینوں نے اپنے مرض کے متعلق شکایت کی تو جبرائیل امین نے اللہ کے حکم کے مطابق ان تینوں کو ان کے مرض سے چھٹکارہ دلوادیا۔ اس کے ساتھ جبرائیل امین علیہ السلام نے ان کی خواہش بھی پوری کر دی۔ ان کو کچھ نہ کچھ مال دلوادیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس تھوڑے سے مال کی بدولت یہ تینوں آدمی اپنے وقت کے مشہور و معروف تاجر بن گئے اور امیروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ایک دن جبرائیل امین علیہ السلام انسانی شکل میں ان کی مانند بیماری کی حالت میں ان کے سامنے گئے یعنی گنجے کے سامنے گنجا بن کر مال طلب کیا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ یہ ہمارے آباء واجداد کی دولت ہے اسے ہم کیوں دیں؟۔ اسی طرح وہ کوڑھی کے پاس گئے تو اس نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ جب تیسرے اندھے کے پاس گئے تو اس سے بکریاں مانگیں جو اس کو دی تھیں تو اس نے کہا کہ جتنی چاہے آپ لے لیں۔ آپ کی آمد باعث سعادت ہے میں تو اندھا تھا اللہ کا کرم ہوا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان دو آدمیوں سے ان کے دولت بھی چلی گئی اور مرض بھی واپس آ گیا جب کہ تیسرا آزمائش سے بچ گیا (۴۵)۔

حدیث میں ایک شخص کے متعلق ہے کہ لوگوں کے قرض معاف کرتا تھا اور کہا کرتا تھا ''تجاوزوا عنه لعل الله يتجاوز عنا فلقي الله فتجاوز الله عنه'' (۴۶) (اسے معاف کردو شاید اللہ ہمیں معاف کر دے چنانچہ اللہ نے اسے معاف کر دیا)۔

جب قرآن مجید کی آیت ﴿لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (۴۷) نازل

ہوئی تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا باغ اللہ کے لیے وقف کر دیا (۴۸)۔

عہدِ نبوی میں فلاحی سرگرمیوں کا طائرانہ جائزہ:

ا۔ آپ ﷺ کی تعلیمی سرگرمیاں:

قوموں کو اس وقت عروج حاصل ہوتا ہے جب علم میں ان کا مقام بلند ہوتا ہے۔علم کی قدر و منزلت کی وجہ سے حضور ﷺ نے مسلمانوں کو علم کی طرف راغب کیا اور آنحضور ﷺ کے کئی اِرشادات ہیں جن سے علم کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"طلب العلم فريضة علٰى كل مسلم" (۴۹) (علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

مسلمان پر حصولِ علم فرض قرار دیا تاکہ ایک مسلم دنیا کے رائج علوم میں ماہر ہو کر اپنی دنیوی اور اُخروی ہر دو زندگی کو آسان بنا سکے اور اپنے ملک اور قوم کی فلاح و کامیابی کے متعلق سوچے۔اللہ تعالیٰ علم حاصل کرنے پر مسلمان کی حوصلہ افزائی یوں فرماتا ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۵۰) (حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں)

پھر قرآن مجید علم کی اہمیت ایک عالم کی غیر عالم پر فضیلت کے انداز میں بیان کرتا ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ﴾ (۵۱) (ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں)۔

سیدنا صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔انھوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں علم حاصل کرنے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ان الملائكة تضع اجنحتها لطالب العلم رضى بما يصنع" (۵۲) (بے شک علم حاصل کرنے والے کے لیے فرشتے اپنے پَر بچھا دیتے ہیں اس چیز سے خوش ہو کر جو وہ کرتا ہے)۔

آپ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "يازيد، تعلم لي كتاب يهود، فاني

واللّٰہ ما اٰمن یھود علی کتابی "(۵۳) (اے زید! یہود کی کتابت سیکھ لو اللہ کی قسم میں اپنے خطوط کے بارے میں یہود سے مطمئن نہیں ہوں)۔

اصحاب صفہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا تعلق بھی علم و عمل کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مسجد نبویؐ میں دو مجالس میں سے علمی مجلس کو آپ ﷺ کا پسند کرنا بھی اہمیت علم کو واضح کرتا ہے۔ علم والی مجلس اور ذکر والی مجلس دونوں کی تعریف فرمائی لیکن خود علمی مجلس میں تشریف رکھ لی (۵۴)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میرے رب نے مجھے بہترین علم سکھایا اور بہترین ادب سکھایا" (۵۵)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جن صحابہ ؓ سے علم حاصل کرتے ان کا بہت احترام کرتے، ایک دفعہ حضرت زید ؓ کی سواری کی رکاب کو تھام لیا۔ انھوں نے فرمایا اے ابن عم رسول کیا کرتے ہو؟ تو فرمایا ہمیں ایسے علمائے کبار سے اس طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۵۶)۔

حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "علم حاصل کرو اور اس کے لیے سکون و وقار بھی سیکھو اور جن سے تعلیم حاصل کرتے ہو ان کا احترام کرو اور متکبر علماء میں سے نہ بن جاؤ (۵۷)۔

ابن وہب فرماتے ہیں: "میں نے امام مالک سے ادب سے افضل علم حاصل نہیں کیا" (۵۸)

امام مالک فرماتے ہیں: "جو حدیث طلب کرے اس کے لیے وقار، سکون اور خشیت کا ہونا لازمی ہے۔ اور پہلے لوگوں کے آثار کی اتباع کرو" (۵۹) صفہ کے علاوہ مختلف مقامات پر آپ ﷺ نے تعلیمی مراکز قائم فرمائے تاکہ لوگ علم حاصل کریں۔ صفہ گویا اسلام کی پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی۔

۲۔ شفاخانوں کا قیام:

اسلام سے قبل عرب میں علاج کرانا ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ خاندانی مسئلہ تھا۔ جسے طاقت اور وسائل کے مطابق حل کیا جاتا تھا۔ شفاخانوں یا ہسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔ لیکن اسلام کی آمد کے بعد شفاخانوں کی بنیاد پڑ گئی۔ صحابیہ حضرت رفیدہؓ نے مسجد نبویؐ کے پاس ایک خیمہ لگا رکھا تھا جس میں وہ محض ثواب کی خاطر جنگ میں زخمی ہونے والے ان افراد کی مرہم پٹی اور علاج کرتی تھیں جن کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذ ؓ غزوۂ خندق میں زخمی ہوئے تو

رسول اللہ ﷺ نے ان کی قوم سے کہا کہ وہ انھیں اس خیمہ میں رکھیں تا کہ وہ قریب رہیں اور عبادت کرنے میں آپ ﷺ کو آسانی ہو(۶۰)۔

۳۔ مساجد کی تعمیر:

مساجد کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کی جاتی ہے۔اس کی تعمیر براہِ راست عبادت میں تعاون ہے۔لیکن دور اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں۔ان کی یہ حیثیت اب بہت کچھ بدل چکی ہے۔اس لیے رفاہی خدمات کے ذیل میں ان کا ذکر ضرور کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عثمان ؓ سے روایت ہے:''قال رسول اللّٰہ ﷺ من بنی مسجداً یبتغی به وجه اللّٰہ بنی اللّٰہ له مثله فی الجنة''(۶۱)(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے اللہ کی رضا کی طلب میں کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس طرح کا گھر جنت میں بنائے گا)۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر مسجد بہت کارِثواب ہے۔

مسجد ایک بہت بڑا رفاہی ادارہ ہے۔جس میں مسلمانوں کی عبادات وملاقات سے لے کر معاملات کے فیصلے تک کیے جاتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ جب کبھی سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے،لوگوں سے ملتے ان کے حالات معلوم کرتے بعض فیصلے کرتے اور بعد ازاں گھر تشریف لے جاتے۔مسجد کو ہر جگہ تعلیمی مرکز کی حیثیت ہونی چاہیے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مسجد نبویؐ میں صفہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں خوراک اور لباس سے غریبوں کی مالی اعانت کی جاتی تھی۔یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ مغربی ممالک میں مساجد اخلاقی اداروں کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔عبادت،تعلیم وتعلم اور شادی بیاہ جیسے امور وہاں سرانجام پاتے ہیں۔

۴۔ سرائیں اور قیام گاہیں تعمیر کرنا:

رفاہی خدمات میں سے ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر ہے۔جہاں مسافروں کو بہتر سہولتیں حاصل ہوں۔اور دیس سے دوری کی وجہ سے انھیں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔حضرت ابو ہریرہ ؓ کی ایک روایت ہے جس سے اس کا اجر وثواب اور فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد

ہے:''ان مما یلحق المؤمن من علمه وحسناته بعد موته علما علّمه ونشره، وولدا صالحا ترکه، ومصحفا ورثه، أو مسجدا بناه، أوبیتاً لا بن السبیل، أونهرا اجراه، أوصدقة أخرجها من ماله فی صحته وحیاته یلحقه بعد موته ''(۶۲)(مومن کے مرنے کے بعد بھی اس کے جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں۔ وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی، قرآن مجید جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا یا مسجد جو اس نے بنوائی یا مسافروں کے لیے کوئی مکان تعمیر کرایا یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا۔ اس کا ثواب اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا)۔

اس حدیث میں رفاہ عامہ کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے۔ اور انھیں صدقہِ جاریہ کہا گیا ہے۔ ان میں مسافروں کے لیے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے۔ ایک اور ارشاد نبوی ﷺ ہے:''اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثه من صدقة جارية اوعلم ينتفع اوولدصالح يدعوله ''(۶۳)(جب انسان انتقال کر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے صدقہ جاریہ، یا وہ علم جو اس کو فائدہ دے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو)۔

۵۔ کنویں کھدوانا:

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صاف پانی کی فراہمی اور ضرورت کے مطابق فراہمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے۔ اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہوسکتا ہے۔ جس میں بندگان خدا کے لیے نہر کی تعمیر کو صدقہ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد ؓ بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے اچھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کنواں کھدوانا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوادیا(۶۴)۔

۶۔ فلاح انسانیت کے دیگر امور:

(۱) ذرائع آمدورفت کی درستی:

کسی قوم یا ملک کی ترقی میں آمدورفت کے ذرائع کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ جہاں راستے صاف ستھرے اور محفوظ و مامون ہوں، سفر کی دشواریاں کم سے کم تر ہوں اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسانیاں پائی جائیں، وہاں ترقی کے مواقع بھی اسی تناسب سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ پُرخطر راستوں کو سفر کے قابل بنایا جاتا ہے۔ سفر کو حادثات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسافروں کو سہولت اور آرام پہنچایا جاتا ہے۔

اسلام نے رفاہی خدمات کی ذمہ داری ریاست کے افراد پر ڈالی ہے اور ان افراد کو کہا گیا ہے کہ وہ راستوں کو صاف رکھیں اور ان پر جو رکاوٹیں ہوں انھیں دور کریں۔ اس سلسلے میں حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت معروف ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**الایمان بضع وسبعون اوبضع وستون شعبة فافضلها قول لا اله الا اللّٰه وادنا ها اما طة الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان**'' (۶۵) (ایمان کی ستر سے اوپر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں ان میں سے بہتر **لا اله الا اللّٰه** ہے اور ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف کو دور کرنا ہے۔ حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ نے تاکید کی کہ وہ راستے کو اس کا حق دیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا راستے کا حق کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''آنکھوں کو نیچے رکھنا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا اور بھٹکے ہوئے کی راہنمائی کرنا'' (۶۶)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**لقد رایت رجلاً یتقلب فی الجنة فی شجرة قطعها من ظهرا لطریق کانت توذی الناس**'' (۶۷) (میں نے ایک شخص کو جنت میں پھرتا دیکھا اس وجہ سے کہ اس نے راستہ میں موجود ایک ایسا درخت کاٹ دیا تھا جو لوگوں کو تکلیف دیتا تھا)۔

(۲) درخت لگانا:

فلاح انسانیت میں سے لوگوں کے گزرنے میں آسانی پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ گرمیوں میں سایہ کی سہولت درخت لگا کر مہیا کرنا، ماحول کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے راستے کے کناروں پر

درختوں کا لگانا بھی خلق خدا کی بھلائی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "مامن مسلم یغرس غرسا اویزرع زرعا فیا کل منه طیر اوانسان اوبھیمة الا کان له به صدقة" (٦٨) (کوئی مسلمان جو درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے تو اس سے پرندے یا انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے)۔

یہ صدقہ جاریہ ہی کی ایک صورت ہے جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے لگائے ہوئے درخت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"إذا مات الانسان إنقطع عمله إلامن ثلاثة. من صدقة جارية أوعلم ينتفع به أو ولدصالح يدعو له" (٦٩) (جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا اعمال نامہ اس سے منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں، صدقہ جاریہ، علم نافع اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے)۔

حضرت سعید بن ابی بردۃ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر صدقہ ہے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا اگر وہ صدقہ کو نہ پاسکے، آپ ﷺ نے فرمایا اپنے ہاتھوں سے کمائے اور اپنے آپ کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے۔ عرض کیا گیا اگر یہ بھی نہ کر سکے، فرمایا کسی مجبور اور پریشان آدمی کی مدد کرے، پوچھا یہ بھی نہ کر سکے، فرمایا نیکی کا حکم دے۔ عرض کی یہ بھی نہ ہو سکے تو فرمایا برائی سے باز رہے یہ بھی صدقہ ہے (٧٠)۔

حضرت علی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "خیرات کرنے میں جلدی کیا کرو کیونکہ بلا اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتی" (٧١)۔

حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ کسی مصیبت میں اس کا ساتھ چھوڑے اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت میں رہتا ہے اللہ اس کی حاجت میں رہتا ہے۔ اور جو مسلمان کسی مسلمان کی سختی دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کی سختیوں میں سے اس کی سختی دور کرے گا۔ اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کرے گا (٧٢)۔

(۳) اپنی پسند مسلمان بھائی کے لیے پسند کرنا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک ایمان دار نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے'' (۷۳)۔

(۴) لڑائی جھگڑا کی صورت میں قطع تعلق کی مدت:

حضرت ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ بات کسی شخص کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے۔ اس طرح کہ دونوں ملیں اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور وہ ادھر منہ پھیر لے۔ سنو! ان دونوں میں اچھا وہ ہے جو پہلے سلام کرے (۷۴)۔

(۵) اکرام مومن:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبۃ اللہ کا طواف کرتے ہوئے فرمایا: ''ما أطيبك وأطيب ريحك وأعظم حرمتك والذى نفس محمد بيده لحرمة المؤمن أعظم عند الله حرمة منك'' (۷۵) (اے کعبہ تو کتنا پاک ہے اور تیری کیا عمدہ خوشبو ہے اور تیری کتنی عزت اور حرمت ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے مومن کی عزت اللہ کے نزدیک تجھ سے کہیں بڑھ کر ہے)۔

(۶) غیر مسلموں سے تعاون:

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کے کام میں غیر مسلم تنظیموں اور اداروں کے ساتھ تعاون میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید نے یہ اصولی تعلیم دی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (۷۶) (نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کی سزا بہت سخت ہے)۔

(۷) ریاست سے تعاون:

خدمت خلق کا سب سے بڑا ادارہ ریاست ہے۔افراد اور تنظیمیں ہزار طاقت ور سہی لیکن ان کی طاقت بہرحال محدود ہوتی ہے۔ ان کو اتنے وسائل و ذرائع حاصل نہیں ہوتے کہ ہر پہلو سے معاشرے کی خدمت کرسکیں اور اس کی تمام مشکلات کو حل کردیں۔ریاست غیر معمولی وسائل و ذرائع کی مالک ہوتی ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرسکتی ہے۔اس لیے ایک فلاحی ریاست کی یہ قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ پورے معاشرے کی تعمیر اس ڈھنگ سے کرے کہ کوئی بھی شخص ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور اسے وہ تمام سہولتیں اور مواقع حاصل ہوں جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔اگر ریاست اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کرے تو اس کا وجود بے معنی ہے لیکن ریاست اتنی بڑی ذمہ داری سے اسی وقت سبک دوش ہوسکتی ہے جبکہ افراد اس سے تعاون کریں۔محض ریاست کی کوشش سے معاشرہ غربت، افلاس، جہالت، بے روزگاری جیسی مصیبتوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ ہر فرد میں معاشرہ کو پستی سے نکالنے اور اوپر اُٹھانے کا جذبہ پایا جائے۔ریاست اور افراد کے اشتراک و تعاون ہی سے خدمت خلق کا حق ادا ہوسکتا ہے اس کے بغیر یہ کام ہمیشہ ادھورا اور ناقص ہی رہے گا۔رسول اللہؐ نے فرمایا:

''من ترك مالاً فلورثته، ومن ترك كلا فالينا'' (۷۷) (جس نے مال چھوڑا وہ اس کے ورثاء کے لیے ہے اور جس نے قرض چھوڑا وہ ہم پر ہے)۔

احتساب کے بارے میں حضور ﷺ کی انتظامی تدابیر و نگرانی:

جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ غلہ کے ڈھیر میں دست مبارک ڈالا تو وہ گیلا تھا۔غلہ والے سے پوچھا یہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا بارش کا پانی پہنچ گیا ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم نے اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیں (کہ وہ بھیگا ہوا ہے) نیز فرمایا:

''من غش فليس منا'' (۷۸) (جو شخص دھوکا کرے وہ ہم میں سے نہیں)۔

رسول اللہ ﷺ نے نگران مقرر فرمادیئے تھے کہ جو شخص شہر سے باہر ہی (سوار) غلہ (اور دیگر اشیاء) کو فروخت کرے اس کو روکیں اور تاکید کریں کہ وہ بازاروں میں لاکر بیچے۔اسی طرح بغیر ناپ

وتول کے اندازہ کر کے غلہ فروخت کرنے کی بھی ممانعت فرمائی تھی اور حضرت سعید بن عاص ﷺ کو مکہ کے بازاروں کا عامل بنایا تھا(۷۹)۔آپ ﷺ نے دھوکا دہی سے تمام صورتوں کی خرید وفروخت کو ناجائز قرار دیا:''نهى رسول الله ﷺ عن بيع الغرر ''(۸۰)(رسول اللہ نے دھوکے کی بیع سے منع فرمایا)۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں فلاح انسانیت کے لیے مالی تعاون:

اسلام نے فلاح انسانی کے ضمن میں ایک دوسرے کی مالی معاونت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔جیسا کہ دوسروں کی مدد کے بارے صحابہ کرام ﷺ کے استفسار پر حکم الٰہی صادر ہوا:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۸۱)(آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دو کہ جو زائد از ضرورت ہو)۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں ایک دوسرے کی مالی اعانت کرنے کی بہت تاکید کی۔ زکاۃ کے مصارف کے متعلق فرمانِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾(۸۲)(بے شک زکوۃ مفلسوں محتاجوں اور (زکوۃ) کا کام کرنے والوں کا حق ہے اور جن کی دل جوئی کرنا ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرض میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کو۔یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔

پھر اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾(۸۳)(اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محتاج کا حق ہے)۔

قرآن مجید نے زکاۃ کو اغنیاء کے مال کو پاک کرنے کا ذریعہ بیان فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾(۸۴)(اے نبی ﷺ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تؤخذ من أغنياء هم وترد ألى فقراء هم" (۸۵) (زکوٰۃ مالداروں سے لے کر فقراء کو دی جاتی ہے)۔

فلاحِ معاشرہ کے لیے دولت کی تقسیم کا طریق کار:

سیرت طیبہ کی روشنی میں فلاح معاشرہ کی خاطر دولت کی بھی ایک منصفانہ تقسیم کی گئی ہے اور اس منصفانہ تقسیم کے تحت دولت کسی خاص طبقہ یا چند طبقوں میں ہی سمٹ کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ اجتماعی مفاد اور اجتماعی عدل کے عملی مقاصد پورے کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَآءِ مِنكُم﴾ (۸۶) (دولت تمھارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتی رہے)۔

اسلامی معاشرے میں چند چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ اس میں سودی نظام کے خاتمے کو بروئے کار لایا جائے۔

۲۔ نظام زکوٰۃ کا حقیقی نفاذ کیا جائے پھر زکوٰۃ کے علاوہ دیگر محاصل کی آمدن کے علاوہ اسلامی ریاست کو اپنے شہریوں پر مزید محاصل عائد کرنے کا بھی اختیار ہے تاکہ فلاح انسانی کے طور پر کام میں آسکیں، تمام علماء نے ان زائد ٹیکسوں کے نفوذ کو چند شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے:

۱۔ لوگوں کی ضرورت سے زائد ٹیکس نہ ہو۔

۲۔ ایسا ٹیکس نہ لگایا جائے جو ٹیکس دہندہ کے لیے بظاہر نا قابل برداشت ہو۔

۳۔ جو محاصل وصول کیے جائیں ان کے خرچ کرنے میں اسراف اور بد دیانتی نہ کی جائے۔

۴۔ بڑے بڑے بیوروکریٹس اور سربراہِ مملکت حکومتی اخراجات کم کر کے غریبوں پر رحم و شفقت والا معاملہ کریں۔

۵۔ اسلام کے نظام وراثت کو نافذ کیا جائے۔ خصوصاً عورتوں کو بطور ماں، بہن اور بیٹی اس کا حق دیا جائے (۸۷)۔

محدث کبیر امام ابن حزم "المحلیٰ" میں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم میں سے جس کے پاس فالتو سواری ہے وہ اسے لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں یا جن کے پاس اپنی ضرورت سے زائد غذا ہے وہ ان لوگوں کو لوٹا دے جن کے پاس غذا نہیں

ہے(۸۸)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زائد چیز رکھنے والے کا حق نہیں ہے بلکہ یہ اس کے لیے ہے جس کو حق دار سمجھ کر دے دی جائے۔

فقراء سے محبت اور ان کی معاشی کفالت:

محسن انسانیت ﷺ نے اس طبقہ کو اس کا صحیح مقام اس طرح دیا ہے ''**ھل تنصرون وترزقون إلا بضعفائکم**''(۸۹)(تمھاری مدد اور تمھارے رزق کا سبب صرف تمھارے کمزور بھائی ہیں)۔

پھر اسی طرح دوسری جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:''**عن ابی درداء عن النبی ﷺ. أبغونی فی ضعفائکم فانما ترزقون او تنصرون بضعفائکم**''(۹۰)(حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کمزوروں کے بارے میں میرا دل خوش کرو۔ تمھیں رزق یا مدد تمھارے کمزوروں کے سبب ملتی ہے)۔

فلاح معاشرہ کے سلسلے میں چند تجاویز

۱۔ غرباء اور بے روزگار لوگوں کے لیے ایسی طعام گاہیں قائم کی جائیں جن سے ان کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔ تاکہ وہ خودکشی جیسے گھناؤنے فعل سے بچ سکیں۔ جیسا کہ دمشق میں تکیہ سلطان سلیم اور تکیہ شیخ محی الدین کی طعام گاہوں کے نمونے ملتے ہیں اسی طرح مغربی ممالک میں سوشل سیکورٹی کی سہولت ہے۔

۲۔ ناداروں، مسکینوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے چاہئیں جن کے پاس اتنی طاقت ہی نہیں کہ وہ اپنے مکانات تعمیر کر سکیں یا کرایہ پر لے سکیں۔

۳۔ راستوں میں عام لوگوں کے پانی پینے کے لیے رفاہ عامہ کے تحت صاف پانی پینے کا انتظام ہونا چاہیے۔

۴۔ پہاڑی علاقوں میں غرباء وعوام کے لیے بھی پانی کے استعمال کا مناسب انتظام ہونا چاہیے۔

۵۔ غریب لڑکوں لڑکیوں کی شادیوں کا انتظام بھی رفاہِ عامہ کے تحت ہو تو فلاحِ معاشرہ کی ایک اچھی کڑی ہے۔

۶۔ غریب طالب علموں کی مالی اِعانت رفاہِ عامہ کے تحت بھی ہونی چاہیے۔ بلکہ یہ کام تو حکومت

بھی اپنے ذمے لے۔

سویڈن اور جرمنی میں اسی وجہ سے تعلیمی نظام کافی بہتر ہے اور لوگ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں کہ وہاں پرائمری سے پی ایچ ڈی تک تعلیم مفت ہے۔

ہمارے ہاں بھی ایسا نظام ہو جائے کہ غریب گھرانوں کے وہ طالب علم جو پڑھائی میں بہت اچھے ہیں تعلیم میں ان کی مدد ہو۔

۷۔ اسی طرح جو لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ان کی رفاہِ عامہ کے تحت بھی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ معاشرے کی حد تک ہی نہیں بلکہ گورنمنٹ لیول پر بھی ان کو Appreciate کرنا چاہیے۔

۸۔ رفاہِ عامہ کے تحت ہسپتالوں کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے تاکہ غریب لوگوں کو علاج معالجے کی سہولت میسر ہو۔

۹۔ اسی طرح دینی تعلیم کا نظام بھی رفاہِ عامہ کے تحت بہتر طور پر سرانجام دینا چاہیے، طلبا اور علمائے دین کی ضرورتوں کو بھی مدّنظر رکھا جائے۔ اور معاشرے میں انھیں شرف و تفضّل کا مقام حاصل ہونا چاہیے۔

مذکورہ تمام تجاویز کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں کا خلاصہ یہ ہے جسے حکومت کو پورا کرنا چاہیے:

۱۔ رہائش۔
۲۔ لباس و خوراک
۳۔ تعلیم
۴۔ روزگار
۵۔ حادثات سے بچاؤ کا انتظام۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور، لسان العرب (دار صادر بیروت ۱۹۹۰ء) ۲/ ۵۴۷، تحت مادہ۔

۲۔ الشمس: ۹۔

۳۔ المؤمنون: ۱۔

۴۔ آل عمران: ۱۸۵۔

۵۔ احمد بن حنبل، المسند (دار الفکر القاہرہ) ۳/ ۱۶۲۔

۶۔ الاعلیٰ: ۱۴۔

۷۔ الجمعہ: ۲۔

۸۔ بخاری، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۸۵۶ حدیث نمبر ۴۸۳۶۔

۹۔ الکہف: ٦۔

۱۰۔ طہٰ: ۱-۳۔

۱۱۔ بطور مثال ملاحظہ ہو بطور مثال ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر) ۱/ ۱۴۰-۱۴۳۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ الانبیا: ۱۰۷۔

۱۴۔ التوبہ: ۱۲۸۔

۱۵۔ السیرۃ الحلبیہ (دار احیاء التراث العربی بیروت) ۱/ ۹۰۔

۱٦۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری، الرحیق المختوم (مکتبہ السلفیہ لاہور، ۱۹۹۴ء) ص ۱۰۷۔

۱۷۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱، حدیث نمبر ۳۔

۱۸۔ المتقی الہندی، علاؤ الدین علی بن حسام الدین، کنز العمال، ۱٦/ ۱۲۸، حدیث نمبر ۴۴۱۵۴۔

۱۹۔ الخطیب التبریزی، ولی الدین ابو عبداللہ محمد، مشکوٰۃ المصابیح (دار الفکر، بیروت) ۳/ ۷۲، حدیث نمبر ۴۹۹۸۔

۲۰۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۲۹، حدیث نمبر ۲۵۸۰۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ البقرۃ: ۱۷۷۔

۲۳۔ ترمذی، السنن (دار السلام الریاض ۱۹۹۹ء، الطبعۃ الاولیٰ) ص ٦۲۰، حدیث نمبر ۳۰۷۲۔

۲۴۔ نسائی، السنن، (دار السلام الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۵۸٦، حدیث نمبر ۴۲۰۲۔

۲۵۔ بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴۔

۲۶۔ علاء الدین علی المتقی، کنز العمال، ۱۶/۴۶۱، حدیث ۴۵۴۳۹۔

۲۷۔ ترمذی، السنن، (دارالسلام الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۴۴۴، حدیث نمبر ۱۸۹۹۔

۲۸۔ بنی اسرائیل: ۲۶۔

۲۹۔ ترمذی، السنن ص ۱۶۸، حدیث نمبر ۶۵۸۔

۳۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۲، حدیث نمبر ۶۰۱۵۔

۳۱۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۷۹۳، حدیث نمبر ۴۶۲۲۔

۳۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۳۹۴، حدیث نمبر ۲۴۴۲؛ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۲۹، حدیث نمبر ۶۵۷۸۔

۳۳۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۱۲۶، حدیث نمبر ۶۵۵۶۔

۳۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۹۵۶، حدیث نمبر ۵۳۵۳۔

۳۵۔ ایضاً ص ۴۷۹، حدیث نمبر ۲۸۹۶۔

۳۶۔ الدھر: ۸-۱۰۔

۳۷۔ الحشر: ۹۔

۳۸۔ بخاری الجامع الصحیح ص ۸۶۶، حدیث نمبر ۴۸۸۹۔

۳۹۔ ایضاً ص ۴۰۷، حدیث ۲۵۱۸۔

۴۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۸۳، حدیث نمبر ۶۲۲۲۔

۴۱۔ النساء: ۱۰۔

۴۲۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۲۹۰-۱۲۹۱، حدیث نمبر ۷۴۶۹۔

۴۳۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۰-۱۰۵۱، حدیث نمبر ۶۰۰۵۔

۴۴۔ الحدید: ۱۱۔

۴۵۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۵۸۳، حدیث نمبر ۳۴۶۴۔

۴۶۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۶۸۴، حدیث نمبر ۳۹۹۸۔

۴۷۔ آل عمران: ۹۲۔

۴۸۔ ابن کثیر، حافظ عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم (دارالسلام الریاض) ۱/۵۰۶۔

۴۹۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۳۴ (مقدمہ) حدیث نمبر ۲۲۴۔

۵۰۔ فاطر: ۲۸۔

۵۱۔ زمر: ۹۔

۵۲۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین (دارالکتاب العربی، بیروت) ۱/۱۰۰۔

۵۳۔ بخاری، الجامع الصحیح ص۱۲۳۹، حدیث ۶۱۹۵۔

۵۴۔ ڈاکٹر محمد علی الہاشمی، اسلامی طرز زندگی، (دارالبلاغ پبلشرز لاہور ۲۰۰۳ء) ص ۸۸۔

۵۵۔ عجلونی، کشف الخفاء (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۸۳ء) ۱/۷۲۔

۵۶۔ ظفر، عبدالرؤف، علوم الحدیث (نشریات، لاہور، ۲۰۰۶ء) ص ۱۴۲۔

۵۷۔ ابن عبدالبر، جامع بیان العلم (دارالفکر، بیروت) ۱/۱۵۱۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔

۵۹۔ ایضاً، ۲/۱۴۔

۶۰۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی ﷺ، ۳/۲۵۸۔

۶۱۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۸۷، حدیث نمبر ۴۵۰۔

۶۲۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۳۷، حدیث نمبر ۲۴۲۔

۶۳۔ ترمذی، السنن، ص ۳۳۳-۳۳۴، حدیث نمبر ۱۳۷۵-۱۳۷۶۔

۶۴۔ ابوداؤد، السنن، ص ۲۴۹، حدیث نمبر ۱۶۸۱۔

۶۵۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۳۸، ۳۹ حدیث نمبر ۱۵۳

۶۶۔ ایضاً ص ۶۸۱، حدیث نمبر ۴۸۱۵-۴۸۱۷۔

۶۷۔ ایضاً ص ۱۱۴۳ حدیث نمبر ۶۶۷۱۔

۶۸۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۳۷۲ حدیث نمبر ۲۳۲۰۔

۶۹۔ ترمذی، السنن، ص ۳۳۴ حدیث نمبر ۱۳۷۶۔

۷۰۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۴۰۷، حدیث نمبر ۲۳۲۳۔

۷۱۔ مشکوۃ، ۱/۵۲۰، حدیث نمبر ۱۸۸۷۔

۷۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱۰۵۱، حدیث نمبر ۶۰۱۱۔

۷۳۔ ایضاً ص ۵، حدیث نمبر ۱۳۔

۷۴۔ ایضاً ص ۱۰۶۰، حدیث نمبر ۶۰۷۷۔

۷۵۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۵۶۴، حدیث نمبر ۳۹۳۲۔

۷۶۔ المائدہ: ۲۔

۷۷۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۷۰۸، حدیث نمبر ۴۱۶۱۔

۷۸۔ ترمذی، السنن، ص ۳۱۹، حدیث نمبر ۱۳۱۵۔

۷۹۔ علامہ عبدالحیٔ کتانی، دورِ نبوی کا نظامِ حکومت (ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۱ء) ص ۱۴۸۔

۸۰۔ ترمذی، السنن، ص ۲۹۹، حدیث نمبر ۱۲۳۰۔

۸۱۔ البقرۃ: ۲۱۹۔

۸۲۔ التوبۃ: ۶۰۔

۸۳۔ الذاریات: ۱۹۔

۸۴۔ التوبہ: ۱۰۳۔

۸۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۷۳۶، حدیث نمبر ۴۳۴۷۔

۸۶۔ الحشر: ۷۔

۸۷۔ ابوبکر غزنوی، قربت کی راہیں (مکتبہ غزنویہ، لاہور) ص ۸۳۔

۸۸۔ ابن حزم، محمد، المحلی (دارالآفاق الجدیدہ بیروت) ۶/۱۵۷۔

۸۹۔ مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳/ ۱۱۸، حدیث ۵۲۳۲۔

۹۰۔ ایضاً، ۳/ ۱۲۰، حدیث نمبر ۵۲۴۶۔

باب پنجم

سیرت رسول ﷺ اور تعلیم و تدریس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تعلیم وتربیت

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت نسل انسانی کے لیے مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس کارِ خیر کے لیے اپنی زندگی کو وقف کیا اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آپ نے وحی کے مطابق محبت والفت، دانائی وحکمت اور محنت وجدوجہد سے اس کام کو سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنی گذشتہ زندگی کو لوگوں کے سامنے پیش فرمایا: ﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ ﴾ (۱) (آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)۔

آپ ﷺ نے لوگوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام نے جب آپ ﷺ کی بعثت کی دعا کی تھی تو اس میں تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ تزکیہ کا لفظ بھی استعمال فرمایا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (۲) (اور اے رب، ان لوگوں میں خود انھیں کی قوم سے ایک رسول اُٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سُنائے، اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مُقتدر اور حکیم ہے)۔

اس دعا میں لفظ "یزکیھم" غور طلب ہے۔ اسی طرح سے سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (۳) (وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انھیں میں سے اُٹھایا، جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)۔

گویا تزکیہ آپ ﷺ کے فرائض میں شامل تھا۔ آپ ﷺ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی کریں چنانچہ اس کا انداز بھی اللہ تعالیٰ نے خود بتایا۔

ارشاد ہے: ﴿ ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

بِـالَّتِـیْ هِـیَ أَحْسَنُ ﴾ (۴) (اے نبی ﷺ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو)۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود بھی اپنے نبی ﷺ کی تربیت کی۔

رسول اللہ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا: "علمنی ربی فاحسن تعلیمی و ادبنی ربی فأحسن تأدیبی" (۵) (میرے رب نے مجھے اچھا علم سکھایا اور مجھے بہترین ادب سکھایا)۔ کسی کو تربیت دینے کے لیے ضروری ہے کہ بہترین انداز سے بات کی جائے اور اخلاص سے نصیحت کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں کو مدنظر رکھا۔ قرآن مجید میں کہیں تزکیہ سے پہلے تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر ہے اور کہیں تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات تعلیم کی ضرورت پہلے ہوتی ہے اور تزکیہ کی بعد میں اور کبھی تزکیہ کی پہلے اور تعلیم کتاب وحکمت کی بعد میں۔ اور کہیں دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان کے بغیر تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

سید ابوبکر غزنویؒ فرماتے ہیں: بعض اکابر مشائخ نے مجھ سے فرمایا اس دور میں بہترین صورت یہی ہے کہ تزکیہ اور کتاب وحکمت کی تعلیم کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ یہ دور اس قدر الحاد وزندقہ اور مادیت کا دور ہے کہ اگر کتاب وحکمت کی تعلیم تزکیہ روحانی کے بغیر حاصل کی جائے تو طالب علم کے لیے گمراہی کا شدید خطرہ ہے۔ اس لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ اس دور میں ظلمت کا غلبہ ہے اس لیے ذکر کے اسباق اور کتاب وحکمت کی تعلیم ساتھ ساتھ ہوتی جائے (۶)۔

رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کے ساتھ تربیت وتزکیہ پر خود توجہ دی جو کہ ایک معلم کے لیے ضروری ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا: " انما بعثت معلما" (۷) (مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا) اور اس سے فائدہ اٹھانے کے متعلق بھی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مثلُ ما بعثنی اللّٰه به من الهدی و العلم کمثل الغیث الکثیر أصاب أرضًا، فکان منها نقیّة قبلت الماء فأنبتت الکلأ و العُشب الکثیر و کانت منها أجادب أمسکت الماء، فنفع اللّٰه بها الناس فشربوا وسقوا وزرعوا، وأصاب منها طائفة أخری انّما هی قیعان لا تمسك ماء و لا تنبت کلأ فذلك مثل من فقه فی دین اللّٰه ونفعه ما بعثنی اللّٰه به فعلم وعلّم، ومثل من لم یرفع بذلك رأسًا

ولم يقبل هدى الله الذى أرسلت به" (۸) (اللہ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر مبعوث کیا ہے اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی مانند ہے جو زمین پر گری اور اس کے ایک قابل روئیدگی علاقہ نے پانی کو جذب کر لیا جس سے گھاس اور سبزی اگی اور ایک علاقہ نا قابلِ روئیدگی تھا جس نے پانی کو روک لیا اور اللہ نے اس سے انسانوں کو نفع پہنچایا، لوگوں نے خود پانی پیا، دوسروں کو پلایا، اور کھیتی باڑی کی۔ اور ایک علاقہ صرف سنگلاخ اور پہاڑی تھا جس نے نہ پانی روکا، نہ سبزہ اگایا۔ یہ اس کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین میں سے کچھ حاصل کیا اور اس کو نفع پہنچایا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اس کو خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے علم و ہدایت آنے کے بعد جہالت سے سر نہیں اٹھایا اور نہ ہی اللہ کی ہدایت قبول کی جس کو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام ؓ کو علم سکھانے کے ساتھ ان کی تربیت کا بہت خیال کرتے اور عمل کی ترغیب دیتے تھے۔ مدینہ کے جنوب میں تھوڑے فاصلہ پر "قبا" میں درسگاہ تھی (قبا وہ مقام ہے جہاں اسلام کی پہلی مسجد تعمیر ہوئی)، بیعتِ عقبہ کے بعد بہت سے صحابہ ؓ جن میں ضعفائے اسلام کی اکثریت تھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مقام قبا میں آنے لگے اور قلیل مدت میں ان کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی، ان میں حضرتِ سالم ؓ مولیٰ ابو حذیفہ (جو قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے) وہی ان حضرات کو تعلیم دیتے تھے اور امامت بھی کراتے تھے۔ یہ تعلیمی سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری تک جاری تھا۔ عبدالرحمٰن بن غنم ؓ کا بیان ہے: "حدثني عشرٌ من أصحاب رسول اللّٰه ﷺ قالوا كنّا نتدارس العلم في مسجد قبا اذ خرج علينا رسول اللّٰه ﷺ فقال: تعلّموا ما شئتم ان تعلّموا فلن يأجركم اللّٰه حتّى تعملوا" (۹) (رسول اللہ ﷺ کے دس صحابہ ؓ نے مجھے بیان کیا کہ ہم لوگ مسجد قبا میں علم دین پڑھتے پڑھاتے تھے، اس حال میں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آئے اور فرمایا کہ تم لوگ جو چاہو پڑھو، جب تک عمل نہیں کرو گے اللہ تعالیٰ اجر و ثواب نہیں دے گا)۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ لوگوں کو دیکھ کر ان کے احوال کے متعلق ان کے حسبِ حال ارشادات فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام ؓ کے ساتھ مجلس میں تشریف فرما تھے تین شخص آئے۔ ان میں سے دو شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھے، ایک شخص مجلس میں جگہ پا کر بیٹھ گیا،

دوسرا شخص حلقہ والوں کے پیچھے بیٹھ گیا، اور تیسرا شخص واپس چلا گیا، رسول اللہ ﷺ نے تعلیم سے فارغ ہوکر فرمایا کہ ان تینوں میں سے ایک اللہ کی طرف گیا تو اللہ نے اس پر رحمت کی، دوسرے نے حیا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ حیا کا معاملہ کیا، اور تیسرے نے اعراض کیا اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض کیا (۱۰)۔

درسگاہِ نبوتؐ کے وقار و تمکنت کا یہ حال تھا کہ شرکاءِ مجلس ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بن شریک کہتے ہیں ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے گرداگرد یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے ہیں (۱۱)۔ ایک مرتبہ مجلس سے ایک آدمی اٹھا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی بیٹھ گیا، اس کے بعد پہلا آدمی آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے بیٹھنے والے سے فرمایا کہ تم اس کی جگہ سے ہٹ جاؤ، ہر شخص اپنی جائے نشست کا زیادہ حق دار ہے (۱۲)۔

درسگاہِ نبویؐ میں تمام طلبہ مودّب ہوکر بیٹھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر باہر جاتے تھے، حضرت حبیب رضی اللہ عنہ بن ابی ثابت کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھتا تھا تو اپنے دونوں گھٹنے آگے نہیں کرتا تھا اور آپؐ سے اجازت لے کر اٹھتا تھا۔

رفاعۃ رضی اللہ عنہ بن رافع الزرقی سے روایت ہے، کہتے ہیں ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب رسول اللہ ﷺ نے رکوع سے اپنا سر مبارک اٹھایا اور کہا: **سمع اللہ لمن حمدہ** تو ایک آدمی نے آپؐ کے پیچھے یہ کلمات کہے: "**اللّٰھم ربّنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ**"۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے پھرے تو آپ ﷺ نے کہا ابھی یہ کلمات کون کہنے والا تھا؟ تو اس آدمی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ میں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اس کو پہلے لکھنے کے لیے آگے بڑھے (۱۳)۔

رسول اللہ ﷺ بچوں اور نوجوانوں سے بہت زیادہ مانوس تھے اور ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے، علم دین کے حصول کی تاکید کرتے تھے اور اس پر اجر و ثواب کی بشارت دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**ایّما نا شئ نشأ فی طلب العلم والعبادۃ حتی یکبر وھو علیٰ ذلک کتب اللہ لہ اجر سبعین صدّیقًا**" (۱۴) (جو شخص علم کی طلب اور عبادت میں پرورش پاتا ہے یہاں تک کہ اسی حالت میں بڑا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ستر صدیقین کا ثواب دیتا ہے)۔

نیز آپ ﷺ نے صحابہ ؓ کو نوجوان طالبانِ حدیث کے بارے میں وصیت فرمائی تھی:
”یاتیکم شباب من اقطار الارض یطلبون الحدیث فاذا جاؤکم فاستوصوا بھم خیراً“ (۱۵) (تمھارے پاس زمین کے اطراف سے نوجوان حدیث کی طلب میں آئیں گے، جب وہ تمھارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)۔

امام بخاریؒ نے باب تعلیم صبیان القرآن میں حضرت ابن عباس ؓ کے بچپن میں قرآن یاد کرنے کا ذکر کیا ہے (۱۶)۔ مدینہ منورہ کے نوخیز نوجوان مجلس نبوی ﷺ میں شریک ہوکر علم دین حاصل کرتے تھے، اور بعد میں انھوں نے ہی حدیث کی روایت کی ہے۔ اس وقت ان کی عمریں آٹھ دس سال سے پندرہ سال تک کی تھی۔ مثلاً حسین ؓ بن علی ؓ بن ابو طالب، عبداللہ ؓ بن زبیر، نعمان ؓ بن بشیر، ابو الطفیل ؓ کنانی، سائب ؓ بن یزید، عمر ؓ بن ابو سلمہ، مسور ؓ بن مخرمہ، انس ؓ بن مالک، عبداللہ ؓ بن عباس، مسلم بن مخلد ؓ، سہل بن سعد ساعدی ؓ، ابو سعید خدری ؓ (۱۷)۔

نرم کلامی، شیریں بیانی اور انداز تعلیم کا یہ حال تھا کہ نومسلم بدوی آپ ؐ پر قربان ہو جاتے تھے، حضرت معاویہ بن حکم ؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نماز پڑھ رہا تھا، مجھ سے خلافِ ادب نماز میں ایک حرکت ہوئی جس پر دیگر لوگ بگڑ گئے، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے مجھے نہایت نرمی سے سمجھایا: ”فبأبي ھو وامّي، ما رأیت معلّما قبله ولا بعده احسن تعلیما منه، و اللّه ما قھرني، ولا شتمني، ولا ضربني، قال: إن ھذه الصلوۃ لا یصلح فیھا شیء من کلام الناس، ھذا انّما ھی التسبیح، والتکبیر، وقراءۃ القرآن“ (۱۸) (میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، میں نے آپ ﷺ سے پہلے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ سے بہتر معلم نہیں دیکھا، خدا کی قسم نہ مجھے جھڑکا، نہ مارا اور نہ ہی سخت سست کہا بلکہ فرمایا کہ نماز میں انسانی کلام اچھا نہیں ہے۔ اس میں تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن پڑھنا ہے)۔

قبیلہ سعد بن بکر کے حضرت ضمام ؓ بن ثعلبہ نے مجلسِ نبوی ﷺ میں آکر کہا: ”إنّي سائلك فمشدّد علیك في المسألة فلا تجد عليّ في نفسك“ (میں آپ سے سوال کروں گا اور سوال میں شدّت کروں گا، اس لیے آپ دل ہی دل میں خفا نہ ہوں)۔ رسول اللہ ﷺ نے

ان کی بات سن کر فرمایا: '' **سل عمّا بدأ لك** ''(۱۹) (تم جو چاہو سوال کرو)۔

غلطی پر اجر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: '' جناب رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک بار میں نے ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ میں ان کی قرأت توجہ سے سننے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کئی الفاظ اس انداز سے پڑھ رہے ہیں جس طرح مجھے رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھائے تھے۔ میرا جی چاہا کہ انھیں نماز ہی میں پکڑ لوں، لیکن میں نے صبر کیا، حتیٰ کہ انھوں نے سلام پھیر لیا۔ تب میں نے انھیں ان کی چادر سے پکڑ کر کہا: '' آپ کو یہ سورت کس نے سکھائی ہے جو میں نے آپ کو پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ ''۔ انھوں نے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا: '' آپ غلط کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے پڑھی ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس سے مختلف انداز سے پڑھائی ہے ''۔

میں انھیں پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں لے گیا اور عرض کیا: '' میں نے انھیں سورۃ الفرقان کے کئی الفاظ اس طرح پڑھتے سنا ہے جس طرح آپؐ نے مجھے نہیں پڑھائے ''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' انھیں چھوڑ دیجیے ''۔ اور فرمایا: '' ہشام! پڑھیے ''۔ انھوں نے اسی طرح پڑھی جس طرح میں نے انھیں پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' اسی طرح نازل ہوئی ہے ''۔ پھر فرمایا: '' عمر! آپ پڑھیے ''۔ میں نے اس طرح پڑھی جس طرح آنحضرت ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات طریقوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا جو طریقہ آسان معلوم ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو ''(۲۰)۔

اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے خاص طور پر جب منع کرتے وقت سختی سے کام لینے کے نتیجہ میں خرابی کا دائرہ وسیع ہونے کا خطرہ ہو۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے اس واقعہ پر غور کریں کہ جب ایک بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس غلطی پر کس ردّ عمل کا مظاہرہ فرمایا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: ہم مسجد میں نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر تھے کہ ایک اعرابی آیا اور مسجد میں (ایک طرف) کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: '' رُک جاؤ، رُک جاؤ ''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' اس کا پیشاب نہ روکو، اسے فارغ ہو لینے دو ''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے

اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ اس نے پیشاب کر لیا۔ اس کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا: ''ان مسجدوں میں پیشاب کرنا یا گندگی پھیلانا درست نہیں، یہ تو اللہ کے ذکر کے لیے، نماز کے لیے اور تلاوتِ قرآن مجید کے لیے ہوتی ہیں''۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے پانی کا ایک ڈول لا کر اس جگہ پر بہادیا''(۲۱)۔

طبرانی کی روایت میں یہ لفظ ہیں کہ اس اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر کہا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر مبعوث کیا ہے۔ میں تو اسے عام زمین کی طرح زمین سمجھا تھا۔ اس لیے میں نے یہاں پیشاب کر دیا(۲۲)۔ اس واقعہ میں تعلیم رسول اللہ ﷺ سے حکمت کی کئی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ غلطی سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بتاتے تھے۔ حضرت ابوامامؓ نے اپنے والد سہل بن حنیف ؓ سے اُن کا ایک واقعہ روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ مقام جحفہ کی وادی خزار میں پہنچے تو وہاں حضرت سہل بن حنیف ؓ غسل کرنے لگے۔ ان کا رنگ گورا تھا اور جلد بہت خوش رنگ تھی۔ قبیلہ بنو عدی بن کعب کے ایک صاحب حضرت عامر بن ربیعہ ؓ نے انھیں غسل کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: ایسی جلد تو میں نے کبھی کسی پردہ نشین لڑکی کی بھی نہیں دیکھی (یعنی کتنا خوبصورت رنگ ہے) اس پر حضرت سہل ؓ تو وہیں زمین پر گر پڑے۔ کسی نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ سہل کو دیکھیں گے، اللہ کی قسم، وہ تو سر بھی نہیں اٹھاتے، انھیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا (سخت بخار ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بارے میں کسی کو قصور وار سمجھتے ہو''؟۔ صحابہ ؓ نے کہا: عامر بن ربیعہ نے انھیں (کپڑے اُتارتے ہوئے) دیکھا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے عامر کو طلب فرمایا، اور انھیں سرزنش فرمائی۔ ارشاد فرمایا: ''ایک آدمی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے۔ اگر تجھے ایک چیز اچھی لگی تھی تو تُو نے برکت کی دُعا کیوں نہ دی؟''۔ پھر فرمایا: ''اس کے لیے اپنے اعضاء دھوؤ''۔ انھوں نے ایک برتن میں چہرہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے، پاؤں اور جسم کا اندر والا حصّہ دھو کر (وہ پانی) دے دیا۔ وہ پانی حضرت سہل ؓ پر ڈالا گیا۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس کو نظر لگی ہو، کوئی شخص پانی اس کے پیچھے کی طرف سے

اس کے سر اور کمر پر ڈال دے۔ پھر برتن بھی اس کے پیچھے ہی الٹا کر کے رکھ دے۔ چنانچہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسے ہی کیا گیا۔تو وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے (۲۳)۔

رسول اللہ ﷺ غلطی کرنے والے کو براہِ راست مخاطب کرنے کے بجائے عام بات کر دیتے تھے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:''کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ نماز میں آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاتے ہیں؟''۔حضور علیہ السلام نے اس بارے میں سختی سے تنبیہ فرمائی،حتی کہ ارشاد فرمایا:''وہ ضرور ضرور اس حرکت سے باز آجائیں،ورنہ ان کی آنکھیں چھین لی جائیں گی''(۲۴)۔

اصلاح کے لیے فطری کمزوریوں کا خیال:

رسول اللہ ﷺ اصلاح کی خاطر انسان کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھتے تھے۔اس کی مثال عورتوں اور خصوصاً سوکنوں میں رقابت کا جذبہ ہے۔بعض اوقات اس جذبہ کے زیر اثر عورت سے ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ اگر کسی اور انسان سے عام حالات میں سرزد ہو تو اس سے بالکل مختلف طریقے سے سلوک کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ عورتوں کی باہمی رقابت اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی غلطیوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے،اور اس میں عدل و انصاف کے ساتھ ساتھ صبر، برداشت اور تحمل کا اظہار فرماتے تھے۔اس کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ''الجامع الصحیح'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔انھوں نے فرمایا: نبی اکرم ﷺ اپنی کسی زوجہ محترمہ کے ہاں تشریف فرما تھے۔ایک اُمّ المومنینؓ نے ایک برتن میں کھانا بھیجا۔نبی اکرم ﷺ ازواجِ مطہراتؓ میں سے جن کے ہاں تشریف فرما تھے، انھوں نے خادمہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا جس کی وجہ سے برتن گر کر ٹوٹ گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے برتن کے ٹکڑے جمع کیے اور ان میں گرا ہوا کھانا ڈالنے لگے اور فرمایا:''تمھاری ماں کو غیرت آ گئی''۔پھر آپ ﷺ نے خادمہ کو روک لیا حتیٰ کہ جس اُمّ المومنینؓ کے ہاں حضور ﷺ تشریف فرما تھے ان کے گھر سے برتن حاضر کیا گیا۔حضور ﷺ نے صحیح برتن ان کے ہاں بھیج دیا جن کا برتن ٹوٹا تھا اور ٹوٹا ہوا برتن ان کے ہاں رہنے دیا جنھوں نے توڑا تھا (۲۵)۔یہ کمال دانش مندی کا مظاہرہ تھا۔

پسندیدہ کاموں کی تحسین:

رسول اللہ ﷺ پسندیدہ کاموں پر دادِ تحسین دیتے اور ہمت افزائی فرماتے تھے۔ نبی کریم ﷺ فضائل اخلاق کی تعمیر، رزائل کی بیخ کنی اور مختلف تعمیری صلاحیتوں کو نشو ونما دینے کے لیے جہاں اوصاف حمیدہ اختیار کرنے اور رذائل سے بچنے کی تلقین فرماتے وہیں آپؐ پسندیدہ کاموں پر صحابہ ؓ کی ہمت افزائی بھی فرماتے۔ جس کی وجہ سے اچھے کاموں پر انھیں استحکام حاصل ہوتا۔ راہِ حق میں پیش آنے والی تلخیوں میں بھی چاشنی محسوس ہوتی۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے انفاق وایثار کی اپیل کی تو حضرت عثمان غنی ؓ نے نوسو اونٹ مع ساز وسامان، سوگھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اللہ کے رسول ﷺ ان دیناروں کو اچھالتے اور فرماتے جاتے: ''آج کے بعد عثمان غنی ؓ کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچائے گا(۲۶)۔'' اس موقع پر سب سے زیادہ ایثار ایک غریب محنت کش انصاری حضرت ابو عقیل ؓ نے کیا۔ جس نے دن بھر پانی کھینچ کھینچ کر چار سیر چھوہارے کمائے اور دو سیر چھوہارے اہل وعیال کے لیے رکھ کر دو سیر آپ ﷺ کی خدمت میں لاکر پیش کیے۔ آنحضور ﷺ نے ان کے جذبۂ ایثار کی قدر کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا: ''ان چھوہاروں کو قیمتی مال کے ڈھیر پر بکھیر دو'' (۲۷)۔

نبی کریم ﷺ کے طریقِ تربیت کے مطالعہ سے سیرتِ پاک میں ایسی بہت سی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ آپ ﷺ نے بوقتِ ضرورت تیور بدل کر بھی بات کی اور زجر وتوبیخ سے کام بھی لیا۔ اصلاح و تربیت کی خاطر آپ ﷺ نے ترکِ تعلق بھی کیا اور اس کا حکم بھی دیا اور اس سلسلہ میں یہ اصول معیّن فرما دیا: ''**اوثق عرى الايمان الموالات فى اللّه والمعاداة فى اللّه والحبّ فى اللّه والبغض فى اللّه**'' (۲۸) (ایمان کا مضبوط ترین کڑا یہ ہے کہ اللہ کے لیے دوستی کی جائے، اللہ ہی کے لیے دشمنی کی جائے، اللہ ہی کی خاطر محبت ہو اور اللہ ہی کی خاطر ناراضی ہو)۔

اگر ضرورت متقاضی ہو تو اصلاح وتربیت کے لیے زجر وتوبیخ اور ترکِ تعلق بھی ایمان کی علامت اور اسلام کا منشا ہے۔ نبی کریم ﷺ حتی الامکان ملاطفت ونرمی، محبت ودل جوئی، پیار وہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو کر نصیحت فرماتے۔ مگر جب حالات سختی اختیار کرنے کا تقاضا کرتے تو آپؐ سختی

سے بھی کام لیتے۔

آپ ﷺ نے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں مارنے کا بھی حکم دیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بوقت ضرورت آپ ﷺ سخت تنبیہ کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مروا اولادکم بالصلوۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم أبناء عشرٍ وفرّقوا بینھم فی المضاجع" (۲۹) (اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں "اور نماز نہ پڑھیں" تو انھیں مارو اور ان کے بستر الگ کر دو)۔ مگر یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ شدّت وسختی اور زجر وتوبیخ اسی وقت اختیار کی جائے جبکہ محبت و پیار سے سمجھانے بجھانے کے تمام طریقے اختیار کیے جا چکے ہوں ورنہ غلط اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

تربیت کے لیے مناسب موقع اور نفسیات کا خیال:

مناسب مواقع تلاش کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی رسول اللہ ﷺ کے طریق تربیت کا حصہ تھے۔ آنحضور ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت کے لیے بہتر مواقع کی تلاش میں رہتے۔ آپ ﷺ کو جب بھی کوئی موقع ملتا، آپ ﷺ اس کو ضائع نہ ہونے دیتے بلکہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے۔ قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی جس کی چھاتی سے دودھ ٹپک رہا تھا۔ اسے قیدیوں میں ایک بچہ نظر آیا۔ اس نے شدّت جذبات اور فرطِ محبت میں اس بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اپنا دودھ پلایا۔ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آنحضور ﷺ نے محسوس کیا کہ اس عورت کے جذبہ محبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بہت متاثر ہیں۔ آپ ﷺ نے اس تأثراتی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "اگر اس عورت کو اختیار دے دیا جائے تو کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! یہ عورت ایسا نہیں کر سکتی"۔ اس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ أرحم بعبادہ من ھذہ بولدھا" "یہ عورت اپنے بچے پر جتنی مہربان ہے۔ (۳۰) (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے)۔

رسول اللہ ﷺ تربیت کے لیے مزاج اور نفسیات کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ گفتگو، برتاؤ اور ہر چیز میں لوگوں کے مراتب اور ان کی نفسیات کا پورا خیال رکھتے۔ آپ ﷺ کو مردم

شناسی میں کمال حاصل تھا۔ ہر شخص کی خوبیوں اور اس کے کمزور پہلوؤں پر آپ ﷺ کی گہری نظر ہوتی۔ ہر شخص کے مزاج اور طبیعت کا گہرا مطالعہ کرتے۔ ہر معاملے میں اُن کے مزاج کی مناسبت کا خیال رکھتے۔ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا: "**انزلوا النّاس منازلھم**" (۳۱) (لوگوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے لحاظ سے پیش آؤ)۔ جن لوگوں کی تربیت آپ ﷺ کو مقصود ہوتی۔ آپ ﷺ ان کے حالات و کوائف، ان کی ذہنی و جسمانی طاقت، ان کی فطری صلاحیت اور ان کے مزاج و طبیعت کو ملحوظ رکھتے۔

مسند احمد اور سنن نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضور ﷺ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ تمھارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی خدمت کرو یہی تمھارا جہاد ہے (۳۲)۔

سنن نسائی میں اس باب کے ساتھ اگلے باب بعنوان "**الرخصة فی التخلف لمن کان له والدة**" میں ایک روایت والدہ کے متعلق ہے۔ مشورہ لینے پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "**هل لك من أم قال: نعم قال: فالزمها فان الجنة تحت رجليها**" (۳۳) (کیا آپ کی والدہ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا: جاؤ اس کی خدمت کرو بے شک جنت اس کے قدموں تلے ہے)۔

غور کیجیے ایک شخص بوڑھی ماں کو چھوڑ کر جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ جبکہ ماں سے فطری محبت کا تقاضا یہ تھا کہ ماں کی خدمت کے لیے جہاد میں عدم شرکت کی اجازت طلب کی جاتی۔ آنحضور ﷺ کی نگاہِ دور رس سے یہ کمزوری کب چھپ سکتی تھی۔ آپ ﷺ نے صحابی کی دُکھتی رَگ پر انگلی رکھی اور فرمایا: "جاؤ اپنی ماں کی خدمت کرو، تمھارے لیے یہی جہاد ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد بہترین عبادت اور افضل ترین عمل ہے مگر جب انسان ماں کے حقوق کی ادائیگی میں کما حقہ دلچسپی نہ لے تو پھر اس کے لیے ماں کی خدمت ہی جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سمجھانے کے لیے اشارات وغیرہ سے اپنی بات کو واضح کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ مخاطب کو اچھی طرح سمجھانے اور اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ بسا اوقات ہاتھ کے اشاروں سے مدد لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ صحابہ ؓ کے سامنے کچھ خطوط کھینچتے اور ان کے ذریعے اپنی بات کو واضح کرتے۔ اس طرح سے حاضرین کے ذہن آسانی سے ان تصورات کو قبول کر

لیتے جو آپ ﷺ ان کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی سمجھانے والا ہاتھ کے اشاروں سے یا خطوط کی مدد سے اپنی بات سمجھاتا ہے تو وہ حاضرین کے ذہنوں میں نقش ہو جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنے طریقۂ تعلیم وتربیت میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔

سہل ؓ بن سعد الساعدی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أنا و كافل اليتيم فی الجنة هكذا واشار باصبعه السّبابة والوسطیٰ" (۳۴) (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح ہوں گے یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے درمیانی اور شہادت والی انگلی سے اشارہ فرمایا)۔

جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی شہادت والی اور درمیانی انگلی اٹھا کر صحابہ کرام ؓ سے یہ فرمایا ہوگا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح ہوں گے یعنی ایک دوسرے سے بالکل قریب ہوں گے۔ دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا تو وہ صحابہ ؓ جو حصولِ جنت کے لیے اپنی دنیا تک داؤ پر لگائے ہوئے تھے، اور رسولِ خدا کا قرب ان کے لیے ہر نعمت سے زیادہ قیمتی تھا۔ تو کیا اس ارشاد اور اشارے کے بعد ہر صحابی ؓ کے دل میں یہ عزم پیدا نہیں ہوا ہوگا کہ مجھے یتیم کی کفالت کر کے اس نعمت کو ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کی روایت نقل کی ہے: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدّ بعضه بعضا وشبّك رسول الله بين أصابعه" (۳۵) (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن، مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے جس کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ کو مضبوط کیے ہوئے ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر جال بنا کر دکھایا)۔

اس حدیث میں آنحضور ﷺ نے اہل ایمان کے باہمی تعلق کی کس خوب صورت و دلنشین انداز میں وضاحت فرمائی۔ سننے اور دیکھنے والا جب انگلیوں کے جال کو دیکھے گا تو مسلمانوں کے گہرے باہمی تعلق کی صحیح تصویر اس کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریق تعلیم تدریس میں ایک بہترین معلم کی تمام خصوصیات تھیں موجود جن کو اپنا کر ہمارے تعلیمی اداروں میں استاد اور شاگرد کا رشتہ بہت مضبوط ہو سکتا ہے اور طلباء بامِ عروج تک پہنچ کر معاشرے کے بہترین فرد ثابت ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ یونس:۱٦۔

۲۔ البقرہ:۱۲۹۔

۳۔ الجمعہ:۲۔

۴۔ النحل:۱۲۵۔

۵۔ المتقی الهندی، علی، کنز العمال (مؤسسہ الرسالہ، بیروت الطبعۃ الخامسۃ ۱۹۸۵ء) ۱۱/۴۰٦، حدیث نمبر ۳۱۸۹۵۔

٦۔ غزنوی، سید ابوبکر، تعلیم وتزکیہ (مکتبہ غزنویہ، شیش محل روڈ، لاہور) ص ۱۷۔

۷۔ ابن ماجہ، السنن (مکتبہ دار السلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۳۵، حدیث نمبر ۲۲۹۔

۸۔ بخاری، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض، الطبعۃ الثانیہ ۱۹۹۹ء) ص ۱۹، حدیث ۷۹۔

۹۔ ابن عبد البر، ابوعمر یوسف، جامع بیان العلم وفضلہ (دار الفکر، بیروت) ۲/۸۔

۱۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۱٦، حدیث نمبر ٦٦۔

۱۱۔ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی، الفقیہ والمتفقہ (دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۰ء) ۲/۱۲۳۔

۱۲۔ بخاری، التاریخ الکبیر (مکتبہ غراس، بیروت) ۲/۱۵۹۔

۱۳۔ ابو داؤد، السنن (دار السلام، الریاض) ص ۱۲۰، حدیث نمبر ۷۷۰؛ ترمذی السنن (دار السلام، الریاض) ص ۱۰۸-۱۰۹، حدیث نمبر ۴۰۴۔

۱۴۔ جامع بیان العلم وفضلہ ۱/ ۹۸۔

۱۵۔ خطیب بغدادی، شرف اصحاب الحدیث (ریاست الشؤن الدینیہ، الجمہوریہ الترکیۃ انقرہ، الطبعۃ الثانیہ ۱۹۹۱ء) ص ۲۱۔

۱٦۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۹۰۲، حدیث نمبر ۵۰۳۵-۵۰۳٦۔

۱۷۔ خطیب بغدادی، الکفایہ (جمعیۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد) ص ۵۵۔

۱۸۔ احمد، المسند (دار الفکر، بیروت) ۵/۴۴۷۔

۱۹۔ بخاری، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی) ۱/۱۴-۱۵۔

۲۰۔ ایضاً، ایضاً ص ۸۹۵، حدیث نمبر ۴۹۹۲؛ ترمذی، السنن، ص ٦٦۱، حدیث نمبر ۲۹۴۳۔

۲۱۔ مسلم، الجامع الصحیح ص ۱۳۳، حدیث ٦٦۰-٦٦۱۔

۲۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر (احیاء التراث العربی، بیروت) ۱۱/۱۷٦، حدیث ۱۱۵۵۲؛ ہیثمی، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (دار الکتاب العربی، بیروت) ۲،/۱۰، حدیث نمبر ۱۹۵۸۔

۲۳۔ الہیثمی، مجمع الزوائد، ۵/ ۱۰۷، حدیث نمبر ۸۴۲۶۔

۲۴۔ احمد، المسند، ۵/ ۲۹۵؛ النسائی، السنن، ص ۱۶۶، حدیث نمبر ۱۱۹۴-۱۱۹۵۔

۲۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۹۳۴، حدیث نمبر ۵۲۲۵۔

۲۶۔ احمد، المسند، ۵/ ۶۳؛ ترمذی، السنن، ص ۸۴۲، حدیث نمبر ۳۷۰۰-۳۷۰۱۔

۲۷۔ منصور پوری، محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور) ۱/ ۱۳۱۔

۲۸۔ البانی، سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (المکتب الاسلامی، بیروت) ۲/ ۶۰۱، حدیث نمبر ۹۹۸۔

۲۹۔ احمد، المسند، ۲/ ۱۸۰-۱۸۷؛ ابوداود، السنن، ص ۸۲، حدیث نمبر ۴۹۴-۴۹۵۔

۳۰۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۰۵۰، حدیث نمبر ۵۹۹۹۔

۳۱۔ ابوداود، السنن، ص ۶۸۵، حدیث نمبر ۴۸۴۲۔

۳۲۔ احمد، المسند، ۲/ ۱۸۸؛ النسائی، السنن، ص ۴۲۶، حدیث نمبر ۳۱۰۵۔

۳۳۔ النسائی، السنن، (دارالسلام، الریاض) ص ۴۲۶، حدیث ۳۱۰۶۔

۳۴۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۹۴۸، حدیث نمبر ۵۳۰۴۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۸۳، حدیث نمبر ۴۸۱، ص ۳۹۴، حدیث نمبر ۲۴۴۶۔

تربیت اولاد اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ کی محبت کا اہل اور اس کا مستحق بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے کہ اس مذہب کے شارع اور بانی کی تعلیمات پر عمل کیا جائے ،لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر یہ بھی اختیار کی ہے کہ اس نے پیغمبر ﷺ کا عملی نمونہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے،جس کو محفوظ طریقے سے ہر دور میں نبی اکرم ﷺ سے روایت بھی کیا گیا ہے اور اس پیکرِ عمل کی پیروی اور اتباع کو اللہ کی محبت کے اہل اور اس کے تعلق کے مستحق بننے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰه ﴾(۱)(اے نبی ﷺ ،لوگوں سے کہہ دو کہ ''اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا)۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾(۲)(درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ تھا)۔

انسانی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں رسول کریم ﷺ کا عملی نمونہ ملتا ہے۔ اس بات کا اقرار تو کافر بھی کرتے ہیں جس کا سید سلیمان ندوی ''خطبات مدراس'' میں ذکر یوں کرتے ہیں:

''آج سے تیس چالیس برس پہلے برصغیر میں پٹنہ کے مشہور واعظ اسلام ماسٹر حسن علی مرحوم ''نورِ اسلام'' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس میں انھوں نے اپنے ایک ہندو تعلیم یافتہ دوست کی رائے لکھی ہے کہ اس نے ایک دن ماسٹر صاحب سے کہا کہ'' میں آپ کے پیغمبر ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان تسلیم کرتا ہوں''۔ انھوں نے پوچھا'' ہمارے پیغمبر ﷺ کے مقابلے میں تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا سمجھتے ہو؟'' اس نے جواب دیا کہ'' حضرت محمد ﷺ کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی دانائے روزگار کے سامنے ایک بھولا بھالا بچہ بیٹھا ہوا میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو۔ انھوں نے دریافت کیا کہ'' تم کیوں پیغمبرِ اسلام ﷺ کو دنیا کا کامل انسان جانتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ مجھ کو ان کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے یکجا کر کے نہیں دکھائے''(۳)۔

ہر انسان حضور اکرم ﷺ سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی

زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیر رکھتی ہو وہی ہستی اس لائق ہے کہ اوصاف و انواع سے بھری ہوئی اس دنیا میں عالم گیر دائمی رہنمائی کا کام انجام دے۔

سیرتِ طیبہ میں جہاں انسانی زندگی کے انتہائی باریک نکتوں پر تعلیمات دی گئی ہیں تو تربیتِ اولاد جیسا ضروری اور اہم کام حضور اکرم ﷺ کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا۔

اسلام میں اولاد کی تربیت پر بہت زور دیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے جو نصیحتیں اپنے بیٹے کو کیں، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں نقل فرمائی ہیں، جو با کردار انسان کے لیے زندگی گزارنے کے سنہری اصول ہیں۔ ملاحظہ ہو:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ . وَإِن جَاهَدَاكَ عَلى أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ . يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُن فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ . يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ . وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ . وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴾ (۴)۔

ان آیات کا مفہوم مختصراً یوں ہے:

- خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
- ماں باپ کے ساتھ ادب سے پیش آنا، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کہ تیری ماں نے تجھے پیدائش سے قبل بڑی مشقت میں اٹھائے رکھا، پھر اس کے بعد دو برس تک تجھے دودھ پلایا۔ تجھے لازم ہے کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر۔ آخر کار تجھے میرے پاس لوٹنا ہے۔
- اپنے والدین کی ہر بات میں اطاعت کر الا یہ کہ وہ تجھے شرک پر مجبور کریں۔ دنیا میں والدین

کے ساتھ حسنِ سلوک کر(یعنی ان کی خدمت کر، ان کی صحبت میں رہتے ہوئے)۔

- ظلم یا برائی خواہ کتنے ہی پردوں میں چھپے ہوں یا کم کیوں نہ ہوں، خدا ان کو دیکھتا اور جانتا ہے اور وہ روزِ قیامت ان کو نکال کر نامہ اعمال میں سامنے رکھ دے گا۔
- نماز قائم کرنا اور اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا۔
- کوئی مصیبت آجائے تو آہ وزاری کرنے کے بجائے اس پر صبر کرنا۔
- زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
- اپنی رفتار میں میانہ روی رکھو اور چیخ چلا کر نہ بولا کرو۔ اپنی آواز مدھم رکھو کیونکہ آوازوں میں بدترین آواز گدھے کی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اولاد کی تربیت کس انداز سے کی، اس کے پس منظر کو غور سے دیکھنا ہوگا۔

افراد سازی:

حضرت محمد ﷺ کو منصب نبوت پر فائز کیا گیا، تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے انسان کو حقیقی انسانیت سے روشناس کرانے کا عزم کیا۔ کیونکہ جب تک انسان کو صحیح معنی میں انسان نہ بنایا جائے اس وقت تک یہ دنیا بے حیائی و بدمعاشی، ظلم و جور اور قتل و غارت گری کا نقشہ پیش کرتی رہے گی۔ مکی عہد کے مکمل تیرہ سال کردار سازی کے کام پر صرف کیے گئے۔ جس میں پیغمبرانہ حکمت و بصیرت کے ساتھ کچھ لوگوں کو اوصاف حمیدہ سے مزین اشرف المخلوقات بنانے کا کام کیا۔ کردار سازی کا یہ کام مکہ مکرمہ کے ایک چھوٹے سے مکان جو کہ ''دارِ ارقم'' کے نام سے موسوم تھا، میں ہوتا تھا۔ جو گویا ایک چھوٹی سی تربیت گاہ بھی تھی۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام خاص قوم یا خاص ملک یا خاص زمانہ کے رسول بن کر آتے تھے، جب کہ آپ ﷺ کی بعثت اور آپ ﷺ کی دعوت پوری دنیا کے جن وانس اور حشر تک آنے والی نسلوں کے لیے عام تھی اور پورے عالم کی اصلاح کر کے سب انسانوں کو دنیا میں امن وسکون اور عزت و عافیت کی زندگی عطا کرنا آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی تاکہ تمام لوگ اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو کر آخرت میں

آرام وسکون کی زندگی حاصل کریں۔

رسول اللہ ﷺ کا سب سے پہلا کام کچھ انسانوں کا ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنا تھا جو اس عظیم مقصد میں آپ ؐ کے دست و بازو بنیں اور آئندہ اس بارِ گراں کو سنبھالنے کے قابل ہوں۔ افراد سازی کا یہ کارِ عظیم جو ''دار ارقم'' کے گمنام گوشوں سے شروع ہوا تھا، اس کام کا مختصر عنوان تو انسان کو مکمل انسان بنانا تھا اور اس کی تفصیل وتشریح وہ پورا قرآن ہے، جو مکی دور نبوت میں نازل ہوا۔ مکہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی عام خصوصیات یہ ہیں:

۱: اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کو راسخ کرنا۔

۲: فکرِ آخرت پیدا کرنا۔

۳: دنیا کی چندروزہ زندگی اور اس میں آرام و بےچینی کی حقیقت کا کھولنا۔

۴: مخلوق کے ساتھ معاملہ میں ان کے حقوق کی پوری ادائیگی اور اپنے حقوق سے چشم پوشی کرنا۔

۵: ایذاؤں پر عفو ودرگزر اور اپنی طرف سے ہر حال میں ان کی خیرخواہی اور ہمدردی کرنا۔

قرآن اور رسول ﷺ کی تعلیم وتربیت سے جو مقدس گروہ پیدا ہوا اللہ تعالیٰ نے اس کا نام حزب اللہ رکھ کر ان کو دنیا وآخرت کی کامیابی کی خوشخبری دے دی۔

﴿أُولَـٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۵) (وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں)

اس ابتدائی گروہ میں بچے سے بوڑھے تک سب شامل تھے اور آنحضرت ﷺ نے مذکورہ چیزوں کو سامنے رکھ کر ان کی تربیت کی۔

ماحول کی اصلاح:

رسول اللہ ﷺ کے سامنے صرف مکہ کی اصلاح کا کام نہیں تھا بلکہ پوری کائنات اور موجودہ و آئندہ نسلوں کی اصلاح آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی اور جتنے افراد مسائل وتکالیف کو برداشت کر کے اس وقت تیار ہوئے تھے وہ پورے عالم کی ہمہ گیر اصلاح کا کام پورا نہیں کر سکتے تھے۔

لہٰذا اس مکتبہ فکر کے ہر تربیت یافتہ شخص پر یہ فرض کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماحول کو بدلنے کی

پوری کوشش کرے اور ہر وہ تدبیر اختیار کرے جو اس ماحول کو اسلامی معاشرت میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہو۔

اس لیے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ نے ہر شخص پر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ جس طرح اپنے عمل کی اصلاح کی فکر کرے اسی طرح اپنے اہل و عیال اور خاص دوستوں کی اصلاح کے لیے بھی ایسی ہی کوشش کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿ قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً ﴾ (٦) (بچاؤ اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو آگ سے)۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته، فالامام راع وھو مسئول عن رعیته، والرجل فی اھله راع وھو مسئول عن رعیته، والمراۃ فی بیت زوجھا راعیة وھی مسئولة عن رعیتھا" (٧) (تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امام ذمہ دار ہے اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں جوابدہ ہے۔ آدمی ذمہ دار ہے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں جوابدہ ہے۔ عورت اپنے خاوند کے گھر میں ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری کے متعلق جوابدہ ہے)۔

بچوں کے حقوق:

اہل و عیال کی اصلاح کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ ابتدا ہی سے نومولود کے قلب و دماغ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے مؤثر اور فطری اصول بتائے ہیں کہ ان کی وجہ سے بغیر کسی مشقت کے بچے کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہنی اور اخلاقی ارتقا خود بخود ہوتا چلا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلا کام جو بچے کی پیدائش پر والدین پر لازم کیا وہ یہ تھا کہ اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ (٨) کم عقل لوگ تو یہی کہیں گے کہ اتنے چھوٹے بچے کے کان میں عربی جملے ڈالنے سے کیا فائدہ؟ لیکن حقیقت شناس لوگ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ درحقیقت ایمان کا بیج ہے، جو کان کے راستے سے بچے کے دل میں ڈالا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا

کام والدین کا یہ ہے کہ بچے کا اچھا نام رکھا جائے۔

حضور انور ﷺ نے فرمایا: "تدعون یوم القیامۃ باسماء کم و اسماء آباء کم فاحسنوا اسماء کم" (۹) (قیامت کے دن تمھیں اپنے اور تمھارے والد کے نام سے پکارا جائے گا۔ پس اپنے نام اچھے رکھو) اس کے علاوہ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ بچے کا عقیقہ کیا جائے۔ "ان رسول اللہ ﷺ قال فی الغلام شاتان مکافاتان وفی الجاریۃ شاۃ" (۱۰) (لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے) ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اور سر منڈایا جائے۔ جب بچہ زبان کھولنے لگے تو سب سے پہلے "اللہ" کا نام سکھانا چاہیے (۱۱)۔

امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ جب بچہ بولنے لگے تو اس سے "لا الہ الا اللہ" کہلوانا چاہیے۔ اس سے بچے اپنے پروردگار کی ذات اور اس کی وحدانیت سے آشنا ہو جاتے ہیں (۱۲)۔

گویا دنیا میں آنا اور جانا اسی کلمہ "لا الـــہ الا اللہ" ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ پھر جب بچہ سمجھنے بوجھنے کے قابل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اس کے دلنشین کراؤ اور سنت کے مطابق ادب و تہذیب سکھاؤ۔ بچے کے سامنے جھوٹ بولنے، غیبت کرنے سے خود بھی پرہیز کرو کہ بچہ ان بُری خصلتوں کا عادی نہ ہو جائے۔ بچے کے ہاتھ سے اچھے کاموں میں خرچ کراؤ کہ بخل اس کی طبیعت میں جگہ نہ پائے۔ بچپن ہی سے اچھی تربیت والدین کا فرض ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص اپنے بیٹے کو لایا کہ وہ اس کا ادب و احترام نہیں کرتا۔ اس لڑکے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تو اس نے سوال کیا کہ کیا میرے (یعنی اولاد کے) فرائض ہیں یا حقوق بھی ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! اولاد کے حقوق بھی ہیں کہ اچھی اولاد کے لیے اچھی بیوی کا انتخاب کرے۔ اس بچے نے کہا: "میرے والد نے ایک حبشی عورت سے شادی کی ہے"۔ اس کے باپ نے غصے سے کہا: "او حبشن کے بچے! تو بچے نے کہا، وہ حبشن آپ سے اچھی ہے، اس نے شوہر کا بہتر انتخاب کیا، لیکن آپ نے بیوی کا اچھا انتخاب نہ کیا۔ پھر بچے نے مزید اپنے حقوق کے متعلق پوچھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پیدائش پر نام اچھا رکھنا، بچے نے کہا کہ اس نے میرا نام "بجو" رکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر حیران ہوئے۔ بچے نے پھر پوچھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اولاد کی تربیت اچھی

کرنا اور اچھی صحبت میں رکھنا۔ اس نے بتایا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، اس نے مجھے چرواہوں میں چھوڑ دیا ہے، جو کچھ ان سے سنتا ہوں، وہی کچھ کرتا ہوں، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس بچے کے باپ کو بہت ڈانٹا" (۱۳)۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "**ما نحل والد ولدا من نحل افضل من ادب حسن**" (۱۴) (کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے اخلاق سے بہتر کوئی دولت نہیں بخشی)۔

آنحضرت ﷺ نے ہر گھر کو ایک تربیت گاہ بنا دیا۔ جس میں ہر چھوٹا بڑا نہ صرف آدابِ انسانیت جانتا تھا بلکہ عملاً اس کا عادی تھا۔ اصلاحِ اخلاق کے اس پروگرام کو آنحضرت ﷺ نے جلسے، جلوسوں اور بڑی بڑی کانفرنسوں سے نہیں بلکہ فطری اصولوں پر قائم کیا۔

اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت پر نظر ڈالنے سے پہلے ایک سرسری نظر اس پر ڈالیے جو آج کی دنیا میں محکمہ تعلیم اور اس کے دفاتر، ان میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد اور پرائمری اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک جو تعلیمی جال پھیلا ہوا ہے، اس کی وسعت اور اس پر اربوں روپے کا خرچ اور اس خرچ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والوں کے تعلیمی مصارف کا بارگراں اور ان سب کے باوجود اس کے نتائج و ثمرات کہ جو بھی علم و فن ان کو پڑھایا جاتا ہے، اس کی استعداد فیصدی کتنے آدمیوں میں ہوتی ہے اور یہ تعلیم ان کے اخلاق و کردار کو کیسا بناتی ہے؟

اس کے بعد حضرت محمد ﷺ کے عطا کردہ نظامِ تعلیم کو دیکھیے وہ کس طرح فطری اور سہل و سادہ اصولوں پر مبنی ہے، جس میں حکومت کا بھی کوئی بہت بڑا خرچ نہیں اور طالب علم پر تو ایک روپے کا بھی بار نہیں۔ اس کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ ہر مسلمان کا گھر بچوں کے لیے پرائمری سکول ہے۔ جس میں غیر شعوری طور پر بچے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ضروری تعلیم حاصل کرتے جاتے ہیں۔

جب بچہ سات سال کا ہو جاتا ہے تو فطری طور پر اس میں پاکی و ناپاکی کی تمیز ہونے لگتی ہے اور اس وقت ماں باپ کے لیے حکم ہے کہ وہ اس کو نماز سکھائیں، مسجد میں ساتھ لے جائیں۔ عام مساجد، ثانوی مدارس کا کام انجام دیتی ہیں، جہاں ہر طرح کے اہل علم و فضل جمع ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے بچے پر غیر شعوری طور پر علم و حکمت کے دروازے کھلتے ہیں، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "**مروا اولادکم**

بالصلاۃ وھم ابناء سبع سنین ،واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر سنین وفرقوا بینھم فی المضاجع" (۱۵) (بچوں کونماز کا حکم دو، جب وہ سات سال کے ہوں اور جب دس سال کے ہوں توان کو مار کر نماز پڑھاؤ اور بستروں کو الگ کردو)۔

اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو بھی اصلاح کی تعلیم دی جانی چاہیے۔

اسلام سے قبل لڑکی کی پیدائش باعثِ عار سمجھی جاتی تھی اور لڑکیاں زندہ درگور کر دی جاتی تھیں۔اللہ تعالیٰ نے اس کام کو آخرت میں جوابدہی کا سبب فرمایا ہے: ﴿وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ. بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ (۱۶) (جب زندہ درگور کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اس کو کس گناہ کی وجہ سے قتل کیا گیا)۔

اسی طرح حضورانور ﷺ نے فرمایا: "عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة انا وھو ھکذا" (۱۷) (جس شخص کی دولڑکیاں ہوں، وہ ان کی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہوجائیں تو قیامت کے دن وہ میرے ساتھ یوں ہوگا (دو انگلیاں ملاکر تشبیہ دی)۔

عورت کی تربیت بہت زیادہ ضروری ہے، کیونکہ اگلی تمام نسل کا انحصار عورت کی تربیت پر ہوتا ہے۔ایک عربی شاعر نے کہا:

الأم مدرسة ان اعدتھا
اعدت شعبا طیب الاعراق
من لی بتربیة النساء فانھا
فی الشرق علة ذلك الاخناق (۱۸)

(ماں کی حیثیت ایک درس گاہ کی ہے، اگر تم نے اس کو تیار کیا تو ایک پاکیزہ اور اصیل نسل کو تیار کروگے۔کون میرے لیے عورتوں کی تربیت کی ضمانت دیتا ہے، کیونکہ مشرق میں ان کی تربیت نہ کرنا اس پستی کا سبب ہے)۔

والدین ہی بچے کی اصل تربیت کے ذمہ دار ہیں۔آنحضرت ﷺ نے یہاں تک ارشاد

فرمایا:"کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ" (۱۹) (ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین یا تو اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی یا آتش پرست)۔

والدین پر آنحضرت ﷺ نے یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ بچے کے سامنے جھوٹ نہ بولیں۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے تو میری والدہ نے مجھے بلا کر کہا میں تمھیں ایک چیز دیتی ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے میری والدہ سے پوچھا: تم اسے کیا چیز دیتی ہو؟ تو اس نے کہا ایک چھوہارا۔ فرمایا اگر تم کچھ نہ دیتیں تو ایک جھوٹ تمھارے حساب میں لکھا جاتا (۲۰)۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے اولاد میں مساوات رکھنے کا حکم دیا تا کہ کوئی بچہ کم توجہی کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔

مثال کے طور پر حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن بشیر کے والد نے ان کو کچھ دیا تو ان کی والدہ نے کہا کہ اس پر آنحضرت ﷺ کو گواہ بنا لو۔ چنانچہ جب ان کے والد نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کیا تم نے اپنی باقی اولاد کو بھی ایسے ہی دیا ہے۔ اس نے کہا نہیں، تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اولاد کے ساتھ انصاف کرو۔ کیا تم اس ظلم پر مجھے گواہ بنانا چاہتے ہو (۲۱)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، اس کا لڑکا آیا تو اس نے اس کا بوسہ لیا اور زانوؤں پر بٹھا لیا، پھر اس کی بیٹی آئی تو اس نے اسے سامنے بٹھا لیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم نے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا (۲۲) آنحضور ﷺ خود فاطمہؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب کسی سفر پر جاتے تو ان کو آخر میں مل کر جاتے اور آتے تو پہلے ان کو آکر ملتے۔

حضرت فاطمہؓ کی ہر چیز آنحضرت ﷺ سے مشابہ تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "ما رایت احدا کان اشبہ سمتاً وھدیا ودلاً وفی روایۃ کلاما برسول اللہ من فاطمۃ" (۲۳) (میں نے حضرت فاطمہؓ سے زیادہ آنحضرت ﷺ کے مشابہ عادت وخصلت، نشست و برخاست اور ایک روایت میں ہے بات چیت میں کسی کو نہیں دیکھا)۔

حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی تربیت کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ حفیظ جالندھری نے کہا:

چلی تھی باپ کے گھر سے نبیؐ کی لاڈلی پہنے
حیا کی چادریں، عصمت کے جامے، صبر کے گہنے

اسی طرح حضور اکرم ﷺ اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو نماز میں اٹھا لیتے، جب سجدے میں جاتے تو اس کو اتار دیتے۔(۲۴)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو چوما تو اقرع بن حابس نے حضور اکرم ﷺ سے کہا: میرے دس بیٹے ہیں، میں نے کسی کو نہیں چوما تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''**من لا یرحم لا یرحم**'' (۲۵) (جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا)۔

آنحضور ﷺ کا طریق تربیت:

اب ہم ان نکات کا جائزہ لیتے ہیں جو حضور اکرم ﷺ کردار سازی میں پیش نظر رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ کے طریق تربیت میں حکمت و دانائی تھی، آپ ﷺ موقع محل کے مطابق کسی کی غلطی پر براہِ راست متنبہ نہیں فرماتے تھے، تا کہ مخاطب لوگوں میں اپنی ہتک نہ تصور کرے۔

جب کچھ لوگوں کے غیر اسلامی طریق کار حضور ﷺ کے علم میں آئے تو حضور ﷺ نے اجتماعی طور پر خطاب کرتے ہوئے اس غلط طرزِ فکر کی اصلاح فرما دی، اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ عام حضرات کے سامنے بھی اسلام کا صحیح منہجِ فکر آ گیا۔ اگر کبھی اس بات کی ضرورت ہوتی کہ غلطی پر فوراً براہِ راست متنبہ کر دیا جائے تو تنہائی میں نہایت دل سوزی اور محبت کے انداز میں سمجھاتے تا کہ مخاطب کسی احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر اپنی اصلاح کرے۔

دعوت و تربیت کے سلسلہ میں ایک خاص حکمت یہ بھی رہی کہ زیادہ لمبی بات اور اکتا دینے والے وعظ سے گریز کرتے۔ آپ ﷺ کا انداز لوگوں کے ساتھ کس قدر محبت آمیز تھا اس کا اندازہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں:

''میں دس برس تک حضور ﷺ کی خدمت میں رہا مگر آپ ﷺ نے کبھی اُف تک نہ کہا۔ جو کام میں نے جس طرح کر دیا، آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''یہ کیوں کیا؟'' اگر کوئی کام نہ کر سکا تو یہ نہیں فرمایا یہ کیوں نہیں کیا؟ (۲۶) آپ ﷺ کا کنیزوں اور خادموں کے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا۔ آپ ﷺ

نے ان میں سے کبھی کسی کو نہیں مارا‘‘۔

نبی کریم ﷺ وقت کی کمی کے باعث بات مختصر کرتے تھے اور آپ ﷺ کو جامع کلمات عطا کیے گئے تھے۔ حضور ﷺ مزاج و نفسیات کے علاوہ جذبات اور احساسات کا بھی لحاظ فرماتے تھے۔

حضور ﷺ ہر بات مناسب موقع پر کرتے تھے اور اچھے کام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔

بعض اوقات حضور ﷺ اپنی بات اشاروں اور پرانی قوموں کے واقعات سے واضح کرتے تھے۔ شگفتہ مزاجی اور نرمی حضور ﷺ کی گفتگو کا حصّہ تھی۔ لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور شدت کی بجائے انتہائی نرمی اور صبر و تحمل سے سمجھاتے تھے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اہم بات یہ کہ حضور اکرم ﷺ ہر کام کا نمونہ پیش کرتے تھے، یعنی جو بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھاتے وہ خود عملی طور پر کر کے دکھاتے تھے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نکات کی روشنی میں نئی نسل کی اصلاح و تربیت کا کام انجام دیا جانا چاہیے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ آل عمران:۳۱۔ ۲۔ احزاب:۲۱۔

۳۔ ندوی، سید سلیمان، خطبات مدراس (کتب خانہ مجیدیہ، ملتان) ص ۹۵۔

۴۔ لقمان:۱۴-۱۹۔ ۵۔ المجادلہ:۲۲۔

۶۔ التحریم:۶۔

۷۔ البخاری، الجامع الصحیح (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۴۱۳، حدیث:۲۵۵۸۔

۸۔ عبداللہ ناصح علوان، تربیۃ الاولاد فی الاسلام، اُردو ترجمہ (مکتبہ قدوسیہ، لاہور) ۱/۷۶۔

۹۔ الخطیب التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (المکتبۃ التجاریۃ/دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۱ء) ۳/۳۰۔

۱۰۔ النسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، السنن (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۵۸۸، حدیث نمبر ۴۲۲۰۔

۱۱۔ تربیۃ الاولاد فی الاسلام، ۱/۱۵۸۔

۱۲۔ استنبولی، محمود مہدی، تحفۃ العروس (علم و عرفان پبلشرز، لاہور) ص ۴۵۷۔

۱۳۔ تربیۃ الاولاد فی الاسلام، ۱/۱۳۷۔

۱۴۔ الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، السنن (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۴۵۳، حدیث نمبر ۱۹۵۲۔

۱۵۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السنن (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۸۲، حدیث نمبر ۴۹۵۔

۱۶۔ التکویر:۸۔ ۱۷۔ مشکوٰۃ المصابیح ص ۶۵، حدیث نمبر ۴۹۵۰۔

۱۸۔ تحفۃ العروس، ص ۴۷۹-۴۸۰۔

۱۹۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص ۲۲۲، حدیث نمبر ۱۳۸۵۔

۲۰۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۰۲، حدیث نمبر ۴۹۹۱۔

۲۱۔ النسائی، السنن، ص ۵۲۰، حدیث نمبر ۳۷۱۴-۳۷۱۷۔

۲۲۔ تحفۃ العروس، ص ۴۹۵۔ ۲۳۔ مشکوٰۃ المصابیح ۳/۱۶، حدیث ۴۶۸۹۔

۲۴۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص ۸۸، حدیث نمبر ۵۱۶۔

۲۵۔ ابوداؤد، السنن، ص ۷۳۲، حدیث نمبر ۵۲۱۸۔

۲۶۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۳/۲۶۷، حدیث نمبر ۵۸۰۱۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیمی اُسوہ

استاد اور شاگرد کا باہمی تعلق محبت، احترام اور عقیدت پر استوار ہے جس کی جڑیں مضبوط ہونی چاہییں۔ اس کے متعلق رہنمائی کے لیے سیرت الرسول ﷺ ہمارے لیے ایک عملی نمونہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے متعلق یہ دعا کی ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (۱) (اے ہمارے رب ان میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیج جو تیری آیات پڑھ کر اُن کو سنائے اور ان کو کتاب و حکمت سکھائے اور ان کو شرک سے پاک کرے بے شک تو زبردست حکمت والا ہے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ایسے معلم پیغمبر کے مبعوث ہونے کی دعا فرمائی جو ان کے نفوس کو پاک کر دے ان کو ہر قسم کی معاشرتی اور اخلاقی برائیوں سے پاک کر دے۔

آنحضرت ﷺ کے اس منصب کے متعلق قرآن مجید میں ایک مقام پر اس طرح سے ارشاد ہے: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۲) (اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ان میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے)۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر آپ ﷺ کے اس منصب معلّمی کو یوں بیان کیا گیا ہے:
﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۳) (وہ ذات جس نے اُمی لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے)۔

ان تینوں آیات میں تعلیم کتاب و حکمت کا اصل مقصد تزکیہ قرار دیا ہے۔ جس کو آنحضرت ﷺ نے بدرجۂ اتم کیا۔ ان آیات پر غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد تلاوت آیات کتاب، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس ہے۔ معلم کو بھی تدریس کے دوران کثرت سے آیات پڑھنی چاہییں۔ تلاوت قرآن اور تعلیم کتاب و حکمت دراصل تزکیۂ نفس کے ذرائع تھے۔ آنحضرت ﷺ

کی تعلیم کا مقصد انسانوں کے افکار و نظریات اور سیرت و کردار اور حکومت کے معاملات میں ہر قسم کے عیوب سے پاک کرنا تھا تاکہ ایک پرامن معاشرہ قائم ہو جو ہر قسم کے محاسن سے متصف ہو۔ یہی مقصد اساتذہ کرام کا ہونا چاہیے۔ وہ دلوں کو پاک و صاف کر دیں۔ آنحضرت ﷺ نے خود ارشاد فرمایا: ﴿ انما بعثت معلما ﴾ مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہے(۴)۔ آپ ﷺ نے ایک اور موقع پر یہ بھی فرمایا: "انما بعثت لاتمم محاسن الاخلاق" (۵)۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت کی روشنی میں استاد صرف تدریس نہیں کرتا بلکہ تربیت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام ؓ ایک ایک سورت عملی طور پر سیکھنے میں بہت وقت لگاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ جیسے ذہین آدمی نے سورۃ البقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال لگائے (۶)۔ آپ کی محفل میں صحابہ کرام ؓ آپ ﷺ کی گفتگو کو سنتے، آنحضرت ﷺ بعض اوقات ایک ایک لفظ کو تین تین دفعہ دہراتے۔ آپ ﷺ طلباء کے جذبۂ طلب علم کو بہت پسند کرتے تھے۔

ایک بار مسجد نبوی میں ایک مجلس ذکر کی تھی اور ایک تعلیم و تعلم کی تھی۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا دونوں بہتر ہیں لیکن آپ تعلیم و تعلم والی مجلس میں تشریف فرما ہوئے (۷)۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ طالب علم کے پاؤں تلے فرشتے پَر بچھاتے ہیں بلکہ فرمایا ہر چیز طالب علم کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہے یہاں تک کہ مچھلیاں سمندر میں اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہیں (۸)۔ آنحضرت ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" (۹) (میرے رب نے مجھے حسن ادب سکھایا)۔

صحابہ کرام ؓ آنحضرت ﷺ کی حدیث بڑے ادب و احترام سے سنتے تھے۔ زمانہ قدیم میں طلباء سے تدریس کا کام بھی لیا جاتا تھا تاکہ وہ خود اساتذہ کے سامنے دیگر لوگوں کی تربیت کر سکیں۔

اس قحط الرجال کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا شغف صرف علم سے ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر پڑھاتے ہیں۔ ان کا تعلق نہ کسی سیاسی جماعت سے ہوتا ہے نہ کسی علاقائی اور نسلی تعصب کا شکار ہوتے ہیں بلکہ ان چیزوں سے بالاتر ہو کر پڑھاتے ہیں۔

موجودہ دور میں جہاں اور چیزوں کو مادیت نے متاثر کیا ہے وہاں یہ مقدس شعبہ بھی اس سے بہت متاثر ہوا ہے اگرچہ اس میں خود استاد کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ بعض اساتذہ اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل کے لیے طلبا کو استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے اساتذہ کے خلاف ان سے کام لیتے ہیں اور انھیں سیاست

میں ملوث کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اس سے طلبا کا کس قدر نقصان ہوتا ہے۔

بعض اساتذہ اس شعبہ سے صرف اس لیے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو کہیں اور ملازمت نہیں ملتی اس لیے وہ اپنے منصب سے مخلص نہیں ہوتے اور صرف کاروباری انداز سے پڑھاتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ان کو صحیح وقت نہیں دیتے اور وہی مضمون فیس لے کر گھر میں پڑھاتے ہیں حالانکہ طالب علم کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استاد کیا کر رہا ہے۔ جب صرف دولت کے حصول کے لیے علم حاصل کیا جائے، پڑھا اور پڑھایا جائے، اپنے وقت کی قیمت وصول کی جائے تو پھر اساتذہ اپنے مضمون پر کیا دسترس حاصل کر سکیں گے وہ صرف وقت گزارنے کے لیے طالب علموں کے سامنے جاتے ہیں بلکہ بعض اساتذہ ذہین طلباء کو اپنا حریف سمجھ لیتے ہیں اس لیے ان کو خاموش کرانے کے درپے رہتے ہیں تاکہ ان کی اپنی کم علمی پر پردہ پڑا رہے۔

شاگرد کو حق حاصل ہے کہ استاد سے استفادہ کرے اور استاد اسے مستفید کرنے کا پابند ہے۔ وہ شاگرد کو اولاد کی سی محبت دے، ادھر شاگرد بھی اس کو عام رشتہ نہ سمجھے بلکہ استاد سے عقیدت کے جذبات وابستہ کرے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب بھی ضروری ہے بلکہ بقول میر تقی میر کوئی چیز بھی ادب کے بغیر نہیں مل سکتی:

دور بیٹھا غبار میر ان سے
بن ادب یہ عشق نہیں آتا (۱۰)

یہ استاد کے فرائض میں سے ہے کہ وہ قوم میں نظریۂ توحید عام کرے، توحید کا مطلب ہی انتشار کا خاتمہ ہے۔ علامہ اقبال نے توحید کے عنوان کے تحت ''ضربِ کلیم'' میں لکھا ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے — قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ — وحدت افکار کی، بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام (۱۱)

اسلام میں استاد ایک ممتاز مقام پر فائز ہے۔ علم صحیح معنوں میں استاد ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو شخص صرف کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہیں ہوگا جس کی اسے ضرورت ہے (۱۲)۔

حضرت مصعب بن زبیر کا قول ہے: اگر تمھیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو اور اس طرح تمھیں منتخب شدہ علم حاصل ہوگا (۱۳)۔ ''رسائل اخوان الصفا'' میں لکھا ہے کہ ہر شخص کی قوت سے باہر ہے کہ وہ صرف اپنی کوشش سے علم حاصل کرے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہے جو حصول علم، تعمیر سیرت اور اس کے عقائد و اعمال میں رہنما کا کام دے (۱۴)۔ ان اقوال سے اساتذہ کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت وہی معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے جس میں اساتذہ کی عزت و توقیر ہوتی ہے اور وہی قوم بام عروج تک پہنچتی ہے جس کے اساتذہ اعلیٰ درجے کی صفات رکھتے ہوں۔ آج تک جو قوم بھی ترقی کے آسمان پر پہنچی اس کے ہاتھ میں علم کی شمع تھی اور یہ شمع ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ خلیفہ مامون سے سوال کیا گیا کہ خدا نے دنیائے اسلام میں تمھیں بہترین درجہ عطا کیا ہے کیا تمھیں اب بھی کسی چیز کی تمنا ہے؟ خلیفہ نے جواب دیا۔ ہاں ایک مقام ایسا ہے وہ ان سب چیزوں سے بڑھ کر ہے جو مجھے حاصل نہیں ہے اور جس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی اور وہ یہ ہے کہ کسی عالم کی مسند پر بیٹھ کر لوگوں کو درس دیا جائے اور انھیں فیض پہنچایا جائے (۱۵)۔ ابتدائی دور میں تدریس کو لوگ ذریعہ معاش نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کو آخرت کے اجر کے لیے پڑھاتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب مدرسہ نظامیہ میں نظام الملک نے تنخواہوں اور اوقاف کا سلسلہ شروع کیا تو علماء کا ایک اجلاس ہوا جس میں اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ استاد کے لیے خوددار ہونا ضروری ہے جو افلاس کی زندگی بسر کرے مگر پھر بھی ضمیر فروشی نہ کرے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہی اقبال نے کہا تھا:

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا (۱۶)

اساتذہ کے اس منصب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اوصاف و فرائض بھی بیان کر دیے جائیں۔ قرآن و حدیث، قلقشندی کی صبح الاعشیٰ، امام غزالیؒ کی احیاء

علوم الدین اور نواب سید صدیق حسن خاں کی ابجد العلوم کے مطابق اساتذہ کے فرائض درج ذیل ہیں:

استاد کے لیے ضروری ہے کہ اس میں احساس ذمہ داری ہو۔ یہ بات ہمہ وقت اس کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ قوم کی تعلیم کا مقدس کام اس کے ذمے ہے، اس میں ذرا سی کوتاہی بھی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہوگی۔ اسے چاہیے کہ وہ روزانہ اپنا سبق تیار کرے اور پڑھائی میں ناغہ نہ کرے۔ جو استاد سبق کی تیاری نہیں کرتا وہ کبھی تدریس میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ طلبا کو مطمئن کرسکتا ہے اس طرح اس کا اپنا علم بھی بہت محدود رہتا ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی (۱۷)

ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قول وفعل میں مطابقت پائی جاتی ہو۔ قرآن مجید میں ہے ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾(۱۸)(تم کیوں کہتے ہو جو کچھ نہیں کرتے)۔ کمزور سیرت کے استاد کی بات پر طلبا عمل نہیں کرتے۔ بے عمل استاد کی مثال ایسے چراغ کی مانند ہے جو جلتا خود ہے لیکن روشنی دوسروں کو دیتا ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے خود ایسے علم سے پناہ مانگی جو فائدہ نہ دے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "ان رسول اللہ ﷺ کان یقول: اللھم انی اعوذبلک من علم لا ینفع وعمل لا یرفع وقلب لا یخشع وقول لا یسمع" (۱۹) (رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے اے اللہ مجھے اس علم سے جو فائدہ نہ دے اور ایسے عمل سے جو بلندی کی طرف نہ لے جاسکے، ایسے دل سے جو خشوع وخضوع پیدا نہ کرسکے، ایسی بات سے جو سنی نہ جائے، مجھے اپنی پناہ میں رکھنا)۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا قول اس سلسلے میں مشعل راہ ہے:

"کامیابی اور فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ آدمی قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہمت کرے۔ اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصے تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ارادے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے کامرانی کی راہیں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں" (۲۰)۔

عمرو بن عتبہ نے اپنے بیٹوں کے استاد کو یہ ہدایات دی تھیں: میرے بچوں کی تعلیم شروع

کرنے سے پہلے آپ کو اپنے اخلاق و عادات درست کرنے چاہییں۔ میرے لڑکے آپ سے اثر لیں گے اور وہی کام کریں گے جو آپ کریں گے اور اس کام سے نفرت کریں گے جسے آپ نہ کریں گے۔ انھیں قرآن مجید پڑھایئے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ اس سے اکتا جائیں۔ احادیث میں سے مناسب احادیث پڑھایئے اس کے علاوہ شستہ و پاکیزہ اشعار ان کے سامنے خوش الحانی سے پڑھیے۔ جب تک وہ ایک مضمون کو خوب ذہن نشین نہ کرلیں دوسرا شروع نہ کیجیے، عقلاء اور دانشمندوں کے اوصاف انھیں سکھایئے (۲۱)۔

استاد ہمیشہ شاگرد سے مہر و الفت کا مظاہرہ کرے جبھی شاگرد تعلیم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ استاد باپ کی مانند ہوتا ہے اور بچے کو ہمیشہ ایک باپ کی حیثیت سے پڑھانا چاہیے۔ جس استاد میں محبت اور شفقت نہ ہو وہ کامل استاد نہیں ہوتا بلکہ شاگرد اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور ان کے دل میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لوگ اطراف زمین سے تمھارے پاس آئیں گے ان سے اچھا سلوک کرنا (۲۲)۔'' بعض اوقات بڑی سے بڑی کوتاہی بھی معاف کرنا پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من لم یرحم صغیرنا و لم یعرف حق کبیرنا فلیس منا'' (۲۳) (جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا حق نہیں پہچانتا وہ ہم میں سے نہیں)۔ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''انما انا لکم مثل الوالد'' (۲۴)۔ (میں آپ کے لیے والد کی مانند ہوں)۔

استاد کے لیے وقت کا پابند ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ بے قاعدگی سے سبق میں تسلسل نہیں رہ سکتا۔ کبھی استاد نہیں ہوتا اور کبھی شاگرد نہیں آتا اس طرح سبق میں دلچسپی نہیں رہتی۔ یہ استاد اور طلبا دونوں کے لیے نقصان دہ ہے کہ طلبا سبق میں اور استاد درس و تدریس میں دلچسپی نہ لیں۔

استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون پر مکمل مہارت رکھتا ہو۔ نالائق استاد شاگردوں میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ استاد مطالعہ سے اپنے علم کو بڑھاتا رہے۔ آنحضرت ﷺ نے خود دعا کی: ﴿رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (۲۵) (اے میرے رب! میرے علم کو زیادہ کر)۔ استاد اچھی طرح سے تیاری کر کے سبق پڑھائے۔ اگر پھر بھی کوئی کمی رہ جائے تو طلبا کو صاف بتا دیا جائے کہ اس کو اس کا علم نہیں بعد میں

بتائے گا۔ کبھی بھی طلبا کو غلط معلومات نہ دے بلکہ شاگردوں کے ساتھ دیانت دارانہ رویہ رکھے۔ اگر طلبا کو مطمئن کیے بغیر سختی سے خاموش کرانے کی کوشش کی جائے تو طلبا ایسے استاد سے بددل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا استاد ان پر بلاوجہ رعب جمانے کی کوشش کرتا ہے جس سے اگرچہ ان کی زبانیں بند رہتی ہیں لیکن ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ بعض اساتذہ کو اگر طلبا کے سوال کا جواب نہ آتا ہو تو وہ غلط بتا دیتے ہیں انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ قاسم بن محمد کہتے ہیں: "**لان یعیش الرجل جاهلا خیر له من ان یفتی بما لا یعلم**" (۲۶) (آدمی کے لیے ناواقف رہنا اس بات سے بہتر ہے کہ وہ ایسا فتویٰ دے جو نہ جانتا ہو)۔

استاد ہمیشہ ہی اپنی عزت نفس کا خیال رکھے، کسی حالت میں بھی وہ ذلیل حرکات نہ کرے کسی طمع اور لالچ میں پڑ کر اپنی عزت کو خطرے میں نہ ڈالے۔ کسی چیز کا طلبا سے سوال نہ کرے در بدر پھر کر چند ٹکوں کے عوض علم کو بیچتا نہ پھرے کیونکہ علم غیور ہوتا ہے کسی کے دروازہ پر نہیں جاتا۔ حضرت امام بخاریؒ کو اس وجہ سے بخارا سے نکالا گیا تھا کہ حاکم بخارا کے کہنے پر کہ اس کے لڑکے کو گھر جا کر نہ پڑھایا۔ فرمایا: علم کسی کے دروازے پر نہیں جاتا (۲۷)۔ اساتذہ کی شان یہ ہے کہ وہ امراء کے سامنے نہیں جھکتے۔ حجاج بن حمزہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک کے پاس خراسان کے حاکم کا بیٹا آیا اور کہنے لگا کہ اسے حدیث سنائی جائے تو آپ نے انکار فرمایا اور حدیث بیان نہ کی۔ جب وہ باہر جانے لگا تو عبداللہ بن مبارک اسے الوداع کہنے کے لیے گھر کے دروازے تک نکلے۔ وہ کہنے لگا! اے ابوعبدالرحمٰن میں نے آپ سے حدیث بیان کرنے کا عرض کیا تو آپ نے نہ سنائی۔ لیکن آپ میرے ساتھ گھر کے دروازے تک تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**اما نفسی فاهتنهالك واما حدیث رسول الله فانی اجلــــه عنك**" (۲۸) (میں نے اپنے نفس کو آپ کے سامنے عاجز کر دیا۔ لیکن میں حدیث رسول اللہ ﷺ کو آپ سے عظیم سمجھتا ہوں)۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ صاحب اقتدار لوگوں کے سامنے حدیث رسول اللہ کو بیان کرنا ضرورت کے بغیر مناسب نہیں۔ حضرت امام مالکؒ بن انس کی تعریف کرتے ہوئے ابن خیاط فرماتے ہیں:

یدع الجواب فلا یراجع هیبه   والسـائـلون نواكس الاذقان

نور الوقار عز سلطان التقی فھو المھیب ولیس ذا سلطان (۲۹)

(جواب چھوڑ دیتے ہیں تو ان کی ہیبت کی وجہ سے ان سے مراجعت نہیں کی جاتی۔سوال کرنے والے سر خم کر کے کھڑے ہوتے ہیں وقار کی روشنی اور تقویٰ کے غلبے کی عزت ہے۔ وہ صاحب ہیبت ہیں اگر چہ حکمران نہیں ہیں)۔ مال و دولت آنی جانی چیز ہے لیکن عزت نفس سب سے بڑھ کر ہے۔ ابن خلدون کا قول ہے چاپلوسی اور اطاعت گزاری حصول دولت اور خوشحالی کے ذرائع ہیں۔ایک خوددار انسان ہمیشہ افلاس میں ہی زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔اقبال نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

قرآن مجید میں ہے: ﴿لَا نُرِيْدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (۳۰) (ہم آپ سے کسی بدلے اور شکریے کی چاہت نہیں کرتے)۔محدثین کسی کی دولت کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ایک دفعہ ایک علوی شخص آیا۔خطیب بغدادی اپنے قالین پر طلبا کے حلقے میں بیٹھے تھے،اس نے قالین پر تین سو درہم رکھ دیے۔خطیب کا چہرہ سرخ ہو گیا، آپ نے قالین بڑے باوقار طریقے سے اٹھایا اور چل دیے۔ وہ علوی شرمندہ ہو کر اپنے پیسے چنتا رہا (۳۱)۔

استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیہودہ گفتگو نہ کرے۔ بد زبانی انسان کے عزت و وقار کو مجروح کرتی ہے۔اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ طلبا بھی استاد کی تقلید کرتے ہیں۔ان کو بھی ایسی ہی عادتیں پڑیں گی جو ان کے استاد میں ہیں۔ شاگردوں کے سامنے عملی نمونہ بننے کے لیے اساتذہ اخلاق حمیدہ سے ہی متصف رہیں۔قرآن مجید میں ہے: ﴿وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (۳۲) (وہ بے ہودہ چیز کے پاس سے عزت سے گزر جاتے ہیں)۔

استاد کبھی بناؤ سنگھار سے کام نہ لے بلکہ سادگی کو اپنا شعار بنا لے۔سادگی اچھی خوبیوں کو جنم دیتی ہے۔ بے شمار برائیوں کو روکتی ہے۔ سادہ آدمی ہمیشہ مخلص اور وفادار ہوتا ہے۔ اس سے طلبا و طالبات کی سیرت پر اثر ہو گا اور استاد کو بھی کئی قسم کی پریشانیوں سے نجات ملے گی۔پیغمبر اسلامؐ نہایت صاف ستھرا لیکن سادہ لباس پہنتے۔کھانے پینے کے معاملہ میں بھی سادگی اختیار کرتے۔قرآن مجید میں

آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ . وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴾ (۳۳) (آپ ﷺ اپنے کپڑوں کو صاف رکھیں اور غلاظت سے دور رہیں)۔

قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ﴾ (۳۴) (کہہ دیجیے میں اللہ کے حکم پہنچانے کا تم سے کچھ اجر نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں)۔ قرآن مجید میں اچھے لوگوں کی صفات اس طرح بیان کی گئی ہیں: ﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ﴾ (۳۵) (اس میں (قبا کی بستی)۔ ایسے آدمی ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں) جو انسان اپنے جسم اور لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھے وہ اپنے عقیدے، نظریات اور اعمال میں بھی نجاست کو قبول نہیں کر سکتا اور اس بات کا اثر لازماً طلبا و طالبات پر ہوتا ہے۔

استاد صرف مخصوص وقت میں ہی طلبا کو تعلیم نہ دے بلکہ بعد ازاں جب طلبا کو کچھ پوچھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہو تو ان کو وقت دے اور یہ سمجھے کہ دنیا و آخرت کا بھلا اسی میں ہے۔ علم ایک ایسی دولت ہے کہ جتنی خرچ کی جائے وہ بڑھتی ہے۔ یہ دولت خرچ کرنے سے گھٹتی نہیں۔ اگر بخل سے کام لے گا تو علم اتنا ہی محدود ہو گا۔ یہ عہدہ اس وقت تک باوقار رہتا ہے جب تک اساتذہ اس جذبہ سے سرشار ہوں۔ اس سے طلبا بھی آئندہ زندگی میں ایثار کریں گے۔ آنحضرت ﷺ وقت اور مال دونوں ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر خرچ کرتے تھے۔ مشہور محدث خطیب بغدادی نے اپنا سرمایہ وفات سے قبل محدثین و طلبا حدیث میں تقسیم کر دیا تھا (۳۶)۔

استاد ہمیشہ طلبا کو غور و فکر اور تدبر کی تعلیم دے تاکہ طلبا محض استاد کے نقال ہی نہ بن جائیں اور خود مطالعہ کی طرف رجحان ہی نہ کریں۔ سبق کے علاوہ اور بھی عمومی گفتگو ہو جائے۔ مختلف قسم کے سوالات کیے جائیں تاکہ نفس مضمون کو سمجھے بغیر زبانی یاد کرنے کے عمل سے نجات حاصل ہو۔ کبھی ملکی حالات پر تبصرہ ہو، کسی وقت معاشرتی برائیوں پر تنقید ہو اور ان کی صحیح رہنمائی کی جائے۔ محض پڑھانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کا اثر کردار پر نہ ہو طلبا کی زندگی کے متعلق استاد کو پوری معلومات حاصل ہوں۔ طلبا کو ہمیشہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کرے اور ان کے سیرت و کردار سے غافل نہ رہے اس کا قوم پر سب سے بڑا احسان یہی ہے۔

شاگرد کے اوصاف اور فرائض بیان کرنے سے قبل بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کی ہدایات بیان کی جائیں جو اس نے اپنے بیٹے امین کے استاد احمر کو دی تھیں۔

اس نے کہا: احمر! میں نے اپنا بچہ جو میرا ہی خون اور میرا صلب ہے تیرے سپرد کر دیا ہے اور تجھے اس پر اختیار و اقتدار دے دیا ہے۔ لہٰذا تجھے چاہیے کہ اپنے مرتبہ کے شایانِ شان اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ امین کو قرآن مجید، احادیث، نظم پڑھاؤ اور خطابت و فصاحت کی قدر شناسی سکھاؤ۔ اسے ہدایت کرو کہ موقع و بے موقع ہنسا نہ کرے۔ ہاشمی خاندان کے شیوخ کی قدر و منزلت کرنے کی عادات پیدا کرو اور اگر سپہ سالاران افواج اس کی مجلس میں آئیں تو انھیں مناسب جگہ پر بٹھائے۔ کوئی وقت ایسا نہ گزرے کہ اسے کوئی نہ کوئی مفید سبق نہ ملے، لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ وہ آزردہ خاطر ہو جائے۔ اس پر حد سے زیادہ شفقت بھی نہ کرنا ورنہ وہ کاہل ہو جائے گا۔ اس کی اصلاح نرمی سے کی جائے لیکن اگر اس سے کام نہ چلے تو تمھیں سختی کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے (۳۷)۔

شاگرد کا فرض ہے کہ استاد کے ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔ عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

ان الطبیب والمعلم کلاهما
لا ینصحان اذا لم یکرما
فاصبر لدائك ان جفوت طبیبا
واقنع بجهلك ان جفوت العلماء (۳۸)

(اگر طبیب اور استاد کا احترام نہ کیا جائے تو وہ خیر خواہی نہیں کرتے، اگر تو طبیب کے ساتھ زیادتی کرے گا تو تجھے اپنی بیماری پر ہی صبر کرنا پڑے گا، اگر علما کے ساتھ زیادتی کرے گا، تو پھر تجھے اپنی جہالت پر قناعت کرنا پڑے گا)۔

شاگرد کبھی استاد کی شان میں گستاخی نہ کرے۔ مشہور مقولہ ہے باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ استاد طلبا کے روحانی باپ ہیں۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمھارے تین باپ ہیں؛ ایک اصل باپ، دوسرا سسر اور تیسرا استاد۔ آپ ﷺ نے فرمایا: علم سکھانے والا بہتر ہے'' (۳۹)۔ اگر کسی موقع پر استاد ترش روئی سے بات کرے یا سخت بات کہے تو شاگرد کبھی غصہ نہ کرے کیونکہ یہ سب کچھ

اس کی بہتری کے لیے کیا جاتا ہے۔ جب استاد کلاس میں آئے تو شاگردوں کے لیے کھڑا ہونا عین ادب کا تقاضا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہ کی آمد پر فرمایا: ''قوموا لسیدکم'' (۴۰) (اپنے بڑے کے لیے کھڑے ہو جاؤ)۔ جو طلبا استاد کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رکھتے استاد کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرتے۔ جن لوگوں کو مرتبہ حاصل ہوا وہ استادوں کی عزت کی وجہ سے ہوا۔ ایک بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ اس طرف پاؤں نہیں کرتے تھے جس طرف ان کے استاد کا مکان تھا۔ موجودہ دور میں اساتذہ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اساتذہ کا بہت ادب کرتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک دفعہ جنازے میں آئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ادب سے ان کی سواری کی رکاب تھام لی۔ پوچھنے پر ارشاد فرمایا: ہمیں اپنے بزرگوں اور علما سے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۴۱)۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر سہیل بن عمرو نے حضور ﷺ کی عزت و احترام دیکھ کر کہا تھا: ''میں بادشاہوں کے درباروں میں گیا ہوں لیکن جو تعظیم صحابہ رضی اللہ عنہم محمد ﷺ کی کرتے ہیں اتنی کوئی نہیں کرتا'' (۴۲)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''انا عبد من علّمنی حرفاً واحدا'' (۴۳) (جس نے مجھے ایک حرف سکھایا میں اس کا غلام ہوں)۔ حضرت امام قشیری کو معلوم ہوا کہ ان کے استاد دقاق اپنے استاد کو ملنے جانے کے لیے غسل کیا کرتے تھے تو قشیری اپنے استاد کو ملنے جانے کے لیے غسل کرتے اور پھر ملنے جاتے۔

استاد کے احترام کے متعلق ایک حدیث ہے: ''عن أبی هريرة قال قال رسول الله ﷺ تعلموا العلم وتعلموا للعلم السكينة والوقار وتواضعوا لمن تتعلمون منه'' (۴۴) (حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم سیکھو اور علم کے لیے سکینت اور وقار سیکھو اور جن سے آپ علم حاصل کرتے ہیں ان سے تواضع سے پیش آؤ)۔

جب استاد گفتگو کرے تو شاگرد انہماک اور توجہ سے سنے۔ معلم اعظم ﷺ جب بات کرتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش ہو کر بیٹھتے تھے اور اگر بات کرنے کی ضرورت بھی پڑتی تو کبھی بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے ﴿لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ (۴۵) (اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے اونچا نہ کرو ان سے اس

طرح اونچی آواز سے باتیں نہ کرو جس طرح آپس میں کرتے ہو)۔استاد کے سامنے بھی ان آداب کا خیال رکھا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت آہستہ گفتگو کرتے اور آپ ﷺ کا دروازہ بھی آہستہ کھٹکھٹاتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا دروازہ ناخنوں سے کھٹکھٹایا جاتا تھا (۴۶)۔

استاد سے محبت دل کی گہرائیوں سے کرنی چاہیے۔رسمی اور ریاکارانہ محبت نہ ہو بلکہ پورے جذبۂ خلوص سے ہو، استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا مضبوط ہوتا ہے۔استاد کوئی ریل گاڑی کا مسافر نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم سفر رہے۔ بلکہ استاد زندگی بھر کے لیے استاد رہتا ہے اور ایک شاگرد زندگی بھر کے لیے شاگرد رہتا ہے۔ ہر استاد اپنے شاگرد کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا ہے۔شاگرد کا فرض ہے کہ وہ بھی اس طرح سے اس سے محبت کرے، اگرچہ محبت ایک قلبی تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق کم و بیش ہو سکتا ہے لیکن معدوم نہیں ہوتا۔علامہ اقبال کو جب حکومت کی طرف سے سَر کا خطاب پیش کیا گیا تو انھوں نے خطاب قبول کرنے کی یہ شرط رکھی کہ پہلے ان کے استاد مولوی میر حسن کو خطاب دیا جائے۔ چنانچہ جب ان کے استاد کو شمس العلماء کا خطاب دے دیا گیا تب علامہ نے سَر کا خطاب قبول کیا۔یہ استاد سے جذبۂ محبت ہی تو تھا۔اقبال کی محبت کا اظہار بانگ درا میں ان کی نظم ''نالۂ فراق'' سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے استاد آرنلڈ کی جدائی میں لکھی۔فرماتے ہیں:

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا میرے دل کو یقیں
ظلمت شب سے ضیائے روز فرقت کم نہیں (۴۷)

یہ صاحبانِ اعلیٰ ظرف کی مثالیں ہیں، کم ظرف ان بلندیوں کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ بعض طلبا جب کسی اعلیٰ منصب پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ اپنے سے منصب میں کم اساتذہ سے ملنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

شاگرد کا فرض ہے کہ استاد کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کی خدمت کرے۔ اطاعت اسے خصوصی توجہ پر مائل رکھتی ہے۔استاد کے حکم کی تعمیل نہ کرنے والا شاگرد کس طرح اس سے فیض حاصل کر

سکتا ہے۔استاد کی ہدایات پر عمل ہی اس کو لا پروائی سے باز رکھ سکتا ہے۔اس طرح شاگرد کے ذہن میں استاد کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور وہ کما حقہ اس سے استفادہ کر سکتا ہے اور خدمت، استاد کے دل میں شاگرد کے لیے جگہ بناتی ہے وہ اس ۔کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہے جو اسے کامیاب کر دیتی ہے۔دراصل استاد شاگرد کا وہ محسن ہوتا ہے جس کے احسانات کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔خدمت احسان مندی کا تقاضا ہے اور احسان مندی شرافت کا۔شریف کبھی احسان فراموش نہیں ہوتا اور احسان فراموش کبھی شریف نہیں ہو سکتا۔

سید احمد شہید کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ ان کے استاد شاہ عبدالقادر نے انھیں رات کے وقت کہا کہ وہ مسجد کے صحن میں بیٹھیں وہ خود گھر چلے گئے اور بھول گئے۔سردی کا موسم تھا بارش شروع ہو گئی لیکن وہ باہر صحن مسجد میں ہی بیٹھے رہے۔آخر استاد نے آ کر کہا تو اندر گئے۔کسی بھی انسان سے محبت کا پتہ اس کی اطاعت سے ہی چلتا ہے۔آنحضرت ﷺ کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے:

تعصی الرسول وانت تظهر حبه
هذا لعمری فی الزمان بدیع
لو کان حبك صادقا لا طعته
ان المحب لمن یحب یطیع

(آپ رسول ﷺ کی محبت کا دم بھرتے ہیں حالانکہ آپ ان کی نافرمانی کرتے ہیں یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔اگر آپ کی محبت سچی ہوتی تو آپ ان کی اطاعت کرتے کیونکہ محبّ اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے)۔

محنت کبھی ضائع نہیں جاتی قرآن مجید میں ہے: ﴿ نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ ﴾ (۴۸) (محنت کرنے والوں کا بدلہ بہتر ہوگا)۔عربی کا مشہور مقولہ ہے "من جدّ وجد" جس نے محنت کی اس کو اجر ملے گا۔ابتدائی دور میں صحابہ کرام ﷺ ایک ایک حدیث کو حاصل کرنے کے لیے بہت لمبے سفر کرتے تھے (۴۹)۔امام غزالیؒ کا قول ہے: جب تک تم سب کچھ علم کو نہ دے ڈالو علم تمھیں اپنا کچھ بھی نہیں دے گا (۵۰)۔عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

بقدر الکد تکسب المعالی ومن طلب العلیٰ سھر اللیالی

ومن طلب العلم من غیر کد اضاع العمر فی طلب المحال

(محنت کے مطابق بلند مراتب حاصل ہوتے ہیں اور جو بلندیوں کے طالب ہوتے ہیں وہ راتوں کو بیدار رہتے ہیں۔ اور جو محنت کے بغیر علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر کو مشکل کام کی طلب میں ضائع کرتا ہے)۔

شاگرد کے لیے استاد سے بھی بڑھ کر وقت کا پابند ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کی غفلت سے سبق وقت پر نہیں پڑھا جائے گا۔ استاد بھی بے اطمینانی برتے گا۔ بے قاعدگی ہمیشہ کے لیے انسان کو سست اور کاہل بنا دیتی ہے۔

ایک طالب علم کے دل میں علم کی لگن کا ہونا ضروری ہے، وہ اس بات پر پورا غور و فکر کرے کہ اس کا اصل کام علم حاصل کرنا ہے، ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر علم حاصل کرتا رہے۔ ہر ایک کام پر علم کو مقدم سمجھے، اگر دلچسپی نہ ہو تو ذہنی خیالات پراگندہ رہیں گے۔ منتشر خیالات کی مثال اس پانی کی مانند ہے جسے برساتی نالوں میں تقسیم کر دیا جائے کچھ نالے سورج کی گرمی سے خشک ہو جائیں گے، ہوا انھیں اڑا کے لے جائے گی۔ کچھ زمین میں جذب ہو جائیں گے، کچھ انسان اور حیوان پی لیں گے اور پانی ختم ہو جائے گا لیکن یہی نالے اکٹھے ہو جائیں تو وہی دریا بن جاتے ہیں اور ناپید نہیں ہو سکتے۔

دن رات پڑھنے سے ذہن تھک جاتا ہے جسم میں طاقت نہیں رہتی اس لیے ضروری ہے کہ طلبا کچھ وقت آرام کریں۔ رات کو اچھی طرح آرام کرنا۔ دن کو باقاعدہ کھیل میں حصہ لینا۔ ایک اچھے صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوگا۔ طالب علم کے لیے جسمانی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ دن رات پڑھنے والا طالب علم زندگی کے میدان میں کامیاب نہیں ہوتا۔ روزانہ ورزش ضروری ہے۔

ایک طالب علم کے لیے اعلیٰ اخلاق کا حامل ہونا ضروری ہے، وہ نہایت ہی متانت سے گفتگو کرے، اپنے ساتھی طلبا سے کبھی بھی الجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ان سے محبت اور پیار سے وقت گزارے۔ بد اخلاقی سے طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اس لیے برے اخلاق سے بچے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''علم دل کی عبادت اور باطنی نماز کا نام ہے'' (۵۱)۔

ضرورت کے وقت ایک طالب علم کو بخل سے کام نہیں لینا چاہیے، اگر کہیں مال خرچ کرنا ہو تو بلا جھجک کرے۔ کتابیں خریدنا اور فیسیں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ اگر کوئی شخص مال کو علم سے زیادہ پسند کرے وہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کر سکے گا۔ علم حاصل کرنے کے لیے انسان کو اپنا سب کچھ لٹانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ معروف ہے کہ حضرت امام مالکؒ نے علم حاصل کرنے کے لیے بے دریغ خرچ کیا۔

طالب علم کا مقصد بلند ہونا چاہیے۔ محض مادی فوائد کے لیے علم نہیں حاصل کرنا چاہیے بلکہ علم حاصل کرنے والے کے ذہن میں اسلام کی خدمت، رضائے الٰہی اور ملک کی خدمت کا جذبہ ہو وہ علم کے خزانے سے نسل انسانی کو فائدہ پہنچائے۔ ابراہیم النخعی کا قول ہے: "من ابتغی شیئا من العلم یبتغی به وجه الله آتاه الله بما یکفیه" (۵۲) (جو علم کو اللہ کی رضا کے لیے چاہتا ہے اللہ اس کو اس سے اتنا دے دیتا ہے کہ اس کے لیے کافی ہو)۔

تکبر خدا تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ طالب علم کو کبھی متکبر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تکبر سے علم کا نور معدوم پڑنے لگتا ہے۔ متکبر آدمی کبھی متکبر مزاج ہو کر علم حاصل نہیں کر سکتا اور علم ہمیشہ اس کے پاس آتا ہے جس میں خاکساری کا مادہ ہو۔

حضرت مسروق کا قول: "بحسب المرء من العلم ان یخشی الله وبحسبه من الجهل یعجب بعلمه" (۵۳) (آدمی کے علم کے لیے کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور اس کی جہالت کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے علم پر فخر کرے)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "علم سیکھو اور علم کے لیے سکون اور حلم سیکھو اور تواضع سے پیش آؤ جن کو پڑھاتے ہو اور ان سے تواضع سے پیش آؤ جن سے پڑھتے ہو۔ علماء سے زیادتی نہ کرو" (۵۴)۔

سب کچھ کرنے کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ کیا جائے تو علم سے محرومی ہوتی ہے۔ کیونکہ منبع علم وہی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ خود تعلیم فرماتا ہے کہ اس طرح دعا کیا کرو ﴿ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴾ (۵۵) (اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما)۔

آپ ﷺ کی تعلیم ہے کہ اس طرح مانگا کرو: "اللهم انی اسألك علماً نافعاً ورزقا طيبا وعملاً متقبلاً" (۵٦) (اے اللہ میں آپ سے علم کا سوال کرتا ہوں جو نفع بخش ہو اور پاکیزہ

رزق کا سوال کرتا ہوں اور ایسے عمل کا سوال کرتا ہوں جسے قبولیت حاصل ہو)۔

آپ ﷺ یوں بھی فرمایا کرتے تھے: "**اللھم انفعنی بما علمتنی و علمنی ما ینفعنی.**" (۵۷) (اے اللہ جو تو نے مجھے سکھایا ہے اس سے مجھے نفع دے اور مجھے وہی سکھا جو مجھے نفع دے)۔

آپ ﷺ یوں بھی دعا فرمایا کرتے: "**اللھم انی اعوذبک من الاربع من علم لا ینفع وقلب لا یخشع ونفس لا تشبع ودعاء لا یسمع**" (۵۸) (اے اللہ میں چار چیزوں سے پناہ مانگتا ہوں: وہ علم جو نفع نہ دے، وہ دل جو بے خوف ہو، وہ نفس جو سیر نہ ہو، وہ دعا جو قبول نہ ہو)۔

استاد کی زندگی میں جس طرح اس کی اطاعت ہوتی ہے اس طرح اس کے مرنے کے بعد دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔ یہ اس کے حقوق میں سے ہے۔ طالب علم کا اصل کام حصول علم ہے۔ اس دوران اسے اپنی توجہ صرف اس طرف رکھنی چاہیے۔ سیاست میں قطعاً حصہ نہیں لینا چاہیے، جو طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ فرائض سے ہٹ کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں بلکہ اصل سمت ہی کھو دیتے ہیں، بعض طلبا جو بڑے ذہین ہوتے ہیں وہ بعض خودغرض سیاستدانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر بہت نقصان اٹھاتے ہیں اور یوں ملک کا ذہین طبقہ ضائع ہو جاتا ہے۔

طلبا کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن اداروں میں علم حاصل کر رہے ہیں اس کا احترام کریں۔ اس کے قواعد وضوابط کی پابندی کریں کسی صورت میں مدرسہ، سکول، کالج، یونیورسٹی کی عمارتوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ مختلف جگہوں پر نہ لکھیں۔ اس ادارے سے جانے کے بعد طالب علم کا اساتذہ اور ادارہ سے تعلق رہتا ہے اور یہ تعلق برقرار رکھا جائے۔ اس طرح طلبا کو کتابوں سے محبت کرنی چاہیے وہ خود ان کو پڑھیں استادوں کو بتائیں۔ اپنی کتاب کی حفاظت کریں۔ فوٹو کاپی شدہ نوٹس لینے کی بجائے اصل کتابوں سے استفادہ کریں۔

آج کل طالب علم کو متاثر کرنے کے اتنے ذرائع اور وسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ یہ معجزہ ہے کہ طالب علم ابھی تک علم کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں، ایسی صورت میں استاد کے فرائض میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس نے اپنی شخصیت اور کردار میں ایسی خوبیاں پیدا نہ کر لیں جو طالب علم کو متاثر کر سکیں تو پھر اگلی صدی میں استاد اور شاگرد کے روابط کم پڑ جائیں گے۔

لیکن اگر استاد نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا اور ماہرین تعلیم نے ایسا نظام متعارف کرایا جو نئی نسل کی شخصیت کی تعمیر کر سکے اور والدین کی ترجیحات میں اولاد کی تعلیم سرفہرست ہو گی تو پھر اکیسویں صدی کا طالب علم ہمارے آج کے طالب علم سے کئی قدم آگے ہوگا اور ہم اپنی قوم اور ملک کو بام عروج پر پہنچا سکیں گے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ البقرہ:۱۲۹۔

۲۔ آل عمران:۱۶۴۔

۳۔ الجمعہ:۲۔

۴۔ ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف، التمہید (المکتبہ التجاریہ، مکہ المکرمہ)۵/ ۱۱۸۔

۵۔ الخطیب البغدادی، الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع (مکتبہ المعارف، الریاض ۱۹۸۳ء)۱/ ۹۳۔

۶۔ ابن تیمیہ، احمد، مجموع الفتاوٰی (ادارہ البحوث العلمیہ، الریاض)۱۳/ ۳۷۔

۷۔ ابن ماجہ، السنن (احیاء السنہ النبویہ، سرگودھا ۱۳۹۸ھ) ص ۲۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۹۔ عجلونی، اسماعیل بن محمد، کشف الخفاء (مؤسسہ الرسالہ، بیروت ۱۹۸۳ء)۱/ ۷۰۔

۱۰۔ میر تقی میر، دیوان (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور) ص ۹۹۔

۱۱۔ اقبال، کلیات اقبال (غلام علی اینڈ سنز لاہور، کراچی ۱۹۸۲ء)، ص ۴۸۵۔

۱۲۔ احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۹ء)، ص ۱۶۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۵-۱۶۶۔

۱۴۔ ایضاً، ۱۶۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۱۶۔ کلیاتِ اقبال، ص ۱۸۰۔

۱۷۔ ایضاً، بال جبریل (الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد) ص ۶۲۱۔

۱۸۔ الصف:۲۔

۱۹۔ ابوخیثمہ، زہیر بن حرب النسائی، کتاب العلم (المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء) ص ۳۷۔

۲۰۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور ۱۹۷۶ء) مقدمہ، خ۔

۲۱۔ احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ، ص ۶۳۔

۲۲۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۲۲۔

۲۳۔ احمد بن حنبل، المسند (دار الفکر القاہرہ)۲/ ۲۲۲۔

۲۴۔ ایضاً، ۲/ ۲۴۷-۲۵۰۔

۲۵۔ طٰہٰ:۱۱۴۔

۲۶۔ ابوخیثمہ، کتاب العلم، ص۲۳۔

۲۷۔ برق التوحید، آفتاب بخاری (مکتبہ اہل سنت والجماعہ لائل پور) ص۵۵۔

۲۸۔ الخطیب البغدادی، الجامع لاخلاق الراوی، (مکتبہ المعارف، الریاض ۱۹۸۳ء) ۱/۳۳۶۔

۲۹۔ ایضاً، ۱۸۴-۱۸۵۔

۳۰۔ الدھر:۹۔

۳۱۔ السبکی، تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن علی، الطبقات الشافعیہ الکبریٰ (دار احیاء الکتب العربیہ، القاہرہ ۱۹۱۸ء) ۳/۱۴۔

۳۲۔ الفرقان:۷۲۔

۳۳۔ المدثر:۴-۵۔

۳۴۔ سورۃ ص:۸۶۔

۳۵۔ التوبہ:۱۰۸۔

۳۶۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان (منشورات الرضی، قم) ۱/۹۳۔

۳۷۔ احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ، ۶۳-۶۴۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ قاری صدیق احمد، آداب المتعلمین (مجلس نشریات اسلام کراچی) ص۳۷۔

۴۱۔ البیہقی، السنن الکبریٰ (نشر السنہ، ملتان) ۶/۲۲۱۔

۴۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ مع الروض الانف (نشر السنہ ملتان) ۲/۲۲۸۔

۴۳۔ قاری صدیق احمد، آداب المتعلمین، ص۳۷۔

۴۴۔ الہیثمی، نورالدین علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد (مؤسسہ المعارف بیروت ۱۹۸۶ء) ۱/۱۳۴۔

۴۵۔ الحجرات:۲۔

۴۶۔ الجامع لاخلاق الراوی، ۱/۱۶۱-۱۶۲۔

۴۷۔ کلیات اقبال، بانگِ درا، ص۱۰۷۔

۴۸۔ آل عمران:۱۳۶۔

۴۹۔ ابن ماجہ، السنن، ص۲۰۔

۵۰۔ آداب المتعلمین، ص۳۸۔

۵۱۔ چیمہ، غلام رسول، اسلام کا معاشرتی نظام (علم و عرفان پبلشرز، لاہور) ص ۳۰۹۔
۵۲۔ الجامع لاخلاق الراوی، ۱/۱۰۴۔
۵۳۔ ابوخیثمہ، کتاب العلم، ص ۱۴۔
۵۴۔ الجامع لاخلاق الراوی، ۱/۹۳۔
۵۵۔ طہ، ۱۱۴۔
۵۶۔ ابن ماجہ، السنن، ص ٦٦۔
۵۷۔ ایضاً، ص ۲۲۔
۵۸۔ ایضاً۔

باب ششم

سیرت نبوی ﷺ اور منہاجِ دعوت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت داعیٔ اعظم

اسلام دعوت کا دین ہے۔قرآن مجید دعوت کی کتاب ہے۔اگرچہ اس میں ہدایت وشریعت کا بیان ہے مگر اس کے اندر دعوت وتبلیغ کا عنصر دیگر عناصر پر غالب ہے۔کیونکہ ایمان کی بنیاد ہدایت پر ہے اور ایمان کے حصول کا دارومدار دعوت پر ہے۔محمد رسول اللہ ﷺ اس دعوت کے داعی ہیں۔چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾(۱)(اے پیغمبر جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے)۔

قرآن مجید میں آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهِ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً. الَّذِىْ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَداً وَّلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيْكٌ فِىْ الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْراً﴾(۲)(نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ سارے جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو، وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی)۔

دعوت اور دیگر مترادف اصطلاحات:

انبیاء کرام صلوۃ اللہ علیھم السلام کے فرائض منصبی میں سے سب سے اہم فریضہ دعوت وتبلیغ ہے۔قرآن مجید نے دعوت وتبلیغ کے لیے متعدد اصطلاحات والفاظ استعمال کیے ہیں۔مثلاً

۱۔ **دعوت:** اس کے معنی پکارنے اور بلانے کے ہیں۔

﴿قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِىْ أَدْعُوْآ إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَاْ وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾(۳)(تم ان سے صاف کہہ دو کہ ''میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور

شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں'')۔اسی طرح آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے:﴿ اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ﴾(۴)((اے نبی ﷺ) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور نصیحت کے ساتھ،اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو)۔

قرآن مجید میں چالیس کے قریب ایسی آیات آئی ہیں جن میں دعوت کا مفہوم بیان ہوا ہے۔

۲۔ تبلیغ:

تبلیغ سے مراد مخاطب تک دین کی بات ایسے عمدہ طریق اور دل نشین انداز میں پہنچانا ہے کہ وہ اس کے دل ودماغ پر اثر کرے۔رسولوں کے متعلق فرمایا گیا:﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا﴾(۵)((یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے لیے)جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے:﴿ يٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾(۶)(اے پیغمبر ﷺ جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا،اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے)۔

۳۔ انذار:

انذار کے لغوی معنی ڈرانے کے ہیں اور نذیر کے معنی ڈرانے والا کے ہیں۔انذار اور نذیر کے الفاظ ۱۱۵ مرتبہ قرآن مجید میں آئے ہیں۔مثلاً﴿يٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَأَنْذِرْ o وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾(۷)(اے اُوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے اُٹھو اور خبردار کرو۔اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:﴿ وَأُوْحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ﴾(۸)(اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے،سب کو متنبہ کردو)۔

۴۔ تذکیر:

قرآن مجید میں دعوت وتبلیغ کے مفہوم میں تذکیر کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے اور ۶۸ مرتبہ یہ لفظ قرآن مجید میں اسی مفہوم میں آیا ہے۔ رسول اللہ کو مخاطب کر کے آپ ﷺ کی اس حیثیت کا اظہار فرمایا: ﴿وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹) (البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے)۔ ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (۱۰) (پس آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کریں، جو میری تنبیہ سے ڈرے)۔

۵۔ تبشیر:

تبشیر کا لفظ بھی دعوت وتبلیغ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں تقریباً ۵۵ مرتبہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے: ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهٰرُ﴾ (۱۱) (اور اے پیغمبر، جولوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کرلیں، انھیں خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی)۔ دیگر انبیاء کے متعلق فرمایا: ﴿رُّسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (۱۲) (یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے)۔

۶۔ تواصی بالحق:

قرآن مجید میں دعوت کے لیے تواصی بالحق کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ العصر میں ہے: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (۱۳) (ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے)۔ سورۃ البقرہ میں یہی مفہوم اس طرح بیان ہوا ہے ﴿وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ (۱۴) (اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب علیہ السلام اپنی اولاد کو کر گئے تھے)۔

۷۔ امر بالمعروف ونھی عن المنکر:

امر بالمعروف ونھی عن المنکر کے الفاظ بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ نبی ﷺ کی ذمہ داریوں میں اہلِ ایمان کو بھی شامل کیا گیا۔

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۱۵) (تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے)۔

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (۱٦) (مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں)۔

۸۔ ہدایت:

ہدایت کا لفظ بھی اسی مفہوم میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے ﴿وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ﴾ (۱۷) (ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ارشاد ہے: ﴿فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴾ (۱۸) (آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا)۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات سے دعوت کے فریضہ کی اہمیت وضرورت اور کام کی نوعیت اور ہمہ جہتی واضح ہو جاتی ہے۔

منصب نبوت اور دعوت

دعوت منصب نبوت کا بنیادی فریضہ:

انبیاء کرام علیہم السلام کا پہلا اور اہم فریضہ دعوت وتبلیغ ہے یعنی جو سچائی ان کو اللہ کی طرف سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم ان کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا۔ اللہ کا

پیغام جس حد تک انھیں پہنچا ہے، اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دینا۔ اس نے ان کو جس صداقت سے آ گاہ کیا ہے، اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس مقدس گروہ کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا، اس اعلان و دعوت میں جو تکلیف بھی آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال و متاع، اہل و عیال الغرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ بن کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا، اس پاک باز طبقہ کی ساری کدو کاوش کا مقصد خدا کی رضا مندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں، دنیا میں جس قدر پیغمبر ﷺ آئے انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ سرانجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے اس فرض کو ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بیکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر اثر ہے، وہ سب بلا واسطہ یا بالواسطہ، دانستہ یا نادانستہ ان کی ہی دعوت و تبلیغ اور جدو جہد کا اثر و نتیجہ ہے(۱۹)۔

دعوت کی اہمیت اور ضرورت:

انبیاءِ کرام علیھم السلام کی بعثت کی سب سے پہلی غرض و غایت امت کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمانِ بندگی کی یاد دہانی ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ﴾ (۲۰) (اور اے نبی ﷺ، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمھارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا ''میں تمھارا رب نہیں ہوں''؟ انھوں نے کہا: ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں'۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں''۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ''ہم تو اس بات سے بے خبر تھے'')۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے ساتھ جنات کی پیدائش کا مقصد بھی اپنی عبادت قرار دیا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۲۱) (میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)۔

انسانوں کی تخلیق کا ایک مقصد عبادت کے ذریعے حصول تقویٰ و پرہیز گاری ہے۔ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (۲۲) (لوگو، بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارے اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمھارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام اشیاء انسان کے لیے مسخر کر دیں لیکن انسان کو صرف عبادت الٰہی کا پابند کیا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۳) (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے)۔

انسان خدا تعالیٰ کے احکامات و منہیات کی تہہ دل سے تعظیم کرے اور اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنائے کیونکہ عبادت نام ہی اس کیفیت کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور منہیات کی تعظیم کرتے ہوئے اس کی توحید کا اقرار ہو اور اطاعت و فرمانبرداری کو شعار بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور اس کے مابین تمام مخلوقات کو اس لیے پیدا کیا تا کہ سب کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہٰذا جن و انس کو جن ذمہ داریوں کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے ان کی بجا آوری اصل عبادت ہے۔

عبادات کی تفصیل محض اٹکل پچو سے ممکن نہیں کہ انسان عقل کی بنیاد پر احکام الٰہیہ کی معرفت حاصل کر سکے۔ لہٰذا اس معرفت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف رسولوں کو بھیجا اور آسمانی کتابیں بھی نازل فرمائیں تا کہ ان حقائق کو بیان کیا جائے جن کی خاطر کائنات کو پیدا کیا گیا اور لوگوں کے سامنے دنیا میں آنے کا مقصد واضح کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے صراط مستقیم کی وضاحت کر کے لوگوں پر حجت قائم کر دی تا کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے والا یا ڈرانے والا آیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیج کر اور آسمانی کتابیں نازل فرما کر لوگوں پر حجت قائم کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر امت میں انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا

الطَّاغُوتَ﴾ (۲۴) (ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے سے سب کو خبر دار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو'')۔ ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (۲۵) (ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)۔

رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے۔ ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بے جا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا یا ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس لیے فرمایا: ﴿رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (۲۶) (یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے)۔ انجام دعوت کے حوالے سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا مشترکہ نکتہ اپنے معاملات کو خدا کے سپرد کرنا ہے:

﴿فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ (۲۷) (آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اُسے یاد کرو گے۔ اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ہر نبی نے ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی۔

حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کا اساسی نکتہ یوں بیان ہوا ہے: ﴿يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ﴾ (۲۸) (اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں)۔

دعوتِ محمدی ﷺ کی ہمہ گیری:

اس کے متعلق قرآن مجید کی آیات بہت واضح ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (۲۹) (ہم نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا)۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۳۰) (ہم نے آپؐ کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (۳۱) (وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اُس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے)۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (۳۲) (اے محمد ﷺ، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبر ہوں)۔

مذکورہ بالا آیات مبارکہ کی عملی تطبیق میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف قوموں اور مختلف مذہبوں کے ارباب اقتدار کے پاس مکتوبات ارسال فرمائے اور دعوت اسلام کی بابت یہ ایسی کارروائی تھی جس کی نظیر دنیا کے کسی سابقہ مذہب کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی کہ ان کے بانیان مذہب نے ایسا کیا ہو۔ چونکہ ہم ہر ایک سچے مذہب کے ہادی کی دل سے عزت وعظمت کرتے ہیں۔ لیکن وہ مقدس بزرگوار اپنے مذہب کو اسی قوم سے مخصوص سمجھتے تھے جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب دو وجوہات کے پیشِ نظر دعوت کے قائل نہ تھے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

۱: ان کے نزدیک قبولیت حق کا اعزاز پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں، مطلب یہ کہ یہ شرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو خاندانی اعتبار سے اس کا اہل ہو۔ کوئی شخص سعی سے یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

۲: حق جو اُن کے پاس ہوتا ہے وہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ ان کے مقدس خاندان کے علاوہ اسے دوسرے ناپاک لوگوں تک پہنچانا اس مقدس مذہب کی توہین ہے (۳۳)۔

یہی وجہ ہے ایک مرتبہ جب ایک یونانی عورت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے برکت چاہی تو حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا: ”مجھے اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا“ (۳۴)۔ یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر بنی اسرائیل) کے آگے پھینک دیں (۳۵)۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا: ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو'' اور اپنے موتی سؤروں کے آگے مت پھینکو(۳۶)۔

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے چھپا کر رکھا ہے کہ وہ اپنا مذہب اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ غیر اسرائیلی لوگ اس نعمت کے اہل نہیں (۳۷)۔

حضرت محمد ﷺ کی دعوت وتبلیغ بھی اسی دعوت کا تسلسل ہے جو تمام سابقہ انبیاء کرامؑ اپنی اپنی قوموں کو دیتے رہے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿قُولُوٓا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلٰىٓ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَآ أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ٥ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَآ آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا﴾ (۳۸) (مسلمانو، کہو کہ: ''ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور جو ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب علیہ السلام کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم اُن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اُسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں)۔

سرزمین عرب کے باشندے احکام خداوندی کو بھول کر ایک خدا کی جگہ سیکڑوں دیوی، دیوتاؤں کی عبادت کر رہے تھے۔ کعبہ جو بندگی خدا کے لیے بنایا گیا تھا، عبادت گاہ کی بجائے ۳۶۰ بتوں کا مرکز تھا۔ ان بتوں کی صبح وشام پوجا ہوتی تھی اولاد قتل کی جارہی تھی۔ بدعات وخرافات کا دور دورہ تھا۔ لوگ بے راہ روی اور بے اعتدالی کا شکار تھے۔ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو رسول اور داعئ حق بنا کر بھیجا، منصب نبوت کی اہم ترین ذمہ داری یعنی دعوت حق کی طرف آپ کو متوجہ کیا۔

ارشاد ہوا: ﴿يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. وَلاَ تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ. وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ (۳۹) (اے چادر اوڑھنے والے اٹھو،

لوگوں کو گمراہی کے انجام سے روکو اور اپنے پروردگار کی عظمت اور جلال کو بیان کرو، لباس کو پاک کرو، بتوں سے جدا رہو، اپنے پروردگار کے معاملہ میں زیادہ احسان نہ کرو اور اپنے رب کے معاملہ میں اذیت و مصیبت پر صبر کرو)۔

اس طرح دعوت وارشاد کی پہلی منزل پر آپؐ نے قدم رکھا اور کلام الٰہی کے اس کلمۂ بلیغ میں دعوت وتبلیغ کا جو پیغام تھا، اس کی خاطر آپؐ کو دعوت وارشاد میں ایک قدم اور بڑھانے کا حکم ملا۔ اہل قرابت اور رشتہ داروں کو دعوت حق پہنچانے کا حکم ہوا ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (۴۰) (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ)۔

اس کے بعد اللہ کا نبی ﷺ کمر ہمت باندھ کر اس دعوت کو عام کرنے کے لیے چل پڑتا ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے ارد گرد لوگوں کو وعظ حق سنانے کے لیے مختلف مقامات پر پہنچتا ہے۔ طائف کا میدان ہو یا عکاظ کا میلہ ایک ہی صدائے دعوت بلند ہو رہی ہے: "یا ایها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا" (۴۱) (لوگو لا اله الا الله کہو کامیاب ہو جاؤ گے)۔

آپ ﷺ نے جس دعوت کا آغاز مکہ کے مشرکانہ ماحول میں کیا تھا، وہ اپنی منازل طے کرتی ہوئی جس کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی وہ صرف اور صرف آپ ﷺ کی ذات مبارکہ کا خاصہ تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً. وَدَاعِياً إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُّنِيراً﴾ (۴۲) (اے نبی ﷺ، ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر)۔

آپ ﷺ کی دعوت کسی خاص مقام اور ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ ﴿قُلْ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (۴۳) (اے محمد ﷺ، کہو کہ "اے انسانو، میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر جو اللہ

اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اس کی، اُمید ہے کہ تم راہ راست پالو گے‘‘)۔

دعوت محمدیہ کے اصول:

آنحضور ﷺ کی دعوت وتبلیغ اصولوں پر مبنی تھی۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱: دعوت بالحکمۃ:

آپ ﷺ کی دعوت حکمت و دانائی کے اصول کے مطابق تھی۔ آپ ؐ مخاطب کی استعداد اور موقع محل کے مدنظر دل نشیں انداز اختیار کرتے اور مخاطب کی نفسیات کو پہچان کر اس کو دعوت دیتے۔ دعوت پیش کرتے وقت مخلصانہ انداز میں وعظ ونصیحت فرماتے اور مؤثر طور پر نشیب وفراز سے آگاہ کرتے۔ مخاطب کے دلائل کی بطریق احسن تردید کرتے یعنی اس آیت کے مصداق:

﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (۴۴) (اے نبی ﷺ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو)۔

۲: قول بلیغ:

آپ ﷺ کی دعوت میں عفو و درگزر، وعظ ونصیحت اور قول بلیغ شامل تھا۔ ارشاد ہے:

﴿فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِيْ أَنفُسِهِمْ قَوْلاً بَلِيْغًا﴾ (۴۵) (آپ ﷺ ان سے چشم پوشی کیجیے انھیں نصیحت کرتے رہیے اور انھیں وہ بات کہیے جو ان کے دلوں میں گھر کرنے والی ہو)۔

آپ ﷺ جامع اور مدلل گفتگو فرماتے۔ انداز دل نشین ہوتا، دعوت وارشاد میں مخالف کی بدتہذیبی اور درشت کلامی کو برداشت کرتے۔ بیزار ہو کر اس کو ترک نہیں فرمادیتے تھے۔ دینِ اسلام کو آسان کر کے پیش فرماتے اور خوشخبری سناتے۔ جب آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن میں دعوت اسلام کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ”یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا“ (۴۶) (دین اسلام کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں۔ لوگوں کو خوشخبری سنانا۔ نفرت نہ دلانا)۔

۳: رفق اور نرمی:

آپ ہمیشہ نرم لہجہ میں گفتگو فرماتے۔ شیریں زبان اور لطف وتحمل آپ کے داعیانہ اوصاف تھے۔ اسلام کی نشر واشاعت میں آپ کی نرم روئی کا بڑا دخل ہے۔ قرآن مجید نے یہ نکتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لانفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۴۷) (اگر آپ تندخو اور سنگ دل ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے چھٹ جاتے)۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی۔ جنگ احد میں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ اس نے چبایا تھا اور آپ کے ناک اور کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا۔ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی، دربار رسالت میں پہنچ کر آپ ﷺ کے حسن اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! سطح زمین پر آپ ﷺ کے گھرانے سے زیادہ کوئی مجھے ناپسند نہ تھا۔ لیکن آج آپ ﷺ کے گھرانے سے کوئی گھرانہ مجھے محبوب تر نہیں'' آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ''خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال ہے'' (۴۸)۔

۴: مجادلۂ حسنہ:

جھگڑا کرنے سے ہر لحاظ سے بچا جائے اگر نوبت آ بھی جائے تو نہایت احسن طریقے اور نرم گفتگو سے معاملے کو حل کیا جائے۔

۵: غور وفکر اور عقل وشعور کی دعوت:

آپ ﷺ نے کبھی بھی دعوت وتبلیغ میں جبر واکراہ سے کام نہیں لیا بلکہ تعقل وبصیرت اور ہر معاملہ میں فہم وتدبر کا لوگوں سے مطالبہ کیا، ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت وحکمت کا اظہار کیا، اسلام نے زور وزبردستی کے طریقہ کو بالکل اختیار نہیں کیا، علاوہ ازیں مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز ہی نہیں:

﴿لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۴۹) (دین میں کوئی زور زبردستی نہیں صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے)۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین لوگوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ہوئی۔

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (۵۰) (صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے)۔ مزید فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ. قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (۵۱) (ان سے کہو "کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کرسکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو"۔ پھر کہو (تمھاری اُس حجت کے مقابلے میں) حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے)۔

آنحضرت ﷺ کو قریش کے اعراض ومخالفت سے حد درجہ غمگین رہنے پر فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ. لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾ (۵۲) (اے پیغمبرؐ آپ کو صرف نصیحت کرنے والے ہیں، آپؐ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں)۔

بعد ازاں دشمن پر غلبہ کے باوجود آپ ﷺ نے صلح وآشتی کو مدّ نظر رکھا اور اپنی دعوت کو بزور شمشیر نہیں پھیلایا۔ اور نہ ہی اپنا مؤقف زبردستی کسی پر مسلط کیا۔

ثمامہ رضی اللہ عنہ بن اثال قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا، اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخری زمانہ میں مسیلمہ کذاب پیدا ہوا تھا، ثمامہ مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور مدینہ منورہ لاکر مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا محمد ﷺ، میری رائے اچھی ہے۔ اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو، جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا۔ پھر اسی طرح دوسرے دن سوال وجواب ہوا، پھر تیسرے دن، آخر آنحضور ﷺ نے فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھول دیا، وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے، مگر سچائی کی زنجیریں پاؤں میں پڑ

گئیں۔ مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر مسلمان ہو گئے۔(۵۳)

کیا زبردستی مسلمان بنانے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے جبر کے بجائے بغور مطالعۂ اسلام کی فرصت دے کر انھیں حلقہ بگوش اسلام کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح جنگ بدر کے قیدیوں کو انھیں اپنے پاس رکھ کر غور وخوض کی فرصت مہیا کی گئی جس کے نتیجے میں ابو العاص رضی اللہ عنہ بن ربیع، نوفل رضی اللہ عنہ بن حارث اور عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے بہ طیب خاطر اسلام قبول کیا۔(۵۴)

غزوۂ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمھارے ذریعے سے ہدایت دے دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ تمھاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں''(۵۵)۔

۶: عزم واستقلال:

قریش مکہ کے اصرار پر جب ابو طالب نے آپ ﷺ سے کہا، میری جان للہ میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اُٹھا نہ سکوں تو آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو بھی میں دعوت کا کام نہ چھوڑوں گا(۵۶)۔

اسی طرح شعب ابی طالب کا محاصرہ اور طائف کی ہزیمت جیسی گونا گوں تکالیف آپ ﷺ کے مشن سے آپ ﷺ کو نہ ہٹا سکیں۔ اس کے بعد فتح مکہ جیسی عظیم فرحت بھی حائل نہ ہو سکی۔ دعوت دین میں آپ ﷺ نے ہمیشہ عزم واستقامت کی راہ اختیار کی۔ پیش آمدہ مصائب ومشکلات میں بالکل پیچھے نہ ہٹے۔ اس طرح دیے گئے مختلف لالچ بھی آپ ﷺ کو اس عزم سے دور نہ کر سکے۔ آپؐ کے داعیانہ کردار کے یہی وہ اعلیٰ نمونے تھے جنھوں نے حضور ﷺ کو دنیا کا سب سے زیادہ کامیاب مبلغ وداعی بنا دیا۔

دعوت کے نتائج وثمرات:

داعی کی کامیابی کا اندازہ دعوت کی کامیابی سے لگایا جاتا ہے جو نتائج آپ کی دعوت کے مرتب ہوئے۔ اس سے پہلے کسی داعی کو وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور نہ کسی داعی کی دعوت دائمی اور ابدی

شکل اختیار کر سکی۔ مگر رسول اللہ کی دعوت دائمی اور ابدی دعوت ٹھہری۔

﴿هُوَ الَّذِيٓ أَرۡسَلَ رَسُولَهُۥ بِالۡهُدَىٰ وَدِينِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهُۥ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِۦ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ (۵۷) (وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے)۔

آپؐ کی دعوت اور دین کے غلبہ کی خوشخبری مندرجہ بالا آیت میں بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تمام دینوں پر غلبہ دیا ہے۔ جس شخص تک آپؐ کی دعوت پہنچی جس نے سنا اسے یقین ہو گیا کہ آپؐ کی دعوت سچی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرنا ضروری ہے اور غالب رہنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ پہلے رسول اللہ کے زمانے میں غالب آیا پھر آخرت پر قیامت سے قبل غالب آ جائے گا اور غلبے سے علمی غلبہ ہی مراد نہیں بلکہ سیاسی غلبہ بھی اس میں شامل ہے۔

تاریخ انسانی کا یہ انوکھا داعی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دعوت کے نتائج دیکھتا ہے۔ داعی مطلوبہ معیاری اور مثالی معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ فلاحی ریاست کی تنظیم کرتا ہے، باطل کو مغلوب کرتا ہے، شرف انسانیت کو مستحکم کرتا ہے۔ داعیٔ اعظم ایسی دعوتی تحریک کا آغاز کرتے ہیں جو بُعد زمانہ کے باوجود آج تک اپنی کامرانیوں اور کامیابیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسۡتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيكُمۡ﴾ (۵۸) (اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمھیں اُس چیز کی طرف بلائے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)۔

یہ دعوت انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے احیاء و قیام کی دعوت ہے، غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس دعوت نے قوموں کی زندگیوں کو کس طرح متحرک کر دیا تھا اور عرب کے اجڈ اعرابی کرۂ ارض کی سب سے بڑی اور مہذب قوم بن گئے۔

آنحضرت ﷺ جب تک مکۂ معظّمہ میں تشریف فرما رہے بنفس نفیس اس فرض کو سرانجام دیتے

رہے، ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ مکرمہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظّمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے۔ آپؐ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے۔ اس سالانہ دعوت سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔ الغرض اس دعوتی عمل اور تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سیکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے۔ قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی مشاورت سے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے اور حبشہ اور یمن میں اسلام کی دعوت روشناس ہوئی۔

جب مدینہ میں اسلام کو اطمینان ہوا اور خوب پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطراف واکناف سے دار الاسلام آتے تھے اور ملک کے مختلف گوشوں میں دعوتِ اسلام کے لیے ایک جماعت تیار کی جو اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے (یعنی چبوترے والے) اس میں بعض اوقات سو سے بھی زیادہ آدمی داخل رہے، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے تھے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی بے دردی سے شہید کیے گئے اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ ؓ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور پر ملتے ہیں۔ تقریباً ایسے ۳۵ اصحاب کے نام ملے ہیں جنھوں نے آنحضور ﷺ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا۔ انھی مبلغین، داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبشہ، ہندوستان ہر جگہ اسلام پہنچ گیا۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع (۱۰ھ) پر جب آپ ﷺ نے مجمع عام کو خطاب کیا:

"انتم تسئلون عنی فما انتم قائلون؟' (۵۹) (تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟)۔

صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ آپ ﷺ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا "اللھم اشھد" (۶۰) (اے اللہ گواہ رہنا)۔

عین اس وقت جب آپ ﷺ اس فرض نبوت کی ادائیگی کی بات کر رہے تھے یہ آیت اُتری ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۶۱) (آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)۔ یہ نہایت حیرت انگیز منظر تھا کہ شہنشاہ عالم لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں آپ ﷺ کی دعوت کی کامیابی کا اعلان فرما رہا ہے۔

آپ ﷺ کی دعوت کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ داعی کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ ﷺ نے اس دعوت کو بے پناہ قربانیوں کے ساتھ آگے بڑھایا پھر اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے سلسلہ دعوت جاری وساری رکھا خواہ ان کا تعلق عجم سے تھا یا عرب سے، انھوں نے اس نیابت اور ذمہ داری کو نبھانے کا خوب حق ادا کیا۔ جس سے خدا تعالیٰ کا دین ہر طرف اور ہر سُو پھیلا۔ اور یوں اُمت محمدیہ کے یہ اصحابِ عزیمت اس آیت کے مصداق ٹھہرے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (۶۲) (اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو اُن کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے)۔

علماء امت یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ دعوت الی اللہ کا کام فرض کفایہ ہے۔ دعوت کا کام آپ ﷺ نے خود کیا اور مختلف علاقوں میں دعوت وتبلیغ کے لیے مبلغین بھیجے۔ مختلف قبائل کے سرداروں کو اور بادشاہوں کو ایسے خطوط لکھے جن میں انھیں توحید کی دعوت دی گئی تھی۔ آج اس کے لیے بہت سے ذرائع استعمال ہو رہے ہیں اور یہ دعوتی فریضہ پوری تندہی سے سرانجام دیا جا رہا ہے، اور اس حکم خداوندی کی تعمیل ہو رہی ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنكَرِ ﴾ (۶۳) (اور تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے)۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں: ''محمد رسول اللہ ﷺ نے دعوت کے ذریعے مردم سازی اور آدم گری کا کام اس سطح سے شروع کیا جہاں سے کسی مصلح کو نہیں کرنا پڑا تھا اور نہ وہ اس کا مکلّف بنایا گیا تھا۔ اس لیے کہ عام طور پر دیگر انبیاء کی قوموں کی معاشرتی سطح زمانہ جاہلیت سے بہت بلند تھی۔ آپ ﷺ نے اس سطح سے کام شروع کیا جہاں حیوانیت کی انتہا اور انسانیت کی ابتدا ہوتی تھی اور اسے اس اعلیٰ سطح تک پہنچا دیا جو انسانیت کی انتہائی منزل ہے اور جس کے بعد نبوت کے سوا کوئی درجہ نہیں، امت محمدیہ کا ہر فرد اپنی ذات میں ایک مستقل معجزہ اور نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور یہی نوع انسانی کے اشرف و افضل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے'' (۶۴)۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ المائدہ: ۶۷۔
۲۔ الفرقان: ۱-۲۔
۳۔ یوسف: ۱۰۸۔
۴۔ النحل: ۱۲۵۔
۵۔ الاحزاب: ۳۹۔
۶۔ المائدہ: ۶۷۔
۷۔ المدثر: ۱-۳۔
۸۔ الانعام: ۱۹۔
۹۔ الذاریات: ۵۵۔
۱۰۔ ق: ۴۵۔
۱۱۔ البقرۃ: ۲۵۔
۱۲۔ النساء: ۱۶۵۔
۱۳۔ العصر: ۳۔
۱۴۔ البقرۃ: ۱۳۲۔
۱۵۔ آل عمران: ۱۰۴۔
۱۶۔ التوبہ: ۷۱۔
۱۷۔ الاعراف: ۱۸۱۔
۱۸۔ مریم: ۴۳۔
۱۹۔ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور ۱۹۹۱ء) ۴/ ۱۰۸۔
۲۰۔ الاعراف: ۱۷۲۔
۲۱۔ الذاریات: ۵۶۔
۲۲۔ البقرہ: ۲۱۔
۲۳۔ الحج: ۶۵۔
۲۴۔ النحل: ۳۶۔
۲.۔ الحدید: ۲۵۔

۲۶۔ النساء: ۱۶۵۔
۲۷۔ المؤمن: ۴۴۔
۲۸۔ الاعراف: ۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵؛ ھود: ۵۰-۶۱، ۸۴؛ المؤمنون: ۲۳۔
۲۹۔ السبا: ۲۸۔
۳۰۔ الانبیاء: ۱۰۷۔
۳۱۔ الفتح: ۲۸۔
۳۲۔ الاعراف: ۱۵۸۔
۳۳۔ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، ۴/ ۱۸۸۔
۳۴۔ بائبل متی، ۱۵-۲۵۔
۳۵۔ ایضاً، ۱۵-۲۵۔
۳۶۔ ایضاً، ۶-۷۔
۳۷۔ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ، ۴/ ۱۸۹۔
۳۸۔ البقرۃ: ۱۳۶-۱۳۷۔
۳۹۔ مدثر: ۱-۷۔
۴۰۔ الشعراء: ۲۱۴۔
۴۱۔ البیہقی، السنن الکبریٰ (نشر السنہ، ملتان) ۶/ ۲۱۔
۴۲۔ الاحزاب: ۴۵-۴۶۔
۴۳۔ الاعراف: ۱۵۸۔
۴۴۔ النحل: ۱۲۵۔
۴۵۔ النساء: ۶۳۔
۴۶۔ بخاری، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۹۶۱ء، طبع ثانی) ۲/ ۶۲۲۔
۴۷۔ آل عمران: ۱۵۹۔
۴۸۔ الازہری، کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی (ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور ۱۴۱۸ھ) ۴/ ۴۶۵-۴۶۶۔
۴۹۔ البقرۃ: ۲۵۶۔
۵۰۔ الکہف: ۲۹۔
۵۱۔ الانعام: ۱۴۸-۱۴۹۔

۵۲۔ الغاشیہ:۲۱-۲۲۔

۵۳۔ مسلم، الجامع الصحیح، ۲/۹۳-۹۴۔

۵۴۔ ابن کثیر، اسماعیل، سیرت النبیؐ (اردو) ترجمہ مولانا ہدایت اللہ ندوی، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۶ء) ۱/۵۲۶، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ، ۱/۲۰۴-۲۰۵۔

۵۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۲/۲۰۶۔

۵۶۔ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، ۱/۱۴۳۔

۵۷۔ الفتح: ۲۸۔

۵۸۔ الانفال: ۲۴۔

۵۹۔ مسلم، الجامع الصحیح: ۴/۳۹۶-۳۹۷۔

۶۰۔ ایضاً۔

۶۱۔ المائدہ: ۳۔

۶۲۔ السجدہ: ۲۴۔

۶۳۔ آل عمران: ۱۰۴۔

۶۴۔ ندوی، ابوالحسن علی، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین (مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۶ء) ص ۱۷۹۔

قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی تاثیر

(غیر مسلموں کے لیے قرآن اور سیرت نبوی ﷺ میں دعوت کے رہنما اصول)

آسمانی کتب کے ذریعے اللہ نے انسانوں کی رہنمائی فرمائی۔ آخری کتاب قرآن مجید سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾(۱) (اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جارہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں)۔

سورۃ جمعہ میں ارشاد ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾(۲) (وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انھی میں سے اُٹھایا، جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)۔

انسانیت کی بہبود اور بہتری کے لیے مختلف ادوار میں مختلف صحائف اور آسمانی کتابیں اللہ نے نازل فرمائیں۔ مگر وہ کتب امتداد زمانہ سے یا تو باقی نہ رہ سکیں یا ان میں تحریف کر دی گئی مگر قرآن مجید وہ سرمایۂ علم وحکمت ہے جو تحریف سے مبرّا اور سب آسمانی کتب کی تعلیم کا مجموعہ ہے۔ یہ زبور کی طرح مجموعہ مناجات بھی ہے اور انجیل کی طرح ذخیرۂ امثال بھی، تورات کی طرح گنجینۂ شریعت بھی اور کتب دانیال کی طرح خزینۂ اخبار بھی:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قرآن وہ معجزہ ہے جس نے پہلی دفعہ عقل اور مذہب میں مطابقت پیدا کی ہے جس نے منطقی دلائل، سریع الفہم امثلہ اور نص سے پیچیدہ مسائل کو حل کر دیا۔ جو نہ صرف مذہبی مسائل کا مجموعہ بلکہ سیاسی زندگی کے لیے راہ نما ہے بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مشرق ومغرب کے غیر مسلم اہل علم اور مفکرین نے قرآن حکیم کی اس دعوتی تاثیر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔اس میں نہ صرف معنوی اعتبار سے غیر معمولی عظمت ہے بلکہ اس کے لفظی آہنگ میں بھی انتہائی غیر معمولی تاثیر ہے۔آدمی سمجھے بغیر بھی قرآن کی آواز سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر وہ قرآن کو سمجھتا بھی ہو تو قرآن مجید کا سننا اس کے دل کو ہلا دے گا۔وہ اس کی روح میں ایک قسم کے ارتعاش کی کیفیت پیدا کر دے گا۔اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید سب سے زیادہ مؤثر دعوتی کتاب ہے۔ قرآن تربیت بھی ہے اور دعوت بھی (۳)۔

قرآن مجید میں جو خصوصیت اور جاذبیت ہے وہ دنیا کی دوسری کسی کتاب میں نہیں۔اللہ کا کلام تمام کلاموں کا بادشاہ ہے۔مسلمانوں پر اس کے اثرات پڑتے ہیں مگر آج دنیا بھر کے غیر مسلموں پر بھی قرآن کی اس دعوتی تاثیر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں اور دنیا بھر کے ۱۹۲ ممالک سے خبریں آ رہی ہیں کہ فلاں ابن فلاں نے قرآنی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

میں نے اس موضوع کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ابتدائے اسلام میں قرآن مجید سے متاثر ہوئے اور وہ پہلے مسلمان نہیں تھے۔بعد میں صحابہ کرام ﷡ کا قرآن مجید سے تعلق اور اُن پر اس کلامِ الٰہی کے اثرات کے چند واقعات بیان کیے گئے ہیں اور آخر میں موجودہ دور کے وہ لوگ جو قرآن سے متاثر ہوئے، ان کا مختصر تذکرہ ہے۔

تاثیر قرآن:

۱: نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار ﷛ نے خطبہ دیا اور فرمایا: " أيّها الملك كنا قوما أهل جاهلية نعبد الأصنام ونأكل الميتة، ونأتي الفواحش، ونقطع الأرحام ونسى الجوار، ويأكل القويّ منّا الضعيف فكنا على ذلك حتى يبعث الله إلينا رسولا منّا، نعرف نسبه وصدقه وأمانته وعفافه، فدعانا إلى الله لنوحّده ونعبده و نخلع ما كنّا نعبد نحن وآباؤنا من دونه من الحجارة والأوثان، وأمرنا بصدق الحديث، وأداء الأمانة، وصلة الرّحم، وحُسن الجوار ....وأمرنا أن نعبد الله وحده لا نشرك به شيئا، وأمرنا بالصلاة والزكاة والصيام" (۴) (اے بادشاہ: ہم جاہل قوم تھے بتوں کی پوجا کرتے تھے اور مردار کھاتے تھے۔فحاشی کو پسند کرتے تھے۔ہم قطع رحمی کرتے، ہمسائے کے ساتھ اچھا سلوک نہ

کرتے۔ ہمارا قوی کمزور پر غالب رہتا، اسی دوران میں اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کے نسب، سچائی، امانت اور عفت سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی تا کہ ہم متحد ہو جائیں، اس کی عبادت کرنے لگیں اور (اس کے مقابلہ میں) اس (جھوٹے معبود) کو چھوڑ دیں جس کی ہم اور ہمارے آباء عبادت کرتے تھے، بت اور پتھر وغیرہ کو۔ اور اُس نے ہم کو سچی بات کہنے کا حکم دیا، امانت ادا کرنے، صلہ رحمی اور ہمسائے کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کا حکم دیا نیز ہمیں حکم دیا کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزہ رکھنے کا (بھی) حکم دیا)۔

پھر سورۂ مریم کی آیات تلاوت کیں تو نجاشی بادشاہِ حبشہ نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ خدا کی قسم مسلمانوں نے جو کہا ہے عیسیٰ علیہ السلام اس سے ایک تنکے کی مقدار برابر بھی زائد نہیں ہیں۔

۲: انسان تو انسان جنات بھی قرآن کی دعوتی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، سفر طائف سے واپسی پر جب رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں قرآن مجید کی تلاوت فرمارہے تھے اس وقت جنوں کی ایک جماعت کا وہاں سے گزر ہوا تو انھوں نے اس کلام کی تاثیر کا اپنے سردار سے ذکر کیا۔ قرآن مجید نے یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿ قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوٓا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِيٓ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ أَحَدًا ﴾(۵)((اے نبی ﷺ) کہو، میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا: ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے)۔

۳: اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ مدینے کا مشہور سردار گھر سے مسلح ہو کر نکلتا ہے کہ اسلام کے مبلغ اوّل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہر کی آبادی سے باہر نکال دے۔ وہ چند آیات سن پاتا ہے اور پھر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے قرآن مجید کی چند آیات سن کر اسلام قبول کر لیتے ہیں (٦)۔

۴: ثمامہ رضی اللہ عنہ بن اثال کے نزدیک آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخص اور مدینۃ النبی ﷺ سے بڑھ

کر کوئی جگہ قابل نفرت نہ تھی۔ اسے صرف دو یوم تک قرآن پاک کی سماعت کا موقع ملتا ہے۔ رشد و ہدایت کی آواز کان سے ہو کر دل تک پہنچ جاتی ہے۔ جب اسے غیر مشروط آزادی مل جاتی ہے تو وہ خود بخود حاضرِ خدمت ہو کر اسلام قبول کر لیتا ہے اور دل و جان کو حقیر ہدیہ کی طرح حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے (۷)۔

۵: حرم میں سردارانِ قریش کی محفل جمی ہے، عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان جیسے اکابر شریک ہیں۔ البتہ عام دنوں کی طرح مسرت و شادمانی کے بجائے ان کے چہروں سے پریشانی اور تردّد کے آثار نمایاں ہیں۔ گفتگو کا موضوع نہ تجارت ہے، نہ جنگ اور نہ انتقام۔ بس محمد ﷺ ہے۔

ان کی دعوت، ان کی تبلیغ، ان کے ساتھی، نئے دین کو ماننے والے، اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے باغی! وہ سوچتے ہیں کہ ان کو دبانے کے لیے ہم نے کیا کچھ نہ کیا؟ نئے دین سے پھیرنے کے لیے کیسی کیسی سرتوڑ کوششیں نہ کر لیں؟ اور دھونس دھاندلی کا کون سا حربہ ایسا ہے جو ہم آزما نہیں چکے۔ ظلم و زیادتی کی ہر تدبیر آزما کر دیکھ لی، مگر کیا مجال کہ وہ دیوانہ ہوش میں آئے۔ اس کی لگائی ہوئی آگ بڑھتی جا رہی ہے، جو ایک دفعہ اس کا ہو جاتا ہے وہ کسی طرح ہمارا نہیں بنتا۔ اب تو اس کو سیدھی راہ دکھانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ اسے لالچ کے دام میں پھانسا جائے "سبز باغ" دکھائے جائیں کیونکہ یہ ترکیب بھی بڑی مؤثر ہوتی ہے۔ بڑے بڑوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔ دولت، عزت عورت، شہرت آرام و آسائش کون نہیں چاہتا اور یہ سب کچھ بڑی مشکل سے ملا کرتا ہے لیکن کسی کو جھولی میں بلا محنت آ پڑے تو ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے۔ عتبہ نے کہا: "اچھا میں جاتا ہوں محمدؐ ذرا دور گوشے میں ہمارے سامنے ہی تو بیٹھے ہیں۔ ان سے بات کرتا ہوں"۔ سب کو اطمینان تھا۔ عتبہ معمولی آدمی نہیں۔ چرب زبان، فصیح اللسان اور ذہین و طباع ہے۔ اس میدان میں اس کے حریف کم ہیں۔ ذرا سی دیر میں محمد (ﷺ) کو زیر کر دے گا۔ سب نے کہا ہاں ہاں جاؤ۔ تم ہمارے نمائندے ہو۔ عتبہ محمد ﷺ کے پاس آیا اور کہا: "محمد ایک بات تو سنو! تم کیا چاہتے ہو؟ مکہ کی ریاست؟ نہیں! تو کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی کے طلب گار ہو؟ اچھا دولت کا ڈھیر چاہیے۔ یقین مانو ہمیں تم سے بڑی ہمدردی ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں چاہتے تو ضرور تم پر کسی جن کا سایہ ہے لیکن ہم اس کا علاج بھی کرا سکتے ہیں۔ پھر تم جلد اچھے ہو جاؤ گے اور

چلو ہم اس پر بھی راضی ہیں کہ کُل مکہ پر تم حکمرانی کرو۔ بس جس چیز پر تم ہاں کر دو گے ہم اسے ضرور مہیا کر دیں گے"۔ اب نبی پاک ﷺ نے کہا "عتبہ تم اپنی کہہ چکے"۔ وہ بولا: ہاں!

فرمایا: "اچھا میری سنو، میں کیا سناتا ہوں! حضور ﷺ نے سورۂ حم السجدہ کی آیات کی تلاوت کی: ﴿ حٰمٓ. تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ. كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ. بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ. وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ ﴾ (۸)

(حم۔ یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں۔ جس چیز کو طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کیے جائیں گے)۔

رسول خدا ﷺ اسی طرح تلاوت کرتے رہے اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے غور سے سن رہا تھا۔ اتنے میں آیت سجدہ آئی تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر کہا: ابو الولید! میرا جواب تم نے سن لیا؟ اب تم جانو اور تمھارا کام۔

بیچارا عتبہ جو طلاقت لسانی کے زعم میں حضور ﷺ کو فتح کرنے آیا تھا خود زیر ہو گیا۔ منہ سا دھے سردارانِ قریش کی طرف واپس ہوا تو اسے دیکھتے ہی وہ سب بول پڑے...... خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر گیا تھا"۔ انھوں نے اس سے پوچھا کیا سن آئے؟ عتبہ نے کہا بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت، اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر ہی رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمھاری

بادشاہی اور اس کی عزت تمھاری عزت ہوگی۔ عتبہ کی یہ باتیں بالکل سیدھی سادی تھیں مگر وہ سردارانِ قریش بھلا کاہے کو ماننے والے تھے۔ کہنے لگے تو بھئی! اس کا جادو اس پر بھی چل گیا (۹)۔

عتبہ کی اپنے مشن میں ناکامی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ تمام قریش کی ناکامی تھی۔ سردارانِ باطل کی شکست تھی، کافروں کی ہار تھی۔ ذرا غور کیجیے آخر یہ کیا ہوا؟ عتبہ کس رنگ میں رسولِ خدا ﷺ کے پاس گیا تھا اور پھر اس کا وہ رنگ کیسے اڑ گیا۔ آپ ﷺ نے کیا کیا تھا؟ عتبہ کی پیش کش پر کوئی لمبی چوڑی تقریر آپ ﷺ نے نہ کی۔ جادوگر آپ ﷺ یقیناً نہ تھے کہ کچھ منتر پڑھ کر پھونک دیا ہو، کوئی رعب نہیں ڈالا، کوئی دھونس نہیں جمائی۔ کسی بڑائی کا اظہار نہیں کیا۔ بس کچھ بول سنا دیے۔ بہت میٹھے بول، جن میں معنی کی گہرائی اور مقصد کی بلندی تھی۔ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ یوں دل کی دنیا بدلی تو چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

بات صاف ہے یہ سب کچھ ان کلمات کا ہی کرشمہ تھا جو عتبہ نے سنے تھے۔ کلام شاہوں کے شہنشاہ کا کلام...... اہل دنیا کے جادو سے بہت مختلف لیکن دل و دماغ کی کایا پلٹ دینے والا کلام۔ اس میں وہ مقناطیسیت ہے جو دلوں کو کھینچتی ہے اس میں وہ کیف ہے کہ سن کر آدمی تو آدمی شجر و حجر بھی جھومنے لگتے ہیں۔ وہ حلاوت ہے جو دل کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ وہ نغمہ ہے جو روح کو سرشار کر دیتا ہے۔ وہ آگ ہے جو اندرون کی تاریک دنیا کو منور کر دیتی ہے۔ وہ طاقت ہے جو ایک نئے انسان کو جنم دیتی ہے۔ لیکن کلام اللہ کی اثر آفرینی کی یہ منفرد مثال نہیں ہے۔ تاریخ بے شمار واقعات سے لبریز ہے۔ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اس کو سمجھنے والے تو متاثر ہوتے ہی ہیں، نہ سمجھنے والے بھی اس سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس بات کی چند شہادتیں ہم اور سامنے لائیں گے۔

۶: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قریش کا جوشیلا اور بانکا نوجوان جس مجلس میں پہنچ جاتا سب سے ممتاز دکھائی دیتا۔ جس کی شجاعت، زور آوری، شہسواری، تیراندازی اور بہادری کے ڈنکے پورے مکہ میں بجتے تھے، جو جسم اور دل دونوں کا مضبوط تھا۔ لیکن جو واقعہ ہم سنا رہے ہیں وہ اس زمانہ کا ہے جب اسلام اس کو مسخر نہ کر سکا تھا۔ حضرت محمد ﷺ اور اہلِ ایمان کا وہ بھی اتنا ہی مخالف تھا، جتنے دوسرے کافر بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ۔ ایک شب یہی عمرؓ نبی پاک ﷺ کو جس وقت ستانے کی غرض سے نکلے، اس

وقت آنحضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور سورۃ الحاقہ کی آیات آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہو رہی تھیں۔ جب عمرؓ پہنچے تو دور ہی سے کان میں قرآن کی آیتیں پڑ گئیں۔ بجائے ستانے اور چھیڑنے کے قرآن کے نظم اور اسلوب سے متاثر ہو کر متحیر کھڑے رہ گئے اور دل میں کہنے لگے: "خدا کی قسم یہ شاعر ہے جیسا کہ قریش کہا کرتے تھے۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ. وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلاً مَا تُؤْمِنُونَ﴾(۱۰) (یہ ایک رسول کریم ﷺ کا قول ہے کسی شاعر کا قول نہیں تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو)۔

جب اس بات کی تردید ہوگئی تو دل نے کہا یقیناً یہ کاہن ہے لیکن پھر یہ آیت سنی: ﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلاً مَا تَذَكَّرُونَ. تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾(۱۱) (اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے)۔

دل پر ایک چوٹ لگی وہ اسلام کی حقانیت اور صداقت کی چوٹ تھی۔ البتہ مستقل مزاجی اور پختہ کاری نے اس چوٹ کو دبائے رکھا لیکن آخر کب تک۔ ایک دن جی میں کیا آئی کہ سوچا چلو قصہ پاک کر دوں محمد ﷺ کا بھی۔ اس ارادے سے نکلے تو عجب اتفاق پیش آیا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید بھی "اسلام" لے آئے ہیں۔ یہ خبر بجلی بن کر گری۔ اسی غصہ کے عالم میں بہن کے گھر پہنچے اور ان دونوں کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا گیا۔ کہاں تو یہ شقاوت قلبی تھی اور کہاں جب غصہ فرو ہوا اور ان سے قرآن لے کر سورۂ طٰہٰ کی ان آیتوں کو پڑھا تو دنیا بدل گئی:

﴿طه. مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ. إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ. تَنزِيلاً مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاوَاتِ الْعُلَى. الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ. لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ. وَإِن تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى. اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾(۱۲) (طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ، یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو زمین و آسمان کے

درمیان ہے اور جو مٹی کے نیچے ہیں تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اُس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں)۔

پڑھتے ہی جیسے موم ہو گئے۔ ساری شقاوت و کثافت ڈھل گئی اور یوں دامنِ اسلام میں آ گرے جیسے پکا پھل ٹوٹ کر گود میں آ جاتا ہے۔ کلامِ الٰہی سنتے ہیں تو چیخ پڑتے ہیں اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں اور سیلِ اشک سے دل میں کفر کی جو بھٹی دہک رہی تھی، سرد پڑ جاتی ہے۔ قلب نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے اور سیدھے آستانۂ نبوت پر جا کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں (۱۳)۔

۷: طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلہ کے سربرآوردہ شخص تھے۔ شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ نئے دین کا شہرہ سنا تو تماشا دیکھنے مکہ چلے آئے۔ مکہ پہنچے تو وہاں کے لوگ چمٹ گئے اور کہنے لگے:

''تم ہمارے شہر میں مہمان آئے ہو اس لیے آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اس شخص نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال کر ہمارا شیرازہ منتشر کر دیا ہے اور ہم لوگوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے، نہ معلوم اس کی زبان میں کیا جادو ہے۔ جس کے ذریعے بیٹے کو باپ سے بھائی کو بھائی سے، بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے۔ ہم کو خوف ہے کہ کہیں تم اور تمھاری قوم ہم لوگوں کی طرح اس کے دام میں نہ آ جائے۔ اس لیے تم اس سے نہ ملو اور نہ اس کی بات سنو۔ پہلے تو یہ قریش کی باتوں میں آ گئے اور کان میں روئی ٹھونستے پھرتے تھے کہ مبادا محمد ﷺ کی آواز کانوں میں پڑ جائے، اس حالت میں ایک دن مسجد حرام کی طرف سے گزرے۔ اس وقت آپ ؐ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کچھ آیتیں کانوں میں پڑ گئیں۔ جی نہ مانا، سوچا ذرا سنوں تو کہ محمد ﷺ پڑھتے کیا ہیں؟ کلام کے معائب و محاسن تو میں بھی خوب سمجھتا ہوں، فوراً پتہ چل جائے گا کہ کیسا کلام ہے۔ قریب کھڑے ہو کر کلام سنا تو مبہوت رہ گئے۔ قرآن کے الفاظ کیا تھے بجلیاں تھیں جنھوں نے دل کے خرمنِ کفر کو بھسم کر دیا۔ حضور ﷺ نماز ختم کر کے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ساتھ ہو لیے۔ آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی قیام گاہ تک پہنچے اور اپنے آپ کو دامنِ اسلام میں گرا دیا۔ بعد میں خود کہا کرتے تھے کہ خدا کی قسم! آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مذہب کوئی دیکھا (۱۴)۔

۸: خالد بن عقبہ قرآن مبین سن پاتا ہے تو ششدر ہو کے رہ جاتا ہے اور جب اس حالت سے سنبھل پاتا ہے تو بول اٹھتا ہے:

واللہ انّ لہ لحلاوۃ وانّ علیہ لطراوۃً

وانّ اسفلہ لمغدق وانّ لا علاہ لمثمر

وما یقول ھذا بشر (۱۵)

(بخدا اس میں عجب شیرینی ہے۔ اس میں عجب تر و تازگی ہے۔ اس کی جڑیں سیراب ہیں۔ اور اس کی شاخیں پھل سے لدی ہوئی ہیں۔ بشر تو ایسا کہہ ہی نہیں سکتا)۔

یہ انسانی کلام نہیں۔ اس کی بات خوبصورت اور اس کا انداز دل نشین ہے۔ وہ اس بار آور درخت کی طرح ہے جس کے اوپر کا حصہ پھل دیتا ہے اور زیریں حصہ گہرا ہوتا ہے۔ یہ غالب ہوگا اور ہرگز مغلوب نہ ہوگا جو اس سے ٹکرائے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن سے تعلق اور اُن پر قرآن مجید کا اثر:

۱: رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا اللہ فرماتے ہیں: " قوموا الی جنۃ عرضھا السموات والارض " ۔ تو عمیر بن حمام الانصاری نے کہا: "بخٍ بخٍ جنت عرضھا السموات والارض" (خوب خوب جنت ہے کہ جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ما یحملک علی قولک بخٍ، بخٍ" (تم خوب خوب کیوں کہتے ہو)۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ بن حمام نے عرض کیا "اکون من اھلھا" (میں بھی اہل جنت میں سے ہو جاؤں) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "انّک من اھلھا" (تو بھی اہل جنت میں سے ہے)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلی سے کچھ کھجوریں نکال کر کھانا شروع کیں اور پھر فرمانے لگے: "واللہ ان جلست حتی افرغ منھا. انھا لحیاۃ طویلۃ" (اگر میں بیٹھ کر ان کو کھاتا رہوں یہاں تک کہ فارغ ہو جاؤں۔ اس صورت میں تو لمبا وقت ہو جائے گا) چنانچہ انھوں نے کھجوروں کو پھینک دیا اور "قاتل حتّی قتل" (سیدھے جا کر لڑے اور شہید ہو گئے) (۱۶)۔

۲: امام ابو یعلیٰ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی

یہ آیت پڑھی: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً ﴾ (۱۷) (تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے)۔ تو حضرت ابودحداح آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''ان اللہ لیرید منا القرض'' کہ اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں! تو حضرت ابودحداح نے عرض کیا مجھے اپنا ہاتھ دکھائیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے: **اقرضت ربّی حائطی**۔ میرا کھجوروں کا باغ میں اللہ کو قرض دیتا ہوں۔ اس باغ میں کھجوروں کے چھ سو درخت تھے۔ چنانچہ جب وہ اپنے باغ میں پہنچے کہ اس باغ میں ہی ان کی رہائش تھی۔ انھوں نے باغ کے دروازے پر ہی اپنی بیوی کو آواز دی: ''**یا امّ دحداح اخرجی فانی اقرضت ربّی حائطی**'' کہ امّ دحداح باغ سے باہر آ جاؤ۔ اب یہ باغ میں نے اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ اس پر اُن کی بیوی نے کہا: ''**ربح بیعلث یا ابا دحداح**'' یہ بہت فائدہ مند تجارت ہے (۱۸)۔

۳: ایک مہاجر اور ایک انصاری کا واقعہ:

نبی اکرم ﷺ ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ شب کو ایک جگہ قیام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آج شب کو حفاظت اور پاسبانی کون کرے گا۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ہم دونوں کریں گے۔ حضور ﷺ نے ایک پہاڑی جہاں سے دشمن کا راستہ ہوسکتا تھا بتادی کہ اس پر دونوں قیام کرو۔ دونوں حضرات وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر انصاری نے مہاجر سے کہا کہ رات کو دو حصّوں میں منقسم کر کے ایک حصّہ میں آپ سو رہیں۔ میں جاگتا رہوں، دوسرے حصّہ میں آپ جاگیں میں سوتا رہوں کہ دونوں کے تمام رات جاگنے میں بھی احتمال ہے کہ کسی وقت نیند کا غلبہ ہو جائے اور دونوں کی آنکھ لگ جائے۔ اگر کوئی خطرہ جاگنے والے کو محسوس ہو تو اپنے ساتھی کو جگا لے۔ رات کا پہلا آدھا حصّہ انصاری کے جاگنے کا قرار پایا اور مہاجر سو گئے۔ انصاری نے نماز کی نیت باندھ لی۔ دشمن کی جانب سے ایک شخص آیا اور دُور سے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر تیر مارا اور جب کوئی حرکت نہ ہوئی تو دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا تیر مارا اور ہر تیر ان کے بدن میں گھستا رہا اور یہ ہاتھ سے اُس کو بدن سے نکال کر پھینکتے رہے۔ اس کے بعد اطمینان سے رکوع کیا۔ سجدہ کیا۔ نماز پوری کر کے اپنے ساتھی کو جگایا۔ وہ تو ایک کی جگہ دو کو دیکھ کر بھاگ گیا کہ نا معلوم کتنے

ہوں۔ مگر ساتھی نے جب اٹھ کر دیکھا تو انصاری کے بدن سے تین جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ مہاجر نے فرمایا: سبحان اللہ تم نے مجھے شروع ہی میں جگا لیا ہوتا۔ انصاری نے فرمایا کہ میں نے سورۃ (سورۂ کہف) شروع کر رکھی تھی۔ میرا دل نہ چاہا کہ اس کو ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ اب بھی مجھے اس کا اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ میں بار بار تیر لگنے سے مر جاؤں اور حضور ﷺ نے جو حفاظت کی خدمت سپرد کر رکھی ہے وہ فوت ہو جائے، اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا تو میں مر جاتا مگر سورۃ ختم کرنے سے پہلے رکوع نہ کرتا (۱۹)۔

یہ تھی ان حضرات کی نماز اور اس کا شوق کہ تیر پر تیر کھائے جائیں اور خون ہی خون ہو جائے مگر نماز کے لطف میں فرق نہ پڑے۔ ایک ہماری نماز ہے کہ اگر مچھر بھی کاٹ لے تو نماز کا خیال جاتا رہے۔ بھڑ کا تو پوچھنا ہی کیا۔

۴: حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ انصاری مدینہ منورہ میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑے باغ والے تھے۔ ''کان ابو طلحة اکثر الانصار بالمدینة مالاً بالنخل'' ان کا ایک باغ تھا۔ جس کا نام ''بیرحا'' تھا۔ وہ ان کو بہت ہی زیادہ محبوب تھا۔ مسجد نبوی ﷺ کے قریب تھا۔ پانی بھی اس میں نہایت شیریں اور افراط سے تھا۔ حضور ﷺ بھی اکثر اس باغ میں تشریف لے جاتے اور اس کا پانی نوش فرماتے۔ جب قرآن شریف کی آیت: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (۲۰) (تم نیکی کے کامل درجہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک ایسی چیزوں سے خرچ نہ کرو گے جو تم کو پسند ہیں) نازل ہوئی تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ ''ان احب مالی الیّ بیرحاء وانّ صدقة للّٰہ ارجو برّھا وذخرھا عند اللّٰہ'' (مجھے اپنا باغ بیرحا سب سے زیادہ محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ محبوب مال اللہ کے راستہ میں خرچ کرو)۔ اس لیے وہ اللہ کے راستہ میں دیتا ہوں۔ آپ ﷺ جیسا مناسب سمجھیں اس کے موافق اس کو خرچ فرما دیں۔

حضور ﷺ نے بہت زیادہ مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا: ''ذالك مالٌ رابح'' یہ بہت نفع مند مال ہے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو اپنے اہلِ قرابت میں تقسیم کر دو۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اس کو

اپنے رشتہ داروں میں تقسیم فرما دیا(۲۱)۔

ہم بھی اپنا کوئی محبوب ترین مال جائیداد کوئی ایک آدھ وعظ سُن کر، قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھ کر یا سُن کر اس طرح بے دھڑک خیرات کر دیتے ہیں۔ اگر وقف وغیرہ کرنے کا خیال بھی آتا ہے تو زندگی سے مایوس ہو جانے کے بعد یا وارثوں سے خفا ہو کر اُن کو محروم کرنے کی نیت سے اور برس کے برس اس سوچ میں لگا دیتے ہیں کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ میری زندگی میں تو میرے ہی کام آ دے۔ بعد میں جو ہو وہ ہوتا رہے۔ ہاں نام و نمود کی کوئی چیز ہو، بیاہ شادی کی تقریب ہو تو سودی قرض سے بھی انکار نہیں۔

۵: حضرت امام ذہبیؒ نقل فرماتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق حضرت ابو عثمان نہدیؒ مشہور تابعی فرماتے ہیں کہ وہ سات دن تک حضرت ابو ہریرہؓ کے ہاں مہمان رہے: **"کنت تضیّفت أبا هريرة سبعاً كانوا يقسمون ليله ثلاثاً أبو هريرة و أهله و خادمه"** (۲۲) (حضرت ابو ہریرہؓ ان کی اہلیہ اور ان کے خادم رات کو تین حصّوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصّہ تلاوت قرآن میں صرف کرتے اور نوافل ادا کرتے)۔

۶: جنگ قادسیہ میں حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ انھوں نے جنگ کی رپورٹ حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجی تو اس میں خصوصی طور پر لکھا: **" قتل سعد بن عبيد القاری وفلان وفلان لا يعلمهم الا اللّٰه كانوا يدوّن بالقرآن اذا جن عليهم الليل كدويّ النّحل"** (۲۳)۔

۷: امام طبریؒ نے تاریخ طبری میں نقل کیا ہے کہ شامی محاذ پر اور ایران کے محاذ پر جنگ جاری تھی۔ ایرانی سپہ سالار نے ایک عیسائی کو جو کہ عربی زبان جانتا تھا، جاسوس بنا کر مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا اور اسے کہا کہ آپ چوبیس گھنٹے تک ان کی پوری نگرانی کریں۔ چنانچہ وہ چوبیس گھنٹے مسلمانوں کے ساتھ رہا اور اس نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ آپ ان کو شکست نہیں دے سکتے کیونکہ یہ لوگ انصاف کرتے ہیں اور ظالم کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ سزا کا جو مستحق ہو اس کو سزا دیتے ہیں خواہ وہ بادشاہ کا بیٹا ہو۔ اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے ہیں۔ اگر زنا کرے تو اس کو سنگسار کر دیتے ہیں۔ وہ

لوگ رات کی تاریکی میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور قیام میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں (۲۴)۔

مسلمانوں کے اوصاف اور قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ان سے جنگ نہ کروں اور اگر میری اُن سے جنگ ہو تو ان سے لڑنے کی بجائے میں زمین کے نیچے چلا جاؤں تو میرے لیے بہتر ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ ان کو کامیابی عطا ہو اور میرا اُن سے مقابلہ نہ ہو۔

دورِ جدید میں قرآن مجید کی اثر انگیزی کے واقعات:

قرآن مجید ابدالآباد تک باقی رہنے والی کتاب ہے۔ جہاں قیامت تک اس کی تعلیمات قابل عمل اور سبب ہدایت ہیں وہاں اس کی دعوتی تاثیر بھی من وعن آج بھی اسی طرح باقی ہے جس طرح قرون اولیٰ میں تھی۔ ذیل میں چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ اللہ کا کلام تمام کلاموں کا بادشاہ ہے۔ مسلمانوں پر تو اس کے اثرات ہوتے ہی ہیں غیر مسلموں اور جانوروں پر بھی اس کلام کی ہیبت کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

ا۔ ہندو افسر پر سورۃ یٰسین کا اثر:

محمد انور لکھتے ہیں کہ میرے ایک دوست کے والد صاحب مرحوم محکمہ جیل میں سروس کرتے تھے۔ اللہ کے کلام کی ہیبت کا ایک واقعہ انھوں نے کافی مدت پہلے بتایا تھا جو ابھی تک تقریباً سارا یاد ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے میرے دوست کے والد صاحب ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں سروس کر رہے تھے۔ اتفاق سے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی سیاسی قیدی کی حیثیت سے اسی جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند تھے۔ اس زمانے میں یعنی پاکستان بننے سے ایک دو سال قبل سپرنٹنڈنٹ جیل انگریز اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہندو اور ڈاکٹر سکھ تھا۔ کیونکہ میرے دوست کے والد مرحوم ڈسپنسر تھے۔ اس لیے وہ ہر صبح ان تینوں افسروں کے ساتھ جیل کے اندر گشت کرتے تھے اور سب سے پہلے سیاسی قیدیوں کی خیر خبر لیتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند رہتے اور ان کو کسی سے بھی ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بخاری صاحب صبح کے وقت سورۂ یٰسین اور سورۂ یوسف کی اتنی بلند آواز سے تلاوت فرماتے کہ ان کی آواز جیل کے کافی حصے

میں سنی جاتی۔ ایک دن صبح کے وقت جب یہ چاروں حضرات گشت کرتے ہوئے بخاری صاحب کی کوٹھری کے قریب آئے تو بخاری صاحب کی تلاوت کی آواز ان چاروں نے سنی۔ ہندو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پر تو فوری اثر ظاہر ہوا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ انگریز سپرنٹنڈنٹ جیل بھی چند قدم کے بعد ٹھٹھک گیا۔ اب یہ چاروں صاحبان خاموشی سے تلاوت سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہندو سپرنٹنڈنٹ نے چیخ ماری اور اونچی آواز میں کہا بخاری صاحب بس کریں ورنہ میں مر جاؤں گا۔ بخاری صاحب نے تلاوت بند کر دی۔ ان کی خیر خبر پوچھنے کے بعد انگریز سپرنٹنڈنٹ نے ہندو سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا تو اس ہندو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا بخاری صاحب ہمارے صاحب آپ سے خوش ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جو مانگنا ہے مانگو۔ بخاری صاحب نے ان کو جواب دیا میں تو اس سے مانگتا ہوں جس سے ساری دنیا مانگتی ہے۔ اس انگریز سے یہی کہوں گا کہ ہمارا ملک چھوڑ کر چلے جاؤ۔ جب یہ کلمات انگریز سپرنٹنڈنٹ کو بتائے گئے تو اس نے کہا شاہ صاحب عظیم انسان ہیں۔ اگر یہ مجھے کہتے تو میں ابھی ان کو رہا کر دیتا کیونکہ ان کے قرآن نے مجھے بہت متاثر کیا ہے (۴۵)۔

۲۔ ایک غیر مسلم پر سورۃ فاتحہ کا اثر:

امریکہ میں جب کوئی آدمی بہت زیادہ سکون محسوس کرتا ہے تو کہتا ہے I am feeling natural high میں بہت زیادہ سکون محسوس کر رہا ہوں۔ امریکہ کا ایک امیر آدمی تھا جس کی زندگی میں سکون نہیں تھا۔ اس وجہ سے اس کے سر میں اکثر درد رہتا تھا۔

ہمارے دوست ''مسٹر احمد'' کسی سرکاری کام کے سلسلے میں وہاں گئے اور ایک مکان میں رہائش اختیار کر لی۔ اس مکان کے قریب ہی وہاں کے مقامی لوگوں نے ایک مسجد بنائی ہوئی تھی۔ مسٹر احمد نے بھی وہاں نماز پڑھنی شروع کر دی۔ تاہم اس امیر آدمی سے اس کی دوستی ہوگئی۔ اس کا مکان بھی قریب تھا۔

ایک دفعہ مسٹر احمد نماز پڑھنے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو اس انگریز نے پیچھے سے آواز دے کر کہا، مسٹر احمد ادھر آئیں، میں آپ کو گانا سنانا چاہتا ہوں۔ مسٹر احمد نے کہا، میں گانا سننے سے نفرت کرتا ہوں اور اب میں نماز کے لیے جا رہا ہوں میں نہیں آ سکتا۔ اس نے اصرار کرتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی۔ بالآخر وہ کہنے لگا، مسٹر احمد! میں آپ کو وہ گانا سنانا چاہتا ہوں جو تم اس مینار سے روزانہ پانچ

مرتبہ سنتے ہو۔

مسٹر احمد فرماتے ہیں کہ میں سمجھا کہ شاید یہ اذان کی بات کر رہا ہے۔ چنانچہ میں اس کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر میں ایک تنہا کمرے میں لے گیا۔ اس نے اس کمرے میں ٹیبل پر طبلہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کمرہ بند کر دیا اور طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ میں پریشان تھا کہ جماعت کا وقت نکل جائے گا۔ مگر اس نے تھوڑی دیر کے بعد طبلے کی لے پر سورہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴾ پڑھنا شروع کر دی۔ میں تو سمجھ گیا کہ حقیقت میں وہ کیا پڑھ رہا تھا۔ اس نے گانے کی لے بنا کر پوری سورت فاتحہ پڑھ دی۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا کہ تو نے یہ گانا کس سے حاصل کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ مجھے بہت زیادہ پریشانی رہتی تھی۔ مصر میں میرے ایک مسلمان دوست رہتے ہیں۔ میں نے ان سے اپنی ذہنی پریشانی بیان کی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ کسی تنہا کمرے میں بیٹھ کر یہ پڑھ لیا کرو۔ تمھیں سکون مل جایا کرے گا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے ذہنی پریشانی ہوتی ہے تو میں اس طرح یہاں بیٹھ کر گانا گا لیتا ہوں تو مجھے بہت زیادہ سکون ملتا ہے اور پھر میں اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں I am feeling natural high کہ میں قدرتی طور پر زیادہ سکون محسوس کر رہا ہوں (۲۶)۔

۳۔ مصری ادیب اور امریکی مستشرق فنکل کا مکالمہ:

قرآن نے عربی زبان میں تصرف کر کے جو ادب تیار کیا، وہ اتنا ممتاز اور مذہبی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کر کے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کا آسمانی ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی دان اس کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم مثال کے طور پر ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

۱۶ جون ۱۹۳۲ء کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی، انھوں نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا، میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ایک عرصے سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا: ''کیا تم بھی انھی لوگوں میں سے ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں؟''۔ یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ

تھا کہ اس عقیدے کی کوئی حیثیت نہیں۔ محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کی کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کر سکتے ہیں۔ تجربہ کر کے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ویسا قرآن تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے فنکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں، وہ تصور یہ ہے کہ ''جہنم بہت وسیع ہے''۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ جملے یہ تھے:

ان جهنم واسعة جدا.

ان جهنم لاوسع مما تظنون.

ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان.

ان جهنم لتسع الدنيا كلها.

ان الجن والانس اذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم.

كل وصف في سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئي من حقيقتها.

ان سعة جهنم لتصغر امامها سعة السماوات والارض.

كل ما خطر ببالك في سعة جهنم فانها لارحب منه وأوسع .

سترون من سعة جهنم ما لم تكون لتحلموا به او تتصوروه.

مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصر و لن تصل الى شيء من حقيقتها.

ان البلاغة المعجزة لتقصر و تعجز اشد العجز عن وصف سعة جهنم ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين.

متى امسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك .

ان سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم، ولا تدور بحسبان كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذيان.

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کر چکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لیے الفاظ نہ رہے تو میں نے پروفیسر فنکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی۔ میں نے کہا: ''جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کر کے اس مفہوم کے لیے اپنی عبارتیں تیار کر چکے ہیں۔ پروفیسر فنکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، قرآن میں کیا ہے؟ میں نے سورۂ ق کی یہ آیت پڑھی: ﴿ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِن مَّزِيْدٍ ﴾ (۲۷) (وہ دن جب کہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟)۔ یہ سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران رہ گئے، انھوں نے کہا: ''صدقت نعم صدقت وانا اقرر لك ذلك مغتبطا من كل قلبي''۔

آپ نے سچ کہا بالکل سچ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں: میں نے کہا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کر لیا۔ کیونکہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا اور لٹریچر کے مطالعے میں اس نے اپنی عمر صرف کر دی تھی (۲۸)۔

۴۔ محترمہ آمنہ:

محترمہ آمنہ پچاس سالہ سیاہ فام امریکی خاتون ہیں، وہ پہلے عیسائی تھیں جو اپنی سماجی خدمات کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان کے بارے میں جو کتاب شائع ہوئی اس کے مطابق ساڑھے تین سو افراد نے ان کی ترغیب سے منشیات سے توبہ کی تھی اور اکیس مرد وزن نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے قبول اسلام کے بارے میں کہتی ہیں: میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اسلام کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہیے۔ میں نے کچھ کتابیں حاصل کیں اور پڑھنے لگی، اسلام کے بارے میں ان کتابوں نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ جب میں نے یہ کتابیں پڑھ لیں تو میرے دل میں قرآن پڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور

میں نے انگریزی میں قرآن کا ایک نسخہ حاصل کرلیا۔ قرآنِ پاک کے اس ترجمے نے مجھے عجیب طرح کا روحانی سرور بخشا، جسے میں بیان نہیں کرسکتی۔ آج میں سمجھتی ہوں کہ اگر کوئی بھی شخص دلچسپی، انہماک اور لگن سے قرآن پاک کا مطالعہ کرے تو وہ اس مقدس کتاب کی حقانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا (۲۹)۔

۵۔ جناب ابراہیم کوان (ملائشیا):

کہتے ہیں کہ میں نے ساٹھ سال کی عمر تک ایک پروٹسٹنٹ عیسائی کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اس دوران میں تقریباً تین سال تک کوالالمپور (ملائشیا) کے چرچ میں پادری کی خدمات بھی انجام دیں۔ مگر بالآخر اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ آج میں تشکر بھری مسرّت کے ساتھ وہ وجوہات بیان کروں گا جو میرے قبول اسلام پر منتج ہوئیں۔

کوالالمپور میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا اور میرا ذہن یہ محسوس کرکے جھنجھلا اٹھا کہ پروٹسٹنٹ چرچ کی کتنی ہی شاخیں ہیں اور ''مذہبی عقائد'' کی بنا پر ہر شاخ دوسری شاخ سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں میں بُعد واختلاف کی شدت کا کیا عالم ہے اور ان کے مذہبی عقائد باہم دگر کتنے مختلف ہیں۔ اس کیفیت نے مجھے سخت پریشان کیا اور گھبرا کر میں نے قرآن کا سہارا لیا۔ جن آیتوں نے میری رہنمائی فرمائی یہ ہیں:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ (۳۰) (اے نبی ﷺ، اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور اُن کتابوں کی تصدیق کررہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کرچکا ہے، اور اس نے وہ کسوٹی اُتاری ہے (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)۔

﴿قُلْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ (۳۱) (اے نبی ﷺ، کہو کہ ''ہم اللہ کو مانتے ہیں'' اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر

نازل کی گئی ہے، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں، اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں)۔

قرآن کے مسلسل اور گہرے مطالعے نے مجھے حقیقت کے قریب کر دیا اور عیسائیت کے عقائد کا کھوکھلا پن مجھ پر واضح ہوتا گیا (۳۲)۔

۶۔ سسٹر امینہ (امریکہ):

محترمہ امینہ جن کا تعلق امریکہ سے ہے، انھوں نے ۱۹۷۷ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ اس سے قبل وہ امریکہ کے سنڈے سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دیا کرتی تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد انھیں غیر معمولی قسم کی قربانیاں دینی پڑیں، مگر انھوں نے کسی موقع پر حوصلہ مندی اور استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کہتی ہیں: ''میں نے اپنی کوششوں کو یوں بیکار جاتے دیکھا تو سوچا کہ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے نقائص اور تضادات سے آگاہ ہو کر مسلمان طالب علموں کو زِچ کر سکوں، مگر دل کے گوشے میں یہ احساس بھی تھا کہ عیسائی پادری، مضمون نگار اور مؤرخ تو مسلمانوں کو وحشی، گنوار، جاہل اور نہ جانے کن کن برائیوں کا مرقع بتاتے ہیں۔ لیکن امریکی معاشرت میں پلنے بڑھنے والے ان سیاہ فام مسلمان نوجوانوں میں تو ایسی کوئی برائی نظر نہیں آتی بلکہ یہ باقی سب طلبہ سے مختلف و منفرد پاکیزہ رویے کے حامل ہیں، پھر کیوں نہ میں اسلام کا خود مطالعہ کروں اور حقیقت حال سے آگاہی حاصل کروں۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر میں نے سب سے پہلے قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ کتاب دل کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی اپیل کرتی ہے۔ عیسائیت پر غور و فکر کے دوران اور بائبل کے مطالعے کے نتیجے میں ذہن میں کتنے ہی سوال پیدا ہوتے تھے، مگر کسی پادری یا دانش ور کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا اور یہی تشنگی روح کے لیے مستقل روگ بن گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھا تو ان سارے سوالوں کے جواب ایسے مل گئے جو عقل اور شعور کے عین مطابق تھے۔ مزید اطمینان کے لیے اپنے کلاس فیلو مسلمان نوجوانوں سے گفتگوئیں کیں، تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ

میں اب تک اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میرا نقطۂ نظر صریحاً بے انصافی اور جہالت پر مبنی تھا۔

مزید اطمینان کی خاطر میں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ امریکی مصنفین کے پروپیگنڈے کے بالکل برعکس حضور ﷺ بنی نوع انسان کے عظیم محسن اور سچے خیر خواہ ہیں۔ خصوصاً انھوں نے عورت کو جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا، اس کی پہلے یا بعد میں کوئی مثال نظر نہیں آتی (۳۳)۔

۷۔ جناب شیخ بشیر احمد شاد (پاکستان):

کہتے ہیں میں ۱۹۲۸ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں دھان گالو کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد متھیاس صاحب مشہور پادری تھے اور تبلیغی خدمات کے سلسلے میں اپنے آبائی ضلع گورداسپور سے شیخوپورہ منتقل ہو گئے تھے۔ میرے دادا مسمی جھنڈے مَل بھی پختہ اعتقاد کے عیسائی تھے اور تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے۔

عیسائیت میں قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ قرآن دراصل تورات، زبور اور انجیل کی نقل ہے۔ چنانچہ توحید کے بعد مجھے ایسے دلائل مطلوب تھے جو قرآن پاک کو آسمانی کتاب ثابت کر دیں۔ شکر ہے کہ تحقیق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔

متی ۳۶/۲۴ میں مرقوم ہے کہ ''خدا کو غیب کا علم ہے اور اس کے سوا کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا''۔ مجھے تحقیق کے باوجود آج تک کوئی عیسائی بائبل کا حافظ نہیں ملا، چنانچہ اگر دنیا بھر سے بائبل کے نسخے نابود ہو جائیں تو بائبل کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جبکہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ قرآن نہ صرف ہر نوع کے تضاد یا تحریف سے پاک ہے، بلکہ لاکھوں حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی اس کی زیر زبر میں فرق نہیں پڑا۔ بائبل کا متن پکار پکار کر کے کہتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کے بہت سے مراحل سے گزرا ہے۔ مگر قرآن کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔ محکم اور اٹل دلائل نے میرا ایمان قرآن پر بھی راسخ کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ فی الواقع یہ خدائے تعالیٰ کا کلام پاک ہے (۳۴)۔

۸۔ جناب حسین رؤف (انگلستان):

جب کوئی شخص اپنے آبائی اور نسلی مذہب کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کرتا ہے تو اس کے پس پردہ عموماً جذباتی، فکری یا سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جہاں تک میری افتادِ طبع کا تعلق ہے میں اس معاملے میں کبھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوا، بلکہ خالص فکری اور سماجی بنیادیں تھیں جنھوں نے بالآخر مجھے اسلام کی آغوش میں ڈالا جبکہ اس سے قبل میں نے دنیا بھر کے تمام مذاہب کے دعاوی، الہامی کتب اور نتائج فکر کا ایک ایک پہلو کھنگال ڈالا تھا۔

بہرحال میں نے مسلمان مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ایک مسلمان کا ترجمہ قرآن پڑھا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مجھے میری منزل مل گئی ہے اور میں سالہا سال سے اسی گوہر مقصود کا متلاشی تھا۔

۱۹۴۵ء کی ایک عید کے موقع پر مجھے دعوت دی گئی کہ میں مسلمانوں کے طریق عبادت کا مشاہدہ کروں اور بعد میں ان کے کھانے میں بھی شرکت کروں۔ میں نے دیکھا کہ دنیا بھر سے مختلف رنگوں، زبانوں اور تہذیبوں کے مسلمان بھائیوں کی طرح یک جا ہیں اور ایک ہی زبان میں ایک ہی طریقے سے عبادت کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ یہاں میں نے ایک ترک شہزادے کو بالکل عام لوگوں سے گھلے ملے ہوئے دیکھا۔ یہاں کسی امیر میں نہ دولت کا نشہ نظر آیا نہ اس نخوت کا مشاہدہ ہوا جو ایک انگریز اپنے سیاہ فام پڑوسی سے عموماً روا رکھتا ہے۔ یہاں مجھے کسی میں مضحکہ خیز قسم کا غرور نظر نہیں آیا نہ ریاکارانہ زہد و تقویٰ کی کوئی جھلک دیکھی، ساری فضا وقار، توازن اور اعتدال کا حسین امتزاج پیش کر رہی تھی۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اسلام سے اس باقاعدہ اور عملی تعارف نے میرے دل و دماغ پر کیا اثرات چھوڑے، یہاں مجھے وہ کچھ نظر آیا، جو کسی بھی اور مذہب میں نہیں تھا۔ آپ میری سوچوں کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ میں نے دنیا بھر کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا مگر کسی میں کشش نظر نہ آئی مگر اسلام نے بہت تھوڑے عرصے میں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں مسلمانوں کی عظیم عالمی برادری کا باقاعدہ رکن بن گیا (۳۵)۔

۹۔ محترمہ خدیجہ فروزئی (انگلستان):

بچپن میں میری مذہبی تربیت چرچ آف انگلستان کی زیر نگرانی ہوئی۔ مگر ہوش سنبھالا تو میرا ذہن اس سے بالکل مطمئن نہ ہوا۔

میں نے قرآن کی صورت میں بلاشبہ ایک متبادل تو پالیا مگر ذہن مختلف سوالوں سے بھر گیا۔ کیا واقعی یہ خدا کی طرف سے وحی ہے یا محمد ﷺ نے کسی ذریعے سے بائبل کی تاریخی کہانیوں کو سنا اور خدا کے حوالے سے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا؟ محمد ﷺ پر کوئی بدروح تو سوار نہیں تھی (خدا مجھے معاف کرے) چونکہ وہ بے حد ذہین انسان تھے، اس لیے کیا شیطان نے تو انھیں آلۂ کار نہیں بنالیا تھا (**العیاذ باللہ**)۔

ان بیہودہ سوالات کے جواب کے لیے میں نے حضرت محمد ﷺ کی زندگی اور کردار کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے لیے میں نے مسلم اور غیر مسلم مصنّفین کی کتابیں حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ انھوں نے کسی انسانی ذریعے سے یہودی اور عیسائی تاریخ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہیں تھے، اس لیے انھوں نے براہِ راست بائبل کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ اب اگر فرض کیا جائے کہ انھوں نے قرآن کی ساری معلومات یہودی اور عیسائی علماء سے معلوم کی تھیں تو یہ ناممکن ہے کہ زبانی گفتگو کو اتنی شرح و بسط سے یاد رکھا جائے اور پھر انھیں کتابی صورت میں مرتب بھی کر لیا جائے۔ فرض کیا اگر یہ صورت ممکن بھی ہوتی تو یہ کھیل دوسرے لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اور پھر خود یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے قرآن کی مخالفت بالکل ایک بے تکی حرکت تھی، دراصل کچھ لوگوں نے اس طرح کے الزامات عائد کرنے کی کوشش بھی کی مگر کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے یہ الزامات دم توڑ بیٹھے۔

بہرحال مکمل اطمینان ہونے پر میں نے اسلام قبول کر لیا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں (۳۶)۔

۱۰۔ جناب سیف الدین ڈرک والٹر موسگ (جرمنی):

قرآن نے مجھے اس امر سے آگاہی بخشی کہ میں اب تک گمراہیوں میں بھٹک رہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے بے حد دکھ ہوا کہ مذہب کے نام پر اب تک مجھے دھوکا دیا جا رہا تھا اور میرے محبوب اساتذہ کے

الفاظ سفید جھوٹ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میرے خیالات و تصورات کی دنیا ایک آن میں تہ و بالا ہوگئی۔ جس پر میں نے تائید ایز دی سے نئی خوبصورت عمارت کھڑی کر لی۔ مجھے اس بات نے لافانی مسرتوں سے ہم کنار کیا کہ بالآخر میں نے اپنے مالکِ حقیقی کو پہچان لیا ہے۔ میرا دل محبت اور احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ میں کسی طرح بھی اس کے فضل و کرم کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی رہنمائی شامل حال نہ ہوتی تو میں ساری عمر جہالت و حماقت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا رہتا (۳۷)۔

۱۱۔ ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس (ہنگری):

میں نے علم کے خشک و تر ذخیرے کا بڑا حصہ حاصل کر لیا جو صدیوں سے جمع ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ہزارہا کتابوں کی ورق گردانی کر ڈالی، لیکن کتابی معلومات کا یہ سرمایہ مجھے قلب کی تسکین کا سامان نہ دے سکا۔ دماغ سیراب تھا، مگر روح تشنہ تھی۔ میری دلی تمنا تھی کہ جو کچھ میں نے اب تک پڑھا ہے، اسے یکسر فراموش کر کے دل کی داخلی کیفیات میں کھو جاؤں۔ میری روح مذہب کے سدا بہار چمن سے مشک بیز ہونا چاہتی تھی۔

میں ہندوستان میں تھا جب کہ ایک رات میں نے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ کی ریش مبارک حنا شدہ تھی (حضور ﷺ کی ریش مبارک کا قدرتی رنگ حنا شدہ بالوں کی طرح تھا)۔ لباس سادہ اور پاکیزہ تھا اور اس میں سے ایک عجیب روح پرور خوشبو مہک رہی تھی۔ آپ ﷺ نے نہایت دل پذیر لہجے میں فرمایا: ''تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ سیدھا راستہ تمھارے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اٹھو اور یقین اور ایمان کی قوت سے اس پر گامزن ہو جاؤ''۔

میں نے ہمت کر کے عرض کیا: ''آپ ﷺ جیسی عظیم ہستی کے لیے یہ بات بہت آسان تھی، جسے خدا نے مافوق الفطرت طاقت عطا کی تھی، جس نے منصبِ نبوت پر فائز ہو کر تائیدِ غیبی سے اپنے دشمنوں پر فتح کامل حاصل کی اور جس کی مساعی پر خدائے قدوس نے عظمت و جلال کا تاج رکھ دیا''۔

آپ ﷺ نے ذرا تیز نگاہ سے میری طرف دیکھا پھر کچھ تامل کے بعد فرمایا: ﴿ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَاداً. وَالْجِبَالَ أَوْتَاداً. وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجاً. وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً ﴾ (۳۸) (کیا

ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا اور تمھیں جوڑے کر کے پیدا نہیں کیا اور ہم ہی نے تمھارے سونے کو راحت کی چیز بنایا)۔

اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل گئی، میں نے کراہتے ہوئے کہا اب مجھے نیند نہیں آسکتی، میں اس راز کو نہیں سمجھ سکتا جو ان پردوں میں نہاں ہے۔ (قرآن کی اس اثر انگیزی کے سبب ڈاکٹر صاحب نے اگلے ہفتے اسلام قبول کرلیا)(۳۹)۔

۱۲۔ ڈاکٹر عبداللہ علاؤالدین (جرمنی):

میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھا کہ نہ اللہ کو کسی نے پیدا کیا اور نہ ہی اللہ نے اپنا کوئی بیٹا پیدا کیا۔ یہ آیت پوری طرح میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن مجھے اسلام اور اس کی تعلیمات کا کوئی علم نہ تھا۔ اس لیے میں نے کسی قریبی اسلامی ملک میں جا کر مسلمانوں کے مذہب اور دین کی معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ شاید مجھے وہ سچا مذہب مل جائے جس کی مجھے پچیس سال سے تلاش ہے۔

میں ایک غریب آدمی ہوں، اس لیے جرمنی سے استنبول تک میں نے سائیکل پر سفر کیا۔ میں استنبول پہنچا اور قرآن شریف کو اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ کتابِ مقدس (بائبل) تورات، زبور اور اناجیل کی جس طرح غلطیاں تلاش کرتا ہوں، اسی طرح اس کتاب کی غلطیاں بھی ڈھونڈوں گا۔ لیکن جوں جوں اس کی تلاوت اور مطالعہ سے مستفیض ہوتا گیا، میرے ایمان میں اضافہ ہوتا رہا کہ یہی وہ آخری اور سچی ہدایت ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میں ۱۹۵۴ء میں استنبول میں مسلمان ہوگیا۔ الحمد للہ مجھے اسلام کی دولت نصیب ہوگئی (۴۰)۔

۱۳۔ ڈاکٹر عزیز الدین (بھارت):

ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا بنگال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد منتقل ہوگئے۔ حق کی تلاش میں انھوں نے ہندی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور پالی زبانیں سیکھیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کا بغور مطالعہ کیا۔ مگر کسی پر مطمئن نہ ہوئے۔ ان کے بقول اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان سب میں سے آخر کس مذہب کو مانا جائے۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام کی تعلیمات آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہیں۔ اسلام کی شخصیات مکمل طور پر تاریخی شخصیات ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس ضمن میں کارلائل کی شہادت بھی پیش کروں گا۔ یورپ کا یہ عظیم اور بے حد معتبر مؤرخ اپنی کتاب ''ہیروز اور ہیرو ورشپ'' میں لکھتا ہے: ''قرآن کو پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی سب سے پہلی خصوصیت اس کا حقیقی، اصلی اور بے میل ہونا ہے۔ میری دانست میں قرآن کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے سچا ہے'' (۴۱)۔

۱۴۔ ڈاکٹر علی سلمان بینواست (فرانس):

میں اگرچہ مذہبی اعتبار سے فرنچ کیتھولک خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مگر ڈاکٹر آف میڈیسن کی حیثیت سے میری سوچ اور فکر ٹھوس سائنسی اور منطقی رنگ میں رنگ گئی تھی اور سمجھ کے بغیر کوئی چیز قبول نہ کرتا۔ عیسائیت کے تثلیث کے عقائد کو ٹھیک نہ سمجھا۔

تاہم میں ابھی تک اسلام سے براہِ راست متعارف نہ ہوا تھا لیکن ایک مرتبہ کسی طرح جب مجھے پتہ چلا کہ اسلام میں توحید باری بنیادی عقیدہ کی حیثیت سے شامل ہے تو میں چونک اٹھا۔ مزید جستجو کی تو پتہ چلا کہ میں اسلامی کلمہ کے ایک جزو لا الـه الا الله کا تو پہلے ہی قائل چلا آرہا تھا اور قرآن کے اس قول فیصل پر مکمل یقین رکھتا تھا:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ۔اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۔وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ ﴾ (۴۲) (کہو، وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے)۔

ان معلومات سے مجھے وجدانی اعتبار سے جو تسکین ہوئی اس کا آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں، ایک روشنی تھی جو اندھیروں میں میری رہنمائی کے لیے لپک رہی تھی، میرے دل میں اسلام کے لیے عقیدت و ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اسلام کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔

اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا، اسی ضمن میں، میں نے مالک بن نبی کی قرآن کے بارے میں قابل قدر فرانسیسی کتاب بھی پڑھ ڈالی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن

خدا کی سچی کتاب ہے، چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اگرچہ قرآن کو نازل ہوئے تیرہ صدیاں گزر گئیں لیکن اس کی بعض آیتیں مختلف معاملات میں ہو بہو وہی رائے دیتی ہیں جو جدید ترین فکر کے حامل محقق دے سکتے ہیں۔ ان حقائق نے میرے دل کی دنیا بدل کر رکھ دی اور میں نے اسلامی کلمے کے دوسرے حصے محمد رسول اللہ کا بھی اقرار کرلیا۔

یہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں نے ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو پیرس کی مسجد میں حاضری دی اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسجد کے مفتی نے مجھے علی سلمان کے اسلامی نام سے موسوم کیا اور میں نے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرالیا (۴۳)۔

ان واقعات سے قرآن کی دعوتی تاثیر کے اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔ مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ زمین اور آسمان اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے زمین پر حکمران کر دیتا ہے:
﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ (۴۴) (زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث ٹھہراتا ہے)۔ اس کا نظام اسی کے احکامات جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں کے مطابق چلنا چاہیے کیونکہ جس نے اس کو بنایا ہے۔ وہ اس کے بارے میں بہتر جانتا ہے کہ اس کو کس طرح چلایا جائے۔ اگر کوئی چیز بنانے والے کے طریقے کے مطابق استعمال نہ کی جائے تو اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے مثلاً کار کے اندر پٹرول یا ڈیزل ہی چل سکتا ہے اگر اس کے اندر دودھ یا جوس ملا دیا جائے تو گاڑی چلنے کی بجائے خراب ہو جائے گی۔ اس لیے زمین کو بھی اللہ کے حکموں کے مطابق ہی چلایا جائے بصورت دیگر بگاڑ پیدا ہو گا۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ الحشر: ۲۱۔

۲۔ الجمعہ: ۲۔

۳۔ محمد انور بن اختر، قرآن کے دنیا پر اثرات اور جدید سائنسی تحقیقات (ادارہ اشاعت اسلام کراچی، ۲۰۰۳) ص ۲۶۱۔

۴۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، السیرۃ النبویۃ (تحقیق: عبد الحفیظ شبلی، مصطفیٰ سقا، ابراہیم الابیاری) مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۳۶) ۱/ ۳۵۹-۳۶۰۔

۵۔ الجن: ۱-۲۔

۶۔ منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور ۱۹۹۹ء) ۳/ ۲۵۷۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ حم السجدہ: ۱-۵۔

۹۔ ابن کثیر، حافظ عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم (مکتبۃ دار السلام، الریاض) ۴/ ۱۱۵-۱۱۷۔

۱۰۔ الحاقہ: ۴۰-۴۱۔

۱۱۔ ایضاً: ۴۲-۴۳۔

۱۲۔ طہٰ: ۱-۷۔

۱۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۲۲-۲۳۔

۱۴۔ ایضاً: ۱/ ۲۶۶۔

۱۵۔ رحمۃ للعالمین، ۳/ ۲۵۷۔

۱۶۔ الازہری، پیر کرم شاہ (ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم ۱۴۱۵ھ) ۳/ ۳۴۰-۳۴۱۔

۱۷۔ البقرہ: ۲۴۵۔

۱۸۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴/ ۳۹۴۔

۱۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ص ۳/ ۲۱۸-۲۱۹۔

۲۰۔ آل عمران: ۹۲۔

۲۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱/ ۵۰۶۔

۲۲۔ الذھبی، شمس الدین محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ السابعۃ ۱۹۹۰ء) ۲/ ۲۰۹۔

۲۳۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک (اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء) ۲/۱، ۴۷۔

۲۴۔ ایضاً، ۲/ ۴۱۷۔

۲۵۔ قرآن کے دنیا پر اثرات اور جدید سائنسی تحقیقات، ص۲۵۹-۲۶۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص۲۶۰-۲۶۱۔

۲۷۔ ق:۳۰۔

۲۸۔ الطنطاوی الجوھری، الجواھر فی تفسیر القرآن الکریم (داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۱ء) ۲۳/۱۰۷-۱۰۸۔

۲۹۔ فاروق، عبدالغنی، ہم کیوں مسلمان ہوئے (مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۰) ص۲۵۔

۳۰۔ آل عمران:۳۔

۳۱۔ ایضاً، ۸۴۔

۳۲۔ ہم کیوں مسلمان ہوئے، ص۳۴-۳۶۔

۳۳۔ ایضاً، ص۲۸-۲۹۔

۳۴۔ ایضاً، ص۶۲-۶۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص۸۳۔

۳۶۔ ایضاً، ص۱۰۴۔

۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۵-۱۳۶۔

۳۸۔ النبأ، :۶-۹۔

۳۹ ہم کیوں مسلمان ہوئے، ص۱۴۸-۱۴۹

۴۰۔ ایضاً، ص۱۶۰۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۷۵۔

۴۲۔ الاخلاص:۱-۴۔

۴۳۔ ہم کیوں مسلمان ہوئے، ص۱۸۱-۱۸۲۔

۴۴۔ الاعراف:۱۲۸۔

۴۴۔ الاعراف:۱۲۸۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں داعیٔ اسلام کے اوصاف

اللہ تعالیٰ بنی آدم علیہ السلام سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہے کہ والدین بھی اپنی اولاد سے نہیں کرتے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بہتری کو پسند کرتا ہے اور ان کے لیے اچھا انجام پسند کرتا ہے اور سیدھے راستے اور ہدایت کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے۔ اللہ نے بنی آدم میں اچھے اخلاق کو راسخ کرنے کے لیے دو طریقے پسند کیے ہیں:

فطرت سلیمہ:

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو دین حق اور فطرت اسلامیہ پر پیدا کیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے وہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں یا مجوسی''(۱)۔

پیدائشی فطرت کی وجہ سے انسان خیر اور شر کے درمیان فرق کرتا ہے، اور اچھائی کو پسند کرتا ہے اور وہ دنیا وآخرت میں نقصان دینے والی چیزوں سے دور رہتا ہے۔

ہدایت ورہنمائی:

ہدایت اور رہنمائی کے طریقے کو اللہ نے اپنے معزز رسولوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج کر ان کو ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنایا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو قولی اور عملی لحاظ سے اچھے اخلاق اور بلند صفات کے حامل ہیں۔ وہ اپنی امت کی مذکورہ چیزوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور وہ ان کو گھٹیا اور برے اخلاق سے دور رکھتے ہیں اور اپنی امت کو اس سے بچاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تمام معاملات میں ہمارے رہنما ہیں۔ اس لیے ایک داعی کے مطلوب اوصاف حمیدہ سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں بیان کیے جاتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے محمد بن عبداللہ ﷺ کو جس وقت تمام بنی آدم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو اس وقت انسانیت نے عبادت کے لیے مختلف طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ ان میں سے بعض بتوں کی عبادت کرتے تھے اور بعض پتھروں کی عبادت کرتے تھے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے تراشتے تھے اور وہ

پتھر نہ سن سکتے تھے، نہ بول سکتے تھے اور نہ ہی کچھ دیکھ سکتے تھے اور اسی طرح بعض لوگ اپنے حاکموں اور بادشاہوں کی عبادت کرتے تھے اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو سجدہ کرتے تھے۔ جبکہ ان میں سے بعض خالق کو چھوڑ کر، آگ، درخت، سورج وغیرہ مخلوق کی عبادت کرتے تھے۔

جزیرۂ عرب کے لوگوں کا دین عیسائیت یا یہودیت تھا۔ لیکن وہ زیادہ تر بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ہر قبیلے اور ہر شہر کا ایک خاص بُت ہوتا تھا جس طرح کہ کلبی نے ذکر کیا ہے۔ مکہ کے ہر گھر میں ایک بت ہوتا تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ جب وہ سفر پر جاتے تو اس کو چھوتے اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو گھر میں آتے ہی ان کا پہلا کام اُنھیں چھو کر برکت حاصل کرنا ہی ہوتا تھا۔

جبکہ دوسرے علاقوں کے لوگ بتوں کے علاوہ آگ، سورج یا درختوں کی عبادت کرتے تھے اور بعض دیگر لوگ حاکموں اور بادشاہوں کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کو سجدہ کرتے تھے جس طرح کہ فارس میں ہوتا تھا کہ جو شخص بھی ان کو سجدہ کرنے یا ان کی عبادت سے انکار کرتا یا ان کی حکم عدولی کرتا تو وہ سخت سزا دیتے تھے۔ بسا اوقات اس کو سولی پر چڑھا دیتے یا قتل کر دیتے تھے یا پھر اس کے جسم کو تمام لوگوں کے سامنے نمونۂ عبرت بنا دیتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی سزا کے ڈر سے احتجاج کرنے یا حق بات کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ان کی زندگی کے اطوار وحشیانہ تھے۔ طاقتور کمزور پر حکومت کرتے تھے۔ وہ کمزور پر حملہ کر کے ان کے مال کو لوٹ لیتے تھے۔ مردوں اور عورتوں کو غلام بنا لیتے۔ اسی طرح انسانی زندگی عدل وانصاف سے خالی تھی۔ ظلم و ناانصافی کی انتہا ہو چکی تھی پھر اللہ نے محمد بن عبداللہ ﷺ کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا تا کہ وہ تمام لوگوں کی اجتماعی انصاف کی طرف رہنمائی کر سکے نیز وہ اپنی دنیوی زندگی میں انصاف کو قائم کریں اور وہ برے اخلاق اور بتوں کی عبادت سے دور رہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق ان کو روز قیامت جنت میں داخل کرے گا کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے کہ وہ رسول بھیجنے سے پہلے لوگوں کو عذاب نہیں دے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (۲) (اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغامبر نہ بھیج دیں)۔

بعثت سے قبل محمد ﷺ بن عبداللہ القریشی کو لوگ صادق اور امین کے لقب سے پکارتے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے اچھے اخلاق، سچائی اور ایمانداری سے فائدہ اٹھاتے تھے جس کے آپ ﷺ لائق تھے کیونکہ سچائی اس لائق ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دینے والے لوگ لازماً اس کے حامل ہوں۔ آپ ﷺ غارِ حرا میں اکیلے عبادت میں مصروف ہوتے، اور بتوں کی عبادت سے دور رہتے تھے۔

ایک دن حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور انھوں نے اللہ کی طرف سے رسالت کا پیغام کلمہ ''اقــــرا'' کہہ کر پہنچایا تو نبی ﷺ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا باوجودیکہ لوگوں نے آپ ﷺ کو تکلیف دی اور جادوگر، جھوٹا اور مجنون کہہ کر مذاق اُڑایا۔ اللہ نے ان کے مذاق والے الفاظ کو بیان کیا ہے:

﴿وَعَجِبُوا أَن جَآءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ (۳)

(ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انھیں میں سے آ گیا۔ منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے)۔

یہ سلوک صرف حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہی نہیں کیا گیا بلکہ آپ ﷺ سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب کے ساتھ یہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴾

(۴) (یونہی ہوتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون)۔

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو ثابت قدم رہنے کے لیے فرمایا تھا کہ آپ ﷺ رسالت کے مشن کو پیغمبرانہ اولوالعزمی کے ساتھ جاری رکھیں۔ تو پھر نبی ﷺ ثابت قدم رہے اور کفار کے تنگ کرنے سے آپ ﷺ کے عزائم میں کوئی کمزوری پیدا نہ ہوئی کیونکہ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ زمانہ طویل ہو یا قلیل آخر کامیابی حق کو ہی حاصل ہوگی۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے مومن لوگوں کے ساتھ مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (۵) (اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں)۔

مزید فرمایا: ﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ. ﴾ (٦) (یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے)۔

آپ ﷺ نے اللہ کے پیغام کو معجزات اور خرق عادت واقعات کے ساتھ نہیں پہنچایا بلکہ آپ ﷺ نے اسے ایک انسان کی طرح اٹھایا اور آگے پہنچایا تاکہ وہ بیان کریں ہمارے لیے ایک مثال کہ آپ ﷺ کی امت کا کوئی فرد بھی اس دعوت کو اٹھانے اور تمام لوگوں کی طرف پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے اور یہ دعوت کا مشن محض آپ ﷺ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ ایک شرف ہے کہ جسے آپ ﷺ کی امت کا ہر فرد حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہے البتہ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے جن کے ذریعے اللہ نے اپنے رسول کی تائید کی ہے تو وہ دعوت کو پہنچانے کے لیے نہیں تھے بلکہ وہ اس لیے تھے تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ انبیاء اور نبوت کی دعوت دینے والے دیگر لوگوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

نبی کریم ﷺ ایک داعی کے جملہ اوصاف سے متصف تھے اور ہر داعی اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ان صفات کا حامل ہو، تاکہ وہ کشادگی میں مضبوطی حاصل کرے اور ان لوگوں کو جن کو وہ دعوت دے رہا ہے، انھیں اس داعی تک پہنچنے میں آسانی ہو اور وہ اس کے ساتھ اسلام کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔ ان میں سے چند اہم صفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اعلیٰ اخلاق

رسول اللہ ﷺ پہلے سے ہی عمدہ اخلاق کی بہترین مثال تھے۔ آپ ﷺ نہ تو کسی کو گالی دیتے اور نہ ہی کسی کو تکلیف دیتے تھے۔ آپ ﷺ حق کی طرف رجوع کرنے والوں کی مدد کرتے تھے۔ آپ ﷺ فقیروں، مسکینوں اور کمزوروں پر نرمی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ بعثت سے قبل کامل اخلاق کے مالک بن گئے جس طرح کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "أدبني ربي فأحسن تأديبي" (۷) (مجھے میرے رب نے نہایت اچھے اخلاق سے نوازا ہے)۔

رسالت محمد یہ ﷺ کے اہم مقاصد میں سرفہرست یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کے اندر اچھے اخلاق کو راسخ کریں۔ فرمان رسول ﷺ ہے: "إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق" (۸) (بے

شک میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔

رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اعمال کے لحاظ سے اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ آپ ﷺ درگزر کرتے تھے، معاف کرتے تھے، چشم پوشی کرتے تھے اور غصہ نہیں کرتے تھے مگر جب اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو پامال کیا جاتا تھا تو حضور ﷺ اپنی ذات کے بجائے اللہ کی رضا کے لیے غصہ کرتے تھے اور کسی سے بھی ذاتی انتقام نہ لیتے تھے یہاں تک کہ وہ لوگ جنھوں نے آنحضور ﷺ کو برا بھلا کہا، آپ کو تکلیف دی، آپؐ کے ساتھ مذاق کیا اور آپ ﷺ کو گالیاں دیں۔ آپ ﷺ نے ان کی حماقتوں سے درگزر فرماتے ہوئے درج ذیل الفاظ کے ساتھ ان کا جواب دیا: "**اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون**" (۹) (اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے وہ جانتی نہیں ہے)۔

اسی طرح مومنوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اچھے کردار، عمدہ اخلاق کو اپنائیں فرمایا: "**ان من أکمل المؤمنین إیمانا أحسنھم خلقا و ألطفھم بأھله**" (۱۰) (یقیناً مؤمنوں میں سے کامل ایمان والے وہ ہیں جو اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں اور اپنے اہل پر نرمی کرتے ہیں)۔

مزید فرمایا: "**ان من أحبکم إلیّ و أقربکم منّی مجلسا یوم القیامة، أحسنکم أخلاقا**" (۱۱) (یقیناً تم میں سے محبوب اور قیامت کے دن میرے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو)۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق کو اپنائے کیونکہ اخلاق بعثت محمدی ﷺ کے مقاصد میں سے ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ **كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ** ﴾ (۱۲) (ہم نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے)۔

یہاں تزکیہ سے مراد تزکیۂ نفس ہی ہے اور اس کے لیے اعلیٰ اخلاق کی تربیت کرنا اور بُرے اخلاق سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔ جب اعلیٰ اخلاق کو اپنانا ہر مسلمان پر فرض ہے تو داعیٔ اسلام پر لازم ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو۔ کیونکہ اس نے اللہ کے دین کی دعوت کا ذمہ لیا ہے اور اچھا اخلاق تو ایک

داعی کی زینت ہے کیونکہ اسی کو رسول ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام ؓ نے اپنایا اور ان کے بعد جو بھی داعی آئے انھوں نے اختیار کیا۔ یقیناً اچھا اخلاق لوگوں کو داعی کے قریب کر دیتا ہے، لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اس کی بات کو سنتے ہیں اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تعریف قرآن مجید میں ان الفاظ کے ساتھ فرمائی ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (۱۳) (اور یقیناً آپ ﷺ اخلاق کے بلند درجے پر فائز ہیں)۔

جس طرح برے اخلاق والے سے لوگ دور بھاگتے ہیں، جو وہ کہتا ہے اس کی بات نہیں سنتے، اس بات کو اللہ نے اپنی کتاب مقدس میں یوں بیان کیا ہے: ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾۔ (۱۴) (اور اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے)۔

۲: سچائی اور ایمان داری: ذاتی عمل

سچائی اور ایمانداری وہ بلند صفات ہیں جو ایک داعی اسلام کے لیے ضروری ہیں تا کہ لوگ اس کی گفتگو کو سن لیں اور اس کی دعوت کو قبول کر لیں، امانت ان بلند اور اعلیٰ صفات میں سے ہے جو نبی اکرم ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل آپ ﷺ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آنحضور ﷺ سچ بات کہنے میں، امانت کی حفاظت کرنے میں اور اس کو مالک کی طرف لوٹانے میں معروف تھے اور یہ وصف آپ ﷺ کے اندر پیدائشی تھا۔ دعوت کے مشن کا آغاز آپ ﷺ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر ان الفاظ کے ساتھ کیا: ''وا صباحاہ وا صباحاہ''۔

یہ جملہ عرب معاشرے میں کسی جنگ یا خوف سے ڈرانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مکہ کی مختلف وادیوں میں سے لوگ آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے، جب سب لوگ آپ ﷺ کے سامنے جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے ناموں سے پکارا:

اے بنو ھاشم! اے بنو عبد مناف، اے بنو لؤی..... پھر آپ ﷺ اس طرح گویا ہوئے: اگر میں تمھیں کہوں کہ گھڑ سواروں کا ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے کیا تم میری تصدیق کرو گے؟

انھوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''ما جربنا علیک کذبا'' (ہم نے آپ ﷺ کو کبھی جھوٹا نہیں

پایا)۔

اس طرح آپ ﷺ نے ان تمام قبیلوں سے سچ کی گواہی حاصل کی جن کو آپ ﷺ اسلام کی دعوت دینے والے تھے۔

سچ کا تعلق محض زبانی دعوے سے نہیں ہوتا بلکہ داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں سچ کا دعویٰ کرے وہاں عمل سے اس کا اظہار بھی کرے، خواہشات سے دور رہے اور وہ جھوٹ کے معاملہ میں سستی نہ کرے کیونکہ داعی اگر جھوٹا ثابت ہو جائے تو لوگ اس کی دعوت کو صدق کے اعتبار سے مشکوک سمجھنے لگتے ہیں اور جھوٹ حاسدین کے لیے ایک ایسا دروازہ کھول دیتا ہے جو اس کی شہرت اور دعوت کے طریقہ کو بدنام کرتے ہیں۔

جس طرح کفر پر قائم رہتے ہوئے بھی نبی ﷺ کے چچا ابو طالب نے اس کی گواہی دی ہے کہ محمد سچے اور ایماندار ہیں:

ودعوتنی وعلمت انك صادقا　　　ولقد صدقت فكنت قبل امينا

(آپ ﷺ نے مجھے دعوت دی میں جانتا ہوں آپ ﷺ سچے ہیں۔ اور میں نے تصدیق کی کہ آپ ﷺ اس سے قبل امین تھے)۔ فضیلت تو یہ ہے کہ دشمن گواہی دیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہودی علما اور راہبوں کو ان کے قول و فعل میں تضاد ہونے کی بنا پر ان الفاظ میں تنبیہ کی ہے۔ اپنے اس فرمان کے ساتھ: ﴿ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ (۱۵) (تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیا تم عقل سے بالکل کام نہیں لیتے؟)۔

جو داعی الی اللہ ہوتا ہے وہ اپنے دین میں مخلص ہوتا ہے، حق پر ایمان رکھتا ہے، لوگوں کی رہنمائی کرنے سے پہلے اپنے آپ کو درست کرتا ہے اور لوگوں کو عمل پر لگانے سے پہلے خود عمل کرتا ہے۔ وہ شخص جو دوسروں کو بھلائی کی طرف بلاتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا ہے اس شخص کی مذمت کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ایسا سخت اسلوب اختیار کیا ہے جو گناہ گاروں اور خطاکاروں کے لیے استعمال کیا گیا چنانچہ فرمان خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ

أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴾(۱۶)(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت نہ پسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں)۔

یہ خطاب تمام مومنین کو متوجہ کرنے والا ہے اور خصوصاً داعی الی اللہ کے لیے زیادہ اہم ہے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں اور اس عمل سے بچیں۔

دعوت کی ذمہ داری کو اٹھانے والے داعی کی کامیابی کا راز سچائی اور ایمانداری میں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ داعی اپنے اقوال، اعمال اور افعال اور منہج میں سچا ہو کیونکہ دعوت میں سچائی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں اہم مقام رکھتی ہے، جب تک داعی سچائی پر قائم رہتا ہے تو یہ اللہ کی نصرت وتائید کا سبب بنتی ہے اور قیامت کے دن نفع کا باعث بن سکتی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: ﴿هٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَداً رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾(۱۷)(یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے)۔

۳: صبر:

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صبر کرنے اور دعوت کے معاملہ میں جلدی نہ کرنے کی ترغیب دی ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ﴾(۱۸) (بس اے نبی ﷺ، صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور اُن کے معاملہ میں جلدی نہ کرو)۔

داعیٔ اسلام کے لیے صابر ہونا ضروری ہے کیونکہ داعی کو اپنی دعوت کے دوران شیاطین جن و انس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ جو اس کی دعوت میں رکاوٹ بنتے ہیں اور بسا اوقات اس کا اور اس کی دعوت کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس صورت میں داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور اپنی دعوت کے نتیجے کو حاصل کرنے میں جلدی نہ کرے۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ: دین میں امامت، صبر اور یقین کے ساتھ حاصل ہوتی

ہے اور اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اور رسول ﷺ کو بار بار صبر کی ترغیب دی اور ان کو حق پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ وہ نہ تو پریشان ہوں اور نہ ہی مشقت محسوس کریں۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ (١٩) (اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ)۔

یقیناً جب داعی دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھے کہ مستقبل میں اس کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مصائب ناگزیر ہیں اور اسے لوگوں کے تنگ کرنے، ان کے مذاق کرنے اور انکار کرنے پر صبر کرنا ہوگا تاکہ ہدف کی طرف راستہ ملنے میں آسانی ہو اور وہ اللہ کے دین کی مدد کر رہا ہوتا ہے۔

دعوت کے ثمرات کو حاصل کرنے میں جلدی کرنا اور اس کے نتائج جلدی چاہنا یہ چیزیں اس صبر میں مناسب نہیں ہیں جس کی تلقین ایک داعی کو کی گئی ہے اور نہ اس داعی الی اللہ کا معیار اس کی دعوت کو قبول کرنے والوں کی کثرت یا اس سے اعراض کرنے والوں کی کثرت ہے نہ داعی کے ارد گرد لوگوں کی کثرت اس کی کامیابی پر دلالت کرتی ہے نہ قلت اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ جب باطل کے ساتھ اہل حق کا مقابلہ ہوتا ہے تو اہل حق ہمیشہ کم ہی ہوتے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اعْمَلُوْا آلَ دَاوُوْدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (٢٠) (اے آل داؤدؑ، عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہیں جو شکر گزار ہیں)۔ اس کے علاوہ بھی کئی آیات اس مفہوم کو واضح کرتی ہیں۔ لیکن میں نے اختصار کی غرض سے انھی پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہر عمل کے لیے بدلہ ہوتا ہے اور ہر داعی کے لیے پیروی کرنا ہوتا ہے۔ دعوۃ الی اللہ میں صبر بہترین رہنمائی کرتا ہے۔

۴: تواضع:

اگر داعی اپنے دعوتی اصولوں میں عاجزی وانکسار کو شامل کرلے تو یہ چیز لوگوں کے ہاں اس کو محبوب بنا دیتی ہے۔ اس کو چاہیے کہ فخر کے رویہ کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی کسی آدمی پر غصہ کا اظہار کرے۔ ان کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ ان کا مذاق نہ اڑائے بلکہ ان کے ساتھ انکسار کے ساتھ پیش آئے اور ان کا احترام کرے۔

فرمانِ رسول ﷺ ہے: "ان اللہ أوحی الی ان تواضعوا، حتی لا یفخر أحد علی أحد ولا یبغی أحد علی أحد" (۲۱) (مجھے وحی کے ذریعے اللہ نے مطلع کیا ہے کہ عجز وانکسار اختیار کریں یہاں تک کہ کوئی شخص کسی شخص پر فخر نہ کرے اور نہ ہی کسی کے خلاف کوئی شخص بغاوت کرے)۔

ایک اور ارشادِ نبوی ہے: "ما نقصت صدقة من مال شیئاً وما زاد اللہ عبدا بعفو الا عزًّا وما تواضع أحدٌ الا رفعه اللہ" (۲۲) (صدقہ کرنے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی، درگزر کرنے سے اللہ بندے کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے اور جو بھی اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتے ہیں)۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی وانکسار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی شان بلند کر دیتا ہے اور دنیا و آخرت میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے اور لوگ اسے پسند کریں گے اس کی دعوت بابرکت ہو جاتی ہے اور جنت میں اس کا درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اسی طرح جو شخص تکبر کرے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔

داعی کی تواضع سے ہی لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور لوگ اس کے قریب ہو جاتے ہیں اور اس کی بات کو سنتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تکبر کوئی اچھی چیز نہیں ہے خواہ کفار اور گنہگاروں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ بسا اوقات وہ داعی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیتے ہیں اور دنیا میں ہدایت کے راستے کی پیروی کرتے ہیں۔

دوسروں کی بات سننا یہ بھی عاجزی وانکسار ہے اگرچہ وہ علم یا عمر کے لحاظ سے کم ہوں کیونکہ حق کی پیروی کرنا ضروری ہے خواہ عالم کی طرف سے یا جاہل کی طرف سے ہو یا چھوٹے کی طرف سے ہو۔

اللہ تعالیٰ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ فرماتے ہیں: "رحم اللہ من اھدی الینا عیوبنا" (اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے ہمارے عیوب کی اصلاح کی)۔

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ عاجزی وانکسار اختیار کرے جب دیکھے کہ کوئی شخص کمزور ہو یا فقیر یا عمر کے لحاظ سے چھوٹا یا بڑا ہو تو اسے حقیر مت جانے، ایسا کرنے سے اس کا دل زیادہ مطیع ہو جائے گا۔ اور گناہ کرنے میں بھی وہ کمی کرے گا، اور اللہ کے ہاں زیادہ قرب حاصل

کرے گا تو اس کی مدد کی جائے۔ اگر وہ مدد طلب کرے، اگر طاقت ہو تو اس کی حاجت پوری کرے۔ وہ بات کرنا چاہے تو اس کی بات کو سن لے۔ اگر وہ دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرے اگرچہ وہ جو کی روٹی کے لیے بلائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے ارشاد فرمایا: ﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۲۳) (اور آپ ﷺ مومنوں کے لیے اپنے بازو جھکا دیں)۔

رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی:

"أنه كان يجلس على الأرض ويأكل على الأرض ويعتقل الشاة ويجيب دعوة المملوك على خبز الشعير" (۲۴) (آپ ﷺ زمین پر بیٹھتے تھے اور زمین پر کھاتے تھے اور بکری کا دودھ خود دوہتے تھے اور غلام جو کی روٹی کی دعوت دیتا تو اس کی دعوت کو آپ ﷺ قبول فرما لیتے تھے)۔

ہر داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے تا کہ وہ دوسروں کے لیے مثال اور قابل تقلید ہو اور ایک داعی اگر کسی انسان کو دیکھے اگرچہ وہ فاسق ہو تو اس پر تکبر نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے جس نے آپ کو فسق و فجور سے عافیت بخشی۔ بسا اوقات اللہ اس کو اسلام کی طرف ہدایت دیتا ہے اور وہ مطیع ہو جاتا ہے، اور اس کا سارا اجر آپ ﷺ کے میزان کے اندر رکھا جائے گا۔

۵: عدل وانصاف:

ہر حق دار کو اس کا حق دینا انصاف (عدل) کہلاتا ہے اور یہ ان امور میں سے ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ترغیب دی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾ (۲۵)

(کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے)۔

اللہ رب العزت نے ہمیں عدل وانصاف کی ترغیب دی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اگر کسی کے ساتھ عداوت بھی رکھتے تھے تو اس کی عداوت کی وجہ سے اس پر ظلم و ناانصافی نہ کی جائے گی اور یہ ان امور میں سے ہے جن کی طرف داعی کا متوجہ ہونا ضروری ہے اور ان پر حق بات کہنا اور حق بات کہنے میں عدل

برابر ہے۔ وہ شخصیت کو پرکھتا ہے، یا دعوت کو، قوم یا کسی اور چیز کو۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ مناسب حد تک اچھائیوں کا تذکرہ کرے اور وہ فقط برائیوں کا تذکرہ نہ کرے اور جو شخص پسند کرے کہ اس کی برائیوں کو چھپایا جائے تو داعی کو ایسے ہی کرنا چاہیے اور اس کی برائیوں کو چھپانا چاہیے کیونکہ اس مسئلہ کا قیامت والے دن حساب ہوگا۔

داعی کے فرائض میں یہ بات بھی ہے کہ وہ تہمت والی باتوں سے لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بچنے والا ہو اور اپنے آپ کو ان خوبیوں سے آراستہ کرے جو اس میں ہونی چاہییں۔ اچھی بات کو اچھا کہے اور بری بات کو برا کہے، اگر وہ کسی شخص کے بارے میں نہیں جانتا تو اگر کوئی اس کے بارے میں سوال کرے تو وہ یہ جواب دے کہ مجھے معلوم نہیں ہے اور وہ حق بات کو ثابت کرنے کے لیے ایسا کرے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ داعی کچھ لوگوں کے ساتھ اختلاف کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ بہت سی آراء میں دیگر دعاۃ کے ساتھ اس کا اختلاف ہو جائے تو داعی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ان کے ایسے اوصاف بیان کرنا شروع کر دے جو ان میں نہیں اور یہ ظاہر کرے کہ دین کے معاملات میں اور کوئی بھی اتنا نہیں جانتا اور اپنے ساتھ اختلاف کرنے والے کے مرتبہ کو کم کرنا شروع کر دے تاکہ اس کی شہرت اور کردار کو لوگوں کے سامنے بدنام کر سکے تاکہ لوگ اس سے بیزار ہو جائیں، داعی کو اس مقام پر اللہ کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہیے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۲۶) (بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کی تلقین کرتا ہے (حکم دیتا ہے))۔

۶: جذبۂ جاوداں:

اپنے مقصد کو پانے کے لیے داعی کو بلند خیال ہونا چاہیے اور وہ مقصد یہ ہے کہ جس اسلام کی وہ دعوت دے رہا ہے۔ اللہ اس کے ہاتھوں لوگوں کی بہت بڑی مقدار میں ہدایت دے دیتا ہے۔ داعی کو انتہا پر ٹھہر کر اپنے نفس کو اس میں خوش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دعوت کے میدان میں کامیابیاں دی ہیں۔ اگر اللہ اس کے ہاتھوں پر کسی کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے یا دے دے تو اسے ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر بہت زیادہ لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا تو اسے ناامید ہو کر اپنے عزائم کو ختم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ چیز اس کی دعوت کو ختم کر دے گی۔ جس دعوت کے علم کو وہ اٹھائے ہوئے ہے اور جس کے راستے کی اس نے خوب تیاری کی ہوئی ہے۔ ہدایت تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

جب حضور ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی موت سے پہلے ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (۲۷) (اے نبی ﷺ تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں)۔ جسے آپ ﷺ چاہیں اس کو ہدایت مل نہیں سکتی اور اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "لان یھدی اللہ بلث رجلا واحدا خیر للث من حمر نعم" (۲۸) (اگر اللہ تیرے ہاتھوں ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے)۔ آج مسلمانوں کے لیے ایسے داعی کی ضرورت ہے جو زندہ جذبات رکھتا ہو اور مشارق و مغارب میں مسلمانوں کے مسائل پر اس کا دل غمزدہ ہوتا ہو، اپنے بھائیوں پر شفقت کرنے والا ہو، اللہ کا فرمان ہے ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۹) (مومن کافروں پر بڑے سخت ہوتے ہیں اور آپس میں رحمدل ہوتے ہیں)۔

ایک مومن کو کفار کے لیے سخت ہونا چاہیے اور مومنوں کے لیے رحم دل تاکہ اس کے بارے میں نبی ﷺ کا فرمان سچا ثابت ہو۔ (مومنوں کی آپس میں محبت، رحمت، شفقت کی مثال ایک جسم کی مانند ہے جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم بے زاری اور بخار میں مبتلا ہوتا ہے)۔ ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا: "المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا" (۳۰) (ایک مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہیں وہ ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں)۔ ملت اسلامیہ کو موجودہ دور میں ایسے داعیوں کی اشد ترین ضرورت ہے جو اپنے بھائیوں کے درد کو محسوس کر سکیں۔ ان کی مصیبت کو سن کر ان

کے لیے دکھ کا اظہار کریں، وہ جہاں کہیں بھی ہوں اور جو کوئی بھی ہوں ان کی مصیبتوں میں غمزدہ ہوں، ان کے دکھ درد میں کم از کم جذباتی طور پر شریک ہوں۔ اور اللہ سے ان کی مصیبت کی دوری کے لیے دعا کریں۔ اگر چہ حق تو یہ ہے کہ وہ ہر اس کوشش کو بروئے کار لائے جو اس کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں کوتاہی نہ کرے۔

۷: اسلوب دعوت:

اللہ نے اپنے دین کو انسانوں کی طرف انبیاء کے ذریعے بھیجا ہے تا کہ لوگوں کو عبادت، تسبیح اور تمجید کی کیفیت سمجھا دیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نجات کے راستے پر چلیں جو ان کو سلامتی کے ساتھ جنت میں لے جائے گا جس طرح کہ انبیاء کو اللہ نے راہنمائی دی ہے، اس طریقے سے وہ لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلائیں۔ اللہ نے جب فرعون کو دعوت دینے کی غرض سے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھیجا تو انھیں فرمایا: ﴿ اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ. فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴾ (۳۱) (جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے)۔

فرعون ان طاغوتوں میں سے تھا جنھوں نے تاریخ میں خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اس کے باوجود اللہ نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ فرعون کے ساتھ نرم گفتگو کریں۔ اسی طرح اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا تھا: ﴿ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ﴾ (۳۲) (اے نبی ﷺ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو)۔ مزید فرمایا کہ: ﴿ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (۳۳) (اگر آپ ﷺ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ ﷺ کے اردگرد نہ بیٹھتے)۔

اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لیے ضروری ہے کہ نرمی اور حکمت کو اختیار کیا جائے کیونکہ اس کے لیے لوگوں کے نفوس میں ایک اچھا تاثر پیدا ہوتا ہے اور تند خوئی اور بد اخلاقی لوگوں کو بھگا دیتے ہیں اور داعی سے دور کر دیتے ہیں۔ فرمان رسول ﷺ ہے: ''إِنّ الرفق لا يكون في شيء إلا

زانه ولا ينزع من شيء إلا شانه" (۳۴) (نرمی جس چیز میں ہو وہ اس کو خوبصورت کر دیتی ہے اور جس چیز میں نہ ہو اس کو عیب دار کر دیتی ہے)۔

کسی بھی داعی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائے اور کتاب اللہ و سنت رسول ﷺ میں سے کوئی دلیل نہ دے کیونکہ ایسا دین کے منافی ہے۔ گالی دینا، بُرا بھلا کہنا اور بُرے اخلاق کا مظاہرہ کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ وہ سب سے بڑھ کر حق کو ماننے والا ہے اور دوسرے ناحق پر ہیں اور یہ دعویٰ کرنا کہ اس کی پیروی کرنا ہی قیامت کے دن اس کو نجات دے گا اور اس کے علاوہ باقی سب جہنمی ہیں۔ ایک داعی کے شان شایان نہیں ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

یہ چیزیں داعی کے اوصاف میں سے نہیں ہیں کیونکہ گالی دینے اور برا بھلا کہنے اور برے اخلاق کا مظاہرہ کرنے سے لوگ داعی اور دین دونوں سے دور بھاگتے ہیں اور اللہ نے مومنین کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے حتی کہ کافر یا بُت ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ یا دین اسلام کو گالی دینے کا سبب بنے گا اور اس وجہ سے وہ باطل پر ڈٹ جائیں گے اور وہ حق اور اہلِ حق سے کنارہ کشی اختیار کریں گے۔

فرمان الٰہی ہے: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۳۵) (اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں اُنہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر انھیں رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت وہ انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں)۔

مندرجہ بالا صفات کا داعیٔ اسلام کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ میں یہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ موجودہ دور میں داعی اسلام کے لیے ان صفات کے بغیر دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا مناسب نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دار ابن کثیر، بیروت، ۱۹۸۷ء) ۱۷۹۲/۴۔

۲۔ الاسراء: ۱۵۔

۳۔ ص: ۴۔

۴۔ الذاریات: ۵۲۔

۵۔ الروم: ۴۷۔

۶۔ غافر: ۵۱۔

۷۔ عجلونی، اسماعیل بن محمد، کشف الخفاء (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء) ۷۲/۱۔

۸۔ البیہقی، ابوبکر حسین بن علی، السنن الکبریٰ (نشر السنۃ، ملتان) ۱۹۲/۱۔

۹۔ احمد بن حنبل، المسند (المکتب الاسلامی، بیروت) ۱/ ۶۸-۱۵۵۔

۱۰۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، السنن (دار السلام، الریاض، طبع ثانی، ۱۹۹۹ء) ص ۵۹۴، حدیث نمبر ۲۶۱۲۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۶۵، حدیث نمبر ۲۰۱۸۔

۱۲۔ البقرہ: ۱۵۱۔

۱۳۔ القلم: ۴۔

۱۴۔ آل عمران: ۱۵۹۔

۱۵۔ البقرۃ: ۴۴۔

۱۶۔ الصف: ۳۔

۱۷۔ المائدۃ: ۱۱۹۔

۱۸۔ الاحقاف: ۳۵۔

۱۹۔ المزمل: ۱۰۔

۲۰۔ سبا، ۱۳۔

۲۱۔ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح (داراحیاء التراث العربی، بیروت) ۲۰۰/۱۷۔

۲۲۔ التبریزی، ولی الدین محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (دار الفکر، بیروت ۱۹۹۱ء) ۵۲۳/۱، حدیث نمبر ۱۸۸۹۔

۲۳۔ الحجر: ۸۸۔

۲۴۔ الہیثمی، نور الدین مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (مؤسسہ المعارف، بیروت ۱۹۸۶ء) ۲۰/۹۔

۲۵۔ المائدۃ: ۸۔

۲۶۔ النحل:۹۰۔

۲۷۔ القصص:۵۶۔

۲۸۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص۶۲۴، حدیث نمبر۳۷۰۱۔

۲۹۔ الفتح:۲۹۔

۳۰۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص۱۰۵۳، حدیث نمبر۶۰۲۶۔

۳۱۔ طٰہٰ:۴۴۔

۳۲۔ النحل:۱۲۵۔

۳۳۔ آل عمران:۱۵۹۔

۳۴۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۳/۸۶، حدیث نمبر۵۰۶۷۔

۳۵۔ الانعام:۱۰۸۔

باب ہفتم

سیرت نبوی ﷺ اور اسلامی ریاست کا آغاز وارتقا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

رحمۃ للعالمین ﷺ کی شخصیت کا حربی پہلو بھی تمام پہلوؤں کی طرح بے نظیر ہے۔ بیشتر مسلمان مصنفین نے اس پہلو پر مستقل کتب لکھی ہیں۔ جن میں آپ ﷺ کی دفاعی سیاست اور جنگی حکمت عملی پر عمدہ بحثیں کی گئی ہیں۔ دنیا کی کسی شخصیت پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا آپ ﷺ کی شخصیت پر لکھا گیا۔ آپ ﷺ کی شخصیت پر لکھنے کو ایک سعادت قرار دیا ہے:

ما ان مدحت محمداً بمقالتی ولکن مدحت مقالتی بمحمدٍ

آپ ﷺ کی ذات کے متعلق مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی قلم اٹھایا۔ بعض نے آپ ﷺ کی تعریف اور بعض نے تنقیص کے لحاظ سے قلم اٹھایا۔ ''The Hundred'' میں آپ ﷺ کا اسم مبارک پہلے نمبر پر ان شخصیات میں لکھا گیا جنھوں نے تاریخ کے دھارے کو بدل ڈالا۔ اس طرح مار گولیتھ آپ ﷺ کی ذات پر لکھنے والے لوگوں میں اپنے آپ کو شامل کرنا اپنے لیے سعادت سمجھتا ہے۔

آپ ﷺ کے متعلق بعض نے آپ کی پوری زندگی پر قلم اٹھایا اور بعض نے آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھا مثلاً: بعض نے آپ کی معاشرتی زندگی پر لکھا۔ بعض نے معاشی زندگی پر، بعض نے سیاسی زندگی پر، بعض نے آپ کے اخلاق پر اور بعض نے آپ ﷺ کے انسانِ کامل ہونے پر لکھا۔ غرضیکہ زندگی کے ہر میدان پر آپ ﷺ سے متعلق تحریرات ملتی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۱) (رسول اللہ ﷺ کی زندگی تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے)۔

تاریخِ عالم میں آپ کا مقام قدیم و جدید تمام سپہ سالاروں اور امیرانِ عسکر سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار جو نمونہ چھوڑا اس میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سریہ کے طور پر بھیجتے تو حکمت کی باتیں سمجھا کر بھیجتے۔ آپ ﷺ نے مکہ کی سرزمین کی طرف ایک سریہ بھیجا اور خط دے کر کسی مقام پر جا کر پڑھنے کے لیے ہدایت دی۔ تو اس میں صرف اتنی ہدایت تھی کہ آپ حالات کا جائزہ لیں کسی پر حملہ نہ کریں۔ لیکن انھوں نے ایک قافلہ کو لوٹ لیا جسے آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا۔ جدید طرز جنگ میں قائد افواج صرف عقل کا محتاج ہوتا ہے اور قدیم

جنگوں میں عسا کر کے لیے عقل کے ساتھ ذاتی شجاعت بھی ضروری تھی۔ آپ ﷺ میں دانشمندی وشجاعت کا حسین امتزاج موجود تھا۔

آپ ﷺ کی بہادری ضرب المثل تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''انا کنا اذا حمی البأس واحمرت الحدق اتقینا برسول اللہ فما یکون احد اقربنا الی العدو منہ'' (۲) (جب گھمسان کارن پڑتا آنکھوں میں خون اترنے لگتا تو ہم رسول اللہ ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے۔ ہم میں سے کوئی آپ ﷺ سے زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا)۔

دشمن سے مقابلہ کے وقت آپؐ ڈٹے رہتے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرماتے: ''إلیّ عباد اللہ، الیّ عباد اللہ، انا رسول اللہ'' (۳) (میری طرف اللہ کے بندو، میری طرف اللہ کے بندو، میں اللہ کا رسول ہوں)۔

آپ ﷺ بڑے خطرناک مقامات پر بھی نہیں گھبراتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک دفعہ خطرے کی وجہ سے شور ہوا تو آپ ﷺ خود ہی سب سے پہلے اس طرف چلے گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نکل کر گئے تو آپ ﷺ کو ادھر سے واپس آتے ہوئے پایا اور آپ ﷺ زین کے بغیر گھوڑے پر سوار تھے اور تلوار آپ ﷺ کے پاس تھی اور آپ ﷺ فرما رہے تھے، گھبراؤ مت میں ادھر سے آ رہا ہوں (۴)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع (سنہ ۷ھ) سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ اکیلے درخت کے نیچے آرام فرما تھے۔ ایک کافر نے موقع غنیمت جان کر آپؐ کی تلوار اٹھا کر آپ کو جگا کر کہا آپ کو مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ ﷺ نے زور سے فرمایا: ''اللہ''۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ آپ ﷺ نے اٹھا کر فرمایا اب تجھے کون بچائے گا تو اس نے کہا آپ ﷺ، آپ ﷺ نے اس کو معاف فرما دیا (۵)۔

اس طرح غزوۂ حنین میں آپ ﷺ نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئاً وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ﴾ (۶) (یاد کرو حنین کے دن کو جب تمھیں اپنی کثرت بڑی اچھی لگ رہی

تھی لیکن اس نے تم کو کچھ فائدہ نہ دیا اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے)۔

اس میں رسول اللہ ﷺ ثابت قدم رہے۔ حضرت براء ؓ بن عازب فرماتے ہیں: "قال رجل للبراء بن عازب رضی اللہ عنہ: أفررتم عن رسول اللہ ﷺ یوم حنین؟ قال: لکنّ رسول اللہ ﷺ لم یفرّ، إنّ ھوازن کانوا قوماً رماۃ وإنّا لمّا لقیناھم حملنا علیھم فانھزموا فأقبل المسلمون علی الغنائم فاستقبلونا بالسّھام، فأما رسول اللہ ﷺ فلم یفرّ، فلقد رأیتہ وإنّہ لعلی بغلتہ البیضاء، وإنّ أبا سفیان آخذٌ بلجامھا والنّبیّ ﷺ یقول: أنا النّبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب" (۷) (ایک شخص نے براء ؓ بن عازب سے پوچھا کیا حنین کی لڑائی میں آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ براء ؓ نے کہا لیکن رسول اللہ ﷺ فرار نہیں ہوئے تھے۔ ہوازن کے لوگ (جن سے اس لڑائی میں مقابلہ تھا) بڑے تیر انداز تھے، جب ہمارا ان سے سامنا ہوا تو شروع میں ہم نے حملہ کر کے انھیں شکست دی تھی پھر مسلمان مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور دشمن نے ہم پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ پھر بھی رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے سفید خچر پر سوار تھے، ابوسفیان اس کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آپ ﷺ یہ فرما رہے تھے کہ میں نبی ہوں جس میں جھوٹ کا کوئی دخل نہیں۔ میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں)۔

آپ ﷺ کی فوج کم بھی ہوتی تو دشمن پر رعب طاری ہو جاتا۔ ارشادِ نبوی ہے: "نصرت بالرعب مسیرۃ شھر" (۸) (مجھے ایک سال کی مسافت تک رعب سے مدد دی گئی ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کے دل میں اپنی فوج کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا ہر لحاظ سے خیال فرماتے تھے۔ آپؐ خود ان کے ساتھ کام کاج میں حصہ لیتے۔ غزوۂ بدر میں سواریوں کی کمی تھی۔ آپؐ کے حصہ کے اونٹ میں حضرت مرثد ؓ بن ابی مرثد غنوی شامل تھے۔ آپؐ صرف اپنی باری پر سوار ہوتے۔ کہنے کے باوجود آپ ﷺ خود بھی اپنی باری پر پیدل چلتے (۹)۔

جنگ خندق سے پہلے سے پہلے آپ ﷺ نے بھی صحابہ کرام ؓ کے ساتھ مل کر خندق کھودی۔

حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں: "رأیت النبی ﷺ یوم الاحزاب ینقل التراب وقد واری التراب بیاض بطنہ" (۱۰) (میں نے رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ احزاب کے موقع پر دیکھا کہ آپ ﷺ مٹی (خندق کھودنے کی وجہ سے جو نکلتی تھی) خود لا رہے تھے۔ مٹی سے آپؐ کے پیٹ کی سفیدی چھپ گئی تھی)۔

دورانِ جنگ پیش آنے والی مشکلات اور تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے تھے اور اپنے اصحاب کے ساتھ برابری کا معاملہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ جنگ خندق میں خوراک کی کمی کی وجہ سے صحابہ ؓ کو فاقہ کشی کرنا پڑتی تھی۔ سخت بھوک کی وجہ سے صحابہ کرام ؓ پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ ایک دفعہ بھوک کی شدت کی وجہ سے صحابہ کرام ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیٹ کھولا تو ایک ایک پتھر تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے پیٹ پر دو پتھر تھے۔

سپہ سالار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں حکمت اور دانائی ہو اور معاملات کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی صلاحیت ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر میں جس جگہ کا انتخاب فرمایا وہ بڑی حکمت سے فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے ریتلی زمین کو پسند فرمایا۔ اگلے دن بارش ہوئی۔ مسلمانوں کی جانب والی زمین جم گئی کفار کی جگہ پر پھسلن تھی (۱۱)۔

غزوۂ اُحد میں آپ ﷺ نے کمال حکمت سے صفوں کو مرتب فرمایا۔ درہ پر ۵۰ صحابہ کی ڈیوٹی لگائی اور حکم دیا کہ خواہ فتح ہو یا شکست آپ اس جگہ کو نہ چھوڑیں۔ آپ ﷺ کے اس حکم کی عدم تعمیل کی وجہ سے دشمن کو ایک دفعہ فتح حاصل ہوئی جو بعد میں آپ ﷺ کی حکمت عملی سے ہی ان کی شکست میں تبدیل ہوئی (۱۲)

صلح کرنے اور جنگ ختم کرنے کی تعلیم:

سپہ سالارِ اعظم ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ دشمن اگر صلح کرنا چاہے تو صلح کر لینی چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (۱۳) (اگر وہ صلح کی طرف راغب ہوں تو آپ بھی ان سے صلح کر لیں)۔

ہادی اعظم ﷺ کا عمل بھی اسی تعلیم کے تحت رہا چنانچہ جب کبھی دشمن نے صلح کی خواہش کی تو رسول اللہ ﷺ اس طرف مائل ہو گئے۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ آپ ﷺ کی حکمت کا عجیب شاہکار تھی۔ آپ ﷺ نے بعض ایسی شرائط منظور فرمائیں جو مسلمانوں کے لیے ظاہری طور پر بہت نقصان دہ معلوم ہوتی تھیں۔ صلح کی بجائے تصادم کی صورت میں کتنی ہی جانیں ضائع ہو جاتیں (۱۴)۔

آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملیاں:

جنگی حکمت عملیوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے انتہائی نا مساعد حالات اور فوجی طاقت وقوت کی قلت کے باوجود دشمن کی کثیر تعداد پر غلبہ حاصل کیا۔ آپ ﷺ دشمن کی ہر حرکت اور سرگرمی پر نظر رکھتے تھے۔ جہاں کہیں دشمن کی حرکت کی اطلاع ملتی حضور اقدس چھوٹے چھوٹے لشکر ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کر دیتے۔ ان سفروں کی وجہ سے ایک طرف جہاں فوج کی تربیت ہوتی رہتی وہاں دوسری طرف ماتحت افسروں اور جوانوں کو جغرافیائی معلومات حاصل ہوتیں اور موسمیاتی اثرات کے مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہوتی رہتی تھی۔ مزید برآں کمانڈروں میں خود اعتمادی پیدا ہونے کے علاوہ مملکت مدینہ کی واقعی اور قانونی حدود کا تعین ہوتا رہتا تھا۔ ان مہموں کے ذریعے مملکت کی حدود میں اضافہ بھی ہوتا رہا اور مختلف قبائل اس کے ساتھ دفاعی یا غیر جانب داری کے معاہدوں کے ذریعے منسلک بھی ہوتے رہے۔ جہاں تک عین لڑائی کا تعلق تھا۔ آپ ﷺ آغاز مدافعانہ کارروائی سے کرتے مگر آپ ﷺ ''مکمل دفاع'' کے ہرگز قائل نہ تھے۔ جونہی حملہ آور کے ابتدائی حملے کی شدت ختم ہوتی محسوس ہوتی آپ ﷺ اپنی فوج کو جوابی حملے کا حکم دے دیتے۔ عالمِ انسانیت کے کامیاب ترین سپہ سالاروں کی طرح بلکہ اس سے بدرجہا بہتر طور پر آپ کو لڑائی کے پیچ وخم پر عبور حاصل تھا بلکہ دنیا کے بہت کم سپہ سالار ایسے ہیں جنھوں نے لڑائی کے دوران لڑائی کے زیر و بم پر اس قدر مکمل قابو رکھا ہو کہ جس طرح اور جس طرف چاہا اس کا رُخ موڑ دیا (۱۵)۔

حضور اقدس ﷺ کے غزوات کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کثرتِ افراد کے ذریعے سے نہیں لڑی جاتی اور نہ کثرت وسائل سے بلکہ جنگ انسانوں کی قوت ارادی، ہتھیاروں اور وسائل کے صحیح استعمال پر منحصر ہوا کرتی ہے اور حضور ﷺ نے یہ مثال قائم کی ہے کہ ملت کی

تمام تر روحانی اور مادی قوتوں کو یکجا کر کے اُنھیں جنگ کو کامیاب طور پر لڑنے کے لیے استوار کر دیا تھا۔ دنیا نے حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے میں صدیاں لگا دیں مگر چونکہ ایمان ویقین اور تقویٰ کا عنصر شامل نہ تھا اس لیے جنگ میں اکیسویں صدی کے وسائل کے باوجود ان میں طرح طرح کی خامیاں رہ گئیں۔ جہاں جنگ میں قوم کی پوری مادی اور افرادی طاقت لگا دی وہاں ایمان وایقان کی کمی اور تقویٰ کے فقدان کی وجہ سے ظلم وتشدد کی طرف ہاتھ بڑھ گئے۔ اس ظلم وتشدد نے دشمن کے ارادوں کو مزید تقویت دی اور یوں جیتے ہوئے میدان ہاتھوں سے نکل گئے۔ آج اگر کوئی فتح چاہتا ہے تو حضور ﷺ کی اس حکمت عملی پر بھی اس کو عمل کرنا ہوگا (۱۶)۔

غیر اہلِ قتال اور اہلِ قتال میں فرق:

غیر اہلِ قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، مجنون، خانقاہ نشین، زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ ایک مرتبہ میدان جنگ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کی لاش پڑی دیکھی تو ناراض ہو کر فرمایا: "**ما كانت هذه تقاتل فيمن يقاتل**" (۱۷) (یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی) پھر اپنے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا: "**لا تقتلن امرأة و لا عسيفاً**" (۱۸) (عورت اور اجیر کو ہرگز قتل نہ کرو)۔

اہلِ قتال وہ لوگ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں یا عقلاً وعرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد۔

غیر اہلِ قتال کے حقوق:

آپ ﷺ کے طرزِ عمل سے استشہاد:

نبی اکرم ﷺ نے بلاوجہ کسی پر جنگ مسلط نہیں کی بلکہ آپ ﷺ کے طرزِ عمل سے ہمیں ان صورتوں کا پتہ چلتا ہے جب قتال فی سبیل اللہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں آپ ﷺ نے غیر اہلِ قتال کے لیے درج ذیل ہدایات جاری فرمائیں:

’’قیام اس جگہ کرنا جہاں بستی والوں کو تمھاری وجہ سے تکلیف نہ ہو، جو مقابلہ پر آئے صرف اس سے لڑنا۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہرگز تلوار نہ اٹھانا، گوشہ نشینوں عبادت خانوں میں بیٹھنے والوں کو بھی نہ چھیڑنا جو امان مانگیں انھیں امان دینا، باغوں اور کھیتوں کو خراب نہ کرنا۔ جب وہ زکاۃ اور صدقات دیں تو ان کے باقی مال سے تعرض نہ کریں۔ ان کے زکاۃ اور صدقات کو انھی کے امراء سے لے کر غرباء میں تقسیم کر دیں (۱۹)۔

اصلاحات:

جو قوم اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے جان لینے اور دینے کا اقدام کرے اس سے یہ توقع بھی ہونی چاہیے کہ میدانِ جنگ میں اس کا طرزِ عمل ان اقوام سے مختلف ہوگا جو اخلاقی مقاصد کے بجائے تجارتی یا مملکتی مقاصد کے لیے میدان میں اترتی ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنی پیش رو اور ہم عصر دنیا کے جنگ کے طریقوں میں بنیادی اور دوررس اصلاحات کیں اور آنے والی دُنیا کے لیے راستہ ہموار کر دیا مثلاً آپ ﷺ نے قدیم جنگی طریقوں کے ایسے پہلوؤں کو یک قلم منسوخ کر دیا جو سرتا سر غیر منصفانہ اور نقصان دہ تھے۔

اس میں درج ذیل اصلاحات شامل ہیں:

۱: بوڑھوں، عورتوں، بچوں، معذوروں، گوشہ نشین راہبوں اور ان لوگوں کو جو کسی اور وجہ سے جنگ میں حصّہ لینے کے قابل نہ ہوں قتل کرنا منع ہے۔ اسی اصول کے مطابق ایٹم بم کے ذریعے ہیروشیما کی تباہی نہ صرف حرام بلکہ قابلِ تعزیر ہے۔

۲: تمام عبادت گاہیں قانوناً جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہیں۔

۳: مقتول دشمن کا چہرہ بگاڑنا یا اس کے اعضاء کاٹنا ممنوع ہے۔

۴: عہد کی پابندی مسلمان پر لازم ہے اور کسی بھی مصلحت کسی بھی بہانے اور کسی بھی چال سے عہد سے روگردانی جائز نہیں۔

۵: اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کی ممانعت ہے، حکم ہے کہ ان کے ساتھ انتہا درجے ملائمت اور نرمی کا سلوک کیا جائے۔

اس دور کے معاشرتی حالات کے پیش نظر بعض جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنائے بنا چارہ نہ تھا۔ سپہ سالارِ اعظم ﷺ نے جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اس معاملہ کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی اور اس عمل کے نقصان دہ اور غیر منصفانہ پہلو ختم کر دیے۔ آپ ﷺ نے غلاموں کے حقوق متعین فرمائے۔ چنانچہ قانون ہے:

۱: غلام کو اپنی آزادی آپ خریدنے کا حق دیا جائے۔

۲: آقا اور غلام کی خوراک، لباس اور رہائش گاہ میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔

۳: غلام کی ذہنی آزادی کا احترام کیا جائے اور اگر وہ جوہرِ قابل ہے تو اس کی تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا جائے۔

۴: غلام کی جان، مال اور آبرو قانون کی نظروں میں آقا کی جان، مال اور آبرو کے برابر ہے اور قانون ان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

۵: غلام کو شادی کرنے اور اپنی انفرادی معاشرتی زندگی گزارنے کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔

۶: اپنے غلام کو آزاد کرنا یا کسی دوسرے سے غلام کو خرید کر آزاد کرنا اسلام میں بہترین نیکی قرار دیا گیا اور کئی گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ غلام آزاد کرنے سے ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مالِ غنیمت کے بارے حکم صرف اس مال پر لگے گا جو جنگ کے نتیجے میں مخالفین جنگ سے حاصل ہو۔ غیر فوجی پُرامن آبادیوں کا مال اس میں شامل نہیں۔ الغرض آپ ﷺ نے بطور سپہ سالار محض لڑائی کی قیادت نہ فرمائی بلکہ اسے بھی ایک فلاحی عمل بنا دیا جس میں پُرامن رہنے والے کو تکلیف نہ ہو اور دشمن پر بھی ظلم نہ ہو (۲۰)۔

اسبابِ قتال:

سیرتِ طیبہ سے ہمیں درج ذیل تین قسم کے اسبابِ قتال کا پتہ چلتا ہے:

۱: جب کفار یا دشمنانِ اسلام دارالاسلام پر حملہ کر کے مسلمانوں کا استیصال کرنے کے درپے ہو جائیں جیسا کہ غزوۂ بدر، اُحد اور احزاب میں ہوا۔

۲: جب دارالکفر میں رہنے والے مظلوم اور مجبور مسلمان یا ان کے حلیف دارالاسلام کے رہنے

والے آزاد مسلمانوں کی مدد کے طالب ہوں جیسے فتح مکہ سے قبل بنوخزاعہ نے قریش کے ظلم کی داستان مدینہ منورہ جاکر سنائی۔

۳: جب کوئی حکومت یا معاشرہ اپنے ماتحت یا زیرِ اثر باشندوں پر جبر یا دوسرے حیلوں سے طلبِ حق کے راستے مسدود کر دے اور ایسے حالات پیدا کر دے کہ اگر اس کے باشندے چاہیں تب بھی ان تک اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آواز نہ پہنچ سکے (۲۱)۔

اہلِ قتال کے حقوق:

سیرت النبی ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ قتال وہ ہیں جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بھی کچھ حدود ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز:

اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً آخر شب میں جب کہ لوگ بے خبر سوتے تھے اچانک جا پڑتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے کو ختم کر دیا اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**کان رسول اللہ ﷺ اذا غزا قوماً لم یغر حتی یصبح**" (۲۲) (آنحضرت ﷺ جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے)۔

۲۔ آگ سے جلانے کی ممانعت:

حضور ﷺ سے پہلے لوگ شدت انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دیا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "**لا ینبغی ان یعذب بالنّار الارب النّار**" (۲۳) (آگ کا عذاب دینا سوائے آگ پیدا کرنے والے کے کسی اور کو سزاوار نہیں)۔

۳۔ قتلِ صبر (باندھ کر مارنے) کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر مارنے کی بھی ممانعت

فرمائی۔عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ ہم عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ پر گئے تھے۔ایک موقع پر ان کے پاس لشکر اعداء میں سے چار آتش پرست پکڑے ہوئے آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ انھیں باندھ کر قتل کر دیا جائے۔اس کی اطلاع جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انھوں نے کہا:

''سمعت رسول اللہ ﷺ ینھی عن قتل الصّبر فوالّذی نفسی بیدہ لو کانت الدّجاجۃ ما صبرتُھا فبلغ ذلك عبدالرّحمن بن خالد بن ولید فأعتق أربع رقاب'' (۲۴)

(میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے قتل صبر (باندھ کر مارنے) سے منع فرمایا ہے۔خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اس کو باندھ کر اس طرح نہ مارتا اس کی خبر جب عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو پہنچی تو انھوں نے چار غلام آزاد کر دیے (یعنی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کیا)۔

۴۔ لوٹ مار کی ممانعت:

ایک دفعہ سفر جہاد میں اہلِ لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے آکر دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا:'' ان النّھبۃ لیست بأحل من المیتۃ'' (۲۵) (لوٹ کھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں)۔

عبداللہ بن یزید الانصاری رضی اللہ عنہ نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا۔ان کا بیان ہے: ''نھی النبی عن النّھبۃ والمثلۃ'' (رسول اللہ ﷺ نے لوٹ کھسوٹ اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا) (۲۶)۔

۵۔ تباہ کاری کی ممانعت:

جب فوجیں کسی علاقے پر چڑھائی کرتی ہیں تو فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل اور آتش زنی ان کے معمولات میں سے ہوتا ہے مگر اسلام اس کو فساد سے تعبیر کرتا ہے، سختی کے ساتھ اس سے منع کرتا ہے اور اسے ناجائز قرار دیتا ہے۔قرآن مجید میں ہے: ﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (۲۷) (جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے مگر اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا)۔

۶۔ مثلہ کی ممانعت:

دشمن کی لاشوں کو بے حرمت کرنے اور ان کے اعضاء کی قطع و برید کرنے کو بھی اسلام نے سختی سے منع کیا ہے: "عن عبداللہ بن یزید الانصاری قال: نهی رسول اللہ عن النّهبة والمثلة" (۲۸) (عبداللہ بن یزید الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے لوٹ کے مال اور مثلہ (قطع اعضاء) سے منع فرمایا ہے)۔

نبی کریم ﷺ فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیا کرتے تھے ان میں تاکید فرماتے: "ولا تغدروا ولا تغلّوا ولا تمثّلوا" (بدعہدی نہ کرنا، غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور مثلہ نہ کرنا) (۲۹)۔

۷۔ قتلِ اسیر کی ممانعت:

اسیروں کو قتل کرنا انتقامی کارروائی کا ایک حصہ تھا۔ رسول اللہ نے قتل اسیر سے منع فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ جب شہر میں داخل ہونے لگے تو فوج میں اعلان کرا دیا تھا: "لا تجهزن علی جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیر ومن اغلق بابه فهو آمن" (۳۰) (کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ امان میں ہے)۔

۸۔ قتلِ سفیر کی ممانعت:

سفراء اور قاصدوں کے قتل سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا۔ مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لو لا ان الرّسل لا تقتل لضربتُ عنقك" (۳۱) (اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا)۔

اسی سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کوئی شخص اگر اسلامی سرحد پر پہنچ کر یہ بیان دے کہ وہ فلاں حکومت کا سفیر ہے تو اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ اِلّا یہ کہ وہ اپنا سفیر ہونا ثابت نہ کر سکے (۳۲)

۹۔ بدعہدی کی ممانعت:

بدعہدی بدترین جرم ہے، غدر نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار احادیث آئی ہیں جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے: "عن عبداللہ بن

عمرو قال قال رسول اللہ من قتل معاهداً لم یرح رائحة الجنّة وانِ ریحها لیوجد من مسیرة اربعین عاما" (۳۳)(حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرو سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہوگی حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے)۔

۱۰۔ بدنظمی وانتشار کی ممانعت:

اہلِ عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے اور جب کسی جگہ اترتے تو ساری زمین پر پھیل جاتے، یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہوجاتا تھا۔ داعیٔ اسلام ﷺ نے اس کی بھی ممانعت کردی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ جہاد کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو آپ ﷺ کے پاس شکایت آئی کہ فوج میں عہد جاہلیت کی سی بدنظمی ہے اور لوگوں نے تنگ کر رکھا ہے، اس پر آپ ﷺ نے منادی کرائی: "أن من ضیق منزلا اوقطع طریقاً فلا جهاد له "(۳۴)(جو کوئی منزل کو تنگ کرے گا یا راہ گیروں کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہوگا)۔

۱۱۔ شور وہنگامہ کی ممانعت:

عرب کی جنگ میں اس قدر شور وہنگامہ برپا ہوتا کہ اس کا نام ہی "دغی" پڑ گیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ برتنا چاہا مگر ہادیٔ اسلام ﷺ نے اس کی اجازت نہ دی۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: "کنّا مع رسول اللہ فکنّا اذا اشرفنا علی وادِ هلّلنا وکبّرنا ارتفعت اصواتنا فقال النبیّ ﷺ: یایها النّاس اربعوا علٰی انفسکم فانّکم لا تدعون اصمّ ولا غائباً انّه معکم انّه سمیع قریب" (۳۵)(ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تو زور وشور سے تکبیر وتہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ لوگو وقار کے ساتھ چلو۔ تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تو تمھارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت قریب ہے)۔

۱۲۔ وحشیانہ اعمال کے خلاف عام ہدایات:

فوجوں کے نظم وضبط کے ساتھ انھیں شائستہ رہنے کی ہدایات کا سلسلہ بھی نبی امی ﷺ کا ایجاد

کردہ ہے۔مغربی دنیا تو انیسویں صدی کے وسط تک اس طریق سے نا آشنا تھی۔داعیٔ اسلام ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ ﷺ کبھی کسی سردار کو جنگ پر بھیجتے تو اسے اور اس کی فوج کو پہلے تقویٰ اور خوف خدا کی نصیحت کرتے پھر فرماتے:"اغزوا بسم اللہ وفی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولا تغدروا ولا تغلّوا ولا تمثّلوا ولا تقتلوا ولیداً" (۳۶) (جاؤ اللہ کا نام لے کر اور اللہ کی راہ میں لڑو ان لوگوں سے جو اللہ سے کفر کرتے ہیں مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو اور کسی بچے کو قتل نہ کرو)۔

جدید حربی قیادت کے لیے اسوۂ رسول ﷺ:

عصرِ حاضر میں حربی مصادر و مراجع میں سپہ سالار کے لیے کئی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ماہرین جنگ نے چند ایسی صفات کا تذکرہ کیا ہے جن کے بغیر کوئی شخصیت حربی قیادت کے بلند مقام پر فائز نہیں ہو سکتی۔ان میں سے درج ذیل اہم ہیں:

۱۔ جنگ میں جدید حکمتِ عملی۔

۲۔ دشمن کی ناکہ بندی اور اقتصادی دباؤ۔

۳۔ عزم کا پختہ اور ارادے کا پکا ہونا۔

۴۔ دل کا صاف اور بغض و کینہ سے پاک۔

۵۔ طبعاً شریف اور نیک نہاد۔

۶۔ جسمانی اعتبار سے قوی اور مضبوط۔

۷۔ زیادہ سے زیادہ شجاعت و دلیری۔

۸۔ فوری طور پر صحیح اور واضح احکام کے اجراء و نفاذ کی صلاحیت۔

۹۔ نہایت آسانی کے ساتھ مسئولیت کا متحمل ہو سکتا ہو۔

۱۰۔ اسبابِ جنگ اور ان کے متعلقات سے پوری طرح سے آگاہ ہو۔

۱۱۔ فتح و شکست ہر حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے اور حد سے باہر نہ نکلے۔

۱۲۔ حد درجہ دور اندیش اور صاحبِ فکر ہو۔

۱۳۔ فوجی افسروں اور سپاہیوں کی نفسیات اور استعداد و اہلیت سے بدرجہ اتم واقفیت رکھتا ہو۔

۱۴۔ اسے فوج پر کامل اعتماد ہو اور فوج کو اس پر کامل بھروسا ہو۔

۱۵۔ فوج اور سالار کے مابین محبت و خلوص کا رشتہ ہو۔

۱۶۔ اقدارِ انسانی کو مضبوط رکھتا ہو۔

مندرجہ بالا تمام مثالی صفات آپ ﷺ کے خصائص کے مقابلے میں بہت قلیل ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایسی صفات سے متصف ہے جن کے بارے میں جنگی کتابیں اشارہ تک نہیں کرتیں۔ وہ صفات صرف آپ ﷺ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اور کوئی دیگر شخصیت اس بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ذیل میں ہم آپ ﷺ کی بعض اُن صفات کا تذکرہ کرتے ہیں جو آپ ﷺ کی حربی حکمت عملی سے ہمیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ امیر لشکر کی حکمتِ عملی:

بدر کی جنگ میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ ؓ کی صف بندی کا خاکہ رات ہی تیار کر لیا تھا میدان کی صورتِ حال اور اپنی افرادی قوت کی کمی کے باوجود آپ ﷺ نے صف بندی کا وہ طریقہ اپنایا جو عربوں نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں کے ساتھ رہنے والے ایرانی اور رومی جس طریقے سے لڑائی کے میدان میں اپنی سپاہ کو ترتیب دیتے تھے، آپ ﷺ نے مکمل طور پر وہ طریقہ بھی نہیں اپنایا۔ اپنی سپاہ کو میدانِ جنگ میں ترتیب دینے اور لڑائی میں اس کی راہنمائی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو طریقہ اپنایا وہ کوئی ایسا کمانڈر ہی اپنا سکتا تھا جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا پورا یقین ہو اور اس مدد پر بھروسا بھی ہو ایسے کمانڈر اللہ کے رسول ﷺ ہی ہو سکتے تھے (۳۷)۔

۲۔ دشمن کی ناکہ بندی اور اقتصادی دباؤ:

حضور ﷺ نے مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے برق رفتار دستے مدینہ اور مکہ کے درمیانی علاقوں میں بھیجنے شروع کیے۔ جب اہلِ مکہ کے ساتھ اعصابی جنگ کا دور تھا تلوار کی جنگ نہ چھڑی تھی، ان عقابوں کا مقصد قریش کے تجارتی قافلوں پر ہی نہیں بلکہ اُن کے گھروں میں بھی ہراس پھیلانا تھا۔ اسلامی دستوں کی پیہم نقل و حرکت کے سامنے دشمن کے اعصاب آہستہ آہستہ

جواب دینے لگے۔

جنگِ بدر کے بعد قریش پر شام کی شاہراہ بند ہو گئی جو مدینہ کے قریب سے گزرتی تھی۔ قریش نے اب عراق کی راہ سے شام کے ساتھ تجارت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہا، لیکن اسلامی جانبازوں نے ان پر یہ راہ بھی بند کر دی۔ فتح مکہ تک قریش تین اطراف سے ناکہ بندی کے حصار میں تھے۔ اس صورتِ حال نے ان پر کسبِ معاش کا دائرہ تنگ کر دیا۔ انھوں نے تکبر میں آ کر خندق تک کی جنگوں میں اپنا کثیر سرمایہ جھونک دیا تھا اور اب افلاس میں گرفتار تھے۔ اسی اثنا میں بنوحنیفہ کا سردار ثمامہ بن اُثال جنگ خیبر کے بعد اسلام لے آیا اور قریش پر غلہ بند کر دیا۔ قریش مدت سے قحط سالی میں مبتلا تھے۔ اب اس نوبت کو پہنچے کہ مردار جانوروں کی گلی سڑی لاشیں بھی کھانے لگے۔ ابوسفیان مدینہ جا کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپؐ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ نے غربائے قریش کے لیے پانچ سو دینار نقد مرحمت فرمائے اور ابوسفیان کو کھجور کا تحفہ دیا۔ ثمامہ رضی اللہ عنہ بن اُثال کو آپ ﷺ نے فرمان لکھا: ''قریش کا غلہ مت روکو''۔ قریش کی طرف سے یہ پہلا اور برملا اعتراف شکست تھا (۳۸)۔

۳۔ عزمِ راسخ و ارادۂ محکم:

داعیٔ اعظم ﷺ نے تنِ تنہا مشرکین و منافقین کے غیظ و غضب اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔ نزولِ وحی سے لے کر آخری دم تک آپ ﷺ نے ذرا بھر بھی متزلزل نہ ہوئے۔ آپ ﷺ کے قویٰ اور مضبوط ارادے نے خوفناک سے خوفناک صورت حال پر بھی قابو پا لیا۔ آپ نے اعراض، تکذیب، مصائب اور خطرات کو صبر سے برداشت کیا۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں اذیتوں اور تکلیفوں کا سامنا کیا (۳۹)۔

یہ آپ ﷺ کا عزم راسخ ہی تھا جس سے آپ ﷺ نے مدینہ کے اندر یہودیوں اور منافقوں کی ریشہ دوانیوں کو ختم کیا اور مدینے سے باہر اسلام کے بدترین دشمنوں مشرکینِ مکہ کی قوت کو توڑا۔ آپ ﷺ تمام نامساعد حالات میں ثابت قدم رہے۔ گرد و پیش کی تمام قوتوں سے مقابلہ جاری رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو غالب کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ دشمنوں کی بے اندازہ فوجی قوت کو کبھی خاطر میں نہ لائے اور نہ کبھی اپنا ارادہ بدلا۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی عزمِ راسخ کی بہترین مثال ہے۔

ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ ﷡ نے کفار کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر خدمت اقدس میں عرض کیا کہ آپ ﷺ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا: "لقد کان من قبلکم لیمشط بمشاط الحدید ما دون عظامه من لحمٍ او عصبٍ ما یصرفه ذلك عن دینه ویوضع المنشارُ علی مفرق رأسه فیشقّ باثنین ما یصرفه ذلك عن دینه ولیتمنّ الله هذا الامر حتی یسیرا الرّاکب من صنعاء الی حضر موت ما یخاف الاّ الله" (۴۰) (تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست سب علیحدہ ہو جاتا لیکن یہ چیز انھیں اپنے دین سے برگشتہ نہ کر سکی اور ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا لیکن یہ آزمائش بھی انھیں اپنے دین سے باز نہ رکھ سکی۔ خدا کی قسم دینِ اسلام اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا جائے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا)۔

۴۔ امیر لشکر کی ذاتی شجاعت:

سپہ سالار کی ذاتی شجاعت بہت سے مواقع پر فیصلہ کُن کردار ادا کرتی ہے۔ ہادیٔ برحق ﷺ کی بے مثال جرأت و شجاعت نے کئی مرتبہ میدانِ جنگ کے نقشے بدلے ہیں۔ آپ ﷺ کی شجاعت کا اظہار کئی جنگی و غیر جنگی واقعات و احکام سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ ﷺ کا معرکۂ بدر کو قبول کر لینا ایک عجیب طرح کی شجاعت ہے کیونکہ آپ ﷺ کی فوج دشمن کی فوج سے دو حصے کم تھی۔ خدانخواستہ مسلمان اس لڑائی میں شکست کھا جاتے تو اس کا اثر اسلام کے مستقبل پر فیصلہ کُن ہوتا اور خطرے کا باعث بنتا (۴۱)۔

غزوۂ احزاب میں آپ ﷺ کا قریش کے دس ہزار کے لشکر کے سامنے ثابت قدم رہنا بھی آپ ﷺ کی ذاتی شجاعت کا مظہر ہے۔ یہودیوں نے اپنے معاہدے توڑ دیے تھے اور بیرونی و اندرونی خطرات مسلمانوں کے لشکر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے (۴۲)۔

ایک اور مثال جس سے آپ ﷺ کی ذاتی شجاعت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اُبی بن خلف آپ ﷺ کا سخت دشمن تھا۔ بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا کہ میرے پاس گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز جوار کھلایا کرتا ہوں۔ اس پر چڑھ کر (معاذ اللہ) محمد ﷺ کو قتل کروں گا۔ میدانِ اُحد میں

اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو روک لیں۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپ ﷺ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھو دی وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا سچ ہے لیکن یہ محمد ﷺ کے ہاتھ کا زخم ہے (۴۳)۔

۵۔ واضح اور فوری احکام:

سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسب ضرورت فوراً احکام صادر کرے تاکہ انھی احکام کی بنا پر اپنی پالیسی استوار کر سکے اور گھمسان کی جنگ میں وہ اسی پالیسی کے مطابق عمل کر سکے۔ احکام کے صحیح اور صریح ہونے کا انحصار دو امور پر ہے۔

ا: سپہ سالار کی عقلی قابلیت وبصیرت۔

۲: معلومات کا حصول۔

ا: سپہ سالار کی عقلی قابلیت وبصیرت:

دنیا کا کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کی عقلی قابلیت اور بصیرت کا منکر نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بشارت سنا کر مائل کیا، انجامِ بد سے آگاہ کیا، ناپسندیدہ کاموں کی ممانعت کی، بڑے بڑے دانشور وعقلاء سے بحثیں کیں اور ایک امت کو تیار کیا اور کیا یہ سب باتیں ایک زبردست اور بے مثال عقل کے بغیر ممکن ہیں۔ آپ ﷺ کی بصیرت اور عقل مندی کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ حربی عمل میں جس کام کے لیے جو آدمی موزوں ہوتا اسی کو منتخب فرماتے اور جس موقع پر جو طریقِ کار مناسب ہوتا اختیار فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے صفوں کو جس طرح ترتیب دیا (۴۴)۔ وہ آپ کی عقل مندی اور بصیرت کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ اُحد میں تیر اندازوں کو جس جگہ متعین فرمایا وہ آپ ؐ کی حسنِ تدبیر کی عمدہ مثال ہے اور آپ ﷺ کی بصیرت کا کھلا ثبوت ہے (۴۵)۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو مکہ کے پہاڑ کی کسی تنگ جگہ پر کھڑا کیا جائے یہاں تک کہ مسلمانوں کے تمام لشکر ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر جائیں تاکہ وہ جا کر اپنی

قوم کو چشم دید حالات سے آگاہ کر سکے اور جو کچھ بیان کرے وہ دلیل اور یقین کی بنا پر بیان کرے (۴۶)۔

۲: معلومات کا حصول:

آپ ﷺ مختلف طریقوں سے معلومات حاصل کرتے تھے:

۱: جنگی طلایہ گرد دستوں کے ذریعے۔ ۲: جاسوسوں کے واسطہ سے۔

۳: شخصی اطلاعات سے۔ ۴: قیدیوں سے۔

۵: عقل مند لوگوں کے مشورے کے ذریعے۔

مثال کے طور پر بدرِ کبریٰ سے پہلے آپؐ کی تمام مہموں کا ایک مقصد معلومات کا حاصل کرنا بھی تھا۔ مدینہ کے گرد کا علاقہ مکہ تک جانے والے راستوں کا علم اور اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔ بدرِ کبریٰ کے معرکے میں آپؐ نے ابوسفیان کے قافلے کی واپسی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے دستہ بھیجا (۴۷)۔ اپنی فوج کا ایک دستہ بدر میں جانے سے قبل اس علاقے کی معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا پھر دو دستے اپنی فوجوں کے بدر پہنچنے سے قبل روانہ فرمائے بلکہ رسول اللہ ﷺ خود بھی شخصی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے باہر نکل گئے اور قریش کی طاقت اور ان کی فوجوں کے پڑاؤ کے حالات لے کر واپس لوٹے (۴۸)۔ اسی طرح آپ نے ان دو قیدیوں سے بھی معلومات حاصل کیں جنھیں ایک طلایہ گرد دستہ گرفتار کر کے بدر کی جنگ سے پہلے لے آیا تھا (۴۹)۔

۶۔ مسئولیت کا تحمل:

جرنیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں کی مسئولیت کا بوجھ اٹھائے۔ مسلمانوں میں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام جنگی و غیر جنگی اعمال میں عظیم ذمہ داری کو برداشت کر سکتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے اعمال و احکام اتنے عظیم تھے کہ انھوں نے تاریخ کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری ابتدائے وحی سے لے کر آخر تک نبھائی۔ مثلاً سریہ عبداللہ بن جحشؓ میں آپ ﷺ کی ہدایت کے برعکس ایک آدمی قتل ہو جاتا ہے تو آپ ﷺ اس کا خون بہا ادا کرتے ہیں (۵۰)

الغرض یہ کہ ہادیٔ برحق ﷺ تمام معاملات کی ذمہ داری قبول فرماتے۔ وہ معاملات جن کا

فیصلہ آپ ﷺ نے کیا اور وہ بھی جن کا مشورہ صحابہ ؓ نے دیا۔

۷۔ استقلالِ مزاج:

آپ ﷺ کی طبیعت میں قدرتی طمانیت تھی۔ آپ ﷺ کو اپنے اعصاب پر بہت قابو حاصل تھا۔ آپ ﷺ کی طبیعت میں فتح و شکست دونوں حالتوں میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ غزوۂ اُحد میں جب مشرکین نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس وقت آپ ﷺ نے حواس پر قابو برقرار رکھا اور مسلمانوں کی کشتی کو سلامتی سے ساحل عافیت سے جا لگایا (۵۱)۔

غزوۂ خندق کے موقع پر بھی اسی طرح کی کیفیت کا مظاہرہ کیا۔ یہودیوں کی غداری نے صورتِ حال کو اور خراب کر دیا تھا۔ مگر آپ ﷺ اپنے حواس پر غالب رہے۔ لشکروں کا مقابلہ کیا اور یہود کا خاتمہ کیا (۵۲)

۸۔ دور اندیشی:

سپہ سالار کی دُور اندیشی اس کی حربی صلاحیتوں کی حقیقی بنیاد ہے۔ مساعد و نا مساعد حالات کا صحیح احساس اور ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی استعداد بہم پہنچانا بہت ضروری ہے۔ ہادی اعظم ﷺ تمام کاموں میں خواہ جنگی ہوں یا غیر جنگی دور اندیشی کی خوبی سے آراستہ تھے اور اس کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ اُن کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ ؓ کے تردد کو نظر انداز کرتے ہوئے صلح حدیبیہ کی شرائط قبول کر لینے پر اصرار کیا کیونکہ آپ ﷺ نے اس صلح کی شرائط کو بغور دیکھا اور اپنی روشن رائے سے معلوم کر لیا کہ ان شرائط کو قبول کر لینا مسلمانوں کی فتح ہے اور یہ شرائط مسلمانوں کے لیے مفید رہیں گی۔ پھر اس امر کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح مکہ میں مسلمانوں کے لشکر کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی (۵۳)۔

فتح مکہ سے قبل کے حالات بتا رہے تھے کہ قریش ہتھیار ڈال دیں گے لیکن اس کے باوجود آنحضور ﷺ نے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تدابیر سوچ رکھی تھیں۔ آپ ﷺ نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا جو مکہ میں چاروں طرف سے داخل ہوئے تھے (۵۴)۔

۹۔ نفسیات اور صلاحیتوں کی معرفت:

رسول اللہ ﷺ اپنے رفقاء کی نفسیات اور اُن کی صلاحیتوں کے متعلق معرفتِ تامہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آپ ﷺ انھی میں ایک فرد کی طرح زندگی گزارتے تھے، اور رنج و راحت میں ان کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ آپ ﷺ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی خوبیاں اور کمالات پہچانتے تھے اور ہر آدمی کو اسی کام پر متعین فرماتے جسے انجام دینے کی صلاحیت اس میں موجود ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم ان مہمات کو بآسانی سرانجام دیتے۔ غزوۂ بدر سے پہلے سرایا کے لیے جن لوگوں کو منتخب فرمایا انھوں نے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا (۵۵)۔

آپ ﷺ نے جن لوگوں کے ذمہ معلومات حاصل کرنے کی خدمت سپرد کی انھوں نے اسے پورا کیا جس کو والی بنایا اس نے اپنے فرائض کو کما حقہ ادا کیا (۵۶)۔

رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے دن ایک تلوار ہاتھ میں پکڑی اور فرمایا: "من یاخذ ھذا السیف بحقه" (۵۷) (اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ کون پکڑے گا)۔

کئی آدمی آپ ﷺ کی طرف بڑھے۔ آپ ﷺ نے تلوار کسی کو نہ دی یہاں تک کہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا: "وما حقه یا رسول اللہ" (۵۸) (یا رسول اللہ ﷺ اس تلوار کا کیا حق ہے)۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "ان تضرب به العدو حتی ینحنی" (۵۹) (تو دشمن پر اتنی ضربیں لگا کہ تلوار ٹیڑھی ہو جائے)۔

ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اس تلوار سے نہایت شدید لڑائی کی۔ جب مسلمان محاصرے میں آ گئے تو ابو دجانہ نے اپنے جسم کو رسول اللہ ﷺ کے لیے ڈھال بنا دیا۔ اپنی پیٹھ آپ ﷺ پر جھکا دی اور تیر پر تیر برستے رہے۔

۱۰۔ باہمی اعتماد:

سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا اس پر کامل اعتماد ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر پورا بھروسا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتماد تھا۔ اس کے لیے ہم حدیبیہ، بدر اور اُحد بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ دوطرفہ محبت:

صحابہ ؓ اور آپ ﷺ کے درمیان اعتماد کے ساتھ ساتھ باہمی محبت بہت زیادہ تھی اور صحابہ کرام ؓ کے لیے یہ محبت ایمان کا درجہ رکھتی تھی اور اگر یہ محبت دین نہ بھی ہوتو بھی صحابہ کرام آپ ﷺ سے محبت کرتے ۔اس لیے آپ ﷺ واقعی محبت کیے جانے کے قابل تھے۔آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بے شمار ایسے واقعات مشہور ہیں جن سے باہمی محبت ومؤدت کے رشتے واضح ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر غزوۂ اُحد میں آنحضرت ﷺ کو مشرکین نے ہر طرف سے گھیر لیا اور آپ ﷺ پر تیر مینہ کی طرح برسنے لگے تو مسلمانوں نے اپنے جسموں کو آڑ بنا کر ان تیروں کو روکا (٦٠)۔

۱۲۔ جسمانی قابلیت وبدنی قوت:

ایک اچھے سپہ سالار کے لیے قوی جسم اور مضبوط بدن کا ہونا ضروری ہے۔اس میں مصائب و مشکلات برداشت کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ہادیٔ برحق ﷺ کی جسمانی قابلیت بھی حد سے زیادہ تھی۔اس طرح صحابہ کرام ؓ خندق کھودنے کے دوران آپ ﷺ سے مدد کے طالب ہوتے۔جب کوئی پتھر کھودنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا تو اسے توڑنے کے لیے آپ ﷺ کی طرف دوڑتے اور پھر آپ ﷺ کے ہتھوڑے کی ضرب سے وہ پتھر ٹوٹ جاتا کیونکہ ایک آپ ؐ کا بے مثل اپنی صلاحیت کا معجزہ دکھانا طاقتور بازو چلاتا تھا۔

۱۳۔ بے داغ شخصیت:

رسول اللہ ﷺ کو جس چیز نے دنیا کے تمام سپہ سالاروں سے ممتاز کیا وہ آپ ﷺ کی بے داغ شخصیت ہے۔آپ ﷺ کی شخصیت کو ماضی اور حال کے جس پیمانے سے ناپیں گے وہ آپ کو بے مثال نظر آئے گی۔خاندانی عز وشرف کے لحاظ سے بھی اور شخصیت وسیرت وکردار کے لحاظ سے بھی آپ ﷺ کی زندگی خصوصاً آغازِ جوانی میں یتیموں ،فقیروں ، بیواؤں، بھوکوں، کمزوروں اور غلاموں پر شفقت و مہربانی میں گزری۔کبھی شراب نہ چکھی ،کبھی جوئے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی اور کسی غیر شائستہ حرکت کا تصور تک نہ کیا۔اس بے داغ شخصیت کی صداقت کو اپنوں بیگانوں سب نے تسلیم کیا۔ابوسفیان کو ہرقل کے دربار میں آپ ﷺ کی سیرت بیان کرنا پڑی (٦١)۔

اشاعتِ اسلام اور تلوار:

سپہ سالارِ اعظم نے کبھی بھی تلوار کا بے جا استعمال نہیں کیا کیونکہ جبراً اشاعتِ اسلام کی ممانعت قرآنِ مجید نے کی ہے۔ ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (۶۲) (دین میں کوئی جبر نہیں)۔

اگر غزوات میں فریقین کی تعداد پر غور کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہر لڑائی میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی، تگنی اور چوگنی ہوتی تھی۔ مسلمان صرف تعداد میں ہی قلیل نہیں ہوتے تھے بلکہ اسلحہ اور سواریوں کے لحاظ سے بھی کمزور تھے اور کبھی تاریخِ عالم میں ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور نے اپنے ہاتھ میں تلوار لی ہو اور گھر سے باہر نکل پڑا ہو کہ تلوار کے ذریعے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ ہاں ایسا ضرور ہوا ہے کہ طاقت ور قوم کا کمزور قوم نے قومی زندگی کی بقا کے لیے دلیری سے مقابلہ کیا ہو اور طاقت ور قوم کو نیچا دکھایا ہو۔ یہ تمام حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ سپہ سالار اعظم نے تلوار کو اشاعتِ اسلام کا ذریعہ نہیں بنایا۔

ان تمام حقائق پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا کے سب سے بڑے سپہ سالار تھے۔

نوٹ:

اس مقالہ کی تیاری میں دیگر مصادر و مراجع کے علاوہ استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی کتاب ''انسانِ کاملؐ '' سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ الاحزاب، ۲۱۔

۲۔ احمد بن حنبل، المسند (دار المعارف، مصر، ۱۹۳۶ء) ۱/۱۲۶۔

۳۔ ابن کثیر، ابو الفدا عماد الدین، اسماعیل بن کثیر، البدایہ و النہایہ (دار الفکر، بیروت) ۴/۲۴۔

۴۔ بخاری، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص ۴۸۰-۴۸۱، حدیث نمبر ۲۹۰۸۔

۵۔ ایضاً، ص ۷۰۰، حدیث نمبر ۴۱۳۶۔

۶۔ التوبہ: ۲۵۔

۷۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۴۷۴، حدیث نمبر ۲۸۶۴۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۸، حدیث نمبر ۳۳۵۔

۹۔ احمد، المسند، ۱/۴۲۲۔

۱۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۴۷۰، حدیث ۲۸۳۷۔

۱۱۔ البیہقی، ابوبکر احمد بن الحسن، دلائل النبوۃ (دار الکتب العلمیہ، بیروت) ۳/۳۵۔

۱۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۵۰۱-۵۰۲، حدیث ۳۰۳۹۔

۱۳۔ الانفال: ۶۱۔

۱۴۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۷۰۹، حدیث ۴۱۸۱-۴۱۸۰۔

۱۵۔ گلزار احمد، بریگیڈیئر، غزوات رسول اللہ ﷺ (اسلامک پبلی کیشنز لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۹۴ء) ص ۹-۱۰۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱-۱۲۔

۱۷۔ ابن ماجہ، السنن (دار السلام، الریاض) ص ۴۱۰، حدیث نمبر ۲۸۴۲۔

۱۸۔ ابوداؤد، السنن (دار السلام، الریاض) ص ۳۸۵، حدیث نمبر ۲۶۶۹۔

۱۹۔ مالک، امام، مؤطا (نشر السنۃ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان) ۲/۴۴۷-۴۴۸۔

۲۰۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۲۲۴، حدیث نمبر ۱۳۹۵، مسلم، الجامع الصحیح ص ۹، حدیث نمبر ۱۹۔

۲۱۔ احسان بی اے، رسول اللہ میدانِ جہاد میں (برادرز پبلشرز، دی مال، لاہور) ص ۲۳۴۔

۲۲۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۴۸۷، حدیث نمبر ۲۹۴۳۔

۲۳۔ ابوداؤد، السنن، ص ۳۸۶، حدیث نمبر ۲۶۷۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۸۹، حدیث نمبر ۲۶۸۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۹۲، حدیث نمبر ۲۷۰۵۔

۲۶۔ احمد، المسند، ۴/ ۳۰۷۔

۲۷۔ البقرہ: ۲۰۵۔

۲۸۔ احمد، المسند، ۴/ ۳۰۷۔

۲۹۔ ترمذی، السنن، کتاب السیر، ۴/ ۱۶۲۔

۳۰۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان (مطبع الموسوعات القاہرۃ مغربیہ، مصر، ۱۹۹۶ء، طبع اوّل) ص ۴۷۔

۳۱۔ ابوداؤد، السنن، ص ۴۰۲، حدیث نمبر ۲۷۶۲۔

۳۲۔ قاضی ابویوسف، کتاب الخراج (المطبعۃ السّلفیہ القاہرۃ) ص ۱۱۶۔

۳۳۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۳۸۶، حدیث نمبر ۲۶۸۶۔

۳۴۔ ابوداؤد، السنن، ص ۳۷۹، حدیث نمبر ۲۶۲۹۔

۳۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۴۹۴، حدیث نمبر ۲۹۹۲۔

۳۶۔ ابن ماجہ، السنن، ص ۴۱۲-۴۱۳، حدیث نمبر ۲۸۵۸۔

۳۷۔ ڈوگر، محمد رفیق، الامین ﷺ (دیدشنید پبلشرز، لاہور، طبع اوّل، ۲۰۰۰ء) ۲/ ۲۳۷۔

۳۸۔ ابن الاثیر، ابوالحسن علی، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (داراحیاء التراث العربی بیروت) ۱/ ۲۴۶۔۲۴۸؛ ظفر، عبدالرؤف، پروفیسر ڈاکٹر، اسلامیات لازمی برائے بی۔اے (وارن پبلشرز، بہاولپور) ص ۱۸۹۔

۳۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۵۰-۶۱۔

۴۰۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۶۴۶، حدیث نمبر ۳۸۵۲۔

۴۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (دارصادر بیروت) ۲/ ۱۵۔

۴۲۔ شرح شفا، ۲/ ۶۴۔

۴۳۔ الطبقات الکبریٰ، ۲/ ۱۵۔

۴۴۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۶۸۴، حدیث نمبر ۴۰۴۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۷۲۴، حدیث نمبر ۴۲۸۰۔

۴۶۔ الطبقات الکبریٰ، ۲/ ۱۱۔

۴۷۔ السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۲۶۸۔

۴۸۔ الطبقات الکبریٰ، ۲/ ۱۵۔

۴۹۔ السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۲۵۵۔

۵۰۔ ایضاً، ۲/ ۲۵۴۔

۵۱۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۶۹۷، حدیث نمبر ۴۱۱۰۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۶۹۸، حدیث نمبر ۴۱۱۷۔

۵۳۔ السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۳۲۔

۵۴۔ الطبقات الکبریٰ، ۲/۷-۱۰۔

۵۵۔ ایضاً، ۲/۱۰۔

۵۶۔ السیرۃ النبویۃ، ۳/۷۱۔

۵۷۔ ایضاً۔

۵۸۔ ایضاً۔

۵۹۔ الطبقات الکبریٰ، ۲/۴۲۔

۶۰۔ ایضاً، ۲/۴۲۔

۶۱۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۱/۵-۶۔

۶۲۔ البقرہ: ۲۵۶۔

❀❀❀❀

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خارجہ حکمت عملی

اسلام کے ظہور پذیر ہونے تک نوع انسانی کو آپس میں متحد کرنے کے دو ہی اصول تھے:

۱: جغرافیائی اتصال۔

۲: نسلی قرابت۔

اسلام نے اپنی وسیع النظری کے تحت ربط وضبط انسانیت کی ان شکلوں کو رد نہیں کیا بلکہ اس خطرے کے پیش نظر کہ اپنی حدود سے متجاوز نہ ہو جائیں ان کی قدر و قیمت گرادی اور انھیں صرف پہچان تک محدود کر دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (۱) (لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے)۔

حدیث نبوی ﷺ ہے: "ليس منا من دعا الى عصبية" (۲) (جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہی پیغام دیا تھا کہ وہ کسی مخصوص گروہ کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو اللہ سے ڈرانے والا اور سیدھی راہ دکھانے والا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ شَـٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا . وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا﴾ (۳) (اے نبی ﷺ، ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿تَبَارَكَ ٱلَّذِى نَزَّلَ ٱلْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِۦ لِيَكُونَ لِلْعَـٰلَمِينَ نَذِيرًا﴾ (۴)

(نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ سارے جہان والوں کے لیے

خبر دار کر دینے والا ہو)۔

آپ ﷺ کی دعوت ہر قوم، ہر نسل، ہر قبیلے، ہر مقام اور زمانے کے لیے تھی۔ مکی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا اثر محدود پیمانے پر ظاہر ہوا لیکن جب آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ تعلیمات عالمگیر حیثیت اختیار کر گئیں۔ ہجرت کے باعث ہی مسلمانوں کے لیے سیاسی نظام مملکت کو تشکیل دینا ممکن ہوا اور مختلف جنگی مہمات میں سپہ سالاروں کا تقرر، غیر ممالک میں مختلف مقاصد کی غرض سے سفیروں کا تقرر، کاروبار مملکت کے لیے مشاورتی اجلاس، ملکی قوانین کا اجراء، نفاذ اور سیاسی نظام کی صورت گری سے ایک ایسا ریاستی نظام وجود میں آیا جس کی مضبوط بنیادوں پر رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ایک مستحکم اجتماعی قوت بنا دیا۔ ریاست کا یہ اندرونی استحکام رسالت مآب ﷺ کے خارجہ مقاصد کے حصول کے لیے انتہائی سودمند ثابت ہوا کیونکہ کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی کے اہم اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ دعوت توحید

رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا اولین اور بنیادی مقصد وہی تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا یعنی دعوت توحید۔ آپ ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء تشریف لائے ان سب نے لوگوں کو یہی دعوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل میں توحید کی دعوت دی: ﴿ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ (۵) (اے زنداں کے ساتھیو! (تم خود ہی سوچو کہ) بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟)۔

حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان الفاظ میں دعوت دی:

﴿ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰـهٍ غَيْرُه ﴾ (۶) (اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں)۔

حضرت نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہی پیغام تھا:

﴿ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَأَطِيْعُوْنِ ﴾ (۷) (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی "لا الـــه الا الله" (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) کا یہی پیغام انسانوں تک پہنچایا۔ دعوت توحید کا یہ اصول رسالت مآب ﷺ کی خارجہ پالیسی میں بھی ہمیشہ اور ہر حالت میں قائم رہا۔ حج کا موقع ہو یا تجارتی میلوں کی رونق، جنگ کا پڑاؤ ہو یا غیر ملکی وفود کی آمد ہر موقع پر اس دعوت حق کو لوگوں تک پہنچانا آپ ﷺ کا مقصود اوّل رہا۔ اسی اصول کی بنا پر آپ ﷺ کو اہل کتاب کو بلانے کا حکم دیا گیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۸) (اے نبی کہو، "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے")۔

۲۔ دفاع ریاست

رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں قائم پہلی اسلامی ریاست شدید بیرونی خطرات سے دوچار تھی۔ مسلمانوں کو خطرہ رہتا تھا کہ مکہ والے کسی بھی وقت حملہ کر سکتے ہیں۔ ان خطرات میں اسلامی ریاست کے دفاع کے لیے اقدامات ناگزیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر قبائل سے رابطہ کیا۔ بالخصوص ان قبائل سے جن کے علاقوں سے مکہ والوں کے تجارتی قافلے گزر کر ملک شام یا مصر کی طرف جاتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ بیرونی حملوں کے خلاف باہمی فوجی امداد کی بنیاد پر دفاعی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

۳۔ امن عالم

اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی نبی بھیجا مگر یہ نبی ایک خاص خطۂ زمین، ایک خاص زمانے اور ایک خاص قوم کے لیے تھے۔ ان میں کسی کی شریعت عالمگیر نہ تھی۔ ان میں کسی کا پیغام سارے زمانوں کے لیے نہ تھا۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور شریعت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی

خاص قوم یا خاص زمانے تک محدود نہ تھی بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے تھی۔ آنحضرت ﷺ کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک ایسا عالمی معاشرہ قائم ہو جو امن و سلامتی پر مبنی ہو کیونکہ اسلام امن کے فروغ اور سلامتی کی ترویج کو عزیز رکھتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ﴾ (۹) (اور اللہ ان کے خوف کو امن میں تبدیل کر دے گا)۔

۴۔ معاہدات کا احترام

اسلام نے معاہدات کے پورا کرنے کے اصول پر خاص زور دیا ہے کہ معاہدات کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ معاہدہ پر عمل درآمد میں خیانت اور خلاف ورزی کو قطعاً حرام قرار دیا ہے اور نقضِ عہد کو بدترین عمل قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ﴾ (۱۰) (اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴾ (۱۱) (اور تم عہد کو پورا کرو یقیناً عہد کے بارے میں جواب دہی ہوگی)۔

۵۔ التوائے جنگ یا صلح

آپ ﷺ نے بلا جواز جنگ سے ہمیشہ گریز کیا اور ان راستوں کو پسند فرمایا جو صلح کی طرف مائل تھے۔ آپ ﷺ کا یہ طرزِ عمل قرآن کے اس ارشاد کے بالکل عین مطابق تھا: ﴿ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِن يُرِيدُوٓا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِىٓ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴾ (۱۲) (اے محمد ﷺ اگر دشمن مائل بہ صلح ہوں تو آپ بھی ایسا ہی کریں اور اللہ پر بھروسا رکھیں۔ یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکا دینے کی تدبیر کریں گے تو اللہ کافی ہے، وہ خدا ہی ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے تمھاری تائید کی)۔

۶۔ بلا وجہ تنازعے سے پرہیز

تمام بنی نوع انسان بحیثیت مخلوق آپس میں برابر اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ کوئی شخص یا کوئی قوم رنگ یا علاقہ کی بنیاد پر دوسرے سے برتر نہیں ہوسکتی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ

إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ ﴾ (۱۳) (اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا)۔

اسلام وحدت نسل انسانی کا پیغامبر ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ایک عالمی انسانی برادری قائم کی جائے لہٰذا بلا وجہ کسی سے تنازعہ پیدا کرنا ناجائز ہے۔

۷۔ حق کی معاونت اور ظلم سے اجتناب

رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہمیشہ حق کی حمایت کی جائے اور ظلم کی مخالفت کی جائے۔ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لیے دی گئی کہ عدوان اور ظلم کو روکا جائے۔ جہاں جنگ کی اجازت دی ہے وہاں طمع، انتقام اور کمزوروں پر ظلم و زیادتی سے منع کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ﴾ (۱۴) (بھلا کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان ناتواں مردوں، عورتوں اور ننھے منے بچوں کے چھٹکارے کے لیے جہاد نہ کرو، جو یوں دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ان ظالموں کی بستی سے ہمیں نجات دے، اور ہمارے اپنی طرف سے حمایتی اور کارساز مقرر کر اور ہمارے لیے خاص اپنے پاس سے مددگار بنا۔)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "واللّٰہ لتأمرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر، ولتاخذن علی یدی الظالم، ولتأطرنہ علی الحق اطراً، ولتقصرنہ علی الحق قصرا" (۱۵) (واللہ تمھیں ضرور نیکی کا حکم دینا ہوگا برائی سے روکنا ہوگا ظالم کے ہاتھ پکڑنے ہوں گے اور اسے حق کی طرف موڑ دینا اور حق پر مجبور کرنا ہوگا)۔

۸۔ اندرونی استحکام

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی ہو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو کر اکثر قلیل اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پہلی اسلامی ریاست

اپنے قیام کے وقت یہود ونصاریٰ اور انصار کے دو گروہوں اوس اور خزرج کی پرانی عداوت کی وجہ سے عدم استحکام کا شکار تھی۔ دفاعِ مدینہ کے لیے ضروری تھا کہ ان تمام فرقوں اور گروہوں کو ایک سیاسی وحدت میں پرو دیا جائے، چنانچہ رسالت مآب ﷺ نے سب سے پہلے اس کی کوشش کی اور تمام فریقوں کو ایک معاہدہ پر متفق کیا۔ اس معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ مدینہ میں مامون زندگی بسر کرنے اور قوت و طاقت اور وسائل عسکری کو فراہم کرنے میں اچھی طرح کامیاب ہو گئے۔ یہ معاہدہ میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔

۹۔ فنونِ حرب میں ترقی و استفادہ

اگر کسی ملک کے پاس مضبوط فوج نہ ہو تو دشمن کے لیے اس کا شکار کرنا آسان ہوتا ہے۔ دشمن اس کی قوت اور شان سے خائف نہیں ہوتا، اس کے برعکس مضبوط فوج ہو تو دشمن اس کی سنتا ہے اور اس کا احترام کرتا ہے بلکہ دشمن سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنے شوق سے کسی کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدْوَّ اللّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ ﴾(۱۶)(اور تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کو تیار رکھنے کی کہ تم اس سے اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے علاوہ جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ انھیں خوب جان رہا ہے۔ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمھارا حق نہ مارا جائے گا)۔

جنگ کے سلسلہ میں اسلام نے ایک تو قوت و طاقت کا مظاہرہ اور دوسرے رباط کا بندوبست یعنی اسلحہ وسامان پر زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ﴾(۱۷)(کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر ایک ہی دفعہ ٹوٹ پڑیں)۔

اس طرح اسلام اسلحہ سازی کے لیے معاملِ حربیہ کا سامان بہم پہنچانے کی بھی ترغیب دیتا ہے اور فولاد و آہن کا بطورِ خاص اس سلسلہ میں ذکر کرتا ہے کہ عسکری اغراض کے لیے اس سے استفادہ کیا جائے۔

۱۰۔ بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری

اسلام کا بین الاقوامی قانون قاصدوں اور سفیروں کو امن دینے کی ضمانت پر مشتمل ہے۔ انھیں کسی حالت میں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جا سکتی۔ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد ابن النواحہ اور ابن اثال جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی قاصد کو قتل کرنے والا ہوتا تو تمھیں قتل کر دیتا (لیکن سفیر ہونے کی بنا پر انھیں قتل نہیں کیا)۔

۱۱۔ سفارتی حکمت عملی

رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف صحابہ کرام ؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ حضرت جعفر ؓ اور ان کے ساتھی جب حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تو حضرت جعفر ؓ نے ایک سفارتی نمائندہ کے طور پر دربارِ نجاشی میں تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے: ''ایھا الملك کنا قوم اھل جاھلیة، نعبد الاصنام، نأکل المیتة ،نأتی الفواحش، یاکل القوی منا الضعیف ،وکنا علی ذلك، حتیٰ بعث اللّٰه الینا رسولا منا نعرف حسبه ونسبه وصدقه وامانته وعفافه فامرنا بصدق الحدیث.....الخ'' (۱۸) (اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں تھے، بتوں کی عبادت کرتے، مردار کھاتے، بے حیائی کے کام کرتے، ہم میں سے طاقتور ضعیف کو کھا جاتا تھا، ہم اس حالت میں تھے کہ اللہ نے اپنا رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب نسب، سچائی امانت اور دیانت کو جانتے تھے۔ اس نے ہمیں سچائی کا حکم دیا ہے۔) پھر اصحمہ نجاشی مسلمان ہوگیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی سفارتی حکمت عملی دو حصوں (مکاتیب اور معاہدات) پر مشتمل تھی۔

(الف) مکاتیب نبوی ﷺ:

مختلف بادشاہوں کی طرف آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام ؓ کو دعوتی خطوط دے کر بھیجا۔ جن کے ہر لفظ سے حکمت جھلکتی ہے۔ اور آپ ﷺ کی خارجی حکمت عملی واضح ہوتی ہے۔

ا: شاہ حبش کی طرف خط:

حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ کو شاہ حبش نجاشی اصحمہ کے پاس بھیجا۔ انھوں نے آپؐ کا یہ مکتوب ان تک پہنچایا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"من محمد رسول اللّٰه، إلى النجاشي الأصحمه ملك الحبشة.

سلم أنت، فإني أحمد إليك اللّٰه [الذي لا إله إلا هو]، الملك، القُدُّوس، السلام، المؤمن، المُهَيمِن، وأشهدُ أن عيسى بن مريم روح اللّٰه وكلمته، ألقاها إلى مريم البتول الطيبة الحصينة، فحملت بعيسى، فخلقه اللّٰه من روحه ونفخه، كما خلق آدم بيده ونفخه.

وإني أدعوك إلى اللّٰه وحده لاشريك له، والموالاة على طاعته، وأن تتبعني، وتؤمن بالذي جاء ني، فإني رسول اللّٰه.

وقد بعثت إليك ابن عمي جعفراً، ونفراًمعه من المسلمين. فإذا جاء ك فاقرهم، ودع التجبر، فإني أدعوك وجنودك إلى اللّٰه، فقد بلغت ونصحت، فاقبلوا نصيحي.

والسلام على من اتبع الهدى." (۱۹)

(یہ خط اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے نجاشی اصحمہ بادشاہ حبش کے نام ہے، تجھ پر سلامتی ہو۔ میں پہلے اللہ کی تعریف کرتا ہوں جو مالک، قدوس، سلام، مومن اور مہیمن ہے اور میں ظاہر کرتا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام بن مریم اللہ کی مخلوق اور اس کا حکم ہیں جو مریم بتول عفیفہ کی طرف بھیجا گیا اور انھیں عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ٹھہرایا گیا۔ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اور نفخ سے اسی طرح پیدا کیا جیسا کہ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ اور نفخ سے پیدا کیا تھا۔ اب میری دعوت یہ ہے کہ تو خدا پر، جو اکیلا اور بلا شرکت غیرے ہے ایمان لے آ، اور ہمیشہ اس کی فرمانبرداری میں رہا کر اور اتباع کر اور میری تعلیم کا سچے دل سے اقرار کر۔ کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں اس سے پہلے اپنے چچازاد بھائی جعفر کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ بھیج چکا

ہوں۔تم اسے آرام سے ٹھہرانا۔نجاشی! تم تکبر چھوڑ دو کیونکہ میں تمھیں اور تمھارے دربار کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔دیکھو میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا اور تمھیں بخوبی سمجھا دیا۔اب مناسب ہے کہ میری نصیحت مان لو، سلام اس پر جو سیدھی راہ پر گامزن ہے)۔اصحمہ چونکہ مسلمان ہو گیا تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کی وفات پر اس کا غائبانہ جنازہ مدینہ منورہ میں پڑھا۔

۲: شاہ بحرین کی طرف خط:

حضرت علاء الحضرمی کو بحرین کے بادشاہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا اور ان کو آپ کا مکتوب پہنچایا۔بحرین فارس کا اہمیت کا حامل خطہ تھا۔وہاں عربوں کی بھی ایک کثیر آبادی تھی۔آپ کا مکتوب بادشاہ کو ملا تو اس نے اسلام قبول کیا۔بادشاہ کے ساتھ اس کی رعایا کے بیشتر حصے نے بھی اسلام قبول کیا۔یہ صورت حال منذر بن ساوی رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں آپ کو لکھی کہ: ''بعض لوگوں نے تو اسلام کو پسند کیا ہے اور بعض نے کراہت کا اظہار کیا ہے۔بحرین میں یہودی اور مجوسی بھی آباد ہیں۔ان کے متعلق حکم فرمائیں۔آپ ﷺ نے اس پر تحریر فرمایا:

''**امابعد!** اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خلوص رکھو گے اور کھجوروں پر عُشر اور اناج پر نصف عُشر دیتے رہو گے اور اپنی اولاد کو مجوسی نہ بناؤ گے تو وہ سب کچھ تمھارے ہی پاس رہے گا جو اسلام قبول کرنے کے وقت تمھاری ملکیت میں تھا لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حق آتش کدہ پر ہوگا اگر تم اس سے انکار کرو گے تو تم پر جزیہ دینا فرض ہوگا''۔

انھی مکتوبات کی بنا پر حضرت علاء الحضرمی رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ و جزیہ کی تقریباً اسی ہزار رقم مدینہ بھیجی (۲۰)۔

۳: قیصر روم ہرقل کی طرف خط:

حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو مکتوب کے ساتھ قیصر روم کی طرف بھیجا۔ان دنوں قیصر حمص میں مقیم تھا جہاں سے اس نے فارس کو شکست دینے کی خوشی میں نذر اتارنے کے لیے بیت المقدس برہنہ پا جانا تھا لیکن پھر بھی اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر مخملی فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے (۲۱)۔

آپ ﷺ کا مکتوب درج ذیل عبارت پر مشتمل تھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

''من محمدٍ عبداللّٰه ورسوله، إلى هرقل عظيم الروم

سلام على من اتبع الهدى. أما بعد: فإني أدعوك بدعاية الإسلام، أسلم تسلم، وأسلم يؤتك اللّٰه أجرك مرتين، فإن توليت فعليك إثم الأريسيين'' و ﴿قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (۲۲)۔

(یہ خط اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے بادشاہ روم کی طرف ہے۔ اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی اطاعت کرے۔ اس کے بعد واضح ہو کہ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرو گے تو بچ جاؤ گے اور تمھیں دوہرا ثواب ہوگا اور اگر تم منہ پھیرو گے تو تمام رعیت کا گناہ تم پر ہوگا اور '' اے اہل کتاب! ایک ایسی بات مان لو جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے یعنی یہ کہ ہم سب خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو سوائے خدا کے پروردگار بنائے۔ پس اگر اہل کتاب اس سے اعراض کریں تو تم کہہ دینا کہ اس بات کے گواہ رہو کہ ہم اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں'')۔

یہ خط قیصر کو ملا تو اس نے مکہ سے آئے ہوئے تجارتی وفد سے رسول اللہ ﷺ کے بارے استفسار کیا۔ اس کے بعد قیصر نے کہا: '' مجھے معلوم تھا کہ نبی آخر الزمان کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی پیدائش عرب میں ہوگی۔ اگر تمھارے جواب صحیح ہیں تو وہ شخص ایک روز اس جگہ پر قابض ہوگا۔ کاش! میں اس تک پہنچ سکتا تو اس کے پاؤں دھوتا'' (۲۳)۔

۴: شاہ مصر کی طرف خط:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اللخمی کو شاہ مصر مقوقس جریج بن متی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ ان کو آپ ﷺ کا یہ مکتوب پہنچا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"من محمد عبداللّٰه ورسوله، إلى المقوقس عظيم القبط.

سلام علـى مـن اتبع الهدى، أما بعد: فإني أدعوك بدعاية الأسلام، أسلم تسـلم، يؤتـك اللّٰه أجرك مرتين. فإن توليت، فعليك إثم القبط: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ" (۲۴)

(خدا کے بندے اور اس کے رسول محمد ﷺ کی جانب سے مقوقس بادشاہ قبط کی طرف، سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد! پس میں تجھ کو دعوت اسلام دیتا ہوں۔ اسلام لے آ سلامت رہے گا اور خدا تعالیٰ تجھے دوہرا ثواب دے گا اور اگر اسلام نہ لایا تو تیرے او پر تمام قبط کو درد پہنچانے والی مصیبت ہوگی۔ اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف، جو ہم تم میں برابر مشترک ہے کہ سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنالیں سوائے (اللہ کے) پس اگر (اہل کتاب) نہ مانیں تو کہہ دو کہ اے اہل کتاب گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں)۔

۵: والیان عمان کی طرف خط:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا خط والیان عمان جیفر اور عبد ابنی الجلندی تک پہنچایا۔ ان سے حضرت عمرو کی ملاقات سمندر کے کنارے صمار کے مقام پر ہوئی۔ خط کی عبارت درج ذیل ہے:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"من محمد رسول اللّٰه، إلى جيفر وعبدٍ ابني الجلندى:

السلام على من اتبع الهدى، أما بعد: فإني أدعوكما بدعاية الإسلام. أسلما تسلما، فإني رسول اللّٰه إلى الناس كافةً، لأنذر من كان حياً ويحق القول على الكافرين. وإنكما إن أقررتما بالإسلام وليتكما. وإن أبيتما أن تقرا بالإسلام، فإن

ملككما زائل، وخيلي تحل بساحتكما، وتظهر نبوتي على ملككما.

وكتب أبي بن كعب"(۲۵)

(محمد رسول اللہ کی طرف سے جلندی کے دونوں فرزندوں جیفر اور عبد کے نام۔ سلام ہو اس پر جو راہ راست کی اطاعت کرے۔

"امابعد! میں تم دونوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ دونوں اسلام قبول کرلو۔ سلامت رہو گے۔ میں تمام لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ ان کو اللہ کی مخالفت سے ڈراؤں، اور کفار پر اللہ کی حُجت تمام ہو جائے۔ اگر تم دونوں نے اسلام قبول کرلیا تو اپنے ملک کے والی رہو گے اور اگر تم نے انکار کیا تو اپنی بادشاہت کھو بیٹھو گے۔ میرے سوار تمھاری سرزمین میں داخل ہو جائیں گے اور میری نبوت تمھاری بادشاہت پر غالب آجائے گی)۔

انھوں نے آپ کا یہ مکتوب ملنے کے بعد ان سے مختلف سوالات کیے پھر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کرلیا (۲۶)۔

۶: حاکم یمامہ کی طرف خط:

حضرت سلیط بن قیس بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر یمامہ کے حاکم ہوذہ بن علی کی طرف بھیجا۔ اور یہ مکتوب بھی لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"من محمد رسول الله ألى هوذة بن علي:

سلام على من اتبع الهدى. واعلم أن ديني سيظهر إلى منتهى الخف والحافر، فأسلم تسلم، وأجعل لك ماتحت يديك"۔(۲۷)

(محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوذہ بن علی کی جانب، سلام ہو اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے اور جان لو کہ میرا دین وہاں تک پھیلے گا جہاں تک چوپائے اور گھوڑے جاسکتے ہیں۔ اسلام قبول کرو تو سلامت رہو گے اور جو کچھ تمھارے اختیار میں ہے اس کا مالک تمھیں کو بنا دیں گے"۔

حاکم یمامہ ہوذہ نے سفیر کو کچھ انعام اور ہجَر کے تیار کردہ کپڑوں کا لباس پیش کیا اور لکھا

''آپ جس چیز کی دعوت دیتے ہیں وہ نہایت اچھی ہے، میں اپنی قوم کا شاعر و خطیب ہوں، عرب میرے رتبہ سے ڈرتے ہیں لہٰذا بعض اختیارات مجھے دیں تو میں اتباع کرلوں گا'' (۲۸)۔

ان کے علاوہ بعض دیگر حکمرانوں کو بھی رسول اللہ ﷺ نے خطوط بھیجے۔

(ب) معاہدات:

رسول اللہ ﷺ نے مختلف معاہدات کے ذریعے امن قائم کیا، ظلم کا خاتمہ کیا اور لوگوں کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی حقوق میں مساوات فراہم کی۔ اسلامی حکومت عالمگیر حکومت تھی، ان معاہدات کی بدولت آپؐ نے بین الاقوامی تعلقات استوار کیے۔

۱: معاہدہ عقبہ اولیٰ:

نبوت کے گیارہویں سال حج کے موسم میں انصار کے بارہ آدمی حج کے لیے مکہ آئے اور عقبہ کے مقام پر رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کی۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے درج ذیل امور پر باقاعدہ بیعت لی:

۱: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔
۲: چوری نہیں کریں گے۔
۳: زِنا کے مرتکب نہیں ہوں گے۔
۴: اولاد کے قتل سے اجتناب کریں گے۔
۵: بہتان تراشی نہیں کریں گے۔
۶: معروف و نیک کاموں میں نافرمانی نہیں کریں گے۔

اس معاہدہ کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا ''فان وفیتم فلکم الجنة وان غشیتم من ذلك شیئاً فامرکم الی اللہ عزوجل ان شاء عذب وان شاء غفر'' (۲۹) (اگر تم اپنے عہد پر قائم رہے تو تمھیں جنت کی بشارت ہے اور اگر ان امور میں سے کسی کے خلاف ورزی کی تو تمھارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے سزا دے اور چاہے بخش دے)۔

اس معاہدہ میں درج ذیل لوگ شامل تھے:

۱۔	اسعد بن زرارہ	۲۔	عوف بن حارث
۳۔	معاذ بن حارث	۴۔	رافع بن مالک
۵۔	ذکوان بن عبدالقیس	۶۔	عبادہ بن صامت
۷۔	یزید بن ثعلبہ	۸۔	عباس بن عبادہ
۹۔	عقبہ بن عامر	۱۰۔	قطبہ بن عامر
۱۱۔	مالک بن التیھان	۱۲۔	عویم بن ساعدہ (۳۰)

۲: معاہدۂ عقبہ ثانیہ:

بعثت کے تیرہویں سال مدینے سے اوس وخزرج قبائل کے ۷۳ افراد فریضۂ حج ادا کرنے مکہ آئے۔ یہ مسلمان اپنے قبائل کے مشورے سے آپؐ سے بیعت ہونے اور آپؐ کو مدینے آنے کی دعوت دینے آئے تھے۔

عقبہ کے مقام پر جہاں دو سال قبل مدینہ کے ۱۲ افراد سے بیعت ومعاہدہ کا عمل ہوا تھا اسی مقام پر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی۔

تاریخی اہمیت کے حامل اس معاہدہ کو آپ ﷺ کفار سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے چچا حضرت عباس کے ہمراہ ملاقات کی جگہ پہنچ گئے اور گفتگو شروع ہوئی، یثرب (مدینہ) کے مسلمان بیعت ہونے لگے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک ایسی بات کہی جو ان کی سیاسی بصیرت اور تحریک اسلام کی حقیقی انقلابی نوعیت کی مظہر ہے، انھوں نے بنوخزرج سے مخاطب ہوکر کہا: ''تمھیں معلوم ہے کہ قریش مکہ محمد ﷺ کے جانی دشمن ہیں اگر تم محمد ﷺ سے کوئی عہد وپیمان کرنے لگے ہو تو یہ سمجھ کر کرنا کہ یہ بڑا نازک اور مشکل کام ہے۔ ان سے عہد وقرار کرنا سرخ وسیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے، وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں، ہم ان کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں، اگر تم بھی مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی جواب دے دو۔ لہٰذا جو اقدام بھی کرو، سوچ سمجھ کر کرو، ورنہ بہتر ہے کچھ نہ کرو۔

ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر آپ ﷺ سے مخاطب ہوکر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! ہم

یہود کے حلیف ہیں۔ اس بیعت کے بعد ان سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو قوت واقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ؐ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائیں"۔

آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا:

"نہیں، تمھارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے اور میں تمھارا ہوں" (۳۱)۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے خطاب کے بعد انھوں نے آپ ﷺ سے کچھ اِرشاد فرمانے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے ان کو قرآن مجید سنایا۔ ایک ایک لفظ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اُترتا اور انھیں مسحور و مسخر کرتا چلا گیا۔ ان پر رقت طاری ہوگئی۔ انھوں نے یک زبان ہو کر آپ ﷺ سے مدینہ چلنے کی درخواست کی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم دینِ حق کی اشاعت میں میرے ساتھ پورا پورا تعاون کرو گے اور جب میں تمھارے شہر میں اقامت اختیار کرلوں تو کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل وعیال کی طرح کرو گے"؟

لیکن اے اللہ کے رسول ﷺ اس کا معاوضہ ہمیں کیا ملے گا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: "جنت"۔

آپ ﷺ کا یہ ارشاد ان کے دلوں میں برق مسرت کی طرح لہرایا اور وہ فرط شوق سے آپ ﷺ سے بیعت کرنے لگے۔ سب سے پہلے براءؓ بن معرور نے بیعت کی۔ پھر باقی سب لوگوں نے بیعت کی (۳۲)۔

رسول اکرم ﷺ کے مدینہ منتقل ہونے کا معاہدہ طے پایا تو آپ ﷺ نے نقیب مقرر کرنے کا حکم دیا، فرمایا: "ان موسی اخذ من بنی اسرائیل اثنی عشر نقیبا فلا یجدن منکم أحد فی نفسه أن یؤخذ غیره فانما یختار لی جبریل، فلماتخیرهم للنقباء انتم کفلاء علی غیرکم کفالة الحواریین العیسیٰ بن مریم وأنا کفیل علی قومی" (۳۳) (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں کا انتخاب کیا، تم میں سے کوئی اپنے دل میں یہ خیال نہ کرے کہ وہ کسی اور کے لیے منتخب ہوا ہے پس اس کو تو صرف جبرائیل علیہ السلام نے میرے لیے منتخب کیا ہے جب ان کو نقیب منتخب کرلیا تو کہا تم اپنے سے علاوہ پر کفیل ہو جیسا کہ عیسیٰ بن مریمؑ حواریین کے لیے کفیل تھے

اور میں اپنی قوم پر کفیل ہوں)۔

- چنانچہ انھوں نے بارہ لوگوں کو منتخب کیا جن میں نو قبیلہ خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔	اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ	۲۔	سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ
۳۔	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ	۴۔	سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ
۵۔	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	۶۔	براء بن معرور رضی اللہ عنہ
۷۔	عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ	۸۔	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
۹۔	رافع بن مالک رضی اللہ عنہ	۱۰۔	اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ
۱۱۔	ابوالہیثم بن تیہان	۱۲۔	سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ

اس معاہدے نے یثرب کے اُن لوگوں کے دلوں میں ایثار اور محبت پیدا کردی جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔قبیلہ اوس اور خزرج کی باہمی جنگ بُعاث ایک سو دس برس جاری رہی۔ جو لوگ زمین کو انسان کے خون سے سیراب کرنے کے خوگر تھے۔آپ ﷺ نے چند لمحات میں اُن کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔قبیلہ اوس وخزرج نے ایک دوسرے کے ذمہ جو خون تھے معاف کردیے۔

۳: میثاقِ مدینہ:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یثرب تشریف لائے تو درج ذیل امور کی ضرورت محسوس کی۔

۱: اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق وفرائض کا تعین۔

۲: مہاجرین کے وطن کا بندوبست۔

۳: مدینہ کے غیر مسلموں خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

۴: مدینہ کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

۵: قریش سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ لینا۔

ان امور کو مدنظر رکھ کر آپ ﷺ نے ایک تحریری معاہدہ مرتب فرمایا۔ یہ معاہدہ طرفین کی رفاہیت اور حقوق کی نگہبانی میں جامعیت کے اعتبار سے تاریخ کا اہم ترین باب ہے، اس معاہدے کی

۵۳ دفعات ہیں۔ جو کہ درج ذیل ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یہ دستاویز محمد ﷺ کی طرف سے ہے جو نبی ﷺ ہیں۔ قریش اور اہل یثرب میں سے مومنوں اور اطاعت گزاروں نیز ان لوگوں کے مابین ہے جو ان کے تابع ہوں، ان کے ساتھ شامل ہو جائیں، اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

۱۔ یہ سب مسلمان دوسرے لوگوں کے مقابل میں ایک امت یعنی سیاسی وحدت ہیں۔

۲۔ قریش کے مہاجر قبل اسلام کے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کیا کریں گے تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۳۔ بنی عوف کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا۔ تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴۔ بنی حارث اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵۔ بنو ساعدہ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۶۔ بنو جشم اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمانداری کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷ تا ۱۰۔ بنو نجار، بنو عمرو بن عوف، بنو نبیت اور بنو اوس اپنے اپنے دستور کے مطابق خون بہا خود ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱۔ اہل ایمان اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو جو مفلس ہو یا قرض کے بوجھ تلے دبا ہو، امداد دیے بغیر نہیں رہیں گے تاکہ اس کا فدیہ یا خون بہا بخوبی ادا ہو سکے۔

۱۲۔ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی اجازت کے بغیر اس کے مولیٰ (معاہداتی بھائی) سے معاہدہ نہیں کرے گا۔

۱۳۔ متقی مومن ہر اس شخص کی مخالفت پر تیار اور متحد رہیں گے، جو سرکشی اختیار کرے، ظلم، گناہ یا زیادتی کا مرتکب ہو یا ایماندار لوگوں میں فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں اہل ایمان کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے، اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۔ کوئی ایمان دار کسی ایماندار کو کافر کے بدلے قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر کو مدد دے گا۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ کا عہد و ذمہ ایک ہی ہے۔ اہل ایمان میں سے کوئی معمولی سا فرد بھی کسی شخص کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا۔ ایمان والے دوسروں کے مقابلے میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

۱۶۔ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا، اسے امداد و مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۷۔ اہل ایمان کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں جنگ ہو تو کوئی ایمان والا دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا۔ جب تک یہ صلح سب ایمان والوں کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

۱۸۔ ان تمام گروہوں کو جو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے نوبت بہ نوبت آرام کا موقع دیا جائے گا۔

۱۹۔ ایمان والوں کو اللہ کی راہ میں جو جانی نقصان اٹھانا پڑے اس کا بدلہ وہ مل کر لیں گے۔

۲۰۔ بلا شبہ متقی مومن سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

۲۱۔ کوئی مشرک (جو اس معاہدے میں شریک ہے) قریش کے مال اور جان کو پناہ نہ دے گا، اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

۲۲۔ جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے گا اور اس کا ثبوت مہیا ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ سوائے اس صورت کے کہ مقتول کا والی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی صورت جائز نہیں ہوگی۔

۲۳۔ کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستاویز کے مندرجات کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکالنے والے فتنہ انگیز کی مدد کرے یا پناہ دے اور جو اس کی حمایت کرے گا یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور غضب کا مستوجب ہوگا۔ اور اس سے کوئی فدیہ یا معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

۲۴۔ جب (اس عہد نامے کے پابند لوگوں کا) آپس میں کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اللہ اور محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۵۔ یہودی جب تک مومنوں کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارف بھی خود ہی برداشت کرتے رہیں گے۔

۲۶۔ بنی عوف کے یہودی مومنوں کے ساتھ ایک سیاسی وحدت (امت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودی اپنے دین پر رہیں اور مسلمان اپنے دین پر خواہ موالی ہوں یا اصل۔ البتہ جو لوگ ظلم اور عہد شکنی کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو ہلاکت و فساد میں نہیں ڈالیں گے۔

۲۷۔ بنو نجار کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

۲۸۔ بنو حارث کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

۲۹۔ بنو ساعدہ کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

۳۰۔ بنو جشم کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

۳۱۔ بنو اوس کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

۳۲۔ بنو ثعلبہ کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں البتہ جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے گا، وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔

۳۳۔ جفنہ بنو ثعلبہ کی شاخ ہیں لہٰذا یہود بنی جفنہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہود بنو ثعلبہ کے ہیں۔

۳۴۔ بنی شطیبہ کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو یہود بنی عوف کے ہیں، وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۵۔ بنی ثعلبہ کے موالی کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

۳۶۔ یہودیوں کے قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

۳۷۔ کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہ نکلے۔

۳۸۔ زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی، جو شخص خون ریزی کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر ہوگی۔ بجز اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور خدا اس کے ساتھ ہے۔

۳۹۔ یہود اپنے خرچ کے ذمے دار ہوں گے اور مسلمان اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے۔

۴۰۔ اس معاہدے کے شرکاء کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کی خیر خواہی پر کاربند رہیں گے اور باہم مشورہ کریں گے۔ ان کا شیوہ وفاداری ہوگا نہ کہ عہد شکنی کا۔

۴۱۔ کسی شخص کو حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کو ہر حال میں مدد دی جائے گی۔

۴۲۔ یہود جب تک ایمان والوں کے ساتھ ہو کر جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارف جنگ خود ادا کریں گے۔

۴۳۔ یثرب کا میدان اس عہد نامے کے شرکاء کے لیے مقدس و محترم ہوگا۔

۴۴۔ پناہ گزین کے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو پناہ دہندہ کے ساتھ ہو رہا ہو۔ نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود عہد شکنی کرے گا۔

۴۵۔ کسی عورت کو اس کے کنبے والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۶۔ اس معاہدے کے شرکاء کے درمیان کوئی نئی بات، معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے، جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ اور محمد ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس عہد نامے میں جو کچھ درج ہے، اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کی پابندی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفا شعاری سے کی جائے۔

۴۷۔ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی اور نہ اس شخص کو جو ان کا معاون ہو۔

۴۸۔ اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو تو ان معاہد فریقوں، یعنی یہودیوں اور مسلمانوں پر ایک دوسرے

کی مدد کرنا لازم ہوگا۔

۴۹۔ اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں اور اس میں شریک رہیں گے۔ اس طرح جب وہ کسی کو صلح کے لیے بلائیں گے تو اُسے قبول کریں گے اور مسلمانوں پر بھی قبول کر لینا لازم ہوگا سوائے اس صورت کے کہ جنگ دین کے لیے ہو۔

۵۰۔ ہر شخص یا گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

۵۱۔ اوس کے یہودیوں کے خواہ وہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس معاہدہ قبول کرنے والوں کو حاصل ہیں۔

۵۲۔ اس عہدنامے کے حکم میں ظالم وخطاکار داخل نہیں۔ جو جنگ کے لیے نکلے وہ بھی اور جو گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی اس کا حقدار ہوگا۔ صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم و جرم کے مرتکب ہوں گے۔

۵۳۔ اللہ اس کا حامی ونگہبان ہے جو عہد و قرار میں وفا شعار اور پرہیزگار ہو۔ اور اللہ کے رسول ﷺ بھی اس کے حامی ہیں (۳۴)۔

۴: معاہدۂ جہینہ:

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو قبیلہ جہینہ کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک دوسرے کے علاقے میں سے گزرنے اور آمد ورفت کے معاہدہ کی درخواست کی کیونکہ یہ قبیلہ مدینہ سے تین منزل کے فاصلے پر آباد تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کی اور درج ذیل امور پر معاہدہ ہوا:

۱: ان لوگوں کو ان کے جان و مال میں امان ہے جو شخص ان پر ظلم کرے یا ان سے جنگ کرے اُس کے خلاف ان کی مدد کی جائے گی۔ سوائے اس کے کہ وہ ظلم و جنگ، دین یا اہل وعیال کے بارے میں ہو۔

۲: ان کے خانہ بدوشوں میں سے جو نیکوکار اور پرہیزگار ہوگا اس کے وہی حقوق ہوں گے جو اُن کے شہریوں کے ہیں۔ اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے (۳۵)۔

۵: معاہدہ ابواء:

رسول اللہ ﷺ ستر مہاجرین کے ساتھ غزوہ ابواء کے سلسلے میں صفر ۲ھ کو ودان مقام پر پہنچے، یہ پہلا غزوہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ شریک ہوئے۔ البتہ لڑائی کی نوبت تو نہیں آئی لیکن میثاق مدینہ کی کڑی کے طور پر آپ ﷺ نے بنوضمرہ کے سردار مخشی بن عمرو ضمری سے معاہدہ کیا۔ جو درج ذیل ہے:

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

هذا كتاب من محمد رسول اللّٰه، لبني ضمرة:

بأنهم آمنو على أموالهم وأنفسهم، وأنّ لهم النصر على من رامهم، إلا أن يحاربوا في دين اللّٰه مابل بحر صوفةً. وإن النبي إذا دعاهم لنصره أجابوه. عليهم بذلك ذِمّة اللّٰه وذِمّة رسوله. ولهم النّصر على من بَرَّ منهم واتّقى''(۳٦)۔

(یہ بنوضمرہ کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے۔ یہ لوگ اپنے جان اور مال کے بارے میں مامون رہیں گے اور جو ان پر یورش کرے گا اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے گی۔ اِلّا یہ کہ خود اللہ کے دین کے خلاف جنگ کریں۔ (یہ معاہدہ اس وقت تک کے لیے ہے) جب تک سمندر اُن کو تر کرے یعنی ہمیشہ کے لیے ہے اور جب نبی ﷺ اپنی مدد کے لیے انھیں آواز دیں گے تو انھیں آنا ہوگا)۔

٦: معاہدۂ حدیبیہ:

رسول اللہ ﷺ کو خواب دکھلایا گیا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام ؓ مسجد حرام میں داخل ہوئے، آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کی کنجی لی اور صحابہ سمیت بیت اللہ کا طواف اور عمرہ کیا۔ پھر کچھ لوگوں نے سر کے بال منڈائے اور کچھ نے کٹوانے پر اکتفا کیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو اس خواب کی اطلاع دی تو انھیں بڑی مسرت ہوئی اور انھوں نے یہ سمجھا کہ اس سال مکہ میں داخلہ نصیب ہوگا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو یہ بھی بتلایا کہ آپ ﷺ عمرہ ادا فرمائیں گے لہٰذا صحابہ کرام ؓ بھی سفر کے لیے تیار ہو گئے۔

یکم ذی القعدہ ٦ھ کو آپ ؐ چودہ سو صحابہ کرام ؓ کے ساتھ روانہ ہو گئے، عسفان کے قریب

پہنچے تو آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ قریش مسلمانوں کی آمد سے آگاہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے عہد کیا ہے کہ آپ ﷺ کو کعبہ کی زیارت نہیں کرنے دیں گے۔ خالد بن ولید کی قیادت میں کفار قریش کا ایک دستہ کراع الغمیم پہنچا ہے۔ اس اطلاع پر آپ ﷺ نے راستہ تبدیل کر کے ثنیۃ المراء کی راہ اختیار کی اور حدیبیہ نامی کنویں کے قرب و جوار میں فروکش ہو گئے۔ یہاں سے سفارتی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

سب سے پہلے بدیل بن ورقا الخزاعی چند ساتھیوں کے ساتھ آیا اور آپ ﷺ کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ ساتھ ہی قریش کے لشکر اور آپ ﷺ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دینے کے ان کے عزائم کے متعلق بتایا۔

آپ ﷺ نے اسے بتایا کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کی خاطر آئے ہیں۔ لڑنے نہیں۔ بدیل نے قریش کو صورت حال بتائی لیکن قریش انھیں روکنے پر ضد کر رہے تھے۔ اب قریش نے مکرز بن حفص کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا تو آپ ﷺ نے اسے بھی وہی مدعا بیان کیا جو بُدیل سے فرمایا تھا۔

مکرز کے بعد قریش نے حلیس یا ابن زمان کو بھیجا۔ قریش کا مقصد یہ تھا کہ اگر حضرت محمد ﷺ نے حلیس کو ٹھکرایا تو یہ قبیلہ ہمارا طرفدار ہو جائے گا۔

آپ ﷺ نے اُسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ بندہ عبادت گزار قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے قربانی کے جانور دکھائے جائیں۔ حلیس قربانی کے جانور دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس نے قریش کو مسلمانوں کے مکہ میں داخلے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اس پر قریش سیخ پا ہو گئے۔ لیکن جب حلیس نے اپنے قبیلے سمیت قریش کے اتحاد سے الگ ہونے کی دھمکی دی تو قریش نے منت سماجت کر کے اسے منایا اور اتنی مہلت مانگی کہ کوئی باہمی مصالحت کی راہ نکل آئے (۳۷)۔

اب قریش نے عروۃ بن مسعود الثقفی کو حدیبیہ بھیجا۔ عروہ نے رسول اکرم ﷺ سے مسلمانوں کی آمد کا مقصد سننے کے بعد کہا کہ آپ ﷺ اپنی ہی قوم کا استحصال کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ کے ساتھی آپ ﷺ کو چھوڑ جائیں گے (۳۸)۔

یاد رکھیں کہ قریش چیتے کی کھالوں میں ملبوس ہیں اور آپ ﷺ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے (۳۹)۔ یہاں عروۃ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین تلخ کلامی ہو گئی۔ اس ملاقات کے دوران میں عروۃ نے

ایسے روح پرور مناظر بھی دیکھے کہ مسلمان آپ ﷺ کے لعاب دہن کو نیچے نہیں گرنے دیتے، آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی نیچے نہیں گرنے دیا جاتا۔ یہ نقوش عروۃ کے دل پر ثبت ہو گئے اور اُس نے واپسی پر قریش کو قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کی مثالیں دے کر سمجھایا کہ اتنے معزز تو وہ بھی نہیں جتنے محمد ﷺ ہیں، بہتر ہے کہ تم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرو (۴۰)۔

قریش کے پے در پے سُفراء کی آمد اور ان کی واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ اندازہ لگایا کہ ہوسکتا ہے کہ واپس جا کر سُفراء قریش پر پوری کیفیت عیاں نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا اپنا سفیر بھیجنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے خراش رضی اللہ عنہ بن امیہ کو ثعلب نامی اُونٹ پر مکہ بھیجا۔

قریش نے اُن کے اونٹ کو ذبح کر ڈالا اور خود خراش کو بھی شہید کر دینے کا ارادہ کیا مگر احابیش کی مداخلت پر وہ ایسا نہ کر سکے (۴۱)۔ اسی رات قریش کے چالیس یا پچاس نوجوان شب خون مارنے آئے تو وہ سب پکڑے گئے۔ لیکن آپ ﷺ نے انھیں معاف کر کے رہا کر دیا (۴۲)۔

بعد ازاں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو قریش کی طرف بھیجا۔ جنھوں نے عمائدین قریش کو آپ ﷺ کا پیغام پہنچایا تو قریش نے ان سے کہا کہ اگر تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کرلو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی عدم رفاقت میں اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاں روک لیا (۴۳)۔

جب قریش مکہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک رکھا تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ اب فیصلہ کن جنگ کے بغیر یہاں سے نہیں ہٹیں گے (۴۴)۔ اور مسلمانوں سے بیعت لی۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (۴۵) (اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے)۔

بیعت لینے کے بعد معلوم ہوا کہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر بے بنیاد تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش گھبرا گئے اور مسلمانوں کے ساتھ تجدید مذاکرات کے لیے سہیل بن عمرو کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن سہیل کو اس بات کا پابند کر دیا کہ وہ اس سال کسی صورت عمرہ کی شرط قبول نہ کریں (۴۶)۔

سہیل کی آمد کے فوراً بعد مذاکرات شروع ہو گئے۔ اور ذیل کے امور پر معاہدہ ہوا:

۱: رسول اللہ ﷺ اس سال مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائیں گے۔ اگلے سال مسلمان مکہ آئیں گے اور تین روز قیام کریں گے۔ ان کے ساتھ تلوار کا ہتھیار ہوگا۔ میانوں میں تلواریں ہوں گی، اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۲: دس سال تک فریقین جنگ بند رکھیں گے۔ اس عرصے میں لوگ مامون رہیں گے، کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔

۳: جو حضرت محمد ﷺ کے عہد و پیمان میں داخل ہونا چاہے داخل ہو سکے گا اور جو قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہونا چاہے ہو سکے گا۔ جو قبیلہ جس فریق میں شامل ہوگا اس فریق کا ایک جزو سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ایسے قبیلے پر زیادتی ہوئی تو خود اس فریق پر زیادتی متصور ہوگی۔

۴: قریش کا جو آدمی اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر یعنی بھاگ کر حضرت محمد ﷺ کے پاس جائے گا حضرت محمد ﷺ اسے واپس کر دیں گے لیکن حضرت محمد ﷺ کے ساتھیوں میں سے جو شخص پناہ کی غرض سے بھاگ کر قریش کے پاس آئے گا اسے واپس نہیں کریں گے (۴۷)۔

۱۲۔ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک:

اسلام سے قبل قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا وہ اذیت ناک تھا۔ اسلام کے پیغمبر نے جہاں اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی وہاں قیدیوں کے بارے میں بھی تاکید فرمائی کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ علماء نے لکھا ہے کہ عربوں کے ہاں جیل خانہ نہیں ہوتا تھا ان کے ہاں جب بھی کوئی قیدی آتا وہ اس کو تسمہ سے باندھ دیا کرتے تھے، تسمہ کو عربی میں ''اسیر'' کہا جاتا ہے۔ اس وجہ سے قیدی ''اسیر'' کہلاتے تھے۔

غزوہ بدر میں جو قیدی آئے ان کی تعداد ستر تھی، نبی اکرم ﷺ نے ان کو صحابہ کرام ؓ میں تقسیم کر دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ ''استوصوا بالاساری خیراً'' (۴۸)

صحابہ کرام ؓ نے اپنے پیغمبر ؐ کے اس فرمان پر اس طرح عمل کیا کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں

ملتی، خود بھوکے رہتے لیکن ان قیدیوں کو کھلاتے، چنانچہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی قید ہو کر آئے، جن انصار کے ہاں وہ قید تھے وہ بیچارے نہایت تنگ دست تھے۔ قیدی کا بیان ہے کہ جب وہ کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر ندامت ہوتی، چنانچہ روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ روٹی مجھ ہی کو واپس کر دیتے (۴۹)۔

ابو عزہ عمرو الجمحی مشہور شاعر تھا وہ اکثر سرکار دو عالم ﷺ کی ہجو میں شعر کہا کرتا تھا وہ بھی غزوہ بدر میں قیدی ہو کر آیا جب اس سے فدیہ کا مطالبہ کیا گیا تو کہنے لگا کہ میں تو تہی دست ہوں، پانچ لڑکیوں کا خرچ میرے ذمہ ہے لہٰذا آپ ﷺ مجھے بغیر فدیہ کے رہا کر دیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اس کا عذر قبول فرماتے ہوئے بلا فدیہ رہا کر دیا، وہ آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہوا اور مکہ میں جا کر آپ ﷺ کی تعریف میں اشعار اور قصیدے کہے (۵۰)۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو قید کی حالت میں مسجد میں رکھا، وہ تسمہ جس سے بندھے ہوئے تھے وہ سخت کسا ہوا تھا اس تکلیف کی وجہ سے کراہ رہے تھے کہ آپ ﷺ کے گوش مبارک میں ان کے کراہنے کی آواز پہنچ گئی۔ پیغمبر ﷺ کی آنکھوں سے نیند جاتی رہی، سخت پریشان اور بے چین تھے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا احساس ہوا تو سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا تسمہ ڈھیلا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے اسیروں کے تسمے بھی ڈھیلے کرا دیے (۵۱)۔

۱۳۔ ذمیوں کے حقوق:

رسول اللہ ﷺ کے دور اور بعد میں ذمیوں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے قاتل کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا "انا احق من ذمی بذمته" (۵۲) (میں ذمی سے زیادہ اس کے ذمہ کا حق دار ہوں)۔ ان کے حقوق کے متعلق فرمایا: "من قتل نفسا معاهداً لم یرح رائحة الجنة وان ریحها لیوجد من مسیرة اربعین عاماً" (۵۳) (جو معاہد (غیر مسلم ذمی) کو قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے)۔

❁❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ الحجرات:۱۳۔

۲۔ ابوداؤد، السنن (المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ بمصر) ص ۷۲۰، حدیث نمبر ۵۱۲۱۔

۳۔ الاحزاب: ۴۵-۴۶۔

۴۔ الفرقان:۱۔

۵۔ یوسف:۳۹۔

۶۔ الاعراف:۸۵۔

۷۔ نوح:۳۔

۸۔ آل عمران:۶۴۔

۹۔ النور:۵۵۔

۱۰۔ المائدہ:۱۔

۱۱۔ بنی اسرائیل:۳۴۔

۱۲۔ الانفال:۶۱-۶۲۔

۱۳۔ الحجرات:۱۳۔

۱۴۔ النساء:۷۵۔

۱۵۔ ابوداؤد، السنن: ص ۶۰۹، حدیث نمبر ۴۳۳۶۔

۱۶۔ الانفال:۶۰۔

۱۷۔ النساء:۱۰۲۔

۱۸۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ (مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۳۶ء) ۱/۳۵۹۔

۱۹۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعہ الوثائق السیاسیۃ (دار النفائس، بیروت، الطبعۃ الخامسۃ ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء) ص ۱۰۰۔

۲۰۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان (مؤسسۃ المعارف، بیروت ۱۹۸۷ء) ص ۱۲۸-۱۳۰۔

۲۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (دار صادر، بیروت ۱۹۸۵ء) ۱/۲۵۹۔

۲۲۔ مسلم، الجامع الصحیح (دارالسلام الریاض، ۱۹۹۸ء) ص ۷۸۸، حدیث نمبر ۴۶۰۷۔

۲۳۔ منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، مئی ۱۹۹۱ء) ۱/۱۵۱-۵۴

۲۴۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعہ الوثائق السیاسیۃ ص ۱۳۵-۱۳۶۔

۲۵۔ ایضاً ص ۱۶۲۔

۲۶۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۲۶۳؛ قریشی، محمد صدیق، رسول اکرمؐ کی سیاستِ خارجہ (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۷ء) ص ۴۰۔

۲۷۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، ص ۱۵۶-۱۵۷۔

۲۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۲۶۲۔

۲۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/۷۵؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۳۱۹۔

۳۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/۷۳-۷۴۔

۳۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۲۲۱-۲۲۲۔

۳۲۔ ایضاً، ۱/۲۲۲-۲۲۳۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/۱۴۷-۱۴۸؛ حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، ص ۵۹-۶۲ (ڈاکٹر صاحب نے ان ۵۳ شقوں کو ۴۷ شقوں میں سمو دیا ہے)۔

۳۵۔ ڈوگر، محمد رفیق، الامین ﷺ (دیدشنید پبلشرز، لاہور ۲۰۰۰ء) ۳/۵۲۱-۵۲۲۔

۳۶۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، ص ۲۶۷۔

۳۷۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۲۲-۳۲۶؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ ۳/۳۱۳-۳۱۶۔

۳۸۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، اردو (نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۷ء) ۱/۳۳۰۔

۳۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۲۷۔

۴۰۔ ایضاً، ۳/۳۲۸؛ طبری، تاریخ طبری (اردو) ۱/۳۳۱۔

۴۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۲۸۔

۴۲۔ طبری، تاریخ طبری (اردو) ۱/۳۳۳۔

۴۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۲۹۔

۴۴۔ طبری، تاریخ طبری (اردو) ۱/۳۳۴۔

۴۵۔ الفتح: ۱۸۔

۴۶۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۳/۳۳۱۔

۴۷۔ ایضاً، ۳/۳۳۱-۳۳۲۔

۴۸۔ ایضاً، ۲/۳۰۰۔

۴۹۔ ایضاً، ۲/۳۰۱۔

۵۰۔ الواقدی، محمد بن عمر بن واقد، المغازی (عالم الکتب، بیروت) ۱/۱۱۰-۱۱۱؛
الحلبی، علی بن برھان الدین، السیرۃ الحلبیہ (داراحیاء التراث العربی، بیروت) ۲/۲۰۰۔

۵۱۔ الامین ﷺ، ۲/ ۲۷۷-۲۷۸۔

۵۲۔ محمد بن محمود، العنایۃ شرح الھدایۃ (مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ) ۸/ ۲۵۶۔

۵۳۔ بخاری، الجامع الصحیح ص۱۱۹۱، حدیث نمبر۶۹۱۴؛
ابن ماجہ، السنن (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۹ء) ص۳۸۶ حدیث نمبر۲۶۸۶۔

❁❁❁❁

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور استحکام پاکستان

پاکستان اپنے معرض وجود میں آنے کے ساٹھ برس مکمل کر چکا ہے اور یہ ملک جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت سے ہدایت حاصل کی جائے۔ ہماری اصلاح اور فلاح کا دارومدار اسی پر ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا تھا: ”لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح بها أولها“ اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح صرف اس کے ساتھ ہوگی جس کے ساتھ پہلے لوگوں کی ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معاشرے کو ٹھیک کرنے اور استحکام پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ امریکہ، برطانیہ، چین اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے افکار کو پڑھا جائے یا زیادہ سے زیادہ انقلاب ایران پر آ کر بات کو ختم کر دیا جاتا ہے کہ معاشرہ بہت زیادہ بگڑ چکا ہے اور مغرب سے سبق سیکھنے کے علاوہ اب کوئی چارۂ کار نہیں جبکہ سیرت نبوی ﷺ کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس معاشرے کو پاک کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا ہمارا معاشرہ کافی خرابیوں کے باوجود اللہ کے فضل وکرم سے اس نہج کو نہیں پہنچا، لہٰذا سیرت نبوی ﷺ پر عمل کرنے اور محمد رسول اللہ کی تعلیمات کو عام کرنے سے کوئی وجہ نہیں کہ معاشرے کی اصلاح اور استحکام پاکستان کا مقصد حاصل نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ جس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے عرب معاشرہ ہر لحاظ سے اس کی ضد تھا۔ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر معاشرے کی بنیاد عقیدہ توحید پر تھی یعنی اللہ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے وہ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے علاوہ نفع ونقصان کا کوئی مالک نہیں جبکہ عرب کے باشندے ہر قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔ عرب معاشرہ میں ظلم عام تھا جبکہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر معاشرہ میں اصل بنیاد ہی عدل تھی۔ ان کے ہاں خاندان اور طبقات کا نظام تھا۔ لڑکیوں کی پیدائش کو ہی باعث ذلت سمجھا جاتا تھا جب کہ محمد ﷺ نے عورت کو عزت وتوقیر بخشی۔ آنحضرت ﷺ کے مجوزہ معاشرے کی بنیاد مساوات پر تھی۔ معاشی لحاظ سے وہ لوگ سود کے عادی تھے۔ حلال وحرام کی تمیز نہ تھی دوسروں کا مال کھالینا ان کے ہاں معیوب نہ تھا۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے کی چند معاشرتی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کی ایک

جھلک پیش کی جائے۔

جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول عام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی پرستش میں مشغول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ سے عملاً وقلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہوگیا تھا اور عبودیت اور بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال انھیں کے ساتھ مخصوص ہوگئے تھے۔عرب میں ہر ایک قبیلے، شہر اور علاقے کا اپنا بُت ہوتا تھا یہاں تک کہ ہر گھر کا بُت جدا تھا۔مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے (۱)۔ بتوں کے علاوہ بھی ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے۔فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثاً﴾(۲) (اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں (اللہ کی) بیٹیاں مقرر کیا)۔قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی (۳)۔صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا۔بنو تمیم وبران کی، لخم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا (۴)۔

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کیے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں۔شراب عام طور پر پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری میں بار بار آیا ہے۔شراب کی دکانیں برسرِ راہ تھیں طوائفیں بہت تھیں اور علامت کے طور پر ان کے گھروں پر پھریرا لہراتا تھا۔زنا کو کچھ معیوب بات نہ سمجھا جاتا تھا (۵)۔

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے تھے اور اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے (۶)۔

عورت کے ساتھ ظلم وبدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی، اس کے حقوق پامال کیے جاتے، اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے، وہ ترکہ اور میراث میں سے کچھ حصہ نہ پاتی تھی اور دوسرے مال ومتاع کی طرح عورت بھی وراثت میں منتقل ہوتی تھی۔شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے (۷)۔

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ ہشیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام قبائل میں رائج تھا (۸)۔

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور گروہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے: ''انصر اخاك ظالماً او مظلوما'' (۹) (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم)۔

ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا تھا جن سے بیگار لی جاتی تھی، کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (۱۰) (خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد مچ گیا)۔ یہ اس وقت کے کائناتی حالات کی مختصر مگر جامع صورتحال ہے۔ تمام دنیا پر بہیمانہ طاقت کی حکومت تھی۔ میزان عدل ٹوٹ چکا تھا انسانیت زخموں سے چور چور تھی۔ بادشاہت بے رحم تھی۔ ظلم کی حکمرانی تھی۔ ان کے خونی ہاتھوں نے اطاعت گزاروں کی گردنیں دبوچی ہوئی تھیں۔ حاکم بے ضمیر تھے، ان کی زندگی کا مقصد نفس پرستی اور بوالہوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عیسائیت اور یہودیت کے دعویدار بھی ان بیماریوں کا شکار تھے۔ پھر اس پیغام کے ساتھ ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ﴾ (۱۱) (اے اہل کتاب ایک کلمے کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کی پوجا نہ کریں)۔ اس انقلاب سے دنیا کا نقشہ بدل گیا۔ یہ دراصل پیغام نجات تھا۔ سورہ اعراف میں فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۲) (وہ ان پر سے بوجھ اتارتا ہے اور طوق جو ان کے اوپر تھے)۔ حضور ﷺ انسان کے بنیادی مسائل یعنی خوف، بھوک، رہائش، سامان زیست اور جہالت کا حل لے کر تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (۱۳) (ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

آج کے دور میں مغرب کے لوگوں کو انسانی حقوق کے علمبردار ہونے کا دعویٰ ہے جبکہ ان کی

تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑھ کر حقوق غصب کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ انسانوں کا تزکیہ حضورﷺ کا اصل مشن تھا۔ اس کے متعلق فرمایا گیا: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ﴾(۱۴) (البتہ تحقیق اللہ نے مومنین پر احسان کیا جب انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو اسکی آیات پڑھ کر انھیں سناتا ہے۔ اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

آنحضرتﷺ کے لائے ہوئے انقلاب سے تہذیب سے عاری علاقہ تہذیب و شائستگی کا مرکز بن گیا جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے وہ بھائی بھائی بن گئے جہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا وہاں امن و آشتی کے پھول کھل اٹھے۔

وحشت و بربریت کی اس سرزمین سے ایک ایسا حسین معاشرہ وجود میں آیا جس کی نظیر زمین و آسمان نے نہیں دیکھی۔ وہ ایسا نمونہ تھا جو رہتی دنیا تک قابل اتباع اور ہر لحاظ سے کامل واکمل ہے اس میں وہ تمام اوصاف یکجا ہو گئے جو مختلف انبیاء میں فرداً فرداً پائے جاتے تھے وہ تمام آپﷺ میں تھے۔ مولانا جامی کا مشہور شعر ہے:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

خدا کے فضل و کرم سے وہی سیرت طیبہ آج بھی ہمارے پاس اپنی صحیح شکل وصورت میں محفوظ ہے۔ اسی سیرت طیبہ کے بڑے بڑے محقق اور عالم ہمارے درمیان موجود ہیں پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تبدیلی رونما نہیں ہوتی؟

حضورﷺ کی ۲۳ سالہ حیات کے دو واضح دور ہیں: پہلا دور مکی زندگی جو تیرہ سال جاری رہا اور دوسرا دور مدنی زندگی جو دس سال کو محیط ہے۔

پہلے دور میں کوئی حکومت نہ تھی۔ اخلاق واعمال اور سیرت و کردار کی تعمیر پر سارا وقت صرف کیا گیا، سب سے پہلے توحید سے معاشرے کی اصلاح شروع کی گئی تا کہ وہ قول و فعل ہر لحاظ سے اللہ کے

بندے بن جائیں۔ آخرت کا صحیح تصور بھی ان کے ذہنوں میں راسخ کیا گیا۔ رسالت کا عقیدہ بھی راسخ کیا گیا۔ اخلاقی اعمال میں غریبوں کی اعانت پر بہت زور دیا گیا۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، یتیموں کی کفالت کرنا اور اس کے ساتھ دو قسم کی عبادتوں کا حکم ملا یعنی نماز اور زکوٰۃ۔ نماز انسان کے دل میں عقائد کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ یہ ایمان کا عملی ثبوت تھا اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی محبت کو مال پر ترجیح دینا ہے، اس سے معاشرے کے نادار طبقوں سے اغنیاء کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

مدنی زندگی میں اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ زکوٰۃ جس کی مکہ میں ترغیب دی گئی تھی یہاں آ کر فرض ہوئی۔ روزے اور جہاد کی فرضیت کے احکام نازل ہوئے اور شراب حرام قرار پائی۔ بین الاقوامی تعلقات کی ابتداء کی وجہ سے مسلمانوں کا قانون بین الاقوام وجود میں آیا۔

دونوں ادوار میں انسانی زندگی کا مکمل احاطہ کر لیا گیا۔ پاکستان کے استحکام کے لیے اسی طریق پر تربیت کی ضرورت ہے جس سے حضور ﷺ نے عرب کے بدوؤں کی اصلاح کی اور مدینے میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت محمد ﷺ کے طریق تربیت میں محبت و دل سوزی، مزاج و نفسیات کا خیال رکھنا، بتدریج تربیت، اخلاص، علم، صبر و تحمل، حسن گفتار اور حسن کردار اہم ہیں لیکن سب سے امتیازی وصف ان کا اپنا عملی نمونہ تھا۔ رسول اکرم ﷺ کسی بھی بات کا دوسروں کو حکم دینے سے پہلے خود عمل کرتے تھے اور ہمیشہ دوسروں سے بڑھ کر عبادات میں مشغول رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کو دن رات میں پانچ وقت فرض نماز ادا کرنے کا حکم دیا جبکہ خود حضور ﷺ اشراق، چاشت اور تہجد ادا کرتے اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق اس طرح ذکر اللہ میں کھڑے رہتے کہ پائے مبارک میں ورم آ جاتا "کان یصلی حتی ترم قدماہ" (۱۵) (آپ ﷺ نماز پڑھتے یہاں تک کہ پاؤں سوج جاتے)۔

آپ ﷺ نے روزوں کا حکم دیا عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی مہینہ اور کوئی ہفتہ روزوں سے خالی نہ جاتا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کبھی افطار ہی نہ کریں گے (۱۶)۔ اسی طرح

زکوٰۃ وخیرات کا حکم دیا تو خود پہلے عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہؓ شہادت دیتی ہیں "آپ ﷺ قرض داروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں" (۱۷)۔ دوسروں کو حکم دیا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (۱۸) (جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں)، اور خود کا یہ عالم تھا کہ جو آیا خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے "انما انا قاسم والله يعطى" (۱۹) آپ نے زہد وقناعت کی تعلیم دی اور ان کا اپنا عالم یہ تھا کہ عرب کے گوشے گوشے سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ وصدقات کے خزانے لدے آتے مگر امیر عرب ﷺ کے گھر میں وہی فقر و فاقہ ہی رہتا تھا۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: حضور ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی کبھی سیر ہو کر آپ ﷺ نے کھانا نہ کھایا (۲۰) دوسروں کو ایثار کا سبق دیا خود ان کا نمونہ یہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کے گھر عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ چکی پیستے پیستے ہتھیلیوں میں گٹے پڑ گئے تھے (۲۱)۔

آج پاکستان کو جن مسائل کا سامنا ہے اور استحکام پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ ان کو حل کیا جائے ان میں دہشت گردی، کرپشن، رشوت، سود، کمزور معاشیات، ذخیرہ اندوزی، افلاس، بیروزگاری، مذہبی فرقہ پرستی، مغرب کی اندھی تقلید، بے دینی، بے جا آزادی نسواں کا مطالبہ اور مسئلہ کشمیر سرفہرست ہیں۔

رشوت اور بددیانتی کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (۲۲) (اے لوگو جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ مگر سوداگری کر کے ایک دوسرے کی رضامندی سے)۔

مال کے حصول کے ناجائز ذرائع میں سے ایک ذریعہ رشوت ہے۔ اسی طرح سفارش کے ضمن میں ہدیہ قبول کرنے کو حضور ﷺ نے سود قرار دیا ہے۔

حضرت ابوامامہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "من شفع لاحد شفاعة فأهدى له هدية عليها فقبلها فقد أتى بابا عظيما من أبواب الربوا" (۲۳) (جس نے کسی کی سفارش کی اس پر اس کو تحفہ دیا گیا اور اس نے قبول کر لیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے

دروازے پر آیا)۔رشوت لینا حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے۔آج ہماری معیشت کی بنیاد سود پر ہے حالانکہ حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ہماری معیشت کی فلاح سود سے مکمل طور پر چھٹکارا پانے میں ہے۔

قرآن مجید نے: ﴿فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِه﴾ (۲۴) (اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کرو)۔سود خوری کو اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا: "لعن اللہ آکل الربوا، ومؤکلہ، وشاھدہ وقال: ھم سواء" (۲۵) (اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس پر گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے اور کہا: وہ سب برابر ہیں)۔اس لیے ہمیں اس لعنت سے لیت ولعل کے بغیر چھٹکارا پانا چاہیے۔ پاکستان میں بعض مغرب زدہ طبقے عورتوں کے حقوق کے بارے میں اخبارات، ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ عورت کے حقوق غصب کیے جارہے ہیں۔حالانکہ اسلام نے جو حقوق عورت کو دیے ہیں اور جو ذمہ داریاں اس پر ڈالی ہیں ان کو مدنظر رکھا جائے تو استحکام پاکستان میں بہت مدد مل سکتی ہے۔عورت کا کردار معاشرے کی تشکیل میں بہت اہم اور اساسی ہے۔اگر عورت بحیثیت ماں، بیٹی، بہن اور بیوی اپنے فرائض کو صحیح سمجھے تو معاشرتی بگاڑ کی صورت ہی پیدا نہ ہو۔موجودہ دور میں دہشت گردی، تخریب کاری، ڈاکہ زنی، رہزنی، بے حیائی اور دیگر اخلاقی اقدار کی پامالی کا سبب نوجوان نسل کی تربیت میں کمی ہے۔ان تمام چیزوں کا حل یہی ہے کہ نوجوان نسل کی صحیح تربیت کی جائے اور ان کے کردار کا خیال رکھا جائے، جو اصل میں عورت کی ذمہ داری ہے، ان کی ابتداء سے ہی دینی اور اخلاقی خطوط پر تربیت کی جائے تو پاکستانی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "ما نحل والد ولدہ احسن من ادب حسن" (۲۶) (کسی باپ نے اپنی اولاد کو ادب سے بڑھ کر تحفہ نہیں دیا)۔لیکن آج کل مغرب سے متاثر ہو کر ہماری عورتیں بچے کو دودھ پلانا اور تربیت کرنا تو کجا بلکہ ملازموں اور نوکروں سے بچوں کی تربیت کرواتی ہیں اور مغربی معاشرے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق ہو جاتی ہے جس کا اثر بچوں پر پڑتا ہے۔مغربی ممالک میں جرائم کو دیکھ کر ہی Sir Alferd Deming نے درست لکھا تھا "اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں سے نمودار ہوتے ہیں" (۲۷)۔

ہمارے ملک میں آزادی اور ثقافت کے نام پر بے حیائی اور فحاشی کے پروگرام عام ہوتے ہیں۔ اکتیس دسمبر اور یکم جنوری کو بعض مخصوص مقامات پر ایسے پروگرام ہوتے ہیں جن میں امریکہ اور یورپ سے ہم کسی طرح پیچھے نہیں رہتے۔ اسی طرح بعض اخبارات اور جرائد میں دلفریب خواتین کی تصاویر محض کشش پیدا کرنے کے لیے دی جاتی ہیں جبکہ بعض غیر ملکی خواتین کی تصویریں بھی نیم عریاں لباس میں دکھائی جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تقریباً ہر روز مغربی ممالک کی عورتوں کے کھیل دکھائے جاتے ہیں بلکہ تیراکی کے پروگرام بھی۔ جن سے معاشرے میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور بے حیائی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**اذا لم تستحی فاصنع ما شئت**" (۲۸) (جب آپ میں حیا ختم ہو جائے تو پھر جو چاہو کرو) اسی طرح مغرب کی نقالی سے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اور لادینیت در آتی ہے ہمارے نوجوان اور عورتیں لباس اور بالوں کی تراش خراش میں مغربی عورتوں کی نقالی کرتے ہیں بعض مسلمان سیرت نبوی کی پیروی کی بجائے مغرب کی طرف رجحان رکھتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ایک سچا مسلمان کہلوانے سے بھی ڈرتے ہیں جیسے بنیاد پرست کہلوانے کا ہوا اہل مغرب نے ہمارے ذہنوں میں بھرا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کر فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

استحکامِ پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو مناسب روزگار کے مواقع مہیا کیے جائیں، معقول تنخواہیں دی جائیں، گداگری کو ختم کرنے کے لیے غرباء کا خیال رکھا جائے اور ان کو روزگار دیا جائے اس سلسلے میں آنحضور ﷺ کی تعلیمات لوگوں میں عام کی جائیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر کوئی لکڑی کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے، اس کو بیچے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کی آبرو قائم رکھے تو یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے وہ اس کو دیں یا نہ دیں'' (۲۹)۔
ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو لوگوں سے مانگتا رہتا ہے وہ اس حالت میں آئے گا

کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا (۳۰)۔

اسی طرح سے جرائم کو ختم کرنے کے لیے اسلامی حدود کو نافذ کیا جائے، ہر روز اخبارات میں آٹھ، دس بے گناہ لوگوں کے قتل کے واقعات درج ہوتے ہیں لیکن ان کی سزا کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہوتا مقدمے کا فیصلہ پندرہ، بیس روز میں عدل کے مطابق ہو اور مجرم کو برسرعام سزا دی جائے۔ قرآن مجید نے اس کو زندگی قرار دیا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (۳۱) (عقلمندو قصاص کا قاعدہ تمھارے لیے زندگی ہے تاکہ تم بچو) اور آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اقامة حد من حدود الله خير من مطر اربعين يوماً'' (۳۲) (اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو نافذ کرنا چالیس دن کی بارش سے بہتر ہے)۔

ذخیرہ اندوزی کو نا قابل معافی جرم قرار دیا جائے اور اس کے مرتکب کو سزا دی جائے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''المحتكر ملعون'' (۳۳) (ذخیرہ اندوز ملعون ہے)۔

محنت کش طبقے کو اس کے حقوق دیے جائیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اعطوا لا جير اجره قبل ان يجف عرقه'' (۳۴) (مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو)۔ اور فرمایا: ''خير الكاسب العامل اذا نصح'' (۳۵) (کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر محنت کش وہ ہے جو اخلاص سے محنت کرتا ہے)۔

معیشت کے میدان میں حضور ﷺ کی تعلیمات کو ہمیشہ مدّ نظر رکھا جائے۔ حلال و حرام کا خیال کیا جائے، منشیات والی چیزوں سے بچا جائے۔ وسیع معاشی ڈھانچے کے باوجود ہم مکمل طور پر اقتصادی استحصال سے آزاد نہیں ہیں۔ پاکستان کے حالات سے ظاہر ہے کہ ہمارا معاشی ڈھانچہ اور اس کے اندر جاری و ساری و تمدنی روح دونوں ناہمواریوں کا شکار اور خستہ حال ہیں۔ اس کی بنیادی وجوہات معاشی ناہمواریاں، جاگیردارانہ تسلط، صنعت کاروں کی گرفت، غرباء، آبادی کا دباؤ، غیر ضروری انتظامی افسران، غیر پیداواری اخراجات اور علم و فن کی زبوں حالی ہیں۔ پاکستان میں اسلام کا مکمل نفاذ ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ اقبال نے سچ فرمایا تھا:

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیر و میر و پیر
تیرے جہاں میں وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کسی آدمی نے آ کر فاقہ کی شکایت کی پھر کوئی آدمی آیا اس نے ڈاکے کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عدی کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے، میں نے کہا نہیں دیکھا لیکن اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر آپ کی لمبی عمر ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور خانہ کعبہ کا طواف کرے گی۔ اللہ کے علاوہ کسی کا اس کو ڈر نہیں ہوگا۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے اپنے دل میں سوچا قبیلہ طے کے ڈاکو کدھر جائیں گے۔ جنھوں نے علاقے میں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی اس وقت ارشاد فرمایا: اگر آپ کی زندگی لمبی ہوئی تو آپ کسریٰ کے خزانوں کو فتح کریں گے میں نے کہا کسریٰ بن ہرمز اور آپ ﷺ نے فرمایا: کسریٰ بن ہرمز، اور آپ کی زندگی لمبی ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا لے کر صدقہ و خیرات کے لیے نکلے گا مگر کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے اس عورت کو دیکھا جس نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا ڈر نہ تھا اور میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنھوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے تقسیم کیے اور اگر آپ لوگ زندہ رہے تو آپ دیکھیں گے جو پیغمبر علیہ السلام نے مٹھی بھر سونا لے کر نکلنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا(۳۶)۔ یہ حضور ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب ان کے اپنے ملک میں بھی پریشانی کا عالم تھا۔ حضور ﷺ کا لایا ہوا نظام خوشحالی، امن و سلامتی، محبت و پیار اور آسودگی کا ضامن ہے۔ ہم نے پیغمبر علیہ السلام سے تعلق توڑ کر پریشانی، چوری، ڈاکے، بھوک، بے حیائی اور ڈر کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کیا۔ پاکستان میں اسلام کا مکمل نفاذ ہی ہمارے تمام مسائل کا حل ممکن بنا سکتا ہے۔ اعجاز رحمانی صاحب نے سچ کہا ہے:

جس قدر رازم بھی ہیں جہاں کے ان سے انسان کو کیا ملا ہے
دامن مصطفیٰ چھوڑنے سے آدمی کرب میں مبتلا ہے

قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۳۷) (پھر جو لوگ اس (پیغمبر) کا حکم نہیں مانتے ان کو ڈرنا چاہیے کوئی مصیبت ان پر آن پڑے یا (آخرت میں) کسی تکلیف کا عذاب ان کو نہ پہنچے)۔ ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ وَلَـكِن كَذَّبُواْ فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ﴾ (۳۸) (اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لاتے اور برے کاموں سے بچے رہتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتیں کھول دیتے مگر انھوں نے تو ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان کے کاموں کی سزا میں ان کو پکڑا)۔

حضرت ابو امامہ ؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "من اقتطع حق امری مسلم بیمینه فقد اوجب الله له النار وحرم الله علیه الجنة" (۳۹) (جس شخص نے کسی مسلمان کا حق قسم اٹھا کر کھالیا اس پر اللہ جہنم واجب کرے گا اور جنت حرام کرے گا)۔

جدید مغربی فکر و فلسفہ کی بدولت اسلام کے خلاف خود مسلمانوں ہی کے مغرب زدہ طبقہ کے اندر جو ذہنی اور عملی بغاوت پھیل رہی ہے۔ اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔

زیادہ سے زیادہ علمی و تحقیقی اداروں کی ضرورت ہے جو نظریۂ پاکستان کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے سمجھائیں اور اسلام اور پاکستان کی خدمت کے لیے ذہین اور صالح الفطرت نوجوانوں کی تربیت بھی کریں۔

پاکستان کو مندرجہ ذیل شعبوں میں استحکام کی ضرورت ہے۔

۱: معاشرتی استحکام۔

۲: سیاسی استحکام۔

۳: اقتصادی استحکام۔

معاشرتی استحکام:

دین سے محبت اور حب الوطنی کے جذبات رکھنے والے مسلمانوں اور خاص طور پر علماء کرام

کے لیے ضروری ہے کہ حالات کی نزاکت کے مطابق اپنی ذمہ داریوں پر غور کریں اور تمام بے جا قسم کی خودداریوں اور گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر پاکستان کی بقاو تحفظ کی راہیں سوچیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ہمارے قومی بلکہ ملّی کردار کا جزو شدید قسم کی جذباتیت ہے، ہم ٹھنڈے دل سے کسی سوچے سمجھے راستے پر دیر تک نہیں چل سکتے۔ اس سلسلے میں اصلاح کی ضرورت ہے

۲۔ باہمی اتحاد ہو، اہل سیاست میں بھی، اہل دین میں بھی اور عوام میں بھی۔ یہ اتحاد صرف اور صرف سیرت النبی ﷺ پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ معاشرتی ناہمواریاں ختم کرنا ہوں گی۔

۴۔ طبقاتی و گروہی کشمکش کو ختم کرنا ہوگا۔

۵۔ عائلی نظام کو صحیح اسوۂ حسنہ پر استوار کیا جائے۔

۶۔ شراب نوشی و سمگلنگ کو قطعی طور خاتمہ کیا جائے۔

۷۔ دہشت گردی ولاقانونیت کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

۸۔ معاشرے میں بے سکونی اور بدامنی کو ختم کرنا ہوگا۔

۹۔ مغرب کی ثقافتی یلغار جو کہ بذریعہ اخبارات اور ذرائع ابلاغ سے ہو رہی ہے اس کو روکا جائے۔

۱۰۔ ایسے ماہر مبلغ ہوں جو کہ عوام کی ذہن سازی کریں اور استحکامِ پاکستان کے لیے جن امور کی اشد ضرورت ہو عوام کے اندر اس کو اجاگر کیا جائے۔

۱۱۔ ایمان کی تجدید، اسلامی عبادات کی پابندی اور اخلاقی قدروں کا احترام کیا جائے۔

۱۲۔ فلسفہ اور سائنس کے جدید علوم حاصل کیے جائیں اور ملک میں تجرباتی لیبارٹریز کھولی جائیں جن میں نوجوان کام کرسکیں۔

۱۳۔ نظام تعلیم کی تشکیل نو کی جائے۔

۱۴۔ مخلوط مجالس، خواتین کا مردوں کے مابین کثرت سے گھومنا، عریانی یا فحاشی کا رنگ رکھنے والی ثقافت سے پرہیز، جنسی آوارگی کو فنون کے ذریعہ پھیلانے کی روک تھام اور بدکاری کا قلع

قمع کیا جائے۔

۱۵۔ ارشادِ نبوی ﷺ "خیرکم من تعلم القرآن وعلمه" (۴۰) کے مطابق ہر پڑھا لکھا آدمی کوشش کرے کہ آس پاس رہنے والے ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائے۔ اس مقصد کے تحت ہر مسجد میں تعلیم ہو۔

سیاسی استحکام:

سیاسی استحکام کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا کرنا ضروری ہے:

۱۔ جاگیردارانہ سیاست کو ختم کیا جائے۔

۲۔ پاکستان میں سول سروس کو عوام کا خادم بنایا جائے۔

۳۔ اسمبلیاں اور سینٹ کو شورائی نظام میں منتقل کیا جائے اور ان کی اصلاح کی جائے۔

۴۔ جرأت مند اور مخلص قیادت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

۵۔ حکمران اپنے تمام تر تعصبات (گروہی، لسانی) سے پاک ہو کر خالصتاً اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

۶۔ عوام کے اندر سیاسی شعور کو اجاگر کیا جائے۔

۷۔ انتخابات میں روپے پیسے، برادری اور گروہ بندی سے بالاتر ہو کر ووٹ دیں۔

۸۔ فوج ملکی حدود کی حفاظت تک محدود ہو۔

۹۔ انصاف سستا اور فوری مہیا کیا جائے۔

اقتصادی استحکام:

اقتصادی استحکام کے سلسلے میں درج ذیل اقدامات ضروری ہے:

۱۔ حضور ﷺ نے کفالت عامہ کا جو تصور دیا تھا اس کو معاشرے میں رائج کیا جائے۔

۲۔ زکوٰۃ کے نظام کو صحیح معنوں میں استوار کیا جائے اور اس کو بطور (Social Security System) کے رائج کیا جائے۔

۳۔ معاشرے میں ایسے افراد کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو ذخیرہ اندوزی، ناپ تول

میں کمی، سود، اسراف، بخل وغیرہ جیسے کبائر کے مرتکب ہوں۔ایسے لوگوں کو اسلامی حدود وتعزیرات کے مطابق سزا دی جائے۔

۴۔ عوام وخواص کو سادگی، کفایت شعاری، دیانت داری اور خود انحصاری کو اپنانا ہوگا۔

۵۔ آنجناب ﷺ نے سود کو حرام قرار دیا اور موجودہ دور میں تمام اسلامی ممالک میں اسلامی بنکاری ہو رہی ہے۔اس بنکاری میں کچھ سود کی شکل موجود ہے۔اس پر مزید اجتہاد کی ضرورت ہے۔

۶۔ درآمدات وبرآمدات کے نظام کو صحیح معنوں میں استوار کیا جائے اور ان معاملات میں ماہرین اور تجربہ کار لوگوں کی رائے کو سامنے رکھا جائے۔

۷۔ زراعت اور صنعت وتجارت کے میدانوں میں بہت اصلاح کی ضرورت ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر میدان میں ایسے تجربہ کار لوگوں کو شامل کیا جائے جو اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کریں۔

۸۔ معاشی ناہمواریوں کا حل نکالا جائے۔

۹۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں مصارف کا پیمانہ مقرر کر کے اچھا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن اس قانون پر عمل کرانے کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ دفاع کی شدید اہمیت اور وسیع تر مصارف سے بچنے کے لیے ایک تو کالجوں میں طلبہ کو فوجی ٹریننگ دی جائے اور دوسرے یہ کہ عوام میں سے نوجوان طبقہ کو ریزرو فوج کے طور پر تیار رکھا جائے۔

۱۱۔ جن لوگوں نے حکومت سے قرض لیے ہیں ان سے واپس لیے جائیں، اور معاف شدہ قرضے واپس لے کر قومی خزانے میں جمع کرائے جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کی فلاح وبہبود کا انحصار اسی پر ہے کہ ہم بطور اُمت محمدیہ کے صرف اس لیے دنیا میں لائے گئے تھے کہ انسان کو فساد سے نکال کر فلاح کے مقام تک پہنچا دیا جائے اور قیام پاکستان کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔اس مقصد کے لیے نیکیوں کو ماحول پر غالب کر دیں۔

کیا آج ہم اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر تیار ہیں تو اپنے ایمان وخوداری کے نور اور حیات طیبہ کی روشنی سے کام لے کر ان دردناک اور شرمناک احوال کا جلد از جلد ازالہ کریں جو قتل و غارت، ملاوٹ، قتل، زنا، سمگلنگ اور رشوت جیسے شیطانی کرتوتوں کے ذریعے ایک طرف ہماری ایمانی اور روحانی قدروں کو تباہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف وطن کی فضاؤں کو منحوس غیر اسلامی آلودگیوں سے بدنما بنا رہے ہیں۔

پہلے اپنے معاشرے کو بحران سے نکالیے اور پھر اپنے نئے پاکیزہ معاشرے کی تصویر ساتھ لے کر ساری دنیا میں ایمان اور قدروں کے احیاء کا پیغام پہنچایئے۔

علامہ اقبال نے صحیح فرمایا ہے:

کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

حوالہ جات

۱۔ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ (دارصادر، بیروت) ۲/۴۳۔

۲۔ الزخرف: ۱۹۔

۳۔ الکامل فی التاریخ، ۲/۴۴۔

۴۔ صاعد اندلسی، طبقات الامم (دارالکتب العلمیہ، بیروت) ص ۴۳۔

۵۔ سبعہ معلقات، معلقہ شعر، قد بت سامرھا (مکتبہ منشورات الآداب الشرقیہ) ص ۷۱۔

۶۔ الطبری، محمد بن جریر، جامع البیان (مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر) ۴/۵۹-۶۱۔

۷۔ البقرہ: ۲۳۲؛ النساء: ۱۹۔

۸۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (مجلس نشریات اسلام، کراچی) ص ۷۲۔

۹۔ الخطیب التبریزی، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (المکتبہ التجاریہ، داراحیاء التراث، بیروت) ۳/۶۶، حدیث نمبر ۴۹۵۷۔

۱۰۔ الروم: ۴۱۔

۱۱۔ آل عمران: ۶۴۔

۱۲۔ الاعراف: ۱۵۷۔

۱۳۔ الانبیاء: ۱۰۷۔

۱۴۔ آل عمران: ۱۶۴۔

۱۵۔ احمد بن حنبل، المسند (دارالفکر، قاہرہ) ۱/۲۵۵؛ البخاری، الجامع الصحیح (دارالسلام الریاض) ص ۱۸۱، حدیث نمبر ۱۱۳۰۔

۱۶۔ البخاری، الجامع الصحیح، ص ۳۱۶، حدیث نمبر ۱۹۶۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱، حدیث نمبر ۳۔

۱۸۔ البقرہ: ۳۔

۱۹۔ احمد، المسند، ۲/۲۳۴؛ طبرانی، المعجم الکبیر (احیاء التراث العربی، بیروت) ۱۹/۳۲۹-۳۳۰۔

۲۰۔ الہیثمی، مجمع الزوائد (دارالکتاب العربی، بیروت) ۱۰/۳۱۳؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (دارالکتب العلمیہ، بیروت) ۶/۶۰۔

۲۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۲/۴۶، حدیث نمبر ۲۳۸۷۔

۲۲۔ النساء: ۲۹۔

۲۳۔ احمد، المسند، ۵/۲۶۱۔

۲۴۔ البقرہ:۱۷۹۔

۲۵۔ احمد، المسند، ۱/ ۸۷؛ ۳/ ۳۰۴۔

۲۶۔ البدایہ والنھایہ، ۸/ ۳۲۰۔

۲۷۔ وحید الدین، علم جدید کا چیلنج (دار التذکیر، لاہور) ص ۲۱۷۔

۲۸۔ البخاری، الجامع الصحیح (دار السلام الریاض) ص ۱۰۶۸، حدیث نمبر ۶۱۲۰۔

۲۹۔ ایضاً ص ۲۳۹، حدیث نمبر ۱۴۱۷۔

۳۰۔ مشکاۃ المصابیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی) ص ۱۶۲۔

۳۱۔ البقرہ:۱۷۹۔

۳۲۔ عجلونی، کشف الخفا (مکتبہ دار التراث، قاہرہ) ۱/ ۱۸۱۔

۳۳۔ ابن ماجہ، السنن (دار السلام، الریاض) ص ۳۰۹، حدیث نمبر ۲۱۵۳۔

۳۴۔ البیہقی، السنن الکبریٰ (نشر السنہ، ملتان) ۶/ ۱۲۰؛ مجمع الزوائد، ۴/ ۹۷۔

۳۵۔ احمد، المسند، ۲/ ۳۴۴-۳۵۷۔

۳۶۔ البخاری، الجامع الصحیح (نور محمد اصح المطابع، کراچی) ۱/ ۵۰۷-۵۰۸؛ احمد، المسند، ۵/ ۲۶۰۔

۳۷۔ النور:۶۳۔

۳۸۔ الاعراف:۹۶۔

۳۹۔ احمد، المسند، ۵/ ۲۶۰۔

۴۰۔ البخاری، الجامع الصحیح، ۲/ ۷۵۲۔

ناموسِ رسالت ﷺ کے شرعی تقاضے

حرمت رسول ﷺ اور عقل:

انسان نے جو معاشرتی قوانین بنائے ہیں ان میں صاحب منصب اور بڑے لوگوں کے لیے ادب واحترام (Protocol) کا بھی قانون بنایا جو ان کے حسب مراتب انھیں تحفظ فراہم کرتا ہے اور ہر موقع پر اس کا خصوصی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جتنی بڑی شخصیت ہوگی اتنا ہی بڑا احترام دیا جائے گا۔ مراعات اور سہولتوں کی فراوانی ہوگی۔ خصوصی انتظامات سے نوازا جائے گا۔ یہ سب کچھ ان کے اس منصب کا تقاضا ہے کہ انھیں دوسروں پُر فوقیت اور اہمیت دی جائے۔ دنیا کے سبھی نظاموں میں اس کا تذکرہ موجود ہے جس کی بنیاد پر برسر اقتدار طبقہ مراعات سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر انسان اپنی عارضی حاکمیت کے دوران یہ سوچ سکتا ہے اور اس کی عملی تنفیذ کے لیے نہ صرف قانون سازی کر سکتا ہے بلکہ اس پر سختی سے عمل درآمد بھی کرا سکتا ہے تو قابل فکر بات یہ ہے کہ وہ رب العالمین جو کائنات کا خالق اور مالک ہے اس کے قبضۂ قدرت میں یہ سب نظام کائنات ہے وہی بادشاہی عطا کرنے والا ہے اور وہی جسے چاہے منصبِ نبوت سے سرفراز کرے اور جسے چاہے رسالت کی خلعت عطا فرمائے۔ وہ کیوں کر ان کے ادب واحترام کا قانون نہ بنائے گا۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین مخلوق انبیائے کرام ہیں ان کے وقار اور عظمت کو تسلیم کرایا اور ان کی عزت وعصمت کو سب انسانوں پر فوقیت دی۔ یہاں تک کہ حضرت محمد ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اپنے ذمہ لیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (۱) (اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے)۔

ویسے تو قرآن مجید کی ایک ایک آیت محمد رسول اللہ ﷺ کے مقام ومرتبہ کی گواہ ہے کہیں اللہ نے آپ ﷺ کی بعثت کو ایمان والوں پر اپنا احسان قرار دیا ہے تو کہیں نبی کریم ﷺ کی اتباع کو کامیابی اور کامرانی کا راستہ قرار دیا ہے۔ کبھی آپ ﷺ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو اللہ تعالیٰ اپنی بات قرار دے رہا ہے تو کہیں آپ ﷺ کی عمومی نبوت اور رسالت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اگر ایک جگہ آپ ﷺ کے اخلاق وکردار کا تذکرہ ہے تو دوسرے مقام پر آپ ﷺ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین کے

اوصاف حمیدہ بیان ہو رہے ہیں۔

قرآن مجید میں آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کے بیان سے پہلے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس بات کا جائزہ لے لیا جائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین کرنے والی قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا سلوک رہا ہے۔ قرآن مجید اقوام کے احوال و واقعات معلوم کرنے کا صحیح ترین ماخذ ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ ماضی میں جن قوموں نے بھی اپنے انبیاء کی توہین کی اور ان کا مذاق اڑایا وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے لوگوں پر اس امر میں کسی قسم کے جبر سے کام نہیں لیا کہ لوگ ان پر ضرور ایمان لائیں۔ حق کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار انسان کو حاصل ہے۔ اگر کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کے نبی کی تعلیمات نہ مانے، اپنے مذہب پر قائم رہے۔ لیکن جو نبی پر ایمان بھی نہ لائے اور نبی کی توہین بھی کرے، اس کے ساتھ تصادم کی پالیسی اپنائے تو ایسا شخص یا قوم دوہرے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔ ماضی میں جب کسی قوم کی طرف سے کسی نبی کے ساتھ توہین اور تصادم کی انتہا ہوگئی تو اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا انکار اور ان کی توہین کرنے میں عموماً قوموں کے سرداروں اور امراء کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام:

قوم نوح علیہ السلام پر پانی کا عذاب آیا۔ آسمان سے بارش برسی اور زمین نے اپنے چشمے ابل دیے۔ قوم پانی کے سیلاب میں غرق ہوگئی۔ اس قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور ان کا مذاق اُڑایا تھا اور ان کی دعوت کا انکار کیا۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے:

﴿فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ﴾ (۲) (ان کی قوم کے سردار جنھوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا بولے: ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں رذیل تھے بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار کر لی ہے، اور ہم کوئی چیز

بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔ بلکہ ہم تو تمھیں جھوٹا سمجھتے ہیں)۔

حضرت ھود علیہ السلام:

حضرت ھود علیہ السلام قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ قوم جسمانی قوت، اپنی عمارتوں کی بلندی، مضبوط ستونوں اور زبردست مملکت کی وجہ سے فخریہ طور پر یہ کہتی تھی: ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (۳)(کون ہے ہم سے زیادہ زورآور؟)۔

اس قوم نے اللہ کے رسول حضرت ھود علیہ السلام کو بے عقل اور جھوٹا کہا نعوذ باللہ ان پر خدا کے نام پر جھوٹ گھڑنے کا الزام لگایا۔ حضرت ھود علیہ السلام کو اپنے دیوتاؤں کے غضب میں مبتلا قرار دیا۔

پیغمبر کی توہین کی یہ قوم اللہ کے جس عذاب سے دوچار ہوئی اس کی روداد قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے۔

﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاء فَبُعْداً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (۴) (آخر کار ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے ان کو آ لیا اور ہم نے ان کو کچرا بنا کر پھینک دیا۔ دوری ہو ظالم قوم کے لیے)۔

﴿وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ .مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ﴾(۵)(اور تمھارے لیے نشانی ہے)عاد میں جب کہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیجی کہ جس چیز سے بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر کے رکھ دیا)۔

حضرت صالح علیہ السلام:

یہ برگزیدہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم ثمود میں مبعوث ہوئے تھے۔ اس قوم کا مسکن حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ کا پہاڑی علاقہ تھا۔ ان لوگوں نے بلند پہاڑوں اور ٹھوس پتھروں کو تراش کر اپنے لیے عالی شان عمارات تعمیر کی تھیں۔ ان کے محلات فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ جب اللہ کے پیغمبر کی ان لوگوں نے تکذیب کی تو انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ ﴿وَكَانُواْ يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً آمِنِينَ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴾(۶)(وہ پہاڑ تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف

اور مطمئن تھے۔آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے ہی آ لیا)۔

حضرت لوط علیہ السلام:

قوم لوط کا وطن سدوم کا علاقہ تھا۔اس قوم نے حضرت لوط علیہ السلام کی نہ صرف بات ماننے سے انکار کیا بلکہ ان کی اور ان کے خاندان کی پاکبازی پر بھی حرف گیری کی اور مذاق اڑایا۔قوم لوط کو ان کے جرائم کی سزا یہ ملی کہ آسمان سے پتھروں کی بارش ان پر برسی اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔ ﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ﴾ (۷) (مگر ان کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں)۔

﴿فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ. مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ﴾ (۸) (پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا)۔

حضرت شعیب علیہ السلام:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین میں آباد تھی۔اس قوم نے اللہ کے پیغمبر کو طنز و مذاق کا نشانہ بنایا۔ان کی راست بازی کا تمسخر اڑایا۔وہ کہتے تھے:

﴿إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ﴾ (۹) (بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے؟)۔

ان کو معاشرے کا کمزور فرد قرار دیا اور انھیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔

﴿قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ﴾ (۱۰) (انھوں نے کہا اے شعیب! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے، تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے)۔

پھر ان پر ایسا عذاب خداوندی آیا کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے۔ارشاد باری

تعالیٰ ہے: ﴿وَأَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِيْ دِيَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ. كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (۱۱) (اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے۔ گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ (۱۲) (انھوں نے جھٹلایا آخرکار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا۔ اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

مصر کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑایا۔ انھیں سحر زدہ آدمی کہا۔ جیل میں ڈال دینے کی دھمکیاں دیں ان کی زبان میں لکنت پر پھبتیاں کسیں اور ذلیل و حقیر کہا۔ آخرکار فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِيْنَ﴾ (۱۳) (پھر ہم نے بعد میں آنے والوں کو غرق کر دیا)۔

اسلام میں رسول اللہ ﷺ کا مقام:

اسلام میں رسول اللہ ﷺ کا مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بلند اور بالا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات نہ صرف وحی الٰہی کی شارح ہے بلکہ شارع بھی ہے۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ بھی منشائے الٰہی ہیں۔ پیغمبر کی شخصیت ہر قسم کے گناہ اور لغزش سے معصوم ہوتی ہے۔ گناہ اور لغزش سے عصمت صرف اور صرف پیغمبر کو حاصل ہے کسی اور انسان کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے پر رسول اکرم ﷺ کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِيْ يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (۱۴) (اے نبی لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا)۔

رسول اکرم ﷺ کی اطاعت ہر لحاظ سے غیر مشروط ہے آپ کے کسی حکم یا فیصلہ میں کسی شخص کی ذاتی پسند یا ناپسند نہیں چلے گی۔

قرآن مجید اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتَّىٰ

يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً﴾(۱۵)((اے محمد ﷺ) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں)۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کو اپنی ذات، والدین اور اپنی اولاد ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں سے مقدم جانے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾(۱۶)(بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں پر مقدم ہیں)۔

مقام مصطفیٰ ﷺ قرآن مجید کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ادب واحترام کے ضمن میں متعدد مقامات پر واضح احکامات نازل فرمائے اور صحابہ کرام ﷺ کو یہ تعلیم دی کہ وہ اس کا لحاظ کریں اور آپ ﷺ کی شان میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے۔

گستاخیٔ رسول ﷺ کے احتمال کا سدباب:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَقُولُواْ رَاعِنَا وَقُولُواْ انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾(۱۷)(اے ایمان والو! تم "راعنا" مت کہا کرو بلکہ "انظرنا" کہا کرو اور خوب غور سے سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے)۔

یہاں اس کی پوری وضاحت اور تفصیل ممکن نہیں، بقول علامہ آلوسی صرف اتنا عرض کرنا ہی کافی ہے "کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ایمان والوں کے لیے اتاری تاکہ مومنین کی طرف سے اہانت رسول کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے اور زبانیں ایسے الفاظ کو بالکل چھوڑ دیں اور بے ادبوں اور گستاخوں سے مشابہت بھی ختم ہو جائے"(۱۸)۔

تفسیر المنار میں ہے "اہانت رسول کے الفاظ اگرچہ غیر ارادی ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان کے ذریعے اس کا دروازہ کھل جائے گا، اس لیے اللہ نے ایسے الفاظ کو بھی منع کر دیا اور اس سلسلے کو بالکل بند کر

دیا"(۱۹)۔

گفتگو میں ادب واحترام کا لحاظ:

سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے ادب واحترام اور تعظیم و تکریم کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ . یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُون﴾(۲۰)(اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے پست رکھو اور ان کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو جس طرح تم ایک دوسرے سے بولتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمھیں ان کی خبر بھی نہ ہو)۔

یہ وہ پروٹوکول ہیں، جن کا تذکرہ رب العالمین نے سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت نازل فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کو اس کا پابند کر دیا۔

حرمت رسول ﷺ کا تحفظ مسلمانوں کی ذمہ داری:

﴿ فَالَّذِیْنَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِیَ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون ﴾ (۲۱)(پس جو لوگ رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں)۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ﴿لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِیْلاً ﴾(۲۲)(تاکہ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور ان کی مدد کرو اور ان کی عظمت کا خیال رکھو اور صبح شام اللہ کی پاکیزگی بیان کرو)۔

رسول اللہ ﷺ کو عام لوگوں کی طرح پکارنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَیْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضاً﴾ (۲۳)(رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نہ

پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو)۔

اس آیت میں آپ ﷺ کے ادب و احترام اور مسلمانوں کو آپ ﷺ کے مقام کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ''آنحضور ﷺ کے بلانے پر حاضر ہونا فرض ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کا بلانا اوروں کی طرح نہیں کہ چاہے اس پر لبیک کہے یا نہ کہے۔ اگر حضور ﷺ کے بلانے پر حاضر نہ ہو تو آپ ﷺ کی بددعا سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ آپ کی دعا معمولی انسانوں جیسی نہیں۔ نیز مخاطبات میں حضور ﷺ کے ادب وعظمت کا پورا خیال رکھنا چاہیے، عام لوگوں کی طرح یا محمد وغیرہ کہہ کر مخاطب نہ کیا جائے بلکہ یا نبی اللہ اور یا رسول اللہ جیسے تعظیمی القابات سے پکارنا چاہیے''(۲۴)۔

اہانت رسول ﷺ کی سزا:

ارشاد الٰہی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ (۲۵) (بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں اللہ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے، اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے)۔

گستاخ رسول پر دنیاوی لعنت یہی ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے اس لیے کہ وہ ناقابل معافی جرم کا مرتکب ہوا ہے اور آخرت میں عذاب میں مبتلا ہوگا۔

حرمت رسول ﷺ بزبان رسول ﷺ:

آپ ﷺ کی حرمت میں بے شمار ارشاداتِ نبوی کتب احادیث میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

گستاخِ رسول کی سزا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من سب نبیاً قتِلَ ومن سبّ اصحابه جلد'' (۲۶) (جس نے نبی کو برا بھلا کہا وہ قتل کیا جائے گا اور جس نے اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہا اسے کوڑے مارے جائیں گے)۔

یہی حدیث شریفِ قاضی عیاض نے اپنی مکمل سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے

نقل کی ہے(۲۷)۔اس میں ''جلد'' کی بجائے ''فاضربوہ'' کے الفاظ ہیں۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جو رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا تھا تو آپؓ نے فرمایا: ''من سب اللہ او سب احداً من الانبیاء فاقتلوہ'' (۲۸) (جس نے اللہ کو یا انبیاء میں سے کسی کو برا بھلا کہا پس اسے قتل کردو) گستاخِ رسول ﷺ پر دنیاوی لعنت یہی ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا﴾ (۲۹) (وہ پھٹکارے ہوئے ہیں جہاں پائے جائیں پکڑے جائیں اور بری طرح قتل کیے جائیں)۔

مسلمان اپنے آقا و مولا حضور سرورِ عالم ﷺ کے نام و ناموس پر مر مٹنے اور اس کی خاطر دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ اس پر تاریخ کی کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی ایسی شہادت موجود ہے جو ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو خواہ وہ ایشیا ہو یا یورپ، افریقہ ہو یا کوئی اور خطہ ارض، جہاں بھی اقتدار حاصل رہا وہاں کی عدالتوں نے اسلامی قانون کی رُو سے شاتمانِ رسول اللہ ﷺ کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔ اس کے برعکس جب کبھی یا جہاں کہیں ان کے پاس حکومت نہیں رہی، وہاں جانثارانِ تحفظ ناموسِ رسالت نے غیر مسلم حکومت کے رائج الوقت قانون کی پروا کیے بغیر گستاخانِ رسول ﷺ کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اور خود ہنستے مسکراتے تختہ دار پر چڑھ گئے۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی دورِ استعمار سے قبل، حتیٰ کہ مغل شہنشاہ اکبر کے سیکولر دور میں بھی شاتمِ رسول ﷺ کو سزائے موت دی گئی۔ لیکن جب اس ملک پر سازشوں کے ذریعے انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ ہوا تو انھوں نے توہینِ رسالت ﷺ کے اس قانون کو یکسر موقوف کر دیا۔ پھر انگریز حکومت ہی کی شہ پر جب ہندوؤں، آریہ سماجیوں اور مہا سبھائیوں نے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہوئے پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی پر حملے کرنے شروع کر دیے تو مسلمانوں نے شاتمانِ رسول ﷺ کو قتل کر کے، اقرارِ جرم کرتے ہوئے دار و رسن کی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا (۳۰)

ایمان کی حلاوت اور محبت رسول ﷺ:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کی حلاوت اسی کو نصیب ہوگی جس میں تین باتیں پائی گئیں۔ ایک یہ کہ اللہ و رسول کی محبت اس کو تمام سے زیادہ ہو،

دوسرے یہ کہ جس آدمی سے بھی اس کو محبت ہو صرف اللہ ہی کے لیے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹنے سے اس کو اتنی نفرت اور اذیت ہو جیسی کہ آگ میں ڈالے جانے سے ہوتی ہے (۳۱)۔

محبتِ رسول اللہ ﷺ:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "**لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من ولده ووالده والناس اجمعین**" (۳۲) (تم میں کوئی اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جاؤں)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کو عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی، میں آپ کو سوائے اپنی جان کے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں۔

اس پر نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "**لن یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه و اهله**" (۳۳) (تم میں سے کوئی اس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی جان اور اہل سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں)۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ پر قرآن مجید نازل کیا۔ آپ ﷺ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "**الآن یا عمر**" (۳۴) (ہاں اب ٹھیک ہے اے عمر)۔

حقوقِ رسول ﷺ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی ایمان والا ایسا نہیں جس کے لیے میں دنیا اور آخرت میں سارے انسانوں سے زیادہ اولیٰ اور اقرب نہ ہوں۔ اگر تمھارا دل چاہے تو اس کی تصدیق کے لیے قرآن کی یہ آیت پڑھ لو "**النبی اولی بالمومنین من انفسهم**" (۳۵) (نبی علیہ الصلاۃ والسلام مومنین کو ان کی جانوں سے بڑھ کر عزیز ہیں)۔

مسلمانوں کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی محبت سے مشروط:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟''۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے بہت سی نمازیں، روزے اور صدقات تو اکٹھے نہیں کیے لیکن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اسی کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت رکھتے ہو'' (۳۶)۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہر پیغمبر کو اپنی امت کے بلکہ ہر مقتدا کو اپنے پیروکاروں کے ساتھ ایک خاص قسم کی شفقت کا تعلق ہوتا ہے جس طرح کہ ہر شخص کو اپنی اولاد کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتا، اور اس تعلق کی وجہ سے ان کی قدرتی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے چھٹکارا پائیں اور اس شفقت و رافت میں رسول اللہ ﷺ سب پیغمبروں سے بڑھے ہوئے ہیں اور اس لیے قدرتی طور پر آپ ﷺ کی یہ بڑی خواہش ہے جو مختلف موقعوں پر بار بار آپ ﷺ سے ظاہر ہوئی کہ آپ ﷺ کی امت دوزخ میں نہ جائے اور جن کی بدعملی اس درجہ کی ہو کہ ان کا دوزخ میں ڈالا جانا اور کچھ عذاب پانا ناگزیر ہو ان کو کچھ سزا پانے کے بعد نکال لیا جائے چنانچہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی خواہش کو پورا فرمائیں گے اور آپ ﷺ کی شفاعت سے بہت لوگ جہنم سے بچ جائیں گے اور بہت سے ڈالے جانے کے بعد نکال لیے جائیں گے۔

پیغمبر اسلام کی توہین، کفار و مشرکین کا قدیم حربہ:

نبی مکرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق، بلند پایہ تعلیمات اور حسن تعامل سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے اور مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی تو قریشِ مکہ کو پریشانی ہوئی۔ علمی و تحقیقی میدان اور دلائل کی دنیا میں تو وہ مقابلہ نہ کر سکے اور ناکام ہو گئے تو انھوں نے بھی وہی حربہ اختیار کیا تھا، جس کا سہارا آج کے دشمن اسلام نے لیا ہے۔ مشرکین مکہ نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ہر طرح کی تکلیفیں دیں۔ اہلِ ایمان کو اسلام

سے برگشتہ کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ مگر اسلام پھیلتا ہی چلا جا رہا تھا اور جمالِ رسالت کی روشنی ہر سو اپنا حلقہ بنا رہی تھی۔

بالآخر نورِ نبوت کے راستے روکنے کے لیے مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ایک کمیٹی صرف اس مقصد کے لیے بنائی گئی کہ دُور دراز سے جو لوگ آ کر حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں، انھیں کسی طریقے سے روکا جائے۔ ابولہب اس کمیٹی کا سربراہ تھا اور دیگر چوبیس افراد اس کے ممبر تھے۔ ان کے پہلے اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ ہم لوگوں کو کیا کہہ کر محمد ﷺ سے بدظن اور دور کریں۔

ایک نے مشورہ دیا کہ ہم انھیں بتائیں گے کہ یہ شخص کاہن ہے۔ ولید بن مغیرہ نے جو اس مجلس کا صدر تھا، اس سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ لوگ جانتے ہیں کاہنوں سے محمد ﷺ کو کیا نسبت۔ اس کا کلام تو بہت اعلیٰ و بالا ہے۔

دوسری تجویز یہ آئی کہ اسے دیوانہ مشہور کیا جائے۔ ولید نے اس سے بھی اختلاف کیا کہ اسے لوگ تسلیم نہیں کریں گے۔

تیسری تجویز آئی کہ اسے شاعر کہا جائے۔ ولید نے کہا ہم عرب لوگ شعر و شاعری اور اصنافِ سخن کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لوگ ہماری اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کریں گے۔

چوتھا خیال تھا کہ اسے جادوگر کہہ کر تعارف کرایا جائے۔ ولید نے یہ کہہ کر اسے مسترد کر دیا کہ محمد ﷺ جس نفاست و نظافت اور سلیقے سے رہتے ہیں، کیا لوگ اسے جادوگر مانیں گے؟ جادوگروں کی منحوس صورتوں اور عادتوں سے لوگ واقف ہیں، یہ بات نہیں بن سکے گی۔

بالآخر ولید بن مغیرہ کی رائے پر ہی اتفاق ہوا کہ محمد ﷺ کو ہر ہر بات پر دق کیا جائے۔ ہنسی اڑائی جائے۔ تمسخر و استہزاء سے ان کی توہین کی جائے۔ اس کے ماننے والوں کا مذاق اڑایا جائے اور ہر طرح سے ایذاء پہنچائی جائے۔ ان کی نقلیں اتاری جائیں، آوازیں کسی جائیں۔ حضور کے وعظ کے دوران شور و شغب کیا جائے اور منہ چڑائے جائیں۔

اس صورت حال میں بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ. إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾ (۳۷) (اے محمد ﷺ جو حکم تجھے دیا گیا ہے اسے صاف

صاف بیان کرتے رہو، ان مشرکین سے صرف نظر کرو، ہم خود تمھاری طرف سے تمسخر اڑانے والوں سے نمٹ لیں گے)۔

کتب سیرت میں اس مجلس کے جن جن لوگوں کے نام اور حالات ملتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا انجام انتہائی بدترین ہوا، انھیں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔

ناموسِ رسالت، پس منظر اور پیش منظر:

ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک کے اخبارات نے محسنِ انسانیت، پیکر اخلاق و شرافت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے متعلق جو توہین آمیز اور شر انگیز خاکے شائع کیے ہیں ان پر پورا عالمِ اسلام سراپا احتجاج ہے اور احتجاج کا یہ سلسلہ آئے روز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس وقت یہ معاملہ پورے زور و شور سے عالمی میڈیا پر چھایا ہوا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ محض اتفاق ہے یا اس کے پسِ پردہ کوئی طویل اور منظم منصوبہ بندی کارفرما ہے۔ تاہم حالات و واقعات کے تناظر میں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں۔

چند صدیوں سے مسلمانوں کی مذہبی دل آزاری اور نبی کریم ﷺ کی اہانت کے نقطۂ نظر سے لکھی اور شائع کی جانے والی کتب، نازیبا خاکوں اور اسی نوعیت کے مسلسل واقعات کے جائزے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ بعض مسیحی مؤرخین، ہنود اور یہود کی طرف سے اہلِ اسلام کے مذہبی جذبات اور ان کے مقدس تاریخی ورثے کا مذاق اڑانا ایک مستقل روایت بن چکی ہے اور وقفہ بہ وقفہ کوئی گستاخ اور تنگ نظر، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور دوسرے مشاہیر امت کی شان میں دریدہ دہنی اور تاریخی حقائق و واقعات میں تحریف کی جسارت کا مرتکب ہوتا رہتا ہے جس سے عالمِ اسلام میں غم و اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے اور مسلمانوں کی عقیدت و محبت کے نازک آبگینوں کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔

پیغمبر رحمت دو عالم حضرت محمد ﷺ کی دوسرے مذاہب کے ساتھ انسان دوستی اور غایت درجہ مذہبی رواداری کے تاریخی اور ناقابلِ تردید حقائق کے باوجود عصرِ حاضر کی نام نہاد سیکولر، انسان دوست مذہبی آزادی اور رواداری کی علمبردار مغربی دنیا کی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے عناد، تنگ نظری، مذہبی تعصب اور عدم رواداری کی ایک جھلک، ڈنمارک کے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء دریدہ دہن اخبار ''جیلنڈ پوسٹن'' میں

دیکھی جاسکتی ہے(۳۸)۔

جس میں گستاخی رسول اکرم ﷺ کا ارتکاب کرتے ہوئے ۱۲ تضحیک آمیز خاکے شائع کیے پھر ناروے کے ایک کٹر عیسائی اخبار ''میگزینیت'' نے اس گستاخی کو دہرایا(۳۹)۔

مسلمانوں کے احتجاج پر معافی مانگنے اور معذرت کی بجائے ڈٹے رہے اور بش نے خصوصی طور پر ڈنمارک کے وزیرِ اعظم کو نہ جھکنے کی تلقین کی اور امریکہ کی طرف سے مکمل حمایت کی یقین دہانی کرائی (۴۰)۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے پے در پے ایک سے زائد مغربی ممالک کے درجن بھر سے زائد اخبارات جان بوجھ کر مذکورہ خاکے شائع کر چکے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق مغرب کی عیسائی دنیا کی بحث و تحقیق کے علاوہ غیر مذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں اور یہ سیلاب بلاخیز آج تک رواں دواں ہے۔ چنانچہ اسی تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مغربی دانشور J.J Saunders لکھتا ہے کہ: ''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پیغمبر عربی ﷺ کو عیسائیوں نے کبھی بھی ہمدردی اور توجہ کی نظر سے نہیں دیکھا جن کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفیق ہستی ہی آئیڈیل رہی ہے۔ صلیبی جنگوں سے آج تک محمد ﷺ کو متنازعہ لٹریچر میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق بے ہودہ کہانیاں پھیلائی گئیں اور طویل عرصہ تک ان پر یقین کیا جاتا رہا'' (۴۱)۔

اس قسم کی تصویر کشی میں دنیا عیسائیت کے جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں سے نمایاں درج ذیل ہیں۔ ڈاکٹر ہٹی (Philip K. Hitti) اپنی کتاب ''اسلام اور مغرب'' (Islam and the West) کے چوتھے باب میں قدیم کتابوں اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں ۲۹ اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے رسول اکرم ﷺ کے متعلق چند اقتباس (نقل کفر کفر نباشد) یہ ہیں۔

۱: قرونِ وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبرِ اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے رسول کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن ان کی بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریقِ حیات تھا (۴۲)۔

۲: سینٹ جان آف دمشق (۷۴۹ء) شام کا مشہور عیسائی عالم اور بازنطینی روایات کا بانی ہے۔ جس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے۔ جس میں ایک

جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔اس کے بیان کے مطابق محمد ﷺ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کیے۔

یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔

۳: ڈانٹے (۱۳۲۱ء) نے محمد ﷺ اور علی ؓ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا۔ جو تفرقہ پردازوں اور رسوا کن اعمال کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)۔

۴: مؤرخ تھیوفین (Theophane) (۸۱۸ء)۔ محمد ﷺ کو ''مشرقی باشندوں کا حکمران اور بناوٹی رسول'' لکھتا تھا۔

۵: اسحاق قرطبہ عیسائی ماں باپ کا بیٹا تھا۔ عربی زبان خوب جانتا تھا اور نوجوانی میں ہی امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں بطور کاتب کی جگہ ملی۔ اس نے برملا حضور نبی ﷺ پر سب وشتم کہا۔ امیر عبدالرحمان نے اس گستاخ رسول ﷺ کی بابت حکم جاری کیا کہ اس کو پھانسی دی جائے چنانچہ جون ۸۵۱ء میں ان احکام کی تعمیل ہوئی (۴۳)۔

اور جب قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کا نام ''محمد کا قرآن'' (The Aleoran of Mahomet) رکھا۔ لفظ Mahomet محمد کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اور ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں ''ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب کے جاننے کی خواہشمند تھے''۔

لفظ Mahomet کی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ Mahmet کی سترہ شکلیں اور Muhammad کی پانچ شکلیں۔ اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف نام کے اکتالیس شکلیں بنائی گئی ہیں۔

یہ چند مثالیں تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کے ساتھ بھی وہی سب کچھ بدترین شکل میں کیا گیا جو دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ کے مخالفین نے آپ ﷺ کی سیرت اور آپ ﷺ کے پیغام کو بگاڑنے کے لیے وہ سب کچھ کیا، جو وہ کر سکتے تھے۔

مگر سابقہ انبیاء ورسل اور ہمارے پیارے رسول کے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ سابقہ انبیاء کے مخالفین بظاہر کامیاب ہو گئے۔ لیکن پیغمبرِ اسلام کے مخالفین کی ساری کارروائیاں بالکل ناکام

ہوکررہ گئیں۔آج تک آپ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کا متن اس طرح کامل صورت میں محفوظ ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مستند صورت موجودہ دور میں ممکن نہیں۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف نفرت، دشمنی اور سب وشتم کا سلسلہ عیسائیت میں سب سے پہلے جان آف دمشق (۷۰۰-۷۵۴ء) نے شروع کیا تھا۔ڈاکٹر حافظ محمد ثانی لکھتے ہیں کہ یہی وہ پہلا عیسائی مشنری تھا جس نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے خانگی حالات کو موضوع بحث بنا کر بے جا اعتراضات کیے(۴۴)۔

''جان آف دمشق'' کے بعد قرونِ وسطیٰ کے تمام مصنّفین نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے تصویر رسول اللہ ﷺ کو خوب بگاڑنے کی کوشش کی۔اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد کئی صدیوں تک مسیحی دنیا کی نفرت وعداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی اور اہلِ مغرب پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں انتہائی توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے۔اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔مغرب نے جب بھی تلوار استعمال کی اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔صلیبی جنگوں میں بھی صلیب سرنگوں ہوگئی۔جب دنیائے مغرب نے محسوس کیا کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا کچھ زیادہ نہیں بگاڑ سکتے تو انھوں نے کمال عیاری سے اسباب ووسائل اور حکمت عملی کو یکسر تبدیل کر دیا۔گویا یہ فیصلہ کرلیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نیا ترکش اور نئے تیر استعمال کیے جائیں۔انھوں نے سوچا کہ اب ذہنی اور فکری محاذ پر اسلام اور اہل اسلام کو زک پہنچائی جائے اور گرم جنگ میں نہ سہی سرد جنگ میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، چنانچہ انھوں نے پیغمبر اسلام کو ہدف تنقید بنایا اور علم وتحقیق کے نام پر اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے، بے ہودہ الزامات اور گستاخانہ خاکوں کے بیج بوکر خرافات کا ایک ایسا جنگل اُگا دیا جسے کاٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ انگریز مؤرخ ڈاکٹر منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"None of the great figures of history is so poorly appreciated in the west as Muhammad. Western writers have mostly been prone to believe the worst of Muhammad, and, wherever an objectionable interpretation of an act seemed plausible, have tended to accept it as fact".(45)

(تاریخ کی عظیم ترین شخصیات میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب میں سب سے کم پذیرائی حاصل ہوئی۔ مغربی مصنفین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدترین چیز پر بھی یقین کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی آپ ﷺ کی ذات کے بارے میں قابل اعتراض توضیح ملتی ہے تو اسے ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیتے ہیں)۔

یورپ اسلام کے ان احسانات کو فراموش کر بیٹھا ہے جن کی بدولت آج اسے فلسفہ، طب، سائنس، ریاضی، ادب، تعلیم، معاشرت اور تہذیب وتمدن کے شعبوں میں امتیاز اور عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ عہدِ حاضر کے بڑے بڑے اشاعتی ادارے اور پرنٹ والیکٹرانک میڈیا بدقسمتی سے یہودی سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ چنانچہ وہ دنیا کے مختلف مذاہب خصوصاً اسلام کی تحقیر اور مختلف العقیدہ فرقوں کے درمیان شدید منافرت اور بے زاری پیدا کرنے کی نمایاں اور پوشیدہ کوششوں میں مصروف رہتے ہیں اور عام طور پر تحریر وتقریر کی آزادی کے نام پر یہ نازک مقاصد نہایت خوش اسلوبی سے پورے کر لیے جاتے ہیں۔ مغربی دانشور جے جے سانڈرس (J.J.Sandrus) نے ان الفاظ میں یہ حقیقت بیان کی ہے: ''امریکا اور یورپ کے بڑے بڑے صنعتی اداروں پر بیشتر اجارہ داری یہودیوں کی ہے اور اخبارات، خبررساں ایجنسیوں، کتابیں شائع کرنے والے اداروں، کمپنیوں اور بڑے تجارتی اداروں کے خاص طور پر مالک ہیں'' (۴۶)۔

ڈنمارک اور دیگر یورپین ممالک کے اخبارات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شائع ہونے والے خاکے اتنے اشتعال انگیز اور اخلاق سوز ہیں کہ مسلمانوں کی غیرت ایمانی ان کا ذکر بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عام پڑھا لکھا اور سنجیدہ انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب وملت ہی سے کیوں نہ ہو وہ اس گھٹیا اندازِ فکر اور مخرب اخلاق تصویر کشی کو شائستہ طرز اظہار اور رواداری کے مطابق قرار نہیں دے سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسلام کے ہمہ جہتی نظام حیات پر نکتہ چینی کی گنجائش نہ پا کر معاندین اسلام اپنے حسد کی آگ ناموسِ رسالت ﷺ پر حملے کر کے ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں (۴۷)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے خلاف تازہ ترین تمسخر کا حربہ بھی بالکل اسی نوعیت کا ہے۔ یہ بھی کوئی اتفاقی حادثہ یا ایک آدمی کی احمقانہ حرکت نہیں ہے، بلکہ یہودی سازشوں کا

شکار صلیبی احمقوں، آلہ کاروں اور سازشیوں کی سوچی سمجھی مکارانہ چال ہے۔ جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو ان کے نبی ﷺ اور مقدس دین سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کی ہوس ملک گیری کی راہ ہموار ہوسکے۔ مسلمانوں کا اپنے نبی ﷺ اور دین سے رشتہ وتعلق کمزور ہوگا تو انھیں زیر کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

مبینہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا نوعیت کا ایک اجلاس اسی مقصد کے لیے ۵ مئی ۲۰۰۵ء کو جرمنی کی ریاست باوریا میں ٹیگرنسی جھیل کے کنارے واقع ہوٹل ڈورنٹ سوفٹیل میں منعقد ہوا تھا، جس میں بحراوقیانوس کے متعدد امراء شریک ہوئے تھے۔

ان توہین آمیز خاکوں کے چھاپنے کا فیصلہ اسی اجلاس میں کیا گیا تھا، جسے عملی جامہ ڈنمارک کے اخبار روزنامہ ''جیلنڈز پوسٹن'' کے بدبخت ایڈیٹر فلمنگ روز نے پہنایا۔ یہ شخص انتہائی متعصب، گوروں کی حاکمیت کا علمبردار اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔

جیسے کل اور آج کے کفار کے افکار وخیالات ایک جیسے اور سازشیں ایک جیسی ہیں اور اسلام کے خلاف حربے ایک جیسے ہیں۔ مسلمان بھی خاطر جمع رکھیں، اللہ کے وعدے بھی پختہ اور اس کا طریقۂ کار بھی وہی ہے۔ جیسے مشرکین مکہ کو اس نے عبرت کا نشان بنایا۔ عصر حاضر کے دشمن اس سے بھی بدتر انجام سے دوچار ہوں گے (۴۸)۔

امت مسلمہ کا کردار:

مسلم امہ نے احتجاج اور مظاہروں کے ذریعے مغرب پر یہ واضح کردیا ہے کہ ابھی مسلمانوں کی راکھ میں ایمان کی چنگاریاں گل نہیں ہوئیں اور اب بھی عالم اسلام کی راکھ کا ڈھیر کسی آتش فشاں کی مانند تمھیں بھسم کرسکتا ہے۔

ہری ہے شاخ تمنا ابھی جلی تو نہیں   جگر کی آگ دبی ہے مگر بجھی تو نہیں

مسلمانوں کی رگ حمیت خواب غفلت کا شکار ضرور ہے لیکن ابھی مردہ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے ایمان میں کمزوری ضرور آئی ہے اور اعمال صالحہ میں نقصان بھی ضرور واقع ہوا ہے لیکن عشق نبی ﷺ کی کھیتیاں دلوں میں ہمیشہ کی طرح لہلہا رہی ہیں اور تر وتازہ ہیں۔ مادیت کے زہر ہلاہل نے امت مسلمہ

کے جسم کو کہیں کا نہیں چھوڑا لیکن ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ناموس کا فانوس ہمیشہ کی طرح روشن اور تاباں ہے۔ ہزار باد مخالف اور منہ زور آندھیاں چلیں لیکن عشق رسول ﷺ کی شمع مسلم امہ کسی بھی حالت میں بجھنے نہیں دے گی۔

؎ بے مصرفہ ہے تعزیر جرم عشق اے محتسب　　　بڑھتا ہے ذوق ''جرم'' یہاں ہر سزا کے بعد

اس صورت حال کے پیش نظر امت مسلمہ کا جذبہ عشق رسول بھی قابل ستائش ہے۔ جلسے، جلوس، سیمینارز اور کانفرنسز کی شکل میں مسلم امت نے اس ناپاک جسارت پر بھرپور احتجاج کیا۔ ایسی ایک کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ کا خلاصہ ہمارے لیے ایک لائحہ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ اس صورت حال کے پیش نظر ہم درج ذیل اقدامات کی توثیق کرتے ہیں:

۱: ہم شانہ بشانہ اس امت کے ساتھ ہیں جو نصرتِ رسول ﷺ اور تحفظ ناموسِ رسالت کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ اس ردِعمل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ اُمت کے اس اقدام میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ضابطۂ اخلاق کی عکاسی ہونی چاہیے جس کا پرتو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے افعال و کردار میں جھلکتا نظر آتا تھا۔

۲: ہم ڈنمارک کی حکومت اور متعلقہ مجاز افسران سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف دنیا بھر سے بلکہ اپنے معاشرے سے بھی اٹھنے والی اس غیر جانبدار، سچی اور کھری پکار کے سامنے سرِتسلیم کرتے ہوئے اپنے قبیح جرم کی مذمت کریں، معافی مانگیں اور اس بحران کو ختم کریں۔ ایسا اس لیے کرنا ضروری ہے تاکہ ڈنمارک عالمی برادری سے الگ نہ ہو جائے۔

۳: یہ بات مسلمہ اور طے شدہ ہے کہ: ہمارا مذہب آزادی اظہار کی ضمانت دیتا ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد وضاحت طلب کرنا یا اپنے مقصد کے لیے تبادلہ خیال کرنا ہو، نہ کہ توہین وتضحیک۔

۴: ہم تمام اہل اسلام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ضبطِ نفس کا مظاہرہ کریں اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں۔ ہم کسی جارحانہ اقدام اور کسی ایسے ردعمل کو تسلیم نہیں کرتے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر ان معاہدات کی خلاف ورزی جو ہماری شریعت کی نظر میں بھی محترم ہیں یا سفارت خانوں پر حملے اور بے گناہ عوام یا دیگر مقامات کو نشانہ بنانے کے اقدامات۔

۵: جن مذہبی اکابرین اور عالمی رہنماؤں نے غیر جانبدارنہ موقف اختیار کرتے ہوئے اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قبیح جرم کی مذمت کی ہے، ہم ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ہم یہ تاکید بھی کرتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ جو مسلم یا غیر مسلم ممالک میں رہ رہے ہیں، انھیں اس جرم کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ اس اُصول کی بنیادیں بھی قرآنی تعلیمات پر رکھی گئی ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا﴾ (۴۹) (اور کوئی انسان کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں)۔

اور ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ (۵۰) (کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ اور بھی ہے؟)۔

۶: ہم اس موقع پر مسلمانوں کو یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہوئے حضور ﷺ کی سنت پر، آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ اور ہدایات پر عمل کرکے ان سے اپنا ربط و تعلق استوار کریں اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو لہر اس وقت مسلمانوں کے دلوں کو گرما گئی ہے، وہ محض ہوا کا جھونکا ثابت نہ ہو جسے گزر جانے پر بھلا دیا جائے بلکہ ایسی رغبت اور میلان مسلمانوں کے اندر ہمیشہ ہی زندہ رہنا چاہیے۔

۷: ہم بارِ دگر تاکید کرتے ہیں کہ ہمارا یہ فرض بنتا ہے اور اس کے لیے ہم ذمہ دار ہیں کہ ہمیں اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل و فضائل اور اخلاقِ حسنہ کی روشنی میں دوسروں کے ساتھ حسنِ عمل سے پیش آنا ہے۔ یہاں یہ بھی امر لازمی ہے کہ متعلقہ ادارے اور مخیّر حضرات آگے آئیں اور اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اس جدوجہد کی بھرپور تائید اور حمایت کریں (۵۱)۔

اظہارِ محبت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اگر کوئی شخص اس کی طاقت نہیں پاتا تو اظہار محبت و غیرت تو ضروری ہے اور اس کے لیے سلیقہ چاہیے۔ یہود و نصاریٰ دنیا کو اسلام اور مسلمانوں کا منفی اور غیر واقعی تعارف کرانے میں مدتوں سے مشغول ہیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ ایک غیر مہذب اور غیر شائستہ قوم ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی سازشیں کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مسلمان ایسے ہی نظر آئیں، جیسے وہ ان کی بگڑی ہوئی تصویر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ توہین رسالت سے ہر مسلمان کا دل زخمی اور جگر پارہ پارہ ہے۔ حواس

شل اور جوش بے قابو ہونے کو ہے۔ مگر کسی حالت میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ ہمیں صبر و استقامت اور فہم و فراست کا دامن چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتے، کسی ایک کے جرم میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

لہٰذا جیسے اظہار محبت و غیرت ضروری ہے۔ ویسے ہی اس کے لیے سلیقہ بھی چاہیے ایسا سلیقہ کہ دنیا جان لے کہ مسلمان سے بڑھ کر غیرت مند اور سلیقہ شعار کوئی قوم نہیں۔ اس طرح اللہ کے فضل سے بالآخر خیر کا پہلو ہی نمایاں ہوگا، اور دنیا جان لے گی کہ یہ تہذیبوں کی نہیں بلکہ تہذیب اور بدتہذیبی کی جنگ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ المائدۃ:۶۷۔

۲۔ ھود:۴۷۔

۳۔ فصّلت:۱۵۔

۴۔ مؤمنون:۴۱۔

۵۔ الذاریات:۴۱-۴۲۔

۶۔ الحجر:۸۲-۸۳۔

۷۔ الاعراف:۸۲۔

۸۔ ھود:۸۲-۸۳۔

۹۔ ایضاً:۸۷۔

۱۰۔ ایضاً:۹۱۔

۱۱۔ ایضاً:۹۴-۹۵۔

۱۲۔ الشعراء:۱۸۹۔

۱۳۔ ایضاً:۶۶۔

۱۴۔ آل عمران:۳۱۔

۱۵۔ النساء:۶۵۔

۱۶۔ الاحزاب:۶۔

۱۷۔ البقرہ:۱۰۴۔

۱۸۔ آلوسی، تفسیر روح المعانی (دارالکتب العلمیۃ، بیروت) ۱/ ۳۴۸۔

۱۹۔ مصری، رشید رضا، تفسیر المنار (دارالکتب العلمیۃ، بیروت) ۱/ ۴۰۹۔

۲۰۔ الحجرات:۱-۲۔

۲۱۔ الاعراف:۱۵۷۔

۲۲۔ الفتح:۹۔

۲۳۔ النور:۶۳۔

۲۴۔ عثمانی، شبیر احمد، تفسیر عثمانی (مکتبہ اسلامیہ، کراچی) ص ۴۷۹۔

۲۵۔ الاحزاب:۵۷۔

۲۶۔ ابن تیمیہ، الصارم المسلول (المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء) ص ۹۸۔

۲۷۔ قاضی عیاض، الشفا (دار ارقم، بیروت، ۲۰۰۳ء) ۲/۲۲۵۔

۲۸۔ ابن تیمیہ، الصارم المسلول ص ۲۹۵۔

۲۹۔ الاحزاب: ۶۱۔

۳۰۔ محمد اسمٰعیل قریشی، ناموس رسالت ﷺ اور قانونِ توہین رسالت (الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور) ص ۴۱۔

۳۱۔ بخاری الجامع الصحیح (دار السلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۶، حدیث نمبر ۱۶؛ مسلم، الجامع الصحیح (دار السلام الریاض، ۱۹۹۸ء) ص ۴۰، حدیث نمبر ۶۷۔

۳۲۔ ابن ماجہ، السنن (دار السلام الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۱۱، حدیث نمبر ۶۷۔

۳۳۔ الہندی، علی المتقی، کنز العمال (موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء) ۱/۲۸۴۔

۳۴۔ الشفاء، ۲/۲۴۔

۳۵۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۸۴۰، حدیث نمبر ۴۷۸۱۔

۳۶۔ ایضاً ص ۱۰۷۵، حدیث نمبر ۶۱۱۷۔

۳۷۔ الحجر: ۹۴-۹۵۔

۳۸۔ نیوز پیپر ''جیلنڈ پوسٹن'' ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء۔

۳۹۔ ماہنامہ، الحق (اکوڑہ خٹک، جنوری فروری ۲۰۰۶ء) ص ۳۔

۴۰۔ ایضاً ص ۳۔

41.J.J Saunders،A History of medieval Islam(London.1965)P34-35.

(بحوالہ حافظ محمد ثانی، رسول اکرم ﷺ اور رواداری)۔

۴۲۔ وحید الدین، شاتم رسولؐ (دار التذکیر رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور) ص ۹-۱۰۔

۴۳۔ محمد اسمٰعیل قریشی، ناموس رسول ﷺ اور قانونِ توہین رسالت، ص ۳۱۰-۳۱۱۔

۴۴۔ حافظ محمد ثانی، ڈاکٹر، رسول اکرمؐ اور رواداری (فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء) ص ۶۴۔

45.Montgomery Watt, Muhammad at Mecca(Oxford Press Karachi, 1993) P.52.

46.J.J.Sandrus, A History of Jewish Crimes(index)

۴۷۔ ہفت روزہ، ضرب مومن، کراچی (محمد عمر عثمانی، مضمون ناموس رسالت۔ پس منظر اور پیش منظر) ص ۳ تا ۹

مارچ ۲۰۰۶ء۔

۴۸۔ ماہنامہ، ترجمان الحدیث، فیصل آباد، شمارہ ۴، جلد ۳۹ اپریل ۲۰۰۶، ص ۱۰۔

۴۹۔ الانعام: ۱۶۴۔

۵۰۔ الرحمٰن: ۶۰۔

۵۱۔ ماہنامہ، محدث (مجلۃ التحقیق، لاہور) اپریل، ۲۰۰۶ء (توہین آمیز خاکوں پر مشترکہ اعلامیہ) ص ۵۵-۵۷۔

حبِّ رسول اور اس کے تقاضے

رسول اللہ ﷺ کی مقدس ہستی کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيزُ الحَكِيمُ﴾(۱) (اے ہمارے رب! ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انھیں کتاب وحکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے، یقیناً آپ غالب اور حکمت والے ہیں)۔

وہ ہستی جن کے آنے کی بشارتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دیتے رہے، وہ جن کے بارے میں مالکِ ارض وسماوات نے فرمایا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّهُ عَلَى الْمُؤمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾(۲) (بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)۔

وہ ہستی جن کے بارے میں رب کائنات نے فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً ﴾(۳) (ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)۔

اسی ذات کے بارے میں رب العالمین فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾(۴) (ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے)۔

ان کے نطق کی شان کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى . إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ﴾(۵) (وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے، یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے)۔

وہ ہستی جسے رحمۃ للعالمین کہا گیا، ان کے بارے میں مالک ارض وسما نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّهُ

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾(۶)(کہہ دیجیے اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطائیں معاف کر دے گا، اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے)۔

یہ انسان کی خوش قسمتی اور سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ سے محبت کی توفیق عطا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ محبوب تھے پورے قرآن مجید میں تمام انبیاء کرام میں سے کسی کی زندگی کی اللہ تعالیٰ نے قسم نہیں اٹھائی۔ صرف حضور اکرم ﷺ کی زندگی کی قسم اٹھائی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾(۷)(آپ ﷺ کی زندگی کی قسم کہ وہ اپنی مدہوشی میں بھٹک رہے ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ما خلق الله تعالىٰ نفساً اكرم على الله من محمد وما سمعت الله اقسم بحياة احد غيره"(۸)(اللہ تعالیٰ نے کوئی متنفس ایسا پیدا نہیں کیا جو حضور ﷺ سے زیادہ اللہ کی نظر میں مکرم و محترم ہو، اور میں نے نہیں سنا کہ آپ ﷺ کے سوا کوئی اور ہو جس کی زندگی کی اللہ نے قسم کھائی ہو)۔

حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کو اتنے محبوب تھے کہ جس شہر میں آپ ﷺ رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے گلی کوچوں کی بھی قسم کھائی ہے:

﴿لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ. وَأَنتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ﴾(۹)(میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں، اس لیے کہ تم اس شہر میں رہتے ہو)۔

محبوب جس شہر میں بستا ہو اس کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔ محبت کی واردات اور کیفیات یہی ہیں:

امر على الديار ديار ليلىٰ   اقبّل ذا الجدار وذا الجدار

وما حبّ الديار شغفن قلبي   ولكن حبّ من سكن الديار

(میں لیلیٰ کے گھر کے پاس سے گزرتا ہوں، تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں، اور کوئی ایسی بات نہیں کہ ان گھروں کی محبت میرے جی میں گھر کر گئی، بلکہ یہ اس کی محبت ہے جو ان گھروں میں رہتا تھا)۔

صحیحین کی روایت ہے: ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ ایک انسان کسی قوم

سے محبت کرے اور پھر اسے ان کی صحبت نصیب نہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"المرءُ مع من احب" (۱۰) (انسان جس سے محبت کرے گا اس کے ساتھ ہوگا)۔

جو دنیا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت کرے گا، آخرت میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوگا، آنحضور ﷺ سے محبت ایمان کا جزو لازم ہے۔ یہ محبت ایسی ہو کہ تمام رشتوں سے بڑھ کر ہو، جب تک تمام کائنات کی ہر چیز کے ساتھ ہماری محبت کے مقابلے میں بڑھ کر یہ محبت نہ ہو ہمارا ایمان نامکمل ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴾(۱۱)

(کہہ دیجیے کہ اگر تمھیں اپنے باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے کنبے قبیلے اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور تمھارے مکان جو تمھیں پسند ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور یہ کہا تھا:

"لأنت أحب إلي من كل شيء إلا نفسي يا رسول الله ﷺ" (آپ ﷺ میری جان کے ماسوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں)۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نہیں بلکہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک کہ میں تمھارے نزدیک تمھاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا یقیناً آپ ﷺ اب میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: "الآن یا عمر" (۱۲) (اے عمر رضی اللہ عنہ اب تمھارا ایمان مکمل ہوا)۔ اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنی جان تک کی محبت اور اس کی خواہشات کی تکمیل انسان کے ایمان میں خلل ڈالتی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا: "**لا یؤمن احدکم حتّی اکون احبّ الیه من والده وولده والناس اجمعین**" (۱۳) (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اس کے نزدیک، اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)۔

۱: یہ محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کی۔

۲: یہ محبت اپنے والد، اولاد اور تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ ہو جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔

۳: یہ محبت اپنے گھر والوں اور مال سے بھی زیادہ ہو جیسا کہ صحیح مسلم اور مسند ابی یعلی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**لا یؤمن عبد حتّی اکون احبّ الیه من اهله وماله والنّاس اجمعین**" (۱۴) (کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں اسے اپنے اہل و عیال، مال اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں)۔

علمائے اُمت نے آپ ﷺ سے محبت کی علامات کو یوں کو بیان فرمایا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

۱: آپ ﷺ کی زیارت کا حصول

۲: آپ ﷺ کی سنت کی حمایت و تائید

۳: آپ ﷺ پر نازل کردہ شریعت کا دفاع

۴: آپ ﷺ کے مخالفین کی سرکوبی

۵: اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۱۵)۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی سنت کی نصرت و تائید کرنا، آپ ﷺ پر نازل کردہ شریعت کا دفاع کرنا اور آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے وقت آپ ﷺ پر اپنی جان و مال فدا کرنے کی غرض سے موجود ہونے کی تمنا کرنا، آپ ﷺ کی محبت میں سے ہے (۱۶)۔

آنحضرت ﷺ سے محبت کا تقاضا آپ ﷺ کا ادب ہے۔ آپ ﷺ کے ادب و احترام کا صحابہ رضی اللہ عنہم بہت خیال رکھتے تھے۔ عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھ کر آیا تو اس نے جا کر قریش کے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آپ ﷺ کا ادب کرنے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

''اے قوم مجھے بارہا نجاشی، قیصر اور کسریٰ کے دربار میں جانے کا اتفاق ہوا مگر مجھے کوئی بھی ایسا بادشاہ نظر نہیں آیا جس کی عظمت اہل دربار کے دل میں ایسی ہو جیسے اصحاب محمد ﷺ کے دل میں محمد ﷺ کی ہے۔ وہ تھوکتے ہیں تو لعابِ دہن زمین پر گرنے نہیں پاتا، کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے۔ جب محمد ﷺ حکم دیتے ہیں تو تعمیل کے لیے سب جلدی کرتے ہیں۔ جب وضو کرتے ہیں تو مستعمل پانی کے لیے لوگ گرے پڑتے ہیں گویا ان میں لڑائی ہو جائے گی۔ جب محمد ﷺ کلام کرتے ہیں تو سب کے سب چپ ہو جاتے ہیں، ان کے دل میں محمد ﷺ کا اتنا ادب ہے کہ کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا (۱۷)۔

آپ ﷺ کا ادب اتنا ہے کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات تمام امت کی ماؤں کے برابر سمجھی جاتی ہیں، قرآن کریم میں فرمایا: ﴿ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ﴾ (۱۸) (آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں)۔

اور اسی طرح اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس طرح بات نہ کی جائے جس طرح کہ تم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہو: ﴿ لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ﴾ (۱۹) (تم رسول اکرم ﷺ کو اس انداز سے نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو)۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرنا جب عمل کو اکارت کر دیتا ہے تو ان کے احکام کے سامنے اپنی رائے اور عقل، اپنی سیاست اور معارف کو مقدم کرنا اعمال صالحہ کے لیے کیوں کر تباہ کن نہ ہوگا؟ (۲۰)۔

نبی اکرم ﷺ سے محبت کی ایک نشانی آپ ﷺ کے دیدار اور صحبت کی تمنا ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں ہجرت کے وقت انصار مدینہ کا شوق اور بے تابی جھلکتی ہے جو آپ ﷺ کے استقبال کے سلسلے میں تھی۔

''مدینہ کے مسلمانوں نے رسول کریم ﷺ کی مکہ سے روانگی کی خبر سنی تو ان کا معمول بن گیا کہ ہر روز صبح کے وقت مدینہ منورہ سے باہر الحرہ کے مقام پر آپ ﷺ کے استقبال کے لیے آتے اور دوپہر کے وقت سورج کی گرمی کی شدت تک انتظار کر کے واپس پلٹتے۔ ابن سعد کی روایت ہے: ''جب سورج

کی حدت اور شدت انھیں اذیت پہنچاتی تو وہ اپنے گھروں کو پلٹتے'' (۲۱)۔ایک روز جب کافی طویل انتظار کے بعد اپنے گھروں کو پلٹے تو ایک یہودی نے جو اپنے کسی کام کی غرض سے ایک ٹیلے پر چڑھا ہوا تھا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو سفید کپڑوں میں ملبوس دور سے آتے دیکھا تو بے ساختگی سے اونچی آواز میں پکارا: ''اے اہل عرب یہ تمھارے سردار جن کا تمھیں انتظار تھا، آ پہنچے'' (۲۲)۔امام احمدؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا استقبال کرنے والے گروہِ انصار کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی (۲۳)۔اہلِ مدینہ کی جانب سے ہادی عالم ﷺ کے استقبال کی تصویر کشی امام احمدؒ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں یوں کی ہے:

''رسول اللہ ﷺ روانہ ہوئے اور میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھا، یہاں تک کہ ہم مدینہ پہنچے لوگوں نے آپ ﷺ کا استقبال کیا وہ راستے میں نکل آئے اور چھتوں پر چڑھ گئے، غلام اور بچے (خوشی سے) راستے میں بلند آواز سے کہہ رہے تھے'' اللہ اکبر! جاء رسول اللہ، جاء محمد ﷺ '' (رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، محمد ﷺ تشریف لائے)۔حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ لوگوں میں اس بات پر جھگڑے کی کیفیت پیدا ہوگئی کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف کون حاصل کرے (۲۴)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس دن کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''میں نے اس دن سے زیادہ پُر نور اور خوبصورت دن کبھی نہیں دیکھا جس روز آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے'' (۲۵)۔

اہل مدینہ کی کیفیت کا تذکرہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔اہل مدینہ جس قدر رسول اکرم ﷺ کی تشریف آوری پر خوش ہوئے میں نے کسی بات پر انھیں اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا (۲۶)۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ ہجرت کے سفر میں اپنا رفیق بنانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں یہ سن کر وہ اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔

ایک سچے محبّ رسول ﷺ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ نے آنحضرت ﷺ سے جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت کی فرمائش کی اور اس واقعے کو امام مسلمؒ نے انھی کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔

''میں رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں رات بسر کرتا تھا۔ میں آپ ﷺ کی خدمت میں وضو کے لیے پانی اور دیگر ضرورت کی چیزیں لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''کسی چیز کی فرمائش کرو''۔ میں نے عرض کی: ''میں جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت کا سوال کرتا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا کوئی اور فرمائش ہے''۔ میں نے عرض کی: ''صرف یہی ایک فرمائش ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس فرمائش کو پورا کروانے میں بہت زیادہ سجدے کر کے میرے ساتھ تعاون کرو'' (۲۷)۔

ذرا تصور کیجیے کہ فرمائش کرنے کا تین بار موقع آیا اور محبِّ رسول کے ذہن میں اور کسی فرمائش کا تصور تک نہ آیا۔

امام طبرانیؒ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بلاشبہ آپ مجھے میری جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ یقیناً آپ ﷺ مجھے میرے بیٹے سے زیادہ پیارے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی محفل میں آتا ہوں تو چین ملتا ہے۔ گھر بیٹھتا ہوں تو مجھے چین نہیں آتا، جب تک کہ آپ ﷺ کا دیدار نہ کرلوں جب میں اپنی اور آپ ﷺ کی موت کا تصور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ تو جنت میں داخل ہونے کے بعد انبیاء کے ساتھ بلند مقام پر ہوں گے اور اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ ﷺ کا دیدار نہ کر پاؤں گا۔ اس موقع پر حضرت جبرائیلؑ اس آیت کے ساتھ تشریف لائے۔

﴿ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَـٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ﴾ (۲۸) (جو کوئی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کریں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے پیغمبروں سے، صدیقوں، شہدا اور صالحین کے ساتھ)۔

ایک صحابی کی بصارت ختم ہوگئی تو کہنے لگے آنکھیں تو مجھے اس لیے عزیز تھیں کہ ان سے آنحضور ﷺ کی زیارت ہوتی تھی جب وہ ہی نہ رہے تو آنکھوں کے جانے کا کیا غم (۲۹)۔

حضرت ربیعہ اسلمی رضی اللہ عنہ ہر وقت خدمت نبی ﷺ میں رہتے تھے جب عشاء کی نماز

سے فارغ ہوکر حضور ﷺ کاشانہ نبوی ﷺ میں تشریف لے جاتے تو آپؓ باہر دروازے پر بیٹھے رہتے کہ شاید کوئی کام پڑ جائے، اور میری قسمت جاگ اٹھے، اور آنحضرت ﷺ کی خدمت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ نے ایک دفعہ حضرت ربیعہؓ سے فرمایا: ربیعہ تم شادی کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے شادی کی تو یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کا آستانہ مجھ سے چھوٹ جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بار بار اصرار کرکے انھیں شادی پر مجبور کیا (۳۰)۔

غزوۂ احد میں حضرت عمارہ بن زیادؓ زخموں سے چور ہو گئے۔ جان کنی کی حالت میں ان سے خواہش پوچھی گئی تو کہا حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ سرہانے پہنچے تو پوچھا عمارہؓ کیا خواہش ہے۔ حضرت عمارہؓ نے جسم گھسیٹ کر سر قدموں میں رکھ دیا اور کہا کہ یہی خواہش تھی (۳۱)۔

آنکھیں تھیں منتظر دل بے قرار تھا   آقا تیری دید کا بس انتظار تھا
اتنا کہا اور جگر پر خنجر سا چل گیا   قدموں میں سر دھر رہا اور دم نکل گیا

آپ ﷺ سے حقیقی محبت کرنے والوں کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ دنیا و آخرت میں آپ ﷺ کے دیدار سے فیض یاب ہوں۔ آج ہمارے لیے آپ ﷺ کا دیدار، آپ کی احادیث کو پڑھنا اور عمل کرنا ہے۔

حبِ رسول ﷺ کی ایک علامت نبی کریم ﷺ پر جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہنا اور محبت کا ایک پیمانہ محبوب کے لیے جان و مال نچھاور کرنے کے لیے تڑپنا ہے۔ محبت کے دعوے میں سچے صحابہ کرام کی جانثاری، محبت اور تعلق کے چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

امام بخاریؒ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے مقدادؓ کی وہ خوبی دیکھی ہے جس کا پانا مجھے دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ ﷺ مشرکوں کے لیے بددعا کر رہے تھے۔ انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ سے وہ بات نہ کہیں گے جو موسیٰؑ کی قوم نے ان سے کہی: ﴿ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلا ﴾ (۳۲) (تو اور تیرا رب دونوں جا کر لڑیں)"۔ بلکہ ہم تو آپ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر جانب سے جنگ کریں گے۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ اس بات نے نبی ﷺ کے چہرے کو روشن کر دیا اور آپ ﷺ خوش ہو گئے" (۳۳)۔

اس روایت میں حضرت مقدادؓ کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا جذبہ جانثاری بھی جھلکتا نظر آتا ہے کہ مقدادؓ کی ایسی خوبی جو مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے۔

اس سلسلے میں حضرت طلحہؓ اور ان کے گیارہ ساتھیوں کی فداکاری کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ امام نسائیؒ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ احد کے روز جب تمام لوگ بکھر گئے، تو ایسی حالت میں آپ ﷺ اپنے بارہ انصاری صحابہؓ کے ساتھ موجود تھے جن میں سے ایک طلحہ بن عبیداللہؓ تھے۔ اسی وقت مشرکین کا ایک جتھا آن پہنچا۔ آپ ﷺ نے نازک صورت حال دیکھ کر ارشاد فرمایا تم میں سے کون ہے جو ان کو یہاں سے بھگائے گا۔ حضرت طلحہؓ نے جلدی سے کہا میں، آپ ﷺ نے فرمایا تم ابھی رہنے دو۔ انصار میں سے ایک شخص بولا، میں، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ تم آگے بڑھو، وہ انصاری آپ ﷺ کا حکم پا کر بے جگری سے لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا کہ ان کا مقابلہ کون کرے گا۔ حضرت طلحہؓ نے فرمایا "میں" آپ ﷺ نے فرمایا نہیں تم ابھی نہیں۔ انصار میں سے ایک شخص بولا میں، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں آپ آگے بڑھو اور یہ انصاری بھی مقابلے میں اترا اور جامِ شہادت نوش کر گیا، یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ ایک ایک کر کے تمام انصاری جامِ شہادت نوش کر گئے اور آخر میں صرف حضرت طلحہؓ نے کہا "میں" آخرکار حضرت طلحہؓ نے گیارہ انصاریوں کے قائم مقام قتال کیا یہاں تک کہ ان کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں تو انھوں نے کہا اوہ، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم بسم اللہ کہہ دیتے تو فرشتے تجھے اوپر اٹھا لیتے اور لوگ منظر دیکھتے، اس کے بعد اللہ نے مشرکین کو پسپا کر دیا (۳۴)۔

حبِّ رسول ﷺ کی ایک نہایت اہم علامت اطاعت رسول ﷺ ہے، محبت کا ایک تقاضا اطاعت مطلق اور کامل ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْنَ آمَنُوا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن تَنَـازَعْتُمْ فِيْ شَـيْءٍ فَـرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾

(۳۵) (اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حکمرانوں کی، اگر کسی معاملہ میں

جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کے فرامین کی روشنی میں حل کرو اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔

"اطیعوا اللہ" کے ساتھ "اطیعوا الرسول" کا فعل دوبارہ لایا گیا تا کہ اطاعت رسول ﷺ کی اہمیت اور حیثیت اجاگر ہو۔ واضح ہو کہ اطاعت رسول دین اسلام کا ایک اہم حصہ ہے نیز اہل ایمان کے ایمان کی تکمیل اس کے بغیر ناممکن ہے۔ اس تناظر میں جب ہم مخلص، سچے محبان رسول ﷺ کو دیکھتے ہیں تو مسلمان خواتین بھی مردوں سے اس مقابلے میں پیچھے نظر نہیں آتیں۔

سنن ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنی بیٹی کے ہمراہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا آپ اس کی زکوٰۃ دیتی ہیں۔ اس نے کہا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ ربّ العزت ان کی جگہ دو آگ کے کنگن تمھیں پہنا دے۔ اس نے فوراً یہ دونوں کنگن اُتار کر رسول اللہ ﷺ کو پیش کر دیے کہ یہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہیں (۳۶)۔

غور فرمایئے کہ اس خاتون نے اطاعتِ رسول میں لمحہ بھر تردد سے کام نہیں لیا بلکہ زیور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اس طرح کا ایک واقعہ غزوۂ احد میں اس خاتون کا ہے۔ جس کا خاوند، بھائی، بیٹا شہید ہو گئے، وہ میدان جنگ سے آنے والے ہر آدمی سے پوچھتی ہے اور آنحضرت ﷺ کی خیریت معلوم کرتی ہے۔ جب آنحضرت ﷺ سے ملاقات ہو گئی تو آنحضرت ﷺ نے اس کے بیٹے، خاوند اور بھائی کے متعلق کلماتِ خیر کہے۔ کہنے لگی: "کل مصیبة بعدك جلل" (۳۷) (آپ کے بعد ہر مصیبت چھوٹی ہے)۔

ایک اور اہم واقعہ تحویل قبلہ کا ہے۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی مدینہ میں سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ امام بخاریؒ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب سورۃ البقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ﴾ (۳۸) (ہم آپ ﷺ کا آسمان کی طرف منہ پھیرنا دیکھ رہے ہیں۔ ہم آپ کو اسی قبلے کی

طرف پھیر دیتے ہیں جسے آپ ﷺ پسند کرتے ہیں)۔

تو ایک شخص آپ ﷺ کے ساتھ نمازِ عصر ادا کر کے نکلا پھر انصار کے ایک گروہ کے پاس ان کا گزر ہوا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ ﷺ کا رُخ اقدس کعبے کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ان حضرات نے نمازِ عصر میں رکوع کی ہی حالت میں اپنے چہرے کو کعبے کی طرف موڑ لیا (۳۹)۔

دیکھیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں رکوع سے سر اٹھانے کی معمولی تاخیر کو بھی برداشت نہیں کیا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی شراب کے اعلانِ حرمت پر اس کا مدینہ کی گلیوں میں بہایا جانا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ: ﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ﴾ (۴۰) (اللہ کے رسول ﷺ جو کچھ تمھیں دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کر دیں اس سے رُک جاؤ)۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے احکامات کی تعمیل میں صرف عام مرغوب اور پسندیدہ چیزوں کو ترک نہیں کرتے تھے بلکہ وہ چیزیں بھی یکسر ترک کر دیتے تھے جو انھوں نے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائی تھیں۔ اس دلیل کا ثبوت وہ واقعہ ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر ایک گروہ کو فضیخ نامی شخص شراب پلا رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ اعلان کرے (کہ شراب کو حرام کر دیا گیا ہے)۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں باہر گیا اور (آ کر) کہا کہ منادی کرنے والا یہ کہہ رہا تھا کہ بے شک شراب حرام کر دی گئی ہے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ جاؤ اور یہ شراب باہر انڈیل دو، میں نے اٹھایا اور شراب کو باہر انڈیل دیا (۴۱)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حرمتِ خمر کے بارے میں آدمی کے اطلاع دینے کے بعد کسی نے نہ دوبارہ اس بارے میں سوال کیا اور نہ کوئی تکرار کی (۴۲)۔

ہم سب کو اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم اطاعت رسول ﷺ کے اس معیارِ مطلوب پر قائم

ہیں جو صحابہ کرام ﷺ اور ہمارے دیگر اسلاف نے قائم کیا تھا یا محض دل کو تسلی دینے کی خاطر خالی دعوے کر رہے ہیں۔

حبِّ رسول ﷺ کی ایک علامت سنتِ رسول کی اتباع ہے، محبت رسول ﷺ کا لازمی تقاضا ہے کہ محبوب ؐ نے جن راہوں میں اپنی قوت اور صلاحیتوں کو خرچ کیا ہے وہ بھی اپنی جان و مال اور اپنی تمام املاک کو اس مقصد کے حصول کے لیے قربان کر دے۔ آپ ﷺ نے اپنی پوری طاقت لوگوں کو کفر اور شرک کی تاریکیوں سے نکال کر توحید اور اسلام کی روشنی کی طرف لانے کے لیے صرف کی۔ لہٰذا محبان رسول ﷺ کو بھی ہمیشہ ان راہوں میں جان عزیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا وصالِ نبوی ﷺ کے دل خراش سانحے اور عظیم ترین صدمے کے بعد جیش اسامہ کو روانہ کرنا دراصل سنت نبوی ﷺ پر عمل کی ایک عمدہ اور بہترین مثال ہے۔

طبری نے عاصم بن عدی کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے دوسرے دن کے بعد حضرت ابوبکر ؓ کی طرف سے منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ اسامہ کے لشکر کو پورا کیا جائے اور اسامہ ؓ کے سارے فوجی شہر سے نکل کر اپنی لشکر گاہ جرف میں پہنچ جائیں۔ بسبب خطرناک صورت حال کے پیش نظر حضرت اُسامہ ؓ نے حضرت ابوبکر ؓ سے اپنے لشکر سمیت مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے حضرت اُسامہ ؓ کو لکھا۔

میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کے علاوہ کسی بھی اور کام سے اپنے امور خلافت کا آغاز کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کسی اور کام سے ابتدا کرنے سے مجھے زیادہ پسند ہے کہ مجھے پرندے اُچک لیں (۴۳)۔

مانعین زکوٰۃ کے انکار اور سرکشی کے باعث حالات کی سنگینی کے باوجود صدیق اکبر ؓ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر انھوں نے مالِ زکوٰۃ کی ایک رسّی بھی روکی جسے وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے، تو میں اس ایک رسّی کے حصول کی خاطر بھی ان کے خلاف جہاد کروں گا (۴۴)۔

نبی اکرم ﷺ ہماری محبت کے محتاج نہیں ہم ان سے محبت کریں یا نہ کریں اس سے آپ ﷺ کی عزت، عظمت اور بزرگی میں نہ فرق واقع ہوگا نہ کمی آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس کا ذکر بلند کر دیا ہے

جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ (۴۵) (اور ہم نے تیرا ذکر بلند کیا)۔

آپ ﷺ تو خالق کائنات کے حبیب ہیں جو بھی آپ ﷺ کی اتباع کرتا ہے رحمٰن اسے اپنا محبوب بنالیتے ہیں۔

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۴۶) (کہہ دیجیے اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطائیں بخش دے گا، وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے)۔

آنحضرت ﷺ کی اتباع ہی نجات کا ذریعہ ہے اور اللہ سے قربت کا ذریعہ بھی آپ ﷺ کی اتباع ہے۔ خود ساختہ طریقوں سے بدعات اور گمراہی کو تو فروغ ہوسکتا ہے لیکن حب رسول ﷺ کا حقیقی نصب العین ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کے رسول کی ذات اور ان کا اُسوہ ہی دراصل پہاڑی کا وہ چراغ ہے جس کو دیکھے اور اس سے روشنی حاصل کیے بغیر جانب منزل سفر کا آغاز ہو ہی نہیں سکتا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وُجُوهٌ يومئذ خاشعة. عاملة ناصبة. تَصْلَى نَاراً حَامِيَةً. تُسْقَى مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ ﴾ (۴۷) (اس دن کچھ چہرے خوف زدہ ہوں گے بڑی بڑی ریاضتیں کرنے والوں کو دہکتی ہوئی آگ میں جھونکا جائے گا۔ کھولتے پانی کے چشمہ سے پینے کو دیا جائے گا)۔

جبکہ نبی اکرم ﷺ سے محبت کرنے والا آخرت میں ان (نبی ﷺ) کے ساتھ ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو نے قیامت کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے۔ اس نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت آپ ﷺ نے فرمایا بے شک تو اسی کے ساتھ ہے جس کے ساتھ تو نے محبت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں اسلام لانے کے بعد اتنی خوشی کسی بات پر نہ ہوئی تھی جتنی نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوئی کہ "انت مع من أحببت" (۴۸) (بے شک تو اسی کے ساتھ ہے جس کے ساتھ تو نے محبت کی)

حبِ رسول ﷺ کے تقاضے:

۱۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم اپنی جان، مال، والدین، اولاد اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپ ﷺ سے محبت کریں۔

۲۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر حبّ رسول کی علامات کو پیدا کریں۔

۳۔ آخرت میں آپ ﷺ کی قربت کی تمنا اپنے دل میں بسائیں۔

۴۔ آپ ﷺ کے مشن پر اپنا جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہیں۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے تعلیمات رسول ﷺ کو عام کریں۔قرآن کریم، حدیث اور سیرت کی تعلیم کے مراکز قائم کریں اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی تعلیم کا اہتمام کریں۔

۵۔ آپ ﷺ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل بجا لائیں۔جن سے روکا ہے اس سے خود بھی رُکیں اور اپنے گھر والوں اور متعلقین کو بھی روکیں۔

۶۔ آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے دفاع کی خاطر ہمہ وقت تیاری میں رہیں۔نبی کریم ﷺ سے اسی طرح کی سچی محبت کریں جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔صرف محبت کے دعوے پر اکتفا نہ کریں۔عملاً کچھ کرنے کا عزم لے کر اٹھیں۔

۷۔ اسوۂ حسنہ کی عمل و کردار کے ذریعے مکمل حفاظت کی جائے اور جو لوگ آنجناب علیہ السلام کی سیرتِ مطہرہ پر زہر افشانی کر رہے ہیں ان کے خلاف قلم و قرطاس کے ذریعے جہاد کیا جائے بالخصوص مستشرقین یورپ جو آئے دن آنجناب علیہ السلام کی شان میں دشنام طرازی کرتے ہوئے سیرت طیبہ کو نشانہ بناتے ہیں۔

۸۔ جو لوگ شریعتِ محمدی ﷺ میں تحریف کریں اور نبوت کا دعویٰ کریں ایسے لوگوں کے خلاف بھی قلم و قرطاس کے ذریعے جہاد کیا جائے نیز ختمِ نبوت کے لٹریچر کو بھی عام کیا جائے۔

۹۔ خالص شریعتِ محمدی ﷺ کا نفاذ عمل میں لایا جائے اور وہ لوگ جو شریعتِ محمدی ﷺ میں بدعات کو شامل کر رہے ہیں ایسے لوگوں کو ترغیب و ترہیب دلائی جائے اور اصل شریعت محمدی ﷺ کو ہی رائج کیا جائے۔

۱۰۔ انفرادی و اجتماعی طور پر اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۱۔ اخلاقی، اقتصادی، سیاسی، طبعیاتی غرض یہ کہ ہر معاملہ میں اسوۂ حسنہ سے ہی روشنی لی جائے۔

۱۲۔ حب رسول ﷺ کا تقاضا یہ ہے کہ غالب مغربی اقوام کے سامنے تمام تر مرعوبیت کے باوجود ان کی ثقافت کو ساری اخلاقی بُرائیوں اور تمدنی خرابیوں کے ساتھ قبول نہیں کرنا چاہیے۔

۱۳۔ حب رسول کا تقاضا یہ ہے کہ کھوکھلے نعروں کے بجائے خالص علمی وفکری بنیادوں پر کام کرنا چاہیے۔حب رسول کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کے ذکر کے بعد اکیسویں صدی میں ہمارے مسائل اور سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں ان کے حل کے ذکر سے صرفِ نظر کرنا موضوع کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

آپ ﷺ کی محبت قیامت تک زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق انسانی مسائل میں رہنمائی فراہم کرتی رہے گی۔آج کے معاشرتی بگاڑ میں ہمیں سنت رسول ﷺ کی مدد سے اصلاح کی کوشش کرنا ہے۔روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑے بڑے معاملات تک ہر جگہ اسی سے روشنی لینی ہے مثال کے طور پر آپ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص پر کفار کی نمایندگی کرنے والے کپڑے دیکھے تو فرمایا ''ان هذا من ثياب الكفار فلا تلبسها''(۴۹)(یہ کفار کے کپڑے ہیں انھیں مت پہنو)۔

مشہور عربی مقولہ ہے کہ ''الناس باللباس'' کہ لباس لوگوں کی پہچان ہوتا ہے۔پیغمبر اسلام کو یہ قطعاً پسند نہیں تھا کہ ایک مسلمان غیر اسلامی تہذیب کا مخصوص لباس پہن کر ان کی تہذیب کا چلتا پھرتا نمایندہ نظر آئے۔بلکہ غیر اسلامی تہذیب کا کوئی رنگ ڈھنگ وجود مسلم پر عیاں ہونا، اسلامی غیرت کے منافی ہے۔

مسلمانوں کا اپنی معاشرت میں یہود ونصاریٰ کے طرزِ ملاقات اور انداز دعا وسلام کے اپنانے سے آپ ﷺ نے روک رکھا ہے تاکہ ان کی تہذیبی روایات مسلمانوں میں در نہ آئیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:'' **لا تشبهوا باليهود ولا بالنصارىٰ فان تسليم اليهود الاشارة بالاصابع وتسليم النصارىٰ الاشارة بالأكف**''(۵۰)۔

یہود ونصاریٰ کے سر اور ہاتھ کے مخصوص اشارے والے سلام کے علاوہ آپ ﷺ نے مشرکین

عرب کے انداز سلام وکلام کو بھی پسند نہیں فرمایا۔ جب غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ شکست کھا کر غم و غصے میں تلملا رہے تھے تو صفوان بن امیہ نے عمیر بن وہب جمحی کو آپ ﷺ کے قتل کے لیے بھیجا۔ عمیر نے مدینہ پہنچ کر مسجد نبوی میں آپ ﷺ سے ملاقات پر صبح بخیر (Good morning) کہا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے تحیۓ سے مشرف کیا ہے جو تمھارے اس تحیۓ سے بہتر ہے، یعنی سلام سے، جو اہل جنت کا تحیہ ہے:

"ان الله عز وجل أبدلنا خيرا من ذلك السلام تحية اهل الجنة" (۵۱)

(بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس سے بہتر اہل جنت کا تحفہ بدل دیا ہے)۔

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو السلام علیکم ورحمة الله وبركاته جیسا خوب صورت سلامتی والا اسلام سکھایا ہے اور ساتھ یہ بھی تلقین کی ہے کہ یہ تمھارا مخصوص ثقافتی شعار ہے، تم نے اپنے اس ثقافتی شعار کو یہود ونصاریٰ کے لیے قطعاً پیش نہیں کرنا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "لا تبدؤا اليهود ولا النصارىٰ بالسلام" (۵۲) (یہود ونصاریٰ سے سلام کی ابتداء نہ کرو)۔

آپ کو اپنے وضع کردہ کلچر کی اہانت وتذلیل کسی طور پر پسند نہ تھی۔ بایں سبب غیر مسلم کے لیے السلام علیکم کہہ کر ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی ہے کیونکہ یہ اغیار کی ثقافت کا حصہ نہیں ہے بلکہ خاص مسلم ثقافت کی پہچان ہے۔

بوقت ملاقات ایک انسان کا دوسرے کی عظمت و بڑائی کے آگے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے کہ بندہ خالق کے بجائے اپنے جیسے ایک دوسرے بندے کے آگے جھک رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی ثقافت میں اس تذلیل سے انسانیت کو نکال کر برابری کے درجے میں ملنے کو رواج دیا، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "قال یا رسول الله ! اینحنی بعضنا لبعض قال : لا" (۵۳) (میں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص دوسرے کے سامنے جھک سکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں)۔

اسی طرح عجمی طرز استقبال کو بھی آپ ﷺ نے رد کر دیا جس میں کسی بڑے کی آمد پر کھڑے ہونے کا رواج تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"لا تقوموا كما يقوم الاعاجم" (۵۴) (جس طرح عجمی کھڑے ہوتے ہیں آپ اس

طرح کھڑے نہ ہوں)۔

اس استقبال میں بھی شرفِ انسانی پامال ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے ایسے کلچر کو فروغ دینا قطعاً مناسب نہیں سمجھا، اس لیے عجمی کلچر کی نفی کی۔

عصرِ حاضر کی غیر اسلامی تہذیبیں اپنے علمبرداروں میں تکبر و غرور کو خوب پروان چڑھاتی ہیں ان کی چال ڈھال اور لباس فاخرانہ انداز کے مظہر ہوتے ہیں، درحقیقت یہ کبر و نخوت کا وطیرہ اخلاقیات کی دنیا میں اخلاق رذیلہ میں شمار کیا جاتا ہے جب کہ آپ ﷺ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (۵۵) (میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں)۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے لباس و چال ڈھال میں متکبرانہ رویے کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی اور فرمایا کہ "ان اللہ لا ینظر الی من جر ثوبہ خیلاء" (۵۶) (بلاشبہ اللہ اس شخص کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا بھی نہیں جو تکبر کی وجہ سے اپنے کپڑے گھسیٹتا ہے)۔

قرآن حکیم میں فرمایا: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً ﴾ (۵۷) (اور تو زمین پر اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے)۔

آدابِ خورد و نوش کسی کلچر کا اہم ترین حصہ ہوتے ہیں کیونکہ آدمی کی صحیح پہچان کھانے کی میز پر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے مسلم دستر خوان پر حلال اور طیب اشیاء سجانے کی دعوت دی ہے۔ اس کے برعکس حرام اور خبیث اشیاء کی طرف ہاتھ بڑھانے کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔

آپ ﷺ نے یہودیوں کے متبرک دن ہفتے اور عیسائیوں کے متبرک دن اتوار کو چھوڑ کر اپنے لیے جمعہ کے دن کو پسند فرمایا، یعنی ہفتہ وار مذہبی عبادات کے لیے دوسرے مذاہب کے طور اطوار اپنانا تو دور کی بات ہے، آپ ﷺ نے دن کی مماثلت بھی گوارا نہیں کی بلکہ جگہ جگہ ثقافتی ٹکر مول لی۔ اغیار کی اجارہ داری کے سامنے یا اپنی رواداری کے نام پر قطعاً ثقافتی جنگ میں نرم رویہ نہیں دکھایا بلکہ خواہ معاشرتی

روایات ہوں یا مذہبی رسومات ہر جگہ اپنے عقیدے کی بنیاد پر سلامتی والی روایات اور خالص عبادات پر مبنی ثقافت کو ترویج دی۔

آج ذرائع ابلاغ اور ٹیکنالوجی پر غلبے کے باعث مغرب نے اپنے مفادات کے متصادم ہر نظام اور اخلاقی اصول کے خلاف اعلانیہ جنگ شروع کر دی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ ہم مسلمان بھی پراپیگنڈے کی لہر میں مسلسل بہے جا رہے ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ کا تفصیلی مطالعہ ایسے بہت سے امور سامنے لاتا ہے جن میں آپ ﷺ نے ثقافتی جنگ لڑی۔ چند روایات کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ کیا یہ ساری مخالفت، مخالفت برائے مخالفت کی سوچ کے تحت تھی یا اعلیٰ اخلاقی اقدار اور بہترین تہذیبی روایات کے فروغ کی خاطر تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس مخالفت کا سبب ان تہذیبی روایات کا شر تھا یا پھر ان روایات کا کفر کا نمائندہ ہونا تھا۔ اسلام کا یہ مزاج قطعاً نہیں ہے کہ مخالفت کے نام پر ہر اچھائی کی بھی برائی کے ساتھ مخالفت کرتا چلا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ تہذیبِ اسلامی کے بالمقابل اس دور کی دیگر تہذیبیں اعلیٰ تعلیمات اور بہترین تہذیبی روایات میں اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں۔ آج زندگی کے ہر میدان میں امانت و دیانت اور اعلیٰ فنی صلاحیتوں کے حامل مردانِ کار کا ایک قحط محسوس ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے افراد کی اخلاقی تربیت کا وہ معیار اور نظام پس پشت ڈال دیا ہے جو ہمیں سنت رسول ﷺ میں نظر آتا ہے۔ ہم صرف محبت کے زبانی دعوے کرتے ہیں مگر اپنی محبت کے عملی ثبوت کے لیے سنت رسول ﷺ پر عمل پیرا ہونے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں کہ اگر ہم آج بھی تربیت افراد کے لیے ان اخلاقی اصولوں کو مشعل راہ بنائیں تو ہم اس قحط الرجال کو ختم کر سکتے ہیں۔ تاریخ اس سے پہلے یہ منظر روز روشن کی طرح دیکھ چکی ہے۔ صرف اپنے ہی نہیں اغیار بھی اس کے معترف ہیں۔

مغربی دانشور Briffault بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ آج بھی حضرت عمرؓ جیسے پختہ فکر کے حاملین کی ضرورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المقدس کی فتح پر چابیاں پیش کرنے کے لیے اہل کتاب نے یاد کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ کپڑوں کو پیوند لگے ہوئے تھے۔ مسلم سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اعلیٰ لباس پہننے کی گزارش کی، فرمایا کہ ہمیں عزت لباس کی بدولت نہیں

اسلام کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔(۵۸) ہمیں یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ اسلام اور اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والی اسلامی تہذیب کل بھی عزت بخشنے والی تھی آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔

آج ہمارے لیے ثقافتی یلغار کے حوالے سے اپنے رویے پر سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ان کے فکری مشاورتی انھیں یہ سبق دے رہے ہیں کہ فوجی لڑائی کے ذریعے کوئی ملک فتح کرنا مشکل ہے اور اس پر قبضہ رکھنا دنیا بھر سے بدنامی کمانے کا باعث ہے۔اس کے بجائے تہذیبی تصادم کی راہ اپناتے ہوئے تہذیبی غلبہ پائیں اور پھر ثقافتی لوازمات فروخت کر کے خوب دولت کمائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمان علمی دنیا میں یتیم، سیاسی طور پر غیر مستحکم اور مالی طور پر بدحال ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پریشان حال امت کو بالکل دیوار کے ساتھ لگانے کے لیے ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن جیسے سکالر Clash of Civilization جیسے معروف زمانہ مقالے لکھ کر اہل یورپ کو تصادم کی راہ دکھا رہے ہیں اور مغرب موجود عالمی غلبے کے زعم میں اپنی ثقافت کے پرچار میں دن رات کوشاں ہے جبکہ یہ کلچر انسانیت کے لیے تباہی کا پیغام لا رہا ہے، خود ان کے ہاں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے۔خاندانی نظام بالکل نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔عزت و غیرت نامی الفاظ ان کی ڈکشنریوں سے غائب ہو چکے ہیں۔منافقت اور خود غرضی کو چالاکی سمجھا جاتا ہے۔دوغلے پن اور دورُخی زندگی کو سیاست اور ڈپلومیسی کا نام دیا جاتا ہے۔دنیا بھر میں اپنے استعماری غلبے کے دوام کی خاطر جگہ جگہ خاص طور پر خون مسلم کی ارزانی ان کے لیے تفریح طبع کا درجہ رکھتی ہے۔

جبکہ سیرت نبوی ﷺ کا تحقیقی مطالعہ کرنے والے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق محمدی انقلاب کے ۲۳ سالہ دور میں کل ۱۰۱۸ مسلم و غیر مسلم افراد کام آئے تھے۔وہاں تہذیبی غلبے کے پیچھے کارفرما اصل روح اپنے فریضہ اظہار دین کی تکمیل تھی۔

﴿ هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ (۵۹) (اللہ تعالیٰ) وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس (دین) کو دیگر ادیان پر غالب کر دے)۔

آج کی غالب عالمی طاقتوں کے ہاں سراسر استعماری ذہنیت کارفرما ہے جب کہ نبوی تحریک میں پہلے اعلیٰ تہذیبی روایات کے مظہر معاشرے کا قیام اور آخر میں اس کے مخالفین سے عسکری ٹکراؤ تھا یہاں پر صرف Super Power کہلانے کا شوق ہے جس کی تکمیل کے لیے اعلیٰ تعلیمات اور بے مثال تمدنی روایات کی تہذیبی تائید سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس مرعوبانہ ذہنیت سے چھٹکارا پانا لازمی ہے جس میں یورپ سے آمدہ ہر روایت سونے کی طرح چمکدار نظر آتی ہے، حالانکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

اسی طرح وہاں سے آمدہ ہر روایت کو رد کرنے کا رویہ اپنانے کی بجائے آنحضرت ﷺ کی سنت کے مطابق ایمان وعمل کے لیے غیر مضر روایتی عنصر کو قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھنا چاہیے۔ اپنے آپ کو برابری کی سطح پر لا کر اس ثقافتی یلغار کا بغور جائزہ لینا چاہیے اور خُذ مَا صَفَادَعْ ما کدر کی چھلنی سے گزار کر ہی قابل قبول چیز کو قبول کرنے اور باقی کو آپ ﷺ کی طرح علی الاعلان رد کرنے میں کوئی جرم نہیں سمجھنا چاہیے، قرآن حکیم بھی یہی تلقین کرتا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ﴾(٦٠)(اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو)۔

﴿ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ﴾(٦١)(جو شخص اسلام کے علاوہ اور دین تلاش کرے اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔

شاعر مشرق نے کیا خوب کہا:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میان حق و باطل نہ کر قبول

آج کے دور کے نجی اور معاشرتی مسائل کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کے حل میں بھی اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت اور ان کے ساتھ سچی محبت میں ہمارے درد کا درماں موجود ہے۔

اکیسویں صدی کے نہایت اہم بین الاقوامی مسائل درج ذیل ہیں:

۱: ذرائع ابلاغ کا کردار ۲: عالمی امن

۳: غربت وافلاس ۴: عالمی تجارت

۵: پرسکون زندگی کا حصول۔

۱: ذرائع ابلاغ:

عالمی میڈیا آج کے دور میں انسان کو متاثر کرنے کے لیے اہم کردار ادا کر رہا ہے، ذرائع ابلاغ کو بیک وقت معلّم، مرشد اور کتاب کا کردار مل گیا ہے۔ کتاب، اخبار، رسائل کا کردار اگرچہ محدود ہے، مگر مؤثر اور آسان، الیکٹرانک میڈیا بہت وسعت پذیر اور بے حد متاثر کن ہے اور کمپیوٹر نے سب کو مات کر دیا ہے اور اس کے ذریعے ایک قوم دوسری قوم کو اس کے گھروں میں بلکہ سونے کے کمروں میں گھس کر ذہنوں کو متاثر کر سکتی ہے، لہٰذا اس سلسلے میں سیرت نبوی ﷺ کی رہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ سیرت نبوی ﷺ کا پیغام یہ ہے کہ علم وحکمت ایک ایسی دولت ہے جو مومن کی گمشدہ میراث ہے اور جہاں بھی ملے وہ اس کا حقدار ہے۔ اس سلسلے میں پیغمبر علیہ السلام نے خبر کی صحت اور تصدیق کو بنیاد قرار دیا ہے۔ معلومات دینے والا آدمی ثقہ ہو۔ محدثین نے روایت حدیث کرنے والوں کی چھان پھٹک کے ضمن میں جو سنہری اصول دیے ہیں وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ تخریبی میڈیا کی معاندانہ روش کو توڑنا ضروری ہے، اسی طرح مسلم معاشرے کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے ہر قسم کی تخریبی اطلاعات کے تبادلے کی مؤثر روک تھام کی ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے جو گمراہی پھیلتی ہے اس سے پہلو بچانے اور محفوظ رہنے کے لیے واضح ہدایات موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو اسلام پھیلانے کے لیے استعمال کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔

۲: عالمی امن:

آج کے اس دور میں دنیا امن کے لیے بیقرار ہے۔ ہر طرف ایٹمی اسلحہ عام ہے۔ جرائم اور فسادات بے تحاشا ہیں۔ بے کس کے لیے زندگی پریشانی کا باعث بن چکی ہے۔ مظلوم پر ظلم کا بدلہ لینے کے لیے کوئی نہیں۔ قرآن مجید نے اس کا نقشہ اس طرح سے پیش کیا ہے۔

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ (٦٢) (خشکی وتری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل

گیا۔اس لیے کہ انھیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے بہت ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں)۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت وتعلیمات کی اصل روح آپ ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا ہے۔ اسلام کا اصل مقصد تو امن وسلامتی کی فضا قائم کرنا ہے۔ جہاد وقتال تو حسب موقع اور حسب ضرورت ہے، جس کے لیے اہل ایمان کو ہر وقت آمادہ وتیار رہنے کی تلقین ہے۔ مگر دورانِ جہاد وقتال بھی اگر دشمن امن وسلامتی کا طالب ہو اور اسلام کی اصل راہ کی طرف مائل ہو جائے تو حکم ربانی یہی ہے کہ اہل ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہوئے امن وسلامتی کا پیغام قبول کر لینا چاہیے۔

﴿وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰه﴾(۶۳)(اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو آپ ﷺ بھی صلح کی طرف مائل ہو جایے اور توکل اللہ پر کیجیے)۔

سیرت نبوی ﷺ کا پیغام یہ ہے:''کہ تم عدل وانصاف قائم کرو دنیا میں امن وسکون قائم ہو جائے گا''۔

۳: غربت وافلاس:

غربت وافلاس انسانیت کا ایک اہم مسئلہ ہے اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ وسائل رزق تک ہر انسان کی آزادانہ رسائی نہ ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام میں وسائل پیداوار محدود ہو جاتے ہیں اور کمیونزم میں سرمایہ دار سے سرمایہ چھین کر غربت ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ اسلام اس کا صحیح حل پیش کرتا ہے۔ سیرت نبوی ﷺ کا پیش کردہ نظام اعتدال پر قائم ہے۔ اس میں ہمدردی اور ایثار ہے اور وسائل رزق تک سب کی رسائی ہے۔ اس پر اجارہ داری اور رُکاوٹ قانون اور اخلاق سے ماورا ہے۔ دولت مند کو اپنی دولت اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کی امانت سمجھ کر خرچ کرنے اور اسراف سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور ساتھ ہی دولت کو وراثت، زکوٰۃ، صدقات، خیرات اور دیگر فلاحی طریقوں سے تقسیم کرتے رہنے کا حکم دیا ہے تاکہ یہ معاشرے کے مختلف طبقوں میں گردش کرتی رہے۔ سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں منصفانہ ومعتدل اقتصادی لائحہ عمل اپنا کر اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔

۴: عالمی تجارت:

یہود وہنود نے دنیائے انسانیت کو ایک تجارت گاہ بنا رکھا ہے۔ سود خوری سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اسے عالمی تجارت کا نام دیا گیا ہے۔ نئے عالمی استعمار کے شیطانی ہتھکنڈے کی یورپ

اور امریکہ میں باضمیر انسان مخالفت کرتے ہیں لیکن مغرب کا مقصد عالم اسلام کی معدنی دولت اور خام مال لوٹ کر اس کو غلام بنانا ہے۔ اس کے لیے ایک مشترکہ کمپنی بنائی گئی ہے اور اسے عالمی تجارتی تنظیم کا پُرکشش نام دیا گیا ہے۔ یہ عالمی تجارت نہیں بلکہ استحصالی نشتر ہے اور قرضوں اور سود میں جکڑے مسلمانوں کے خون کو نچوڑنا عالمی سامراج کا مقصد ہے۔ مسلمان کے لیے سیرت نبوی ﷺ کا پیغام یہ ہے:

''۹۰ فیصد رزق تجارت میں ہے'' (۶۴)

حضور ﷺ نے خود تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا، صداقت اور امانت کے ساتھ تجارت میں اصول پسندی کا بہترین نمونہ قائم کیا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ''سچا اور امین تاجر نبیوں اور صدیقوں کے ساتھ اٹھے گا'' (۶۵)۔ عالمی تجارت ایک نبوی ورثہ ہے جو مسلمانوں کا حق ہے۔ دنیا سے اسی صورت میں استحصالی نظام اور سودی کاروبار ختم ہو سکتا ہے جب اس کو سیرت نبوی کی پاکیزہ تعلیمات کی روشنی میں ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۵: پُرسکون زندگی کا حصول:

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آرام کی زندگی بسر کرے۔ اگر دنیا میں امن قائم ہو جائے، اظہار رائے کی آزادی ہو، فقر و افلاس سے دنیا کو نجات مل جائے، ہر انسان کی عزت کی جائے۔ ذرائع ابلاغ کو صحیح استعمال کیا جائے تو پرسکون زندگی کا مقصد کافی حد تک حاصل ہو سکتا ہے، مسلمان کی زندگی محض کھانے پینے، سونے کھیلنے اور عیش کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک اور عالم (آخرت) کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا بھی ضروری ہے۔ دنیا تو اس کے لیے ایک عارضی جگہ ہے بلکہ آزمائش گاہ ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُم ﴾ (۶۶) (اس نے موت و حیات کو تمھیں آزمانے کے لیے پیدا کیا ہے)۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی مسافر رہتا ہے'' اور اپنے آپ کو آخرت کے لیے تیار کرو بلکہ پیغمبر علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا: انسان صبح کرلے تو شام کا انتظار نہ کرے اور شام کرلے تو صبح کا انتظار نہ کرے''۔ اور حضور ﷺ نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو اطمینان قلب کا باعث قرار دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ البقرہ:۱۲۹۔

۲۔ آل عمران:۱۶۴۔

۳۔ سبا:۲۸۔

۴۔ الانبیاء:۱۰۷۔

۵۔ النجم:۳-۴۔

۶۔ آل عمران:۳۱۔

۷۔ الحجر:۷۲۔

۸۔ بروسوی، اسماعیل حقی، تفسیر روح البیان (دار احیاء التراث العربی بیروت، الطبعۃ السابعۃ ۱۳۰۵ھ) ۴/ ۴۷۸۔

۹۔ البلد:۱-۲۔

۱۰۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض، طبع ثانی، ۱۹۹۹ء) ص ۱۰۷۵، حدیث نمبر ۶۱۶۸۔

۱۱۔ التوبہ:۲۴۔

۱۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۱۴۶، حدیث نمبر ۶۶۳۲۔

۱۳۔ بخاری، الجامع الصحیح ص ۶، حدیث نمبر ۱۵؛ مسلم، الجامع الصحیح (نور محمد، اصح الکتب کراچی، ۱۹۹۶ء) ۱/ ۴۹

۱۴۔ مسلم، الجامع الصحیح، ۱/ ۴۹۔

۱۵۔ ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری (دار النشر الکتب الاسلامیہ، لاہور ۱۹۸۱ء) ۱/ ۵۹۔

۱۶۔ قاضی، ابوالفضل عیاض بن موسی، الشفاء بتعریف حقوق مصطفیٰ ﷺ (المکتبۃ التجاریہ، مصر) ۱/ ۳۴۔

۱۷۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۲/ ۸۳۵، حدیث نمبر ۲۷۳۱۔

۱۸۔ الاحزاب:۶۔

۱۹۔ النور:۶۳۔

۲۰۔ ابن قیم، شمس الدین ابو عبداللہ محمد، اعلام الموقعین (دار الحدیث مصر)، ۱/ ۴۲۔

۲۱۔ ابن سعد، محمد، الطبقات الکبریٰ (دار صادر بیروت، ۱۹۸۵ء) ۱/ ۲۳۳۔

۲۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۱/ ۵۵۴-۵۵۵۔

۲۳۔ الساعاتی، احمد بن عبدالرحمٰن، الفتح الربانی بترتیب مسند احمد (دار احیاء التراث العربی، بیروت) ۲۰/ ۲۹۱۔

۲۴۔ احمد بن حنبل، المسند (دار الفکر، بیروت) ۱/ ۳۔

۲۵۔ الفتح الربانی، ۲۰/ ۲۹۱۔

۲۶۔ بخاری، الجامع الصحیح، ۱/ ۵۵۸۔
۲۷۔ مسلم، الجامع الصحیح، ۱/ ۱۹۳۔
۲۸۔ النساء: ۶۹۔
۲۹۔ الہیثمی، نورالدین، مجمع الزوائد (مؤسسہ المعارف، بیروت ۱۹۸۶ء)، ۲/ ۲۔
۳۰۔ احمد، المسند ۴/ ۵۷-۵۸۔
۳۱۔ منصور پوری، محمد سلیمان، رحمۃ اللعالمین (الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور) ۱/ ۱۰۶۔
۳۲۔ المائدۃ: ۲۴۔
۳۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۶۶۸، حدیث نمبر ۳۹۵۲۔
۳۴۔ النسائی، السنن، مع التعلیقات السلفیۃ (المکتبہ السلفیہ، لاہور) ۲/ ۵۲-۵۳۔
۳۵۔ النساء: ۵۹۔
۳۶۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۲۳۰، حدیث نمبر ۱۵۶۳۔
۳۷۔ السیرہ النبویہ، ۳/ ۱۰۵۔
۳۸۔ البقرۃ: ۱۴۴۔
۳۹۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۰، حدیث ۴۰۔
۴۰۔ الحشر: ۷۔
۴۱۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۷۹۰، حدیث نمبر ۴۶۲۰۔
۴۲۔ ایضاً ص ۷۸۹، حدیث نمبر ۴۶۱۷۔
۴۳۔ خلیفہ بن خیاط، التاریخ (دارالفکر، بیروت) ص ۱۰۰۔
۴۴۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۲۵۳، حدیث نمبر ۷۲۸۴-۷۲۸۵۔
۴۵۔ الم نشرح: ۴۔
۴۶۔ آل عمران: ۳۱۔
۴۷۔ الغاشیہ: ۲-۵۔
۴۸۔ بخاری، الجامع الصحیح، ص ۱۰۷۵، حدیث نمبر ۶۱۷۱۔
۴۹۔ مسلم، الجامع الصحیح، ص ۹۳۰، حدیث ۵۴۳۴۔
۵۰۔ الترمذی، محمد بن عیسی، السنن (دارالسلام، الریاض، ۱۹۹۹ء) ص ۶۱۱، ۶۱۲، حدیث نمبر ۲۶۹۵
۵۱۔ احمد، المسند، ۴/ ۳۸۱۔

۵۲۔ مسلم، الجامع الصحیح ،ص۹۶۴، حدیث نمبر۵۶۶۱۔

۵۳۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، السنن (دارالسلام، الریاض، طبع ثانی، ۱۹۹۹ء) ص۵۳۰، حدیث نمبر۳۷۰۲۔

۵۴۔ الخطیب التبریزی، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح (نورمحمد اصح المطابع، کراچی) ص۴۰۳۔

۵۵۔ مالک بن انس، المؤطا (داراحیاء العلوم، بیروت، ۱۹۹۴ء) ص۶۹۳، حدیث نمبر۱۶۷۷۔

۵۶۔ بخاری، الجامع الصحیح ،ص۱۰۲۰، حدیث نمبر۵۷۸۴۔

۵۷۔ بنی اسرائیل: ۳۷۔

58. Briffault,Making of Humanity.P.78.

۵۹۔ الصف: ۹۔

۶۰۔ النور: ۲۱۔

۶۱۔ آل عمران: ۸۵۔

۶۲۔ الروم: ۴۱۔

۶۳۔ الانفال: ۶۱۔

۶۴۔ غزالی، احیاء علوم الدین (مصر ۱۹۳۹ء) ۲/۶۴۔

۶۵۔ ترمذی، السنن، ص۲۹۵، حدیث نمبر۱۲۰۹۔

۶۶۔ الملک: ۲۔

عدل کے ادارے اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

عدل مصدر ہے اس کا مادہ ع۔د۔ل ہے، اس مادے میں برابری اور مساوات وانصاف کے مفہوم ہیں۔لسان العرب میں ہے:"عدل،انہ مستقیم وھو ضدّالجور، العدل:من اسماء اللّٰہ ھو الذی لایمیل بہ الھویٰ،العدل الحکم بالحق"(۱)(عدل،اس کا معنی سیدھا اور یہ جور کی ضد ہے،عدل لفظ اللہ کے ناموں میں سے ہے یعنی وہ خواہشات کی طرف مائل نہیں ہوتا،عدل حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں)۔

امام جرجانیؒ کا کہنا ہے:"العدل الأمر المتوسط بین الإفراط والتفریط" (۲) (عدل افراط وتفریط کے درمیان متوسط کام کو کہتے ہیں)۔

ایڈورڈ ولیم لین کے مطابق امور ومعاملاتِ قضا میں درست اور برابری کا رویہ اختیار کرنے کو عدل کہتے ہیں(۳)۔عدل کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی"برابر"اور یکساں بھی ہیں(۴)۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:﴿ أو عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَاماً لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ﴾(۵) (یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کیے کی سزا چکھے)۔

عدل(بالفتح) کے معنی قیمت،فدیہ،مردصالح اور حق وانصاف کے ہیں(۶)۔

عدل"فدیہ"کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے(۷)۔اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلاَ يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلاَ هُمْ يُنصَرُونَ﴾(۸)۔

(اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے گی اور نہ کسی سے کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے گا)۔

لیکن اگر عدل بالکسرہ ہو تو اخفش کے مطابق اس کے معنی"المثل"کے ہیں(۹)۔

اہل لغت نے اگرچہ"العَدل"اور"العِدل"کے معنی الگ الگ لیے ہیں لیکن اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ قریب المعنی ہیں۔"عَدل"معنوی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اور"عِدل"ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جن کا ادراک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے(۱۰)۔

عدل اصل میں عربی لفظ ہے۔اردو میں اس کا ہم معنی"انصاف"انگریزی میں "Justice"

اور عبرانی میں ''صداقاۃ'' اور ''مشپاط'' ہے۔

Twentieth Century Encyclopaedia میں "Justice" کے ضمن میں مقالہ نگار لکھتا ہے:

Equal distribution of right in expressing opinions; fair representation of facts respecting merit or demerit: equity, impartiality.(11)

عبرانی میں عدل کے لیے ''صداقاۃ'' اور ''مشپاط'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

The Standard Jewish Encyclopaedia کے مطابق

The Biblical Hebrew words for Tzedek, Tzedakah, Mishpat possess many shades of meaning, Justice, righteousness, proper behaviour, fairness, integrity.(12)

اردو زبان میں عدل کو بطور اسم ذات بھی استعمال کیا جاتا ہے اور بطور اسم صفت بھی، اس صورت میں اس کے معنی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

''اسم ذات کے طور پر عدل کے معنی ''انصاف'' یا ''دادرسی'' کے ہیں اور اسم صفت کے طور پر اس کے معنی مستقیم، منصفانہ اور متوازن کے آتے ہیں'' (۱۳)

جب کہ عام اصطلاح اور قضا کے نقطۂ نظر سے عدل کا مفہوم یہ ہے: ''روزمرہ کے معاملات میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے جج یا قاضی عدل وانصاف کے ساتھ ان کے حقوق عامہ کا یوں تحفظ کرے کہ کسی ایک کی بھی حق تلفی نہ ہو''۔

''عدل کو عربی زبان میں 'قضاء' کہتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں قضاء کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے معینہ ادارے کی طرف سے قرآن وسنت اور شرعی احکام کی روشنی میں عامۃ الناس کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کیا جائے اور مقدمات فیصل کیے جائیں''۔ (۱۴)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''سیاستِ شرعیہ کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے ایک ہے مناصب اور عہدے اہل تر لوگوں کو دینا اور دوسرا ہے عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کرنا، انصاف ہی پر دین ودنیا کی فلاح کا دارومدار ہے اور بغیر عدل کے فلاحِ دارین کا حصول ناممکن ہے''۔ (۱۵)

رازی کہتے ہیں: ''العدل فهو عبارة عن الأمر المتوسط بين طرفي الافراط و التفريط، و ذلك امر واجب الرعاية فی جميع الاشياء''(۱٦)۔

مندرجہ بالا تعریفات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ عدل کا مفہوم مختلف مناسبتوں سے مختلف ہوتا ہے۔عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے،یعنی اللہ کے حق کو اپنی خواہش پر مقدم رکھے۔دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ عدل کرے،یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام باتوں اور چیزوں سے بچائے رکھے جن سے جسمانی و روحانی ہلاکت و اذیت کا خطرہ ہو اور تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات اور مخلوق کے درمیان عدل کرے۔یعنی تمام مخلوقات سے ہمدردی و خیر خواہی کا برتاؤ کرے۔ہمارے ہاں عدل کو عدالت کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔

عدل و انصاف کی اہمیت و ضرورت: قرآن و حدیث کی روشنی میں:

معاشرے میں استحکام پیدا کرنے کے لیے عدل و انصاف اور سزا ضروری ہیں۔اس کے بغیر معاشرہ جرائم اور منکرات سے پاک نہیں ہو سکتا۔معاشرے کو برائیوں سے مبرا رکھنے کے لیے قانون و عدل نہایت ضروری ہیں۔عدل کے بغیر جس کی بنیاد قانون پر ہوتی ہے، امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، اس لیے اسلام نے ایسے جرائم میں حد مقرر کی جس کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے جیسے چوری، زنا، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور شراب نوشی وغیرہ اور انصاف اور سزا کا اختیار صرف ان لوگوں کو دیا جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو۔قانون کے نفاذ سے جرائم کا انسداد ضرور ہو جاتا ہے اور معاشرہ کسی حد تک جرائم سے پاک بھی ہو جاتا ہے(۱۷)۔

اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے میں عدل قائم کرنے پر زور دیا ہے۔اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے: ﴿وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُم﴾(۱۸)(مجھے تمھارے درمیان انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے)۔﴿وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ﴾(۱۹)(اور جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو)﴿وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾(۲۰)(اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو

یہی تقویٰ کے بہت زیادہ قریب ہے)۔﴿ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ﴾(۲۱)(اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کر)۔﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ﴾(۲۲)(اور کہہ دے کہ میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے)۔

احادیث میں بھی عدل کی بہت زیادہ اہمیت پائی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فإن عدلوا فلأ نفسهم، وإن ظلموا فعليها"(۲۳)(اگر وہ انصاف کریں تو ان کے لیے فائدہ مند ہے اور اگر ظلم کریں تو ان کے لیے وبال جان ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً ﴾(۲۴)(مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے) کے بارے میں روایت کرتے ہیں۔ میں نے اس آیت کے بارے میں نبی ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مکہ والوں نے کہا:

"فقد عدلنا بالله، قتلنا النفس التي حرّم الله إلاّ بالحقّ وأتينا الفواحش فانزل الله(إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً)"(۲۵)(پس ہم نے انصاف کیا اللہ کے معاملے میں اور قتل کیا اُس نفس کو جس کو اللہ نے حرام کیا، مگر حق کے ساتھ اور ہم نے فحش کام کیے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔(إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحا)۔لوگوں کے درمیان اصلاح کروانے اور ان کے درمیان انصاف کرنے والے کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:"يعدل بين الناس صدقة "(۲٦)(لوگوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے)۔

حکمران کے بارے میں حدیث میں آتا ہے"فإذا عدل كان له الأجر"(۲۷)(جب وہ عدل کرے تو اس کے لیے اجر ہے)۔

عدل وانصاف کے اصول:

محسن انسانیت ﷺ نے ایک طرف تو جرم کی سزا کی تنفیذ کی سختی سے تاکید فرمائی تو دوسری طرف آپس کے معاملات میں جن کا تعلق انفرادی زندگی سے تھا، عفو ودرگزر کی تعلیم دے کر معاشرہ میں جماعت اور افراد دونوں کو استحکام بخشا اور نظام عدل کو ایسے بنیادی اصولوں سے نوازا جو عالم گیر اہمیت کے

حامل ہیں۔

ا۔اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ:

رب کائنات ہی حکمران حقیقی ہے۔اس حقیقت کو قرآن کریم میں متعدد بار بیان کیا گیا اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پُر زور الفاظ کسی بات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُواْ إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ﴾ (۲۸) (حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی اور اطاعت نہ کرو۔یہی صحیح طریقہ ہے)۔

۲۔قانون سازی میں رسول اللہ ﷺ کی حیثیت:

نبی کریم ﷺ نے بطور منصف انسانیت کے لیے عظیم اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے۔کہ اس نے نبی ﷺ کو قاضی مقرر کیا ہے کیونکہ آپ ﷺ اللہ کی جانب سے صرف حق بات ہی کہتے ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ﴾ (۲۹) (اور جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا)۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "انـی لا اقـول الاحـقـا" (۳۰) (میں فی الواقع حق کے سوا کچھ نہیں کہتا)۔نبی ﷺ بطور منصف کی تصدیق مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتی ہے:"عن عليؓ قال لما نزلت:(وللّٰه على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا) قالو:يارسول اللّٰه! أفي كل عام؟ فسكت فقالوا: يارسول اللّٰه في كل عام؟ قال: لا،ولو قلت: نعم،لوجبت فأنزل اللّٰه تعالىٰ:﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَسْأَلُواْ عَنْ أَشْيَاء إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ﴾ (۳۱) (جب یہ آیت نازل ہوئی(وللّٰه على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا) تو لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا ہر سال (حج کرنا) فرض ہے؟ حضور ﷺ خاموش رہے لوگوں نے پھر عرض: کیا ہر سال؟ یارسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا"نہیں"اور اگر میں کہہ دیتا"ہاں"تو ہر سال حج واجب ہو جاتا)۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مقدمات میں اللہ سے انصاف طلب کریں۔اللہ سے

انصاف طلب کرنے سے مراد یہ کہ اس کے رسول ﷺ کو مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے منصف تسلیم کیا جائے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (۳۲) (اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول اور جو تم میں حکمران ہیں ان کا حکم مانو۔ پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اللہ اور رسول ﷺ کے حضور رجوع کرو۔ اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے)۔ اس آیت مبارکہ میں حضور ﷺ کو سب سے بڑا انتظامی اور عدالتی اختیار تفویض کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کے احکامات اور فیصلوں کی اطاعت حکم الٰہی اور ایک مسلمان کے ایمان کی نشانی بھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان منافق اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا ہوا۔ مسلمان منافق نے کہا۔ چلو کعب ابن اشرف سے فیصلہ کرائیں گے۔ یہودی نے کہا۔ نہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو ان سے فیصلہ کرائیں گے۔ وہ مسلمان منافق (مجبوراً) آمادہ ہو گیا اور دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقدمہ پیش کیا۔ حضور ﷺ نے (فریقین کے بیانات سن کر) یہودی کے حق میں فیصلہ فرما دیا۔ اس منافق مسلمان نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا چلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کرائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دونوں حاضر ہوئے اور پورا قصہ بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس منافق مسلمان سے پوچھا۔ کیا یہ سچ کہتا ہے۔ واقعہ یہی ہے؟ منافق نے کہا ''ہاں ٹھیک ہے ہاں ٹھیک ہے''۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''تم ذرا ٹھہرو میں ابھی آ کر فیصلہ کرتا ہوں''۔ اور گھر سے برہنہ تلوار لے کر آئے۔ منافق کی گردن اُڑا دی اور فرمایا۔ ''جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کو قبول نہ کرے میں اس کا فیصلہ اسی طرح کیا کرتا ہوں''۔ روایات میں ہے کہ اسی وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی واقعہ پر طاغوت کے مقابلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام فاروق رکھ دیا (۳۳)۔

۳۔مجلس شوریٰ:

جدید علم سیاست میں جس ادارے کو مقننہ یا قانون ساز ادارہ کہا جاتا ہے علوم اسلامیہ کی قدیم اصطلاح میں اس کو اہل حل وعقد بھی کہا جاتا تھا۔ اسلام میں مجلس شوریٰ یا مقننہ صرف ان مسائل ومعاملات کے سلسلہ میں قانون وضع کرنے کی مجاز ہوگی، جن کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح احکام موجود نہ ہوں۔ یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہوگی، اسی طرح آزاد بھی نہ ہوگی، بلکہ دین کے مزاج اور شریعت کی مقررہ حدود کے تحت ہی ہوگی۔ صرف کتاب وسنت کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر انھی کی بنیاد پر کی جائے گی۔

"عن علیؓ قال :سئل رسول عن العزم قال مشاورۃ اھل الرأی ثم اتباعھم"

(۳۴) (حضرت علیؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے عزم کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر ان کی پیروی کرنا)۔

۴۔تعزیرات کا نفاذ:

فوجداری جرائم کی سزائیں صرف اسی حال میں نافذ کی جائیں، جب معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خاطر خواہ اہتمام موجود ہو اور حالات معمول پر ہوں۔ جب تک معاشرہ میں نفاذ اسلام کے لیے سازگار حالات پیدا نہ کردیئے جائیں یا یہ کہ حالات ایسے غیر معمولی ہوں جن میں ارتکاب جرم کے محرکات ترقی پذیر ہوں تو سزاؤں کی انتہائی حد کا نفاذ رکا رہے گا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک بار شکایت آئی کہ حاطب کے غلاموں نے مزنی کا اونٹ چرا کر ذبح کرکے کھالیا، حاطب کو طلب فرما کر حضرت عمرؓ نے پوچھا تو غلاموں کو بھوکا رکھتا ہے پھر فرمایا غلاموں کو سزا دینے سے بہتر یہ ہے کہ تم کو گراں بار کیا جائے۔ مزنی سے پوچھا تیرے اونٹ کی کیا قیمت تھی اس نے کہا کہ لوگوں نے چار سو درہم لگائے تھے، مگر میں اس پر فروخت کرنے کے لیے راضی نہ تھا حضرت عمرؓ نے حاطب سے فرمایا کہ جاؤ اس کے اونٹ کے آٹھ سو درہم دے دو (۳۵)۔

۵۔قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ:

مفتی وقاضی پر لازم ہے کہ وہ قانون الٰہی، یعنی قرآن اور سنت کے مطابق فیصلہ کرے اور

عدل وانصاف سے کام لے۔ عدل وانصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم کسی کی خواہشات پر چلنے کی نفی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت اس آیت میں فرمادی ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقاً مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُوْن ﴾(۳۶) (اور آپس میں اپنے مالوں کو ناحق نہ کھاؤ، اوران کو حکام کی طرف ڈالو، تا کہ تم گناہ کے ساتھ لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھا جاؤ اور تم تو جانتے ہو)۔

عدل میں حرص یا خواہشات کا خواہ وہ اپنی ہو یا کسی اور کی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ حاکم کو شہادتوں کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

نظام عدل کی ضرورت اور تاریخی ارتقا:

نظام عدل کی بنیاد کب اور کس نے ڈالی اور ابتدائی دور کا نظام عدل کیسا تھا؟ یہ بتانا ذرا مشکل ہے، لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ انسان نے جب معاشرتی زندگی کا آغاز کیا اسی دن سے انصاف کے اصولوں کو اپنانے کی کوشش شروع کردی ہوگی۔

پہلا جھگڑا حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ہوا تھا ایک نے دوسرے کو قتل کر کے خود ہی انصاف حاصل کرلیا۔ اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''قدیم زمانے میں انسان اپنے نزاع کا تصفیہ ذاتی طاقت اور قوت کے استعمال سے کرتا تھا۔ ذاتی انتقامی کاروائی انصاف کے خلاف استعمال ہوتی تھی'' (۳۷)۔

''ابتدائی زمانہ میں جب انسان کی طرز معاشرت وحشیانہ تھی اور منظم ومنضبط حکومتوں کا قیام نہیں ہوا تھا، ستم رسیدہ اور متضرر اشخاص اپنا انتقام آپ لیا کرتے تھے اور اگر ایک شخص کی دوسرا حق تلفی کرتا تو دوسرا اپنے حق کو بچانے کے لیے جنگ وجدل اور دھینگا مشتی سے اپنی مدد آپ کرتا تھا، بعض وقت ضرر رسیدہ کے قرابت دار اور احباب بھی اس کے دشمنوں سے انتقام لینے میں اس کے شریک ہو جاتے تھے'' (۳۸)

ایک زمانے میں مظلوم اپنی مدد آپ کرسکتا تھا پھر وہ دور آیا کہ اس حق پر کچھ پابندیاں عائد کردی گئیں۔ پھر زمانہ بدلا اور حق لینے کے لیے صاحب رسوخ کی زیر نگرانی ڈوؤل (DUAL) لڑنے کا رواج پایا۔ پھر وہ وقت آیا کہ تنازعات کو ثالثوں اور پنچوں کے سپرد کرنے کا رواج چل نکلا۔ لیکن جب

سلطنتیں مضبوط اور مستحکم ہوگئیں تو انھوں نے باقاعدہ عدالتیں قائم کردیں جو انصاف کرنے کے معاملے میں فرمانروا کی نمائندہ قرار دی گئیں اور اس طرح نظام معدلت وجود میں آ گیا۔

تاریخ کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ نظام عدل کا قیام حکومتوں اور سلطنتوں کی مضبوط مستحکم قوت کی بناء پر معرض وجود میں آیا۔ نظام معدلت کو قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ تمام ارباب خیر فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو انھیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور مخاصمت باہمی میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اگر ذی اقتدار افراد نہ ہوں تو عالم میں شخصی انارکی پھیل جائے اور تہذیب اجتماع کا شیرازہ بکھر جائے (۳۹)۔

اسی رہبر اور حاکم کی طرف قرآن مجید میں اشارہ فرمایا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۴۰) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے حکمرانوں کی پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اُٹھے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے حضور رجوع کرو اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو)۔

جیسے جیسے تہذیب نے ترقی کی عدل کی ضرورت بھی بڑھتی گئی اور دنیا کے نظام عدل میں ترقی اور جدتیں بھی پیدا ہوتی گئیں اور آج ہمارے سامنے جو نظام عدل قیام فرما ہے، وہ تہذیب کے تمام تر تجربات کا نچوڑ ہے کیا وہ مہذب دنیا کا مہذب نظام عدل کہلانے کا مستحق ہے؟

اسلامی عدل وانصاف کا ارتقا:

اسلام میں سب سے پہلے قاضی خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ جنھوں نے عدل کا بول بالا کیا۔ نبی کریم ﷺ کے عدالتی طریق کار کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہد قضا آتا ہے۔ ''اگر کتاب وسنت سے کوئی نظیر نہیں ملتی تھی تو وہ باہر تشریف لے جاتے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے، کیا تم جانتے ہو؟'' وہ اس کے بارے میں جو بات کہتے ان سے مشورہ کر کے قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلہ کرتے (۴۱)۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عدلیہ اور انتظامیہ کو "قانون کی حکمرانی" کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں نظام عدل:

حضرت عمرؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ والا اصول اپنایا کہ پہلے قرآن و سنت سے مسئلے کا فیصلہ ڈھونڈتے تھے۔اس کے بعد دیکھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہو چکا ہے؟ اگر معلوم ہو جاتا تو حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کو نافذ کر دیتے، ورنہ وہ بھی روٴس المسلمین کو جمع کرتے اور وہ اجتماعی رائے سے جو فیصلہ کرتے اس کو نافذ کر دیتے تھے۔

قواعد عدالت کے متعلق حضرت عمرؓ کی تحریر:

"خدا کی تعریف کے بعد قضاء ایک ضروری فرض ہے، لوگوں کو اپنے حضور میں اپنی مجلس میں اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف کے حصول میں مایوس نہ ہو اور تمھاری رعایت کی امید نہ پیدا ہو۔ جو شخص دعویٰ کرے اس پر بار ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اس پر قسم۔ صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہو جائے، کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو۔ جس مسئلے میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر غور کرو۔ پھر قیاس لگاؤ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے تو اس کے لیے ایک میعاد مقرر کرو اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ۔ ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ مسلمان سب ثقہ ہیں، سوا اُن اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں درے لگائے گئے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہے، یا وِلاء اور وراثت میں مشکوک ہوں" (۴۲)۔

حضرت عمرؓ کے دور میں قاضی (جج) کا تقرر ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر گیا تھا اس کو دیگر خلفاء نے بھی جاری رکھا۔

عامل کو قاضی کے ماتحت رکھا گیا تھا تاکہ وہ اس کے اثر سے آزاد ہو کر عدل کر سکے۔ قاضی کو تمام بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ہر صوبے میں قاضی کا تقرر ہوتا تھا۔ صوبائی گورنر کو قاضی کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں چھوٹے قاضی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں قاضیوں کو تنخواہیں دی جانے لگی تھیں تاکہ وہ اپنی زندگی بآسانی گزار سکیں اور لالچ میں مبتلا نہ ہوں (۴۳)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں نظام عدل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک نرم دل خلیفہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدل گستری سے متعلق جو اوصاف وضوابط طے کیے وہ ان کے زمانے میں بحال رہے۔ ان کے زمانے میں ایک عمارت ''دار القضاء'' کے نام سے بنائی گئی (۴۴)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں نظام عدل:

عدلیہ کی جو حیثیت اور شان ووقعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھی اور پھر تینوں خلفائے راشدین کے عہد میں تھی، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی باقی رہی۔

باب قضاء میں علی ''علی'' تھے۔ سراج نبوت سے ہر صحابی نے کسب نور کیا، سب کے الگ الگ رنگ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے کارِ قضاء میں ممتاز بنایا اور ''**اقضاهم علی**'' کا امتیاز انھیں ملا۔ کتنی گتھیوں کو ان کی ذہانت نے سلجھایا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا حضرت شریح کی عدالت میں حاضر ہوکر ایک یہودی کے خلاف انصاف چاہنا اور قاضی شریح کا امیر المومنین کے خلاف ایک یہودی کے حق میں فیصلہ دینا معروف ہے (۴۵)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں نظام عدل کو بھی بہت ترقی دی اور ان کے فیصلے اسلامی نظام عدل میں نظیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گواہی دینے سے متعلق آپؓ نے جو فیصلے کیے ہیں، ان میں جھوٹی گواہی دینے پر شہر میں تشہیر کرنے کے بعد قید کی سزا اور ایک گواہ پر بھی فیصلہ ہوسکتا ہے۔ چار عادل گواہ اگر خود متہم ہوں تو ان چاروں پر حد لگے گی۔ عورتوں کی گواہی نکاح میں جائز قرار دی، لیکن طلاق میں نہیں ان کے مطابق دشمن کی گواہی کو تسلیم نہیں کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نےؓ عہدۂ خلافت کے ساتھ ساتھ عہدۂ قضاء کو بھی بخوبی انجام دیا۔ ان کے فیصلے تاریخ میں روشن مثالیں ہیں۔

اموی اور عباسی عہد میں نظام عدل:

ابتداء میں خلفائے راشدین اور ان کے تعینات کیے ہوئے صوبائی امیر انتظامی امور کے

ساتھ ساتھ قاضیوں کے فرائض خود سرانجام دیتے تھے، مگر رفتہ رفتہ ہر صوبے اور ہر شہر میں عامل کے علاوہ قاضی کا تقرر ہونے لگا۔

بنو امیہ کے دور میں بھی کم وبیش خلفائے راشدین کے دور کی طرح ہی نظام عدل قائم رہا، بعد میں چند تبدیلیاں بھی آئیں۔ ڈاکٹر حمید الدین کے بقول:

''قاضیوں کے فیصلے اسلامی شریعت کی رو سے قرار پاتے اگر کوئی تنازعہ اس نوعیت کا ہوتا جس کے بارے میں قرآن اور حدیث کوئی قطعی فیصلہ نہ دیتے ہوں تو ایسے معاملات کے فیصلے قاضی اپنے اجتہاد اور علماء کے مشوروں سے کرتے تھے۔ انھیں صرف مسلمانوں کے مقدمات سننے کا حق حاصل تھا غیر مسلموں کے لیے علیحدہ جج اور پیشوا مقرر ہوتے تھے۔ جو ان کے لیے اپنے مذہب اور رواج کے مطابق فیصلے کرتے'' (۴۶)۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''قاضیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ رشوت یا خیانت کی طرف مائل نہ ہوسکیں۔ انصاف کے علاوہ اوقاف کے مال کی نگرانی بھی قاضیوں کے فرائض میں شامل تھی۔ بنی امیہ کے عہد میں عدلیہ، خلافت راشدہ ہی کی طرح انتظامیہ سے آزاد رہی اور اس محکمہ کو صیغہ قضاء کہتے تھے۔ مرکز کے علاوہ ہر صوبہ اور ہر ضلع میں عدالت قائم تھی جہاں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے'' (۴۷)۔

بنو امیہ کے زمانہ کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ جن میں پہلی خصوصیت یہ تھی:

اس دور میں قاضی عام طور پر اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ کسی مخصوص شخص کی تقلید نہیں کرتے تھے، اور انھیں کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی پوری آزادی تھی۔

دوسری خصوصیت یہ تھی:

''عدالت کا محکمہ اپنے اختیارات وفرائض میں اموی فرمانرواؤں کے اثر سے بالکل آزاد تھا۔ ان کے ذاتی رجحانات کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس زمانے میں عدالت کے فیصلے گورنروں اور خراج کے افسروں تک بلا رو رعایت نافذ کیے جاتے تھے۔ عہد اموی میں قاضی کے انتخاب کے لیے ضروری تھا کہ وہ بلند سیرت، پاکباز، پرہیزگار، عالم، مجتہد اور عیوب سے مبراء ہو اور عدل وانصاف کے مقابلے میں اس

کو دنیا کی کسی طاقت کی کوئی پرواہ نہ ہو'' (۴۸)۔

عہد عباسی میں بنوامیہ کی ہی طرح قاضیوں کے اختیارات تھے۔قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے رعب داب اور عزت و مرتبہ کا یہ عالم تھا کہ امراء، وزراء بلکہ خلیفہ تک کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ اس کے فیصلوں سے سرتابی کر سکے۔غیر مسلموں کے دیوانی مقدمات ان کے اپنے مذہبی پیشوا سنتے۔ فوجداری کی صورت میں بلاتمیز رنگ و نسل، جنس و قوم، زبان، مذہب و ملت، سبھی کو حکومت کے مقرر کردہ منصفوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا، حتیٰ کہ خلیفہ بھی کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا نہ تو حق دار ہوتا اور نہ ہی مطالبہ کر سکتا تھا۔

عہد بنی عباس میں عدالتی نظام میں زبردست انقلاب آیا اور اس میں کئی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔

''اس دور میں عراق کے قاضی امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق، شام اور بلادِ مغرب کے قاضی امام مالک کے مذہب کے مطابق اور مصر کے قاضی امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اگر مدعی مدعا علیہ ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہوتے جو عام طور پر اس شہر میں رائج نہ ہوتا تو اس وقت ان کے مقدمے کے فیصلے کے لیے قاضی کسی ایسے شخص کو نائب بنا دیتا جو انھی کے مذہب کا پیروکار ہوتا تھا'' (۴۹)۔آہستہ آہستہ اس نظام کو زوال آ گیا۔عباسی دورِ انحطاط میں عدالت کا محکمہ سیاسی اثر سے آزاد نہ تھا۔

مسلم اسپین میں عدلیہ اور نظام عدل:

مسلم اسپین میں حکومت کا ہر محکمہ منظم طور پر قائم تھا اور مسلمانوں کے دور حکومت میں اسپین علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔مسلمان حکمرانوں نے اسپین میں عدلیہ کے ادارے بھی مضبوط بنیادوں پر قائم کیے تھے۔مسلم اسپین میں سب سے بڑا اور مقدس عہدہ قضاء کا ہوتا تھا۔

قاضی دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لیے جدا جدا ہوتے تھے۔ان کا اجلاس عام طور پر مسجد کے دروازے پر ہوتا تھا۔

آئی ایچ برنی نے لکھا ہے:

''صرف یہی ایک عہدہ دار تھا جو تمام سلطنت میں سب سے زیادہ بااختیار رہوتا تھا اور خلیفہ تک کو اس کے فیصلے رد کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اسپین کا نظام عدالت اس زمانہ کے عجائبات میں سے تھا۔ پہلے قواعد بنائے جاتے تھے، پھر ان کو دارالسلطنت اور سرحدی علاقوں میں نافذ کر کے ان کا تجربہ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ سلطنت میں نافذ کیے جاتے تھے مقدمات کے فیصلے میں قطعاً دیر نہ کی جاتی تھی اور کسی سفارش یا حمایت کو فیصلے پر اثر انداز نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ جتنے فیصلے ہوتے وہ نہایت ہوش مندی اور انصاف پر مبنی ہوتے تھے''۔(۵۰)

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو یہاں بھی عام طور پر وہی اسلامی قانون ان کا رہنما تھا، لیکن ہندوؤں کا تمدن چونکہ بہت قدیم اور اس ملک کے لیے نہایت موزوں بھی تھا۔ اس لیے دھرم شاستر کے احکام اور دیگر معتقدات ورواجات کا بھی خاص احترام کیا جاتا تھا(۵۱)۔

فتح سندھ کے تقریباً تین صدی بعد غزنویوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔ غزنویوں نے سندھ کی عرب حکومت کی طرح دیوانی معاملات میں خود ہندوؤں کی پنچائتوں سے کام لیا اور ہندو پنڈتوں کو فصلِ خصومات کا اختیار دیا تاہم مسلمانوں کے معاملات قاضیوں سے متعلق رہے۔ نظام عدل کے دوسرے معاملات میں غزنویوں نے عباسیوں کی کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ پیروی کی۔

سلطنت دہلی میں نظام عدل:

اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی عدالتی عہدیداروں پر بڑی کڑی اور بھاری ذمہ داری عائد تھی اور قاضیوں کو خلاف شرع فیصلہ کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سلطان بحیثیت نافذ قانون وسربراہ مملکت تین طرح کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

''اپنی پہلی حیثیت میں وہ ''دیوان قضاء'' کے ذریعے انصاف پروری کرتا تھا۔ دوسری حیثیت میں ''دیوان مظالم'' کے ذریعے اور تیسری حیثیت میں وہ خود یا اس کے اعلیٰ فوجی عہدے دار فوجی عادل کی حیثیت سے باغیوں کے مقدمات سنتے تھے''(۵۲)۔

عہد سلاطین میں سب مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے طور پر عدل قائم کرنے کی کوشش کی۔ انھی میں سے سلطان التمش بھی اپنے عدل وانصاف میں مشہور تھا۔

غرض وہ سلاطین دہلی ہوں یا مغل حکمران ہر کسی نے اپنے طور پر عدلیہ کے مضبوط ادارے قائم کیے اور عدلیہ کو دیگر اداروں پر فوقیت دی۔

انصاف ہمیشہ مسلمان بادشاہوں کا شعار رہا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد جو حکم دیا وہ ''زنجیر عدل'' کے باندھنے کا تھا تاکہ مظلوموں کی دادرسی وانصاف رسانی میں اگر عہدیداران عدالت کوتاہی وغفلت کریں تو مظلوم خود اس زنجیر کے پاس پہنچ کر اسے ہلا دے (۵۳)۔ یہ زنجیر مظلوم کی دسترس میں تھی اور اس کو ہاتھ لگتے ہی گھنٹیاں بجتیں جن کی آواز بادشاہ تک پہنچتی اور فوراً مظلوم کی دادرسی کی جاتی۔

عالمگیر نے تمام امراء، وزراء اور سرداروں کے مقابلے میں قاضیوں اور عالموں کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا اور انھیں اس قدر اختیارات دے دیے کہ سلطنت کے بڑے بڑے ارکان ان سے رشک وحسد کرنے لگے۔

عالمگیر کی دین داری، رعیت پروری اور عدل گستری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے تمام سلطنت مغلیہ میں یہ اعلان کر دیا کہ جس کسی کو بادشاہ کے خلاف کوئی شکایت یا شرعی دعویٰ ہو وہ بادشاہی وکیل سے رجوع کر کے اپنا معاملہ صاف کرے۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی مجبوری کے سبب دارالحکومت میں پہنچنے سے معذور تھے۔ ان کی سہولت کے لیے شرعی وکیل مقرر کر دیے گئے (۵۴)۔

غیر جانبداری:

مغلیہ دور میں عدل وانصاف کرنے میں غیر جانبداری سے کام لیا جاتا۔ نظریاتی حوالوں اور شاہان مغلیہ کے اقوال کے علاوہ مؤرخین نے بھی کہا ہے کہ مغل حکمران غیر جانبداری سے انصاف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بلا رو و رعایت عدل گستری کے فرائض انجام دیتے۔ اکبر کے ایک منظور نظر گورنر (خان اعظم میرزا عزیز) کے ایک مقدمے میں عام عدالت نے فیصلہ کیا اور گورنر کو ایک کثیر رقم بطور خون بہا ادا کرنی پڑی۔ عدالت میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جاتا تھا، امیر غریب سب کے ساتھ مساوی سلوک ہوتا تھا۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی حکومت صدیوں تک قائم رہی اور ابتدائے عہد سے

انگریزی حکومت کے قائم ہونے تک مسلمان فرمانرواؤں کا نظام عدل کارفرما رہا۔ ملکی نظم ونسق کے ساتھ عدل وانصاف کا محکمہ خاص توجہ کا مرکز تھا، اور ان کے عدل وانصاف کے بعض واقعات اب بھی زبان زدِ خاص وعام ہیں۔

اسلامی شریعت کے احکام کا اطلاق ہوتا تھا خلیفہ ریاست کا سربراہ ہونے کے باوجود کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا نہ تو حق دار ہوتا تھا اور نہ ہی مطالبہ کرسکتا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات خلیفہ وقت کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہوکر کسی معاملے میں صفائی پیش کرنا پڑتی تھی۔ صرف عادل اور نیک لوگوں کی شہادت قبول کی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا اصول قضا:

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے قضاۃ کے منصب پر فائز کیا اور اس کے کچھ اصول مقرر کیے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ﴾ (۵۵) (اور فرمادیجیے میں ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمھارے درمیان عدل قائم کروں)۔ ﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾ (۵۶) (اور کہہ دیجیے کہ میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے)۔

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ﴾ (۵۷) (اور اگر تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر)۔

حضور ﷺ نے قاضی کا منصب اس نام کے تحت کبھی کسی کو عطا نہیں فرمایا البتہ عمال کی ذیلی ذمہ داریوں میں امور قضاء کی انجام دہی بھی شامل تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے خود یمن کے لیے امیر تعینات فرمایا تھا۔ دراصل عمر رضی اللہ عنہ اسلام کے دورِ خلفائے راشدین کے پہلے قاضی تھے جنھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں باقاعدہ قاضی کے عہدے پر فائز کیا مگر سال بھر تک ان کے سامنے کوئی مقدمہ ہی پیش نہ ہوا۔ اصل بات یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو اکنافِ عرب میں مقدمہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے کر روانہ فرمایا اگرچہ ان کے لیے قاضی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا (۵۸)۔

جب حضرت علیؓ کو یمن بھیجا گیا تو انھوں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ وہاں نئے نئے مقدمات پیش ہوں گے اور مجھے قضاء کا تجربہ ہے نہ علم" فرمایا "اللہ تعالیٰ تیری زبان کو راہِ راست کی توفیق عطا فرمائے گا اور تیرے قلب کو ثبات بخشے گا"۔ بہر حال حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو اس منصب کا پورا پورا اہل ثابت کیا جوان کے سپرد عین جوانی میں کیا گیا تھا (۵۹)۔ معاذ بن جبلؓ کو اسی غرض سے یمن روانہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا "کیف تقضی؟" (فیصلہ کیسے کرو گے؟) تو انھوں نے فرمایا: کتاب اللہ کے مطابق پھر سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق......الخ (۶۰)۔

یمن کے نواح میں چار اور فیصلہ کرنے والے بھی آپ ﷺ نے مقرر فرمائے۔ خالد بن سعیدؓ صنعاء کے لیے مہاجری بن امیہؓ کندہ کے لیے زیاد بن لبیدؓ حضرموت کے لیے اور ابو موسیٰؓ اشعری کو زبید، زمعہ، عدن اور سواح کے لیے روانہ فرمایا۔ اسی طرح عتاب بن اسیدؓ کو مکہ میں عامل مقرر فرمایا ان کی عمر اس وقت بیس برس کے لگ بھگ تھی عہدۂ امارت کے لیے نبی اکرم ﷺ جب بھی کسی مہاجر کو عامل مقرر فرماتے تو ہمراہ کسی انصاری کو بھی روانہ فرماتے ان اصحاب کے انتخاب کے وقت حضور اکرم ﷺ ان کی علمیت اور کردار کا جائزہ ضرور لیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں روانگی سے پہلے ان عمال کا حضور ﷺ خود ایک انٹرویو لیتے جنھیں عملاً بطور قاضی بھی کام کرنا ہوتا تھا (۶۱)۔

محصلین زکوٰۃ کی ایک طویل فہرست کتبِ سیر میں ملتی ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ لوگ بھی جھگڑے چکا دیا کرتے تھے۔ بہر حال قاضی یا جج کا عہدہ بعد کے زمانے میں امارت یا عامل سے الگ کیا گیا۔ ابن خلدون نے قضاء کو خلافت کے وظائف (functions) میں شمار کیا ہے اور اسے صرف خلیفہ کے لیے سمجھا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے امورِ خلافت کے پھیلاؤ کے باعث یہ منصب بطور عہدہ اپنے پورے اختیار کے ساتھ حضرت ابودردانہ انصاریؓ اور عویمر بن ثعلبہ انصاری کو مدینہ میں مقرر فرمایا۔ دراصل یہ تقسیم کار کی ایک صورت تھی (۶۲)۔

جب آپ ﷺ سفر پر روانہ ہوتے تو عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کو بھی اپنا نائب یا امیر مقرر فرمایا کرتے اور وہ نابینا تھے۔ (۶۳) دورِ مکی میں نبی کریم ﷺ نے اس امر کا اہتمام فرمایا کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو اسلامی مملکت کے سیاسی، انتظامی اور مالی امور بحسن خوبی چلا سکیں، جبکہ اقتدار کے حصول کی

سنجیدہ کوششیں نہیں کی گئی تھیں۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلامی مملکت کا قیام عمل میں لائے اور مسلمانوں میں باہمی بھائی چارہ قائم کر دیا۔ پھر یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین عرب سے معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ نے ایک ایسا آئین مرتب کیا جس کی ۲۴ اور ۴۴ دونوں دفعات عدل پر مشتمل ہیں یہ دنیا کا پہلا تحریری دستور کہلانے کا مستحق ہے (۶۴)۔ جس میں سیاسی فوجی اور مالی امور شامل ہیں۔ معاہدہ کرنے والے سب فریق ان امور کے پابند تھے۔ اب ہم اس آئین کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اس میں اصلاح کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ جن میں سے نظام عدل کی اصلاح بھی ہے۔ اس معاہدے کی رو وہ تمام اصول اور ضابطے منسوخ قرار پا گئے تھے۔ جن پر نظام عدل کی اساس پہلے سے تھی۔ اور ایسے نئے اصول اور ضابطے میسر آ گئے جو انسانیت کے لیے پہلے سے زیادہ اطمینان بخش تھے۔ ڈاکٹر لوتھر نے بڑی عقیدت کے ساتھ ایسے نئے اصولوں کے بارے میں کہا ہے:

''اسلام نے بڑی سلطنتوں اور مستقل تہذیبوں کو تہہ و بالا کر کے نفوس اقوام کو نئی ترکیب دی اور ایک مکمل جدید دنیا یعنی دنیائے اسلام تعمیر کی جس کا اثر تمام نوع انسان پر مرتب ہو کر رہے گا'' (۶۵)۔

فتح مکہ کے بعد صرف طائف کا قبیلہ ایسا تھا جس نے اطاعت قبول نہیں کی تھی، آنحضرت ﷺ نے اس کا محاصرہ کیا مگر چند روز بعد بعض وجوہ کی بنا پر محاصرہ اُٹھا لیا صخر کے ایک رئیس کو جب معلوم ہوا تو اس نے خود طائف کی حصار بندی کی اور انھیں مصالحت پر آمادہ کیا، اس واقعہ کے بعد مغیرہ بن شعبہ ثقفی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ صخر نے ان کی پھوپھی کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے، آپ ﷺ نے صخر کو بلا کر حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچا دو۔ اس کے بعد بنو سلیم نے آ کر شکایت کی کہ اسلام لانے سے قبل صخر نے ان کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب چونکہ وہ اسلام لا چکے ہیں لہٰذا ان کا چشمہ انھیں دلایا جائے آپ ﷺ نے صخر کو بلا کر فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کر لیتی ہے۔ وہ اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے اور آپ ﷺ نے وہ چشمہ واپس کرا دیا۔ ان دونوں معاملات میں فیصلہ صخر کے خلاف ہوا حالانکہ فتح طائف کا سہرا انہی کے سر تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ نے ان کی خدمات کے باوجود عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا (۶۶)۔

قرآن اور سنت ہی وہ قانون ہیں جن کی اتباع ان پر واجب ہے۔ نیز دستور کی شق نمبر ۴۲ کا منشاء یہ ہے کہ غیر مسلموں کو قانونی حقوق حاصل ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر ادیان کے پیروکاروں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿فَإِن جَآؤُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُم أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيْئاً وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُوْلَـئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ﴾ (٦٧) (اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تو راۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے)۔

اس آیت میں مذکور ہے کہ دیگر ادیان کے پیروکار نبی اکرم ﷺ کی طرف رجوع فرمائیں گے جب وہ آپس میں اپنے جھگڑوں کا فیصلہ نہ چکا سکیں۔ چنانچہ عہد رسالت میں مدینہ کے باشندے اپنے جھگڑے اور دعوے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں عدل:

ادارۂ نبوت کے ذمہ خاتم النبین ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سمیت جو مختلف فرائض سپرد رہے، ان میں سے قرآن مجید کی شہادت کے مطابق ایک بڑا فریضہ قیام نظام عدل بھی تھا۔ عدل وانصاف کے اعلیٰ اور برتر اصولوں کی حکمرانی کے لیے آپ ﷺ خود ہی ہمیشہ جواب دہی کے لیے تیار رہتے تھے اور اگر آپ ﷺ کے کسی سلوک (نادانستہ طور پر) سے کسی شخص کو ایذا پہنچ جاتی تو آپ ﷺ اسے اپنا بدلہ لینے کے لیے فراخ دلانہ پیش کش فرماتے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران میں ایک شخص ؓ کے چہرے پر جو اپنا حصہ لینے کے لیے آپ ﷺ پر جھک آیا تھا آپ ﷺ کے نیزے کا زخم لگ گیا آپ ﷺ نے فوراً اسے بدلہ لینے کی پیش کش کی مگر اس نے کوئی بدلہ نہ لیا (٦٨)۔

ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے ایک شخص کی کمر پر (جو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے لوگوں کو ہنسا رہا تھا) ٹھوکا دیا جس پر اس نے بدلہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے اپنی کمر آگے کر دی۔ مگر اس نے کہا: ''میں برہنہ تن تھا، جبکہ آپ ﷺ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے قمیص اُٹھا دی اس نے آگے بڑھ کر مہر نبوت کو چوما اور کہا میں تو صرف یہ چاہتا تھا'' (۶۹)۔ حضور ﷺ بیماری کی حالت میں تشریف لاتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں:

"اے لوگو! اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کبھی درہ مارا ہے تو یہ میری پیٹھ حاضر ہے وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے اگر میں نے کسی کو برا بھلا کہا تو یہ میری آبرو حاضر ہے وہ اس سے انتقام لے سکتا ہے اگر میں نے کسی کا مال چھینا ہے تو میرا مال حاضر ہے وہ اس سے اپنا حق لے سکتا ہے، اور تم میں سے کوئی یہ اندیشہ نہ کرے کہ اگر کسی نے انتقام لیا تو میں اس سے ناراض ہوں گا، یہ بات میری شان کے لائق نہیں" (۷۰)۔

اولاد کے ساتھ عدل کے بارے میں حدیث میں آتا ہے۔ حضرت جابر ؓ بن عبداللہ سے روایت ہے حضرت نعمان بن بشیر ؓ کی اہلیہ نے اُن سے کہا، میرے لڑکے کو فلاں غلام بخش دو، اس پر رسول ﷺ کو گواہ بناؤ۔ حضرت نعمان بن بشیر نے یہ سارا واقعہ حضور ﷺ سے بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کے علاوہ اور بھی بیٹے ہیں اس نے کہا جی ہاں مگر ہر ایک کو دینے کی استعداد نہیں۔ فرمایا پھر میں ناحق پر گواہ نہیں بن سکتا (۷۱)۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''**فاتقوا اللّٰہ واعدلوا بین اولادکم**'' (۷۲) (خدا سے ڈرو اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو)۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ اسماءؓ بنت یزید بن سکن انصاری عورتوں کی نمائندہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے کہا یا رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مردوں اور عورتوں دونوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ ہم عورتیں بھی خدائے عالم پر ایمان لائی ہیں، لیکن خدا کی راہ میں جان کی بازی تمام فضیلت اور ثواب کے ساتھ صرف مردوں پر واجب کی گئی ہے کہ اگر وہ فتح کریں تو اُن کو ثواب اور مال غنیمت ملتا ہے اور اگر قتل کر دیئے جائیں تو مقام

شہادت پر فائز ہوتے ہیں۔ ہم عورتیں جب ہمارے شوہر جنگ کے میدان میں ہوتے ہیں تو گھر اور بچوں کی رکھوالی اور گھریلو کاموں کی بجا آوری میں مشغول ہوتی ہیں، کیا ہم بھی جہاد کے ثواب میں مردوں کی شریک ہوسکتی ہیں؟ تو آنحضرت ﷺ نے اصحاب کی طرف رُخ کر کے فرمایا کہ انھوں نے کس قدر اچھا سوال کیا ہے۔ پھر حضرت اسماء سے فرمایا کہ دوسری عورتوں سے بھی جن کی طرف سے تم نے یہ بات کہی ہے، میرا یہ قول پہنچا دینا کہ گھریلو فرائض کی انجام دہی، بچوں کی پرورش اور شوہر کی خدمت عورتوں کی طرف سے خدا کی راہ میں جہاد شمار کیا جاتا ہے'' (۷۳)۔

خواتین کے معاملے میں عدل وانصاف کے بارے میں بہت ساری احادیث کا ذکر ہے۔ حدیث میں ہے: خواتین نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ سے فیض حاصل کرنے میں ہم پر مرد غالب رہتے ہیں، اس لیے آپ ہمارے لیے ایک دن مختص فرما دیجیے۔ آپ نے ان کے لیے ایک دن متعین فرما دیا ان سے ملے، وعظ فرمایا اور احکام دیئے۔ اس موقع پر آپ نے خواتین سے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سے کسی کے اگر تین بچے فوت ہوگئے تو وہ اس کے لیے دوزخ کی آگ سے رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ ایک خاتون نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر دو ہی بچے فوت ہوئے تو آپ نے فرمایا اگر دو بھی فوت ہوئے تب بھی (۷۴)۔ ان دو حدیثوں پر اگر آپ غور فرمائیں تو چند ایک نہایت ہی اہم باتوں کی وضاحت ہوتی ہے اور ان کے متعلق ہمیں توجیہات وتعلیمات نبوی سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

اسی طرح خواتین کے لیے وراثت کا حق رکھنا اُن کو تعلیم دلوانا اچھی تربیت کرنا سب خواتین کے لیے عدل کے حکم میں آتا ہے۔

غلاموں کے بارے میں حدیث میں ہے کہ صہیب رومی ؓ کو بارگاہِ رسالت پناہ ﷺ میں وہی قرب حاصل تھا جو حضرت صدیق اکبر ؓ اور حضرت فاروق اعظم ؓ کو حاصل تھا۔ حضرت اُسامہ ؓ امیرِ لشکر بنائے گئے جو بظاہر غلام زادہ تھے، لیکن اسلام نے اُن کو وہ سربلندی عطا کی تھی کہ ان کی قیادت وامارت میں بڑے بڑے ذی حشم خاندان کے افراد اور عزت وسروری کے کلاہ کج سروں پر رکھنے والے قبائل کے افراد جو دولت ایمان سے سربلندی حاصل کر چکے تھے، جوشِ ایمانی اور جذبہ جہاد سے سرشاران

کو اپنا رہنما بنائے منزلِ مقصود کی طرف گامزن تھے۔ دنیا اس مساوات اور معاشرتی عدل کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے غلام کے بارے میں متعدد مرتبہ اِرشاد فرمایا: ''یہ تمھارے بھائی ہیں، "فاطعموہ مما تأکلون، واکسوہ مما تکسبون" (۷۵) (جو خود کھاؤ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو انھیں پہناؤ)۔

''عن ابي مسعود الانصاریؓ قال: کنت أضرب غلاماً لي فسمعت من خلفي صوتاً (اعلم أبا مسعود)..... فالتفت فإذا هو رسول الله ﷺ فقلت: یا رسول الله ﷺ! هو حر لوجه الله قال: ((أما[إنك]لو لم تفعل للفحتك النار" (۷۶) (حضرت ابو مسعود انصاری ؓ سے روایت ہے کہ وہ اپنے غلام کو مارے جا رہے تھے کسی نے پیچھے سے آواز دی جان لے ابو مسعود۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو حضور ﷺ تھے عرض کی میں نے اسے آزاد کر دیا فرمایا: ''اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تمھیں پکڑ لیتی)۔

عدلِ عائلی کے بارے میں سیدہ عائشہؓ صدیقہ سے روایت ہے کہ مرض الوصال کے آخری دِنوں حضور ﷺ نے چاہا کہ میرے گھر میں قیام کریں تو باقی ازواج مطہرات سے ایسا کرنے کی اجازت چاہی اور قیام فرمایا (۷۷) جو عدل عائلی کی نمایاں مثال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وصال کے دن حضرت عائشہؓ کی باری ہی تھی۔

انصاف کرنے میں آپ ﷺ کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم، اپنے اور بے گانے میں کوئی فرق نہ تھا، چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا مثلاً ایک روایت ہے کہ ایک یہودی کا ایک مسلمان پر قرض تھا۔ اس نے غزوۂ خیبر کے دوران میں تقاضا شروع کر دیا۔ مسلمان نے مہلت مانگی، مگر یہودی نے مہلت دینے سے انکار کیا۔ آپ ﷺ نے مقروض کو فوری ادائیگی کا حکم دیا اور تعمیل نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ کو اس کے بعض کپڑے لے جانے کی اجازت دی (۷۸)۔

آپ ﷺ کے مدینہ منورہ آنے سے پہلے بنو قریظہ اور بنو نضیر کے مابین قصاص اور دیت کے معاملات میں فرق تھا۔ چنانچہ اگر کوئی نضیری (بڑی قوم کا) کسی قریظی (چھوٹی قوم کے کسی شخص) کو ہلاک

کر دیتا تو نصف دیت ادا کی جاتی اور برعکس صورت میں پوری لازمی سمجھی جاتی۔ آپ ﷺ نے اس ناانصافی کی ختم کر دیا۔ دونوں کے مابین اس بارے میں یکسانیت قائم فرمائی (۷۹)۔

فتح خیبر کے بعد آپ ﷺ نے کھیتی باڑی کا سارا کام یہودیوں کے سپرد کر دیا یہودیوں نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ مسلمان اپنا حصہ لینے کے بعد بھی ان کی فصلوں اور سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اقلیت (معاہدین) کا مال مسلمانوں کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمان ان سے سبزی وغیرہ بھی قیمتاً خریدتے تھے (۸۰)۔

آپ ﷺ نے ہر معاملے میں عدل سے کام لیا حتیٰ کہ کسی معاہدے میں حد سے تجاوز کرنے سے روکا۔ آپ ﷺ نے تو کسی معاہدے میں بھی ظلم کو برداشت نہیں کیا۔ رسول ﷺ نے فرمایا اگر تمھیں کسی قوم سے جنگ لڑنی پڑے اور تم ان پر غالب آ جاؤ اور وہ تم سے چند شرائط پر صلح کر لے تو تمھارے لیے ان مقررہ شرائط سے تجاوز کرنا جائز نہیں (۸۱) ''**من قتل معاهداً في غير كنهه حرم الله عليه الجنه**'' (۸۲) (جس نے کسی معاہد کا قتل کیا بغیر کسی وجہ کے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا)۔

حدود کے معاملے میں عدل نبوی ﷺ:

حضرت انس ؓ بن مالک نے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ایک لڑکی یا لونڈی زیور پہنے ہوئے گھر سے باہر نکلی تو ایک یہودی نے اسے پتھر مارا۔ وہ لڑکی زخمی حالت میں نبی ﷺ کی خدمت میں لائی گئی جبکہ ابھی اس میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''**من قتلك، فلان قتلك؟ قالت: لا، برأسها قال من قتلك؟ فلان قتلك؟ قالت: لا، برأسها فرفعت راسها فقال لها في الثالثة: فلان قتلك؟ فدعا به رسول الله ﷺ فقتله بين الحجرين**'' (۸۳) (فلاں شخص نے تجھے قتل کیا؟ اس لڑکی نے اپنے سر کے اشارے سے کہا نہیں حضور ﷺ نے اس سے کہا کس نے تجھے قتل کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے؟ اس نے پھر اپنے سر سے اشارہ کیا نہیں۔ تیسری بار آپ ﷺ نے پھر پوچھا کہ فلاں شخص نے تجھے قتل کیا ہے؟ تو اس نے اپنا سر اثبات میں نیچے کر دیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کو بلوایا اور دو پتھروں کے درمیان رکھ کر اسے قتل کرا دیا)۔

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں انس ﷺ بن مالک کی پھوپھی ربیع بنت نضر نے انصار کی ایک لونڈی کا اگلا دانت توڑ دیا تو اس کے گھر والوں نے ان سے قصاص کا مطالبہ کیا۔ یہ ان سے معافی کے طلب گار ہوئے، انھوں نے انکار کر دیا، انھوں نے دیت کی پیشکش کی تو انھوں نے اس کے لینے سے بھی انکار کر دیا وہ نبی ﷺ کے پاس آئے تو انھوں نے کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا (۸۴)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ جھگڑے کا فیصلہ نبی ﷺ کے پاس لے کر آئے نبی کریم ﷺ نے انھیں قصاص کا حکم دیا۔ ربیع کے بھائی انس ﷺ بن مالک کے چچا، انس ﷺ بن نضر نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ ﷺ ربیع کا اگلا دانت توڑیں گے؟ اللہ کی قسم آپ ﷺ اس کا دانت نہیں توڑیں گے دوسری روایت میں ہے، آپ اس کا اگلا دانت نہیں توڑیں گے۔ جب کہ وہ اس لونڈی کے گھر والوں سے معافی اور دیت کا مطالبہ کر چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے انس ﷺ: کتاب اللہ قصاص کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب ربیع کے بھائی، جو انس ﷺ کے چچا اور راحد کے شہید ہیں، نے قسم اُٹھائی تو وہ لوگ راضی ہو گئے۔ انھوں نے معاف کر دیا اور دیت قبول کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں، اگر وہ اللہ پر قسم ڈال دیں تو اللہ اسے ضرور پورا کرتا ہے (۸۵)۔

ماعز بن مالک کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے زنا کا اعتراف نبی کریم ﷺ کے سامنے کیا: "فامر بہ ان یرجم" (۸۶) (پس آپ ﷺ نے اُسے رجم کرنے کا حکم دیا) اور اس کو رجم کیا گیا۔ اسی طرح ایک حاملہ عورت کو بچے کی پیدائش کے بعد رجم کیا گیا۔ جب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑے لگائے، جبکہ اس کے خلاف زنا کا جرم ثابت ہو چکا تھا (۸۷)۔

نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص پیش کیا گیا۔ جس نے صفوان بن امیہ کے کپڑے چوری کیے تھے۔ عدالتی جرح کے نتیجہ میں اس شخص کا جرم ثابت ہو گیا۔ تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی (۸۸)۔ اسی طرح فتح مکہ کے وقت نبی اکرم ﷺ نے ایک مال دار عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا:

"عن عائشة قالت: كانت امرأة مخزومية تستعير المتاع وتجحده، فأمر النبي ﷺ بقطع يدها" (۸۹) (حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مخزومیہ قبیلے کی ایک عورت چوری

کرتی تھی اور پھر انکار کرتی تھی۔ نبی ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا)۔دوسری روایت میں ہے کہ اس نے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی سفارش رسول اللہ ﷺ کے ہاں بھیجی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ اگر بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور کمزور آدمی کو سزا دیتے اور فرمایا:''وایم اللہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا''(۹۰)(اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے اس چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا۔جس نے دوسروں کا مال چرالیا تھا اور اس نے عدالت کے سامنے اقبال جرم کرلیا تھا۔

عدالت میں ابونعیم نامی شخص پیش کیا گیا کیونکہ اس نے شراب پی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے سزا کے طور پر اسے چالیس کوڑے مارنے کا حکم دیا۔جب ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی اور عدالت میں یہ جرم ثابت کرنے سے قاصر رہے تو انھیں تہمت لگانے کی سزا کے طور پر اسی کوڑے مارے گئے(۹۱)۔

عائلی زندگی کے بارے میں عدل نبوی ﷺ:

"عن ابن عباس قال: ان جاریة بکرا اتت رسول اللہ فذکرت ان اباھا زوجھا وھی کارھة فخیرھا النبی "(۹۲)(ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی آنحضرت ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس کے باپ نے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کا نکاح کردیا ہے۔آپ ﷺ نے اسے اختیار دے دیا(کہ چاہے تو اپنا نکاح باقی رکھے چاہے تو توڑ دے)۔

"عن ابن عباس قال: جاء ت امراة ثابت بن قیس بن شماس الی النبی ﷺ فقالت: یارسول اللہ! ماانقم علی ثابت فی دین ولا خلق، الا انی اخاف الکفر فقال رسول اللہ: فتردین علیه حدیقته فقالت نعم فردت علیه وامره ففار قھا "(۹۳)(ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی آنحضرت ﷺ کے پاس آئی اور کہا یارسول اللہ ﷺ! میں ثابت کے دین اور اخلاق میں کوئی عیب چینی نہیں کرتی۔البتہ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس کی فرمانبرداری نہیں کرسکوں گی۔آپ ﷺ نے فرمایا۔کیا تو اس کا باغ اس کو لوٹا دے گی؟ کہنے لگی ہاں۔

چنانچہ اس نے باغ لوٹا دیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی جدائی کا فیصلہ دے دیا)۔

"طلق رکانہ بن عبدیزید اخوبنی المطلب امراته ثلاثاً فی مجلس واحد فحزن علیها حزناً شدیداً فساله رسول اللّٰه کیف طلقتها فقال طلقتها ثلاثا فقال فی مجلس تلك واحدة فارجعها ان شئت قال فراجعها "(۹۴) (رکانہ بن عبد یزید بنو مطلب کے بھائی نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی۔ پھر اسے بہت افسوس ہوا۔ تو حضور ﷺ نے اس پوچھا کہ تو نے کیسے طلاق دی تھی۔ اس نے کہا میں نے تین طلاقیں دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایک مجلس میں؟ اس نے کہا ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ تو ایک ہے۔ چاہے تو رجوع کر لے۔ پس اس نے رجوع کر لیا)۔

لعان کے مقدمات میں بھی آپ ﷺ کے بصیرت افروز ارشادات ملتے ہیں۔ مثلاً

"عن ابی هریرة ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال: یارسول اللّٰه! ولدلی غلام اسود، فقال هل لك من ابل ؟ قال نعم قال ما الوانها؟ قال حمر، قال فیها من اورق؟ قال نعم قال فانی ذلك؟ قال لعله نزعه عرق قال فلعل ابنك هذا نزعه"(۹۵) (حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے ہاں سیاہ رنگ کا بچہ پیدا ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں؟ کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا ان کے رنگ کیسے ہیں اس نے کہا سرخ فرمایا ان میں کوئی اورق (سیاہی مائل) ہے اس نے کہا ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے ہوا؟ اس نے کہا شاید اوپر کی نسل میں کوئی چیز ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمھارے بیٹے میں بھی شاید اسی طرح اوپر کی نسل سے کوئی چیز آ گئی ہو)۔

''عن عبداللّٰه ان رجلا من الانصار قذف امراته فاحلفها النبی ﷺ ثم فرق بینهما''(۹۶) (حضرت عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ انصار کے ایک مرد نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو حضور ﷺ نے قسم لی، پھر دونوں میں تفریق کرادی)۔

اسلامی نظام عدل وقضا کی خصوصیات:

اسلام کی اس سربلندی اور عظمت کی سب سے بڑی وجہ عدل وانصاف پر مبنی اسلام کا وہ نظام قضاء ہے جس کے تحت اسلامی مملکت کے ہر شہری کو آسان اور سستا انصاف ہر آن میسر آتا ہے کہ ہر کوئی

بغیر کسی دقت اور پریشانی کے اپنے حقوق ذاتی کا تحفظ آسانی سے کر سکتا ہے۔ اسلام کا یہ نظام اپنی جگہ بے مثال ہے اور ایسی خصوصیات کا حامل کہ جن میں یہ منفرد حیثیت رکھتا ہے ذیل میں انھی خصوصیات کا بیان ہے۔

ا۔ عدلیہ کا اسلامی دستور:

کوئی بھی عدلیہ اپنے وجود کے اعتبار سے بیکار محض ہے اگر اس کی پشت پر رہنمائی کے لیے کوئی دستور نہ ہو۔ اسلامی عدلیہ کا دستور قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کے اصول اربعہ پر مبنی ہے مسائل کے استنباط اور قوانین کی ترتیب و تجسیم کے لیے قرآن و سنت کی حیثیت اصول استناد کی ہے کہ جنھیں دین میں دلیل شرعی اور حجت ہونے کی بنا پر سند کے طور پیش کیا جاتا ہے جبکہ اجماع و قیاس اجتہاد کے بنیادی اصول قرار پاتے ہیں کہ جن کی رہنمائی میں مجتہد اور فقیہ مسائل کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے۔

۲۔ انفرادی حقوق کی ضمانت:

نبی اکرم ﷺ نے جس معیاری نظام عدل و قضاء کو دنیا کے سامنے پیش فرمایا ہے اس کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نظام کے ذریعہ مملکت کے ہر فرد کے حقوق کی مکمل طور پر ضمانت دی گئی ہے اسی لیے یہ بات ارباب حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ مملکت کے ہر باشندے کی عزت و آبرو جائیداد و مال، جسم و جان اور چادر و چار دیواری کے تحفظ کا اہتمام کریں اور عدل و انصاف کی بنیاد پر ہر اس شخص کے حقوق کی پاسداری کا بندوبست کریں جو اس مملکت کا شہری ہے ورنہ وہ نا اہل تصور ہوں گے اور اپنی کوتاہیوں اور فرائض سے غفلت پر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ (۹۷) (بلاشبہ تم کو اللہ اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دو اور جب لوگوں میں تصفیہ کرنے بیٹھو تو انصاف کے ساتھ تصفیہ کرو)۔

۳۔ شخصی آزادی:

اسلامی عدل و انصاف لی ایک بہت ہی خوبصورت خوبی شخصی آزادی کا ہونا ہے آپ ﷺ نے ہر فرد کو ہر قسم کے حاکمانہ جبر و استحصال سے نجات دلائی۔ نبی ﷺ کا یہی واقعہ شخصی آزادی کے تحفظ کے لیے کافی ہے: "عن بهز بن حكيم عن ابنه انه اى جده قام الى النبى ﷺ وهو يخطب

فقال : جیرانی بما أخذوا ؟فاعرض عنه مرتین ثم ذکر ما شأ فقال النبی خلّوا له عن جیرانه" (۹۸) (بھز بن حکیم رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (ان کے دادا) حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے درآنحالیکہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے انھوں نے سوال کیا میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے نبی ﷺ نے اس سے دو مرتبہ سے صرف نظر کیا تو اس شخص نے پھر کچھ کہا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو)۔

میثاق مدینہ رائے اور مسلک کی آزادی کا بہترین نمونہ ہے۔اس کے علاوہ پورا خطبہ الوداع انسانی حقوق کے تحفظ کا ایک چارٹر ہے۔

۴۔قانون کی حکومت:

اسلامی نظام عدل وقضاء کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر آزاد، غلام، امیر، غریب، کمزور، توانا، کالے گورے یا حاکم ومحکوم کی کوئی تفریق نہیں اور قانون کی نظر میں سب کے سب برابر کی حیثیت کے مالک ہیں۔اس نظام میں بادشاہ یا امیر مملکت بھی عدالت کے روبرو ویسے ہی کٹھرے میں کھڑا ہوگا جس طرح ایک عام آدمی کھڑا ہوتا ہے اور اپنے مقدمے کی پیروی کرتا ہے۔جیسا کہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مقدمہ کے وقت امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب جب حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کی عدالت میں پہنچے تو آپ کو دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے درمیان میں فرش پر جگہ کشادہ کردی اور عرض کیا امیر المومنین یہاں تشریف رکھیے یہ بات آپ کو ناگوار گزری جس پر آپ نے فرمایا کہ:"ھـذا اوّل جورٍ جریت فی حکمك ولكن اجلس مع خصمی "(۹۹) (یہ تمھارا پہلا ظلم ہے جو تمھارے فیصلے میں ہوا ہے میں تو اپنے مدمقابل کے ساتھ ہی بیٹھوں گا)۔

۵۔آسان اور سستا انصاف:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ یمن کا گورنر بنا کر روانہ فرمایا تو دونوں کو وصیت فرمائی:

"یسّرا ولا تعسّرا وبشرا ولا تنفرا و تطاوعا" (۱۰۰) (نرمی برتنا دشواری پیدا نہ کرنا خوشخبری سُنانا نفرت انگیزی نہ کرنا اور باہم متحد رہنا)۔

اس لیے یہ بات ہرگز جائز نہیں ہے کہ عوام کے لیے انصاف کے حصول کو مشکل بنا دیا جائے اور ایسے قواعد وضوابط وضع کیے جائیں جن سے عام آدمی اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ جائے اور عدل وانصاف تک نہ پہنچ سکے۔

پاکستان کے عدالتی نظام کی خامیاں:

۱۔ اسلامی عدالتی نظام کے برعکس پاکستان میں مروجہ نظام ہائے عدالت آزاد وخود مختار نہیں ہے۔ پاکستان کے تمام دساتیر جب بنائے گئے عدالتوں میں عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کے وعدے تو کیے گئے مگر ان پر عمل درآمد نہ کیا گیا۔۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی اس بات کی تائید موجود تھی مگر تا حال اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

۲۔ پاکستان میں عدالتیں سربراہ مملکت، وزیر اعظم، گورنر اور وزراء کے خلاف مقدمات ازخود چلانے کی مجاز نہیں ہیں اعلیٰ حکام کے خلاف حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔اسی طرح غیر ملکی سفراء کے خلاف مقدمات بھی نہیں چلائے جا سکتے یہ امتیازی سلوک کی واضح مثالیں ہیں۔

۳۔ ججوں کی اسامیاں بعض دفعہ میرٹ کی بجائے سیاسی بنیادوں پر پُر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔حکومتیں عدلیہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ ماتحت عدالتوں میں مجسٹریٹ انتظامیہ کے ماتحت ہوتے ہیں۔

۴۔ پاکستان میں مروجہ عدالتی نظام انتہائی پیچیدہ ہے جس کی وجہ سے مقدمات طول پکڑتے ہیں اور نتیجتاً ملزمان سزا سے بچ نکلتے ہیں۔

۵۔ شہادت کا نظام انتہائی ناقص ہے گواہ عدالتوں میں پیش ہی نہیں ہوتے۔ پولیس چالان داخلِ عدالت کرنے میں تاخیر کرتی ہے۔ گواہوں کی جانچ اور پرکھنے کا کوئی معیار ونظام مقرر نہیں ہے۔

۶۔ ملزمان کی طرف سے سرکاری وکلاء پیروی نہیں کرتے ہیں۔ذاتی مفادات اور حکومتی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں اور صحیح طور پر مقدمات کی پیروی کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

۷۔ ماتحت عدالتیں بلا جواز ملزم کو ریمانڈ کے ذریعے حوالۂ پولیس کر دیتی ہیں۔

۸۔ جیل سے قیدیوں کو پیش کرنے کا نظام ناقص ہونے کی وجہ سے عدالتیں ہر تاریخ سماعت پر سماعت ملتوی کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

۹۔ ماتحت عدالتوں کے افسران انتظامی افسران ہونے کی وجہ سے لاء اینڈ آرڈر کنٹرول کرنے میں مصروف رہتے ہیں جس کی وجہ سے عدلیہ سے متعلق امور تاخیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ عدالتوں کی تعداد میں کمی کی وجہ سے ایک عدالت میں کافی تعداد میں مقدمات زیر سماعت رہتے ہیں جس کی وجہ سے عدالتیں ان پر مکمل توجہ نہیں دے پاتیں۔

۱۱۔ عدالتوں پر حکومتی و سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ جس کی بناء پر عدالتیں اپنے آزادانہ فیصلوں میں دشواری محسوس کرتی ہیں۔

۱۲۔ عدالتی افسران، اہلکاروں کی تنخواہیں اور مراعات معاشرتی ضرورتوں سے ہم آہنگی نہیں رکھتیں۔

۱۳۔ عدالتوں کے جج صاحبان کو تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا اور ان کی زندگیوں کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔

۱۴۔ ہمارے عدالتی نظام کے اندر ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک ملک کے اندر مختلف قوانین چل رہے ہیں، کہیں انگریزی قوانین کے مطابق فیصلہ ہو رہا ہے، کہیں شریعت کے مطابق، ایک ہی کیس میں اپیل کے لیے اتنے سارے فورم ہیں کہ فیصلے پر عمل درآمد دشوار ہو جاتا ہے(۱۰۷)۔

پاکستان کے عدالتی نظام کی اصلاح کے لیے تجاویز:

سب سے پہلی تجویز یہ ہے کہ اسلامی نظام عدالت رائج کیا جائے۔ تحصیل اور ضلعی سطح پر قاضی کورٹس قائم کی جائیں۔ ہر تھانہ میں قاضی کورٹ ہو، جہاں سرکاری وکیل تعینات ہوں۔

۱۔ وفاقی شرعی عدالت کو سپریم کورٹ میں ضم کر کے اس کے ججوں کو سپریم کورٹ کے ججوں کے برابر تسلیم کیا جائے اور ہر ہائی کورٹ میں کم از کم ایک تہائی تعداد مفتیوں کی ہو۔

۲۔ اسلامی نظریاتی کونسل کو مزید فعال بنایا جائے۔ اگر کسی قانون کی کوئی دفعہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کی نظر میں فیصلے میں اس کا تذکرہ کر دے اور متعلقہ حصہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیج دے اور کونسل کے لیے لازمی ہو کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر اپنی رپورٹ اسمبلی اور کورٹ کو بھیج دے۔

۳۔ عدالتی آسامیاں اہل، قابل، دیانت دار، محنتی اور اسلامی قانون کے ماہرین سے پُر کی جائیں۔ سفارش اور اقرباء پروری عدلیہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ بلکہ ایک جج کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت اور فقہ کا ماہر ہو اور جدید تعلیم سے آشنا ہو۔

۴۔ شہادت کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔ ملزم کو عدالت میں بروقت پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھ گواہان اور مثل مقدمہ پیش کیا جائے تاکہ تاخیر نہ ہو بلا جواز ریمانڈ نہ دیا جائے۔ جو عدالت ملزم کو جیل بھیجے اس کی نگہبان بھی وہی عدالت ہو جو اس کا ریکارڈ رکھے اور اُسے عدالت میں منگوانے کا انتظام کرے یا جیل میں جا کر اس کا فیصلہ کر دے۔

۵۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ کیا جائے۔ انتظامیہ کی ذمہ داری امن وامان کا قائم رکھنا اور ریونیو اکٹھا کرنا ہو۔ جبکہ عدالتیں صرف عدالتی کام کریں۔ عدالتی افسران کے لیے ایل ایل بی، اسلامی فقہ، قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخی فیصلوں سے آگاہی لازمی قرار دی جائے۔

۶۔ جج صاحبان کو خصوصی مراعات دی جائیں، ان کی تنخواہوں اور مراعات کو معاشی ومعاشرتی ضروریات کے مطابق کیا جائے۔ جج صاحبان کو تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ وہ بلا خوف وخطر فیصلے کر سکیں۔

۷۔ عدالتوں کو سیاسی اور حکومتی دباؤ سے آزاد رکھا جائے تاکہ وہ بلا خوف خطر فیصلے کر سکیں۔

۸۔ عدالتوں کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے۔ قوانین میں تبدیلی کی جائے تاکہ سربراہِ مملکت، اعلیٰ حکام، وزراء اور سفراء وغیرہ پر مقدمہ چلانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہ رہے۔ امتیازی سلوک کو ختم کیا جائے۔ قانون کی نظر میں عام شہری حکمران طبقے کے برابر ہو۔

۹۔ جرائم میں ملوث یا غفلت ورشوت ستانی کے مرتکب افسران اور اہلکاروں کو عبرتناک سزا دی جائے۔

۱۰۔ ایف آئی آر درج کرنا انتہائی آسان ہو اور پولیس کی طرف سے ایف آئی آر درج ہونے کے پندرہ دن کے اندر اندر مقدمہ کا چالان عدالت میں پیش ہونا چاہیے خواہ چالان مکمل ہو یا نامکمل ہو عدالت چاہے تو چالان مکمل کرنے کے لیے مزید ایک مہینہ دے سکتی ہے۔ مقدمے کی مکمل سماعت ایک مہینے کے اندر اندر شروع کی جائے اور اس کی سماعت سے پہلے ساری کاغذی کاروائیاں مکمل ہونی چاہیے۔

۱۱۔ مقدمات کی تاریخوں کا موجودہ طریقۂ کار بالکل ختم کیا جانا چاہیے۔ ایک دفعہ مقدمہ کی سماعت شروع ہو جائے تو پھر یہ سماعت مسلسل اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک تمام گواہوں کے بیانات اور وکیلوں کی بحث ختم نہ ہو جائے۔ مقدمہ کی سماعت مکمل ہونے کے پندرہ دن کے اندر اندر فیصلہ سنانا ضروری ہو۔ اس طریقے سے کوئی بھی مقدمہ چھ مہینے سے زیادہ نہیں لے گا۔ کوشش کی جائے کہ مقدمہ ایک ماہ میں ختم ہو۔

۱۲۔ اگر کسی تحصیل ہیڈ کوارٹر میں ایک فوجداری اور ایک دیوانی سیشن جج پر کام کا بوجھ زیادہ ہے تو وہاں دو یا دو سے زیادہ سیشن ججوں کو تعینات کیا جائے۔ مقدمات کی سماعت مختصر اور آسان ہو۔

۱۳۔ وکلاء کی فیسیں عام آدمی کو انصاف کی راہ سے دور رکھتی ہیں۔ پاکستان میں غربت انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وکلاء صاحبان کی فیسیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک غریب آدمی کے لیے انصاف حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے وکیل کے اخراجات ادا کرے۔

۱۴۔ وفاقی محتسب کے ادارے کو مزید فعال بنایا جائے۔ جہاں صرف ایک سادہ درخواست لکھ دینے سے انسان کے لیے انصاف کا راستہ نکل آتا ہے، جس سے سرکاری محکموں کی ناانصافیوں کے خلاف عام آدمی کو انصاف مہیا ہونے میں آسانی پیدا ہوگی۔

۱۵۔ تمام عدالتوں کے ججوں کے لیے یہ اصول اختیار کیا جائے کہ اگر وہ مقرر وقت کے اندر کیس کا فیصلہ نہیں کریں گے تو یہ ان کا ایک ڈِس کریڈٹ شمار ہو۔ ان کو لازماً انصاف کی فوری فراہمی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ججوں کو اضافی وقت صرف کرنے کا اضافی معاوضہ دیا جائے۔ اس سے ان کی استعدادِ کار میں اضافہ ہوگا۔

۱۶۔ بعض وکلاء اپنے مؤکلین کے فائدے کے لیے وقت ضائع کرنے کا سہارا لیتے ہیں، اگر ایک جج چاہے تو ان چیزوں کو بڑی آسانی سے کنٹرول کرسکتا ہے۔

۱۷۔ ترقی یافتہ ممالک میں وکلاء گروپ کی شکل میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اس طرح کسی وکیل کی بیماری یا چھٹی کی وجہ سے کیس کی سماعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے پاکستان میں بھی وکلاء گروپ کی شکل میں اگر پریکٹس کریں گے تو ایک وکیل کی غیر حاضری میں دوسرا وکیل کیس کو چلا سکے گا اور مقدمات کا فیصلہ بروقت ہو جائے گا۔

۱۸۔ محکمہ پولیس کی اصلاح کی جائے، کیونکہ ملزمان عدالت میں پہنچ کرنا کارہ شہادتوں کی ناقص کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں کے ذریعے بری ہو جاتے ہیں۔ اصل ملزم کے گرفتار ہونے اور سزایاب ہونے کا مکمل انحصار پولیس کی تفتیش اور عدالت میں مقدمہ کی پیروی پر منحصر ہے۔ اگر صحیح خطوط پر تفتیش ہوا اور صحیح معنوں میں مقدمہ کی پیروی ہو تو ملزم سزا سے بری ہو جاتے ہیں۔ پولیس مقدمہ درج ہی نہیں کرتی۔ مدعی مقدمہ درج کرانے کے لیے سفارش کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، اکثر اصلی مجرم پولیس کی غلط تفتیش، غلط کارروائی، غلط رپورٹنگ اور عدم پیروی سے سزا سے بچ جاتے ہیں۔

۱۹۔ جیلوں کی اصلاح کی جائے، جیل میں قیدیوں کو رکھنے کا مقصد ان کی اصلاح کرنا ہے۔ ان کے کیے کی سزا دینا اور دوسروں کو عبرت دینا وغیرہ۔ اسلامی نظام میں جیل کا مقصد اصلاح وتربیت گاہ اور عبرت گاہ ہے جیل سے سزا کاٹ کر ایک مجرم صحیح انسان بن کر باہر نکلے وہ معاشرے کے لیے پریشانی کا باعث نہ ہو اور ناسور نہ رہے جب کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ جیل سے واپسی پر بڑے مجرم بن کر آتے ہیں۔

۲۰۔ جیل حکام ملزموں کو بروقت پیشی پر پیش نہیں کرتے جس کی وجہ سے بے گناہ اپنے ناکردہ گناہ کی سزا کاٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جیل میں قیدیوں کی اخلاقی، مذہبی، علمی اور فنی تعلیم و تربیت کے لیے کوئی معقول بندوبست نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان کی صحت و صفائی اور خوراک کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تھانے اور جیلیں مجرم کو مزید مجرمانہ ٹریننگ مہیا کرنے کے ادارے کا کام کرتے ہیں۔

۲۰۔ سرکاری وکلاء کی کارکردگی بہتر بنائی جائے، سیشن کے سرکاری وکلاء کا ٹھیکیداری نظام ختم کیا جائے کیونکہ وہ زیادہ تر اپنے ذاتی مقدمات میں زیادہ محنت اور وقت صرف کرتے ہیں اور سرکاری مقدمات کے لیے فیس کم ہونے کی بناء پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ انھیں کل وقتی وکیل مقرر کیا جائے، تاکہ وہ ان مقدمات پر توجہ دے سکیں اور انھیں اچھی تنخواہیں اور مراعات دی جائیں تاکہ وہ دل جمعی سے کام کر سکیں اور بدعنوانی میں ملوث نہ ہوں۔

۲۱۔ تعزیرات پاکستان، جو مغربی رنگ لیے ہوئے ہے اس کی جگہ اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کی جائیں۔ تعزیرات پاکستان میں مقدار کے لحاظ سے سزائیں بہت کم ہیں، خصوصاً کوڑوں کی سزا سوائے حدود آرڈیننس کے شامل نہیں ہے۔ اسلامی قوانین کے مطابق حاکم، سرکاری اہلکار وغیرہ سب کے سب عدالت کے سامنے جواب دہ ہیں جب کہ مغربی قوانین کے مطابق سربراہ مملکت، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ، گورنر کے خلاف تو عدالتیں کارروائی نہیں کر سکتیں جب کہ سرکاری افسروں کے لیے پہلے مرکز یا صوبائی حکومتوں سے اجازت لینا پڑتی ہے جو کہ عدل وانصاف کے تقاضوں کے منافی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایک عام آدمی سے لے کر سربراہ مملکت تک شہریوں اور حکام کو عدالت کے سامنے جوابدہ بنایا جائے۔ ایسی تمام مستثنیات خواہ تعزیرات پاکستان، ضابطۂ فوجداری یا آئین میں موجود ہیں، منسوخ کی جائیں تاکہ یکسانیت اور مساوات پیدا ہو اور عدل وانصاف میں تمام افراد برابر ہو سکیں (۱۰۸)۔ یہی اسلام کی تعلیم اور اسلامی عدل کا طرۂ امتیاز ہے۔

نوٹ:

اس مقالے کی تیاری میں دیگر کتب کے علاوہ کنیز فاطمہ کا مقالہ برائے ڈاکٹریٹ شعبہ علوم اسلامی جامعہ، کراچی ۲۰۰۵ء، بعنوان اسلامی نظام عدل کی روشنی میں پاکستان کے عدالتی نظام کا تحقیقی مطالعہ بھی مددگار ثابت ہوا۔

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب (دارِصادر، بیروت) ۱۱/۴۳۰۔

۲۔ صدیقی محمد عبدالحفیظ، برصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظام عدل (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) ص ۹۔

3. (i) Edward William Lane, An Arabic English Lexicon, 1/1972;

(ii) Hans Wehr A Dictionary of Modern Written Arabic, P.596.

۴۔ دکتور ابراهیم و رفقائه، المعجم الوسیط (المکتبۃ العلمیہ، تہران) ۲،۱/۵۸۸۔

۵۔ المائدہ: ۹۵۔

۶۔ ابن منظور، ابوالفضل، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب (دارِصادر، بیروت) ۹/۸۳۔

۷۔ الازہری، ابومنصور بن احمد، معجم تہذیب اللغۃ (دارِصادر، بیروت) ۳/۲۳۵۸؛

الجوھری، اسماعیل بن حماد، الصحاح (دارالکتب العربی، مصر) ۴/۱۴۳۶۔

۸۔ البقرہ: ۴۸۔

۹۔ خلیل بن احمد، الفراہیدی، کتاب العین (دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۳ھ) ۶۰۹؛ الجوہری، الصحاح، ۴/۱۴۳۶؛ رازی، ابوبکر، مختار الصحاح (دارالقلم، بیروت) ۲۵۱۔

۱۰۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن (مکتبۃ الرتضویہ ۱۳۹۲ھ) ۳۲۵؛

معجم تہذیب اللغۃ، ۳/۲۳۵۸۔

11. Charles Smith, Twentieth Century Encyclopaedia,4/1732.

12. Cecil Roth, The Standard Jewish Encyclopedia,1084.

۱۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور) ۱۳/۴۔

۱۴۔ ابن تیمیہ، شیخ الاسلام، السیاسۃ الشرعیۃ (الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورہ) ص ۷۔

۱۵۔ صالح بن عبداللہ و عبدالرحمٰن، نضرۃ النعیم (دارالوسیلۃ، جدۃ) (العدل والمساوات) ۷/۲۷۹۲۔

۱۶۔ رازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب، ۲۰/۱۰۵۔

۱۷۔ مقالات سیرت، حصہ اوّل (نویں قومی سیرت کانفرنس، وزارت امور مذہبی حکومت پاکستان، اسلام آباد)

پروفیسر عبداللطیف انصاری، اسلام کے قانونی نظام کے بنیادی اصول، ص ۱۰۱۔

۱۸۔ الشوریٰ: ۱۵۔

۱۹۔ النساء: ۵۸۔

۲۰۔ المائدہ: ۸۔

۲۱۔ ایضاً:۴۲۔

۲۲۔ الاعراف:۲۹۔

۲۳۔ ابوداؤد، السنن (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۸ء) ص ۲۳۵، حدیث نمبر ۱۵۸۸۔

۲۴۔ ھود:۶۰۔

۲۵۔ البخاری، الجامع الصحیح (دارالسلام، الریاض ۱۹۹۸ء) ص ۸۳۵، حدیث نمبر ۴۷۶۵۔

۲۶۔ ایضاً ص ۴۴۲، حدیث نمبر ۲۷۰۷۔

۲۷۔ الخطیب التبریزی، مشکوۃ المصابیح (المکتبہ التجاریہ، دارالفکر، بیروت ۱۹۹۱ء) ۲/۳۴۲، حدیث نمبر ۳۷۱۸۔

۲۸۔ یوسف:۴۰۔

۲۹۔ النجم:۳۔

۳۰۔ ترمذی، السنن (مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۴ء) کتاب البر، باب ماجاء فی المزاح ۴/۳۵۱۔

۳۱۔ ایضاً، کتاب الحج، باب ماجاء کم فرض الحج ۳/۱۷۸۔

۳۲۔ النساء:۵۹۔

۳۳۔ آلوسی تفسیر روح المعانی (ادارہ الطباعۃ المنیریہ القاہرہ) ۵/۶۷۔

۳۴۔ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم (المکتبہ المالکیہ، مصر) ۱/۴۲۰۔

۳۵۔ جھنڈا نگری، عبدالرؤف رحمانی، ایام خلافت راشدہ (مکتبہ قدوسیہ، لاہور ۱۹۹۷ء) ص ۲۴۹۔

۳۶۔ البقرۃ:۱۸۸۔

۳۷۔ رضوی، اظہار حیدر: ''اصول قانون''، (مکتبہ فریدی اردو کالج، کراچی) ص ۱۱۲۔

۳۸۔ سالمنڈ، سرجان، ''اصول قانون'' (دارالطبع عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۵ء) ص ۹۱۔

۳۹۔ الماوردی: ''الاحکام السلطانیہ'' (ترجمہ سید محمد ابراہیم مطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، اشاعت ۱۹۳۱ء) ص ۱۱۔

۴۰۔ النساء:۵۹

۴۱۔ جعفری، رئیس احمد: ''سیاست شرعیہ'' (ادارۂ ثقافت اسلامیہ، پاکستان، لاہور، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹)، ص ۱۲۷-۱۲۸۔

۴۲۔ شبلی نعمانی، الفاروق (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) ص ۲۲۰۔

۴۳۔ راشدہ شعیب، اسلامی نظام حکومت (بک پروموٹرز، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۸۔

۴۴۔ محمد حمیداللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی (مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، بار دوم ۱۹۴۹ء) ص ۳۵۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ حمید الدین، ڈاکٹر، تاریخ اسلامی (فیروزسنز لمیٹڈ، کراچی، ایڈیشن ہشتم) ص ۲۷۶۔

۴۷۔ ایضاً۔

۴۸۔ حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم علیم اللہ صدیقی (دار الاشاعت، فریدی بک سنٹر، کراچی) ص ۲۸۲۔

۴۹۔ حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، ص ۲۸۲۔

۵۰۔ برنی، ای ایچ، مسلم اسپین وثقافتی تاریخ (کفایت اکیڈمی، کراچی) ص ۵۴۶۔

۵۱۔ خان، میر باسط علی، تاریخ عدالت آصفی (ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد ۱۹۷۳ء) ص ۲۱۔

۵۲۔ قریشی، اشتیاق حسین، سلطنت دہلی کا نظم حکومت، ترجمہ ہلال احمد زبیری (شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی) طبع اوّل، ص ۱۵۸۔

۵۳۔ خان، میر باسط علی، تاریخ عدالت آصفی، ص ۲۰۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۵۰۵۔

۵۵۔ الشوریٰ: ۱۵۔

۵۶۔ الاعراف: ۲۹۔

۵۷۔ المائدہ: ۴۲۔

۵۸۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) ۲/۵۰۔

۵۹۔ عباس محمود العقاد المصری، علی بن ابی طالب، ترجمہ مولانا فتح پوری (نفیس اکیڈمی، لاہور) ص ۲۵۹۔

۶۰۔ ابوداؤد، السنن، ص ۵۱۶، حدیث نمبر ۳۵۹۲۔

۶۱۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب، الاحکام السلطانیہ (دار الطباعت عثمانیہ، لاہور) ص ۲۱۔

۶۲۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن، المقدمۃ (مصطفیٰ محمد القاہرہ، ۱۳۲۹ھ)۔

۶۳۔ ابوداؤد، السنن، ص ۴۲۶، حدیث نمبر ۲۹۲۹۔

۶۴۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی، (مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن) ۱/۸۴۔

۶۵۔ ڈاکٹر لوتھر، جدید دنیائے اسلام (بحوالہ مقالات سیرت، نویں قومی کانفرنس، اسلام آباد) ص ۱۶۵۔

۶۶۔ ابوداؤد، السنن، ص ۴۴۹، حدیث نمبر ۳۰۶۷۔

۶۷۔ المائدہ: ۴۲۔

۶۸۔ ابوداؤد، السنن، ص ۶۴۱، حدیث نمبر ۴۵۳۶۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۷۳۳، حدیث نمبر ۵۲۲۴۔

۷۰۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری، الرحیق المختوم (المکتبہ السلفیہ، لاہور ۱۹۹۴ء) ص ۴۵۷۔

۷۱۔ البخاری، الجامع الصحیح (دار السلام، الریاض ۱۹۹۸ء) ص ۴۱۷، حدیث نمبر ۲۵۸۶۔

۷۲۔ ایضاً،ص ۴۱۷،حدیث نمبر ۲۵۸۷۔

۷۳۔ مقالات سیرت نبوی ﷺ،ص:۱۹۲۔

۷۴۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص ۲۳،حدیث نمبر ۱۰۱۔

۷۵۔ ابوداؤد،السنن،ص ۷۲۵،حدیث نمبر ۵۱۶۲۔

۷۶۔ ایضاً،ص ۷۲۵،حدیث نمبر ۵۱۵۹۔

۷۷۔ ابن ھشام،السیرۃ النبویۃ (مطبعۃ مصطفیٰ البانی الحلبی،مصر) ۴/۲۹۸-۳۰۱۔

۷۸۔ احمد بن حنبل،المسند (دارالفکر،بیروت) ۲/۲۴۳۔

۷۹۔ ابوداؤد،السنن،ص ۵۱۵،حدیث نمبر ۳۵۹۱۔

۸۰۔ الواقدی،محمد بن عمر،کتاب المغازی (عالم الکتب،بیروت) ۲/۶۹۱۔

۸۱۔ ابوداؤد،السنن،ص ۴۰۱،حدیث نمبر ۲۷۵۹۔

۸۲۔ ایضاً،ص ۴۰۱،حدیث نمبر ۲۸۶۰۔

۸۳۔ ایضاً،ص ۶۴۰،حدیث نمبر ۴۵۲۹۔

۸۴۔ مسلم،الجامع الصحیح (دارالسلام،الریاض،۱۹۹۸ء) ص ۷۴۳،حدیث نمبر ۴۳۷۴۔

۸۵۔ الموسوعۃ القضائیۃ (اردو ترجمہ) (فلاح فاؤنڈیشن،لاہور) ص ۸۹۔

۸۶۔ ابوداؤد،السنن،ص ۶۲۲،حدیث نمبر ۴۴۱۹۔

۸۷۔ ایضاً،ص ۶۲۵،حدیث نمبر ۴۴۴۲۔

۸۸۔ ایضاً،ص ۶۱۸،حدیث نمبر ۴۳۹۴۔

۸۹۔ ایضاً،ص ۶۱۵،حدیث نمبر ۴۳۷۴۔

۹۰۔ ترمذی،السنن،ص ۳۴۶،حدیث نمبر ۱۴۳۰۔

۹۱۔ ایضاً،ص ۶۳۲،حدیث نمبر ۴۴۸۴۔

۹۲۔ ایضاً،ص ۳۰۳،حدیث نمبر ۲۰۹۶۔

۹۳۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص ۹۴۳،حدیث نمبر ۵۲۷۳۔

۹۴۔ ابن قیم،اعلام الموقعین (مطبعہ التجاریہ،القاہرہ،۱۹۶۲ء) ۴/۲۹۱۔

۹۵۔ البخاری،الجامع الصحیح،ص ۹۴۸،حدیث نمبر ۵۳۰۵۔

۹۶۔ ایضاً،ص ۹۴۸،حدیث نمبر ۵۳۰۱۔

۹۷۔ النساء:۵۸۔

۹۸۔ ابوداؤد، السنن، ص ۵۲۱، حدیث نمبر ۳۶۳۱۔

۹۹۔ مقالات سیرت (حصہ اوّل) نویں قومی سیرت کانفرنس (وزارتِ امورِ مذہبی حکومت پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۴ء) ص ۹۰۔

۱۰۰۔ ابوداؤد، السنن، ص ۱۰۶۷، حدیث نمبر ۶۱۲۴۔

۱۰۱۔ سید ریاض حسن، پاکستان ناگزیر تھا (شعبہ تصنیف، کراچی یونیورسٹی، کراچی) ص ۵۲۳۔

۱۰۲۔ محمد مجاہد فاروق، پاکستان کی نظریاتی تاریخ حکومت اور سیاست (نیو بک پیلس، لاہور) ص ۵۷۔

۱۰۳۔ چودھری محمد اعظم، پاکستان کا آئین ۱۹۷۳ء (مکتبہ فریدی وفاقی اردو کالج، کراچی ۱۹۹۳ء) ص ۴۰۔

104. Khan, Makhdom Ali "The Constitution of Republic of Pakistan 1973, Karachi,(Pakistan Law Book House)P.86.

۱۰۵۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، ص ۶۸۹۔

۱۰۶۔ ملک محمد دین، رہنمائے وکالت (الفا براؤ میاں چیمبرز، لاہور) ص ۴۲۸۔

۱۰۷۔ کنیز فاطمہ، اسلامی نظام عدل کی روشنی میں پاکستان کے عدالتی نظام کا تحقیقی مطالعہ (مقالہ ڈاکٹریٹ شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی ۲۰۰۵ء) ص ۳۸۶-۳۸۷۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۳۸۸-۳۹۰۔

کتابیات

⇦ القرآن۔

⇦ آزاد، ابوالکلام، اسلام کا نظریہ جنگ، غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

⇦ ایضاً، تذکرہ، ارشد بک سیلرز، میر پور آزاد کشمیر۔

⇦ ایضاً، رسولِ رحمت، غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

⇦ آصف قدوائی، مقالات سیرت، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

⇦ آفتاب، اصغر، تاریخ نویسی فارسی ہندو پاکستان، خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران لاہور ۱۳۶۴ھ۔

⇦ آلوسی، علامہ، شہاب الدین، روح المعانی، دار الکتب العربیہ، بیروت۔

⇦ آلوسی، محمود شکری، بلوغ العرب (اردو ترجمہ) مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

⇦ ابن الاثیر، علامہ عز الدین ابو الحسن علی بن ابی کرم محمد، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، دار احیا التراث العربی، بیروت۔

⇦ ایضاً، الکامل فی تاریخ، دار صادر، بیروت۔

⇦ ابن تیمیہ، احمد، السیاستہ الشرعیۃ، الجامعہ الاسلامیۃ المدینہ منورہ۔

⇦ ایضاً، ایضاً، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، ۱۹۳۱ء۔

⇦ ایضاً، الصارم المسلول، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۴۱۴ھ۔

⇦ ایضاً، ایضاً، دار السلام الریاض۔

⇦ ایضاً، مجموع فتاویٰ، ادارہ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والارشاد، الریاض۔

⇦ ایضاً، ریاست الحرمین الشریفین، سعودی عرب۔

⇦ ابن حجر، احمد بن علی، العسقلانی، تہذیب التہذیب، دار الفکر بیروت، ۱۹۸۴ء۔

⇦ ایضاً، فتح الباری شرح جامع الصحیح البخاری، مکتب الدعوۃ والارشاد، الریاض۔

⇦ ایضاً، ایضاً، دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور۔

⇦ ایضاً، ایضاً، المکتبۃ السلفیہ القاہرہ۔

⇦ ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد، جوامع السیرۃ، دار المعارف مصر۔

⇦ ایضاً، المحلی، دار آفاق الجدید، بیروت۔

⇦ ابن حیان، الاندلسی، محمد عبد اللہ امیر الدین محمد بن یوسف تفسیر البحر المحیط، مکتبہ مطابع النصر الحدیثہ مصر۔

⇦ ابن خلدون، عبد الرحمٰن، المقدمۃ، مصطفیٰ محمد، القاہرہ، ۱۳۲۹ھ۔

⇦ ابن خلکان، ابو العباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر، وفیات الاعیان، منشورات الرضی، قم۔

⇦ ابن سعد، محمد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت۔

⇦ [illegible] ابو عمر یوسف، التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید، المکتبہ التجاریہ مصطفیٰ احمد الباز،

مکتبۃ المکرمہ

⇦ ایضاً، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۶۸ھ۔

⇦ ایضاً، جامع بیان العلم وفضلہ، دارالفکر، بیروت۔

⇦ ابن عساکر، ابوالقاسم علی بن الحسن، تہذیب تاریخ دمشق، دارالمسیرہ، بیروت ۱۳۹۹ھ۔

⇦ ابن قتیبہ، ابومحمد عبداللہ بن مسلم الدینوری، المعارف، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۸۸ء۔

⇦ ابن قیم، شمس الدین ابوعبداللہ محمد، اعلام الموقعین، دارالحدیث، مصر۔

⇦ ایضاً، ایضاً، مطبعۃ القاہرہ ۱۹۶۲ء۔

⇦ ایضاً، زادالمعاد (اردو مترجم، رئیس احمد جعفری) نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۵ء۔

⇦ ابن کثیر، ابوالفداء، اسماعیل، البدایہ والنہایہ، دارالفکر، بیروت۔

⇦ ایضاً، سیرۃ النبی ﷺ (اردو) ترجمہ مولانا ہدایت اللہ ندوی، مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور، طبع اوّل، اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

⇦ ایضاً تفسیر القرآن العظیم، دارالسلام الریاض۔

⇦ ایضاً، ایضاً، المکتبہ المالکیہ، مصر۔

⇦ ابن ماجہ، محمد بن یزید، السنن، احیاء السنۃ النبویہ، سرگودھا ۱۳۹۸ھ۔

⇦ ایضاً، ایضاً، دارالسلام الریاض۔

⇦ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، دارصادر، بیروت ۱۹۵۶ء۔

⇦ ابن نجیم، زین الدین ابراہیم، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی ۱۴۰۵ھ۔

⇦ ابن ندیم، ابویعقوب محمد بن اسحاق، الفہرست (اردو ترجمہ) مترجم محمد اسحاق بھٹی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

⇦ ابن ہشام، عبدالملک، السیرۃ النبویہ دارالجیل بیروت، ۱۹۹۸ء۔

⇦ ایضاً، ایضاً، انتشارات الرضی قم، ایران۔

⇦ ایضاً، ایضاً، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۔

⇦ ابوخیثمہ، زہیر بن حرب، النسائی، کتاب العلم، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۸۳ء۔

⇦ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، السنن، دارالسلام الریاض ۱۹۹۹ء۔

⇦ ایضاً، ایضاً، المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، مصر۔

⇦ احسان بی اے، رسول اللہ ﷺ میدانِ جہاد میں، برادرز پبلشرز، دی مال، لاہور۔

⇦ احمد بن حنبل، المسند، دارالفکر، القاہرہ۔

⇦ احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ (اردو) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۹ء۔

⇦ احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی، ایران وپاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء۔

⇦ الازہری، کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور ۱۴۱۸ھ۔

⇦ استنبولی،محمود مہدی،تحفۃ العروس،علم وعرفان پبلشرز،لاہور۔
⇦ اسماعیل حقی،بروسوی،تفسیر روح البیان،داراحیارالتراث العربی،بیروت ۱۳۰۵ھ۔
⇦ اکبرآبادی،نادرالمعراج وبحرالاسرار،مطبع خورشید عالم برائے کتب خانہ نورانیہ،پشاور ۱۳۷۵ھ۔
⇦ امروہوی،سید قاسم رضا،جدید نسیم اللغات اردو،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور ۱۹۹۶ء۔
⇦ امین احسن اصلاحی،تدبر قرآن،مکتبہ انجمن خدام القرآن،لاہور ۱۹۷۶ء۔
⇦ انور محمود خالد،ڈاکٹر،اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ،اقبال اکادمی،پاکستان،لاہور ۱۹۸۹ء۔

⇦ البانی،الشیخ محمد ناصر الدین،سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ،المکتب الاسلامی،بیروت۔
⇦ ایضاً،سلسلہ الاحادیث الضعیفہ،المکتب الاسلامی،بیروت۔
⇦ بخاری،محمد بن اسماعیل،الجامع الصحیح (دوسرا ایڈیشن) دارالسلام الریاض۔
⇦ ایضاً،ایضاً،نور محمد اصح المطابع،کراچی۔
⇦ ایضاً،ایضاً،دارابن کثیر،بیروت ۱۹۸۷ء۔
⇦ ایضاً،ایضاً،دارالعلم،بیروت۔
⇦ ایضاً،الادب المفرد،مکتبہ المعارف،الریاض ۱۹۹۸ء۔
⇦ ایضاً،التاریخ الکبیر،مکتبہ غراس،بیروت۔
⇦ برق التوحیدی،آفتاب بخارا،مکتبہ اہل سنت والجماعت،لائل پور۔
⇦ برق،غلام جیلانی،یورپ پر اسلام کے احسان،غلام علی اینڈ سنز،لاہور۔
⇦ برنی،آئی ایچ،مسلم اسپین کی ثقافتی تاریخ،کفایت اکیڈمی،کراچی۔
⇦ البستی،ابن حبان محمد،السیرہ النبویہ واخبار الخلفاء،مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ بیروت۔
⇦ ایضاً،کتاب الضعفاء والمجروحین من المحدثین،دارالوعی حلب ۱۳۹۶ھ،الطبعہ الاولیٰ۔
⇦ البغوی،ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء،شرح السنہ،المکتب الاسلامی،بیروت ۱۴۰۳ھ۔
⇦ ایضاً،معالم التنزیل،دارالفکر،بیروت۔
⇦ البلاذری،احمد بن یحییٰ بن جابر،فتوح البلدان،مؤسسۃ المعارف بیروت ۱۹۸۷ء۔
⇦ بلیاوی،عبدالحفیظ،مصباح اللغات،مقبول اکیڈمی،لاہور۔
⇦ بہاری،فضل حسین،الحیاۃ بعد المماۃ،مکتبہ شعیب حدیث منزل،کراچی۔
⇦ بھٹی،محمد اسحاق،فقہائے ہند،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور۔
⇦ ایضاً،برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور۔
⇦ البیضاوی،عبداللہ بن عمر،تفسیر بیضاوی،مصطفیٰ البابی الحلبی،مصر۔
⇦ البیہقی،ابوبکر احمد بن الحسین بن علی،دلائل النبوہ،دارالکتب العلمیہ،بیروت۔
⇦ ایضاً،السنن الکبریٰ،نشر السنہ،ملتان۔

⇦ ایضاً، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

ت

⇦ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، السنن، دارالسلام، الریاض الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء۔

⇦ ایضاً، ایضاً، قرآن محل، کراچی۔

⇦ ایضاً، الشمائل المحمدیہ دار المطبوعات الحدیثہ جدہ سعودی عرب ۱۹۸۸ء۔

ث

⇦ ثانی، ڈاکٹر حافظ محمد، تجلیات سیرت، فضلی سنز کراچی ۱۹۹۶ء۔

⇦ ایضاً، رسول اکرم ﷺ اور رواداری، فضلی سنز، کراچی ۱۹۹۸ء۔

⇦ ثانی، صلاح الدین، ڈاکٹر، اصول سیرت نگاری، مکتبہ یادگار، شبیر احمد عثانی، کراچی۔

⇦ ثناء اللہ، حسین، قرآن حکیم اور مستشرقین، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ج

⇦ الجبری، عبدالمتعال، محمد، الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری مکتبہ وھبہ، القاہرہ۔

⇦ جصاص، ابوبکر احمد، احکام القرآن، احیاء التراث العربی، بیروت۔

⇦ جعفری، رئیس احمد، سیاست شرعیہ (اردو) ادارہ ثقافت پاکستان، اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۹ء۔

⇦ جھنڈانگری، عبدالرؤف رحمانی، ایام خلافت راشدہ مکتبہ قدوسیہ لاہور ۱۹۹۷ء۔

⇦ الجہنی، مانع بن حماد، الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب المعاصرہ، الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی الریاض، ۱۹۸۹ء۔

⇦ جیلانی، ڈاکٹر عبدالقادر، اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین، کتاب سرائے اردو بازار، لاہور ۲۰۰۵ء۔

چ

⇦ چراغ، محمد علی، حضرت عمر فاروق ؓ، نذیر پبلشرز، لاہور۔

⇦ چشتی، علی اصغر، ڈاکٹر، تاریخ حدیث، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

⇦ چغتائی، طارق محمود، سنت نبوی ﷺ اور جدید سائنس، دارالدعوۃ حاصل پور، ضلع بہاولپور۔

⇦ چوہدری محمد اعظم، پاکستان کا آئین ۱۹۷۳ء، مکتبہ فریدی وفاقی اردو کالج، کراچی ۱۹۹۳ء۔

⇦ چیمہ، چوہدری غلام رسول، سیرۃ سید البشر ﷺ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔

⇦ ایضاً، اسلام کا معاشرتی نظام، علم و عرفان پبلشرز لاہور۔

ح

⇦ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، مکتبہ اسلامیہ، تہران ۱۹۶۷ء۔

⇦ حافظ سعد اللہ، وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والے، اقبال پبلشنگ کمپنی، مدینہ کالونی، لاہور کینٹ۔

⇦ الحاکم، ابوعبداللہ محمد النیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتاب العربی، بیروت۔

⇦ حالی، خواجہ الطاف حسین، کلیات نظم حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

⇦ الحدیدی، ابوالنور، الدکتور، التفسیر بلماثور ومنهاج المفسرون، بحوث المرکز لتعلیم الاسلامی مکہ مکرمہ ۱۹۸۲ء۔

⇦ الحریری، ابوالنور، الدکتور، التفسیر بالمأثور ومناھج المفسرین بحوث المرکز لتعلیم الاسلامی، مکہ المکرمہ ۱۹۸۲ء۔

⇦ حسان بن ثابت، دیوان حسان بن ثابت، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۷۴ء۔

⇦ حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، دارالاشاعت فریدی بک سنٹر، کراچی۔

⇦ الحلبی، علی بن برھان الدین، السیرۃ الحلبیہ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، س، ن۔

⇦ ایضاً، ایضاً، مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، القاہرہ۔

⇦ حمید الدین، ڈاکٹر، تاریخ اسلامی، فیروزسنز لمیٹڈ، کراچی۔

⇦ حنیف، محمد، مفکر پاکستان، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔

خ

⇦ خازن، علاء الدین علی بن محمد، لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف تفسیر خازن، مصطفی البابی الحلبی، مصر ۱۳۸۶ھ۔

⇦ خان، میر باسط علی، تاریخ عدالت آصفی، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد ۱۹۷۳ء۔

⇦ خضری بک محمد، نور الیقین فی سیرت سید المرسلین، داراحیا التراث العربی، بیروت۔

⇦ خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی، الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، مکتبہ المعارف، الریاض۔

⇦ ایضاً، شرف اصحاب الحدیث، ریاست الشؤن الدینیہ الجمھوریہ الترکیۃ انقرہ، الطبعہ الثانیہ ۱۹۹۱ء۔

⇦ ایضاً، الفقیہ والمتفقہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۰ء۔

⇦ ایضاً، الکفایہ فی علم اصول الروایہ، جمعیۃ دائرہ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد۔

⇦ الخطیب التبریزی، ولی الدین ابوعبداللہ محمد، مشکوٰۃ المصابیح، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی دوسرا ایڈیشن۔

⇦ ایضاً، ایضاً، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی ۱۹۷۷ء۔

⇦ ایضاً، ایضاً، دارالفکر، بیروت ۱۹۹۱ء۔

⇦ خلیفہ بن خیاط، التاریخ، دارالفکر، بیروت۔

⇦ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ادارہ ادارۃ ادبیات لاہور ۱۹۸۱ء۔

د

⇦ الدارمی، ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن، السنن، دارالفکر، بیروت۔

⇦ ایضاً، ایضاً، المدینہ المنورہ۔

⇦ داناپوری، ابوالبرکات، عبدالرؤف، اصح السیر مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

⇦ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، عجالہ نافعہ (ترجمہ اردو) ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی ۱۹۶۴ء۔

ذ

⇦ الذھبی، شمس الدین محمد بن احمد، تذکرۃ الحفاظ، دارالمعارف العثمانیہ، حیدرآباد ۱۹۰۹ء۔

⇐ ... النبلاء، مؤسسة الرسالة بیروت، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۹۰ء۔

⇐ ایضاً، ... عمر، دار الکتب العربیہ، بیروت ۱۳۴۸ء۔

ر

⇐ ... علمائے ہند (مترجم محمد ایوب قادری) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء۔

⇐ ... اسلامی نظام حکومت، بک پروموٹرز اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء۔

⇐ ... علامہ، تفسیر المنار، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

⇐ ... اصول قانون، مکتبہ فریدی اردو کالج، کراچی۔

ز

⇐ ... پیغمبر اسلام اور اخلاق حسنہ، راحت پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

⇐ ... سید محمد مرتضی، تاج العروس، دار الفکر، بیروت ۲۰۰۵ء۔

⇐ ... صدیقی، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۷ء

⇐ زرقانی، شرح المواہب اللدنیہ، مکتبہ عباس احمد الباز، مکہ المکرمہ، ۱۹۹۶ء۔

⇐ زکریا، مولانا، شرح شمائل ترمذی مع خصائل نبوی ﷺ (ترجمہ) مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔

⇐ زکریا، ہاشم، الاسلام والمستشرقون، لجنۃ التعریف بالاسلام جمھوریۃ العربیۃ المتحدہ، مصر ۱۹۶۵ء۔

⇐ الزمخشری، ابو القاسم، جار اللہ محمود بن عمر، تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۴۸ء۔

س

⇐ ساجد الرحمٰن، اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۹۷ء۔

⇐ سالمنڈ ... جان، اصول قانون، دار الطباعت عثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۹۲۵ء۔

⇐ الساعاتی، احمد بن عبد الرحمٰن، الفتح الربانی بترتیب مسند احمد بن حنبل الشیبانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

⇐ السبکی، تاج الدین، ابو نصر عبد الوہاب بن علی، الطبقات الشافعیہ، دار احیاء الکتب العربیۃ، القاہرہ۔

⇐ السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ (اردو ترجمہ) مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۶ء۔

⇐ السہیلی، ابو القاسم عبد الرحمٰن بن عبد اللہ، الروض الانف فی تفسیر السیرۃ النبویۃ لابن ہشام، عبد التواب اکیڈمی، ملتان۔

⇐ سوامی لکشمن پرشاد، عرب کا چاند، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور۔

⇐ سیف، قاضی محمد اسلم تحریک اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں، جامعہ تعلیم الاسلام، ماموں کانجن، فیصل آباد۔

⇐ سیوطی، جلال الدین عبد الرحمٰن، تفسیر جلالین، سراج الدین اینڈ سنز لاہور۔

⇐ ایضاً، الجامع الصغیر، مکتبہ اسلامیہ لائل پور، ۱۳۹۴ھ۔

⇐ ... ریاض حسن، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

ش

⇐ شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ھیئۃ الاوقاف، حکومت پنجاب، لاہور، ۱۹۸۱ء۔
⇐ ایضاً، حجۃ اللہ البالغہ، المکتبۃ السلفیۃ لاہور، ۱۹۷۵ء۔
⇐ شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور ۱۹۹۱ء۔
⇐ ایضاً، الفاروقؓ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔
⇐ شبیر احمد عثمانی، مولانا، تفسیر عثمانی، مکتبہ اسلامیہ کراچی۔
⇐ شوکانی، محمد بن علی، تفسیر فتح القدیر، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۔
⇐ ایضاً، نیل الاوطار، دار الحدیث القاہرہ۔
⇐ الشہرستانی، عبدالکریم .... الملل والنحل، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۔

ص

⇐ صالح بن عبداللہ (وغیرہ)، موسوعۃ نضرۃ النعیم فی مکارم اخلاق الرسول الکریم، دار الوسیلۃ، جدہ المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء۔
⇐ صاعد اندلسی، طبقات الامم، دار الکتب العلمیہ بیروت۔
⇐ صبحی محمصانی، الاوضاع التشریعیۃ فی دول العربیہ ماضیھا وحاضرھا، دار العلم للملایین بیروت، ۱۹۶۵ء۔
⇐ صدیق احمد، قاری، آداب المتعلمین، مجلس نشریات اسلام کراچی۔
⇐ صدیقی، زبید احمد، ڈاکٹر، عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۷ء۔
⇐ صدیقی، محمد عبدالحفیظ، برصغیر پاک و ہند میں اسلامی نظام عدل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔
⇐ صدیقی، مظہر الدین، اسلام اور تھیوکریسی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء۔
⇐ صدیقی، مظہر یٰسین، ڈاکٹر، مکی اسوۂ نبی ﷺ، اسلامک فاؤنڈیشن دہلی ۲۰۰۵ء، طبع اوّل۔

ط

⇐ طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، مؤسسہ الکتب الثقافیۃ، بیروت ۱۹۸۶ء۔
⇐ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۔
⇐ ایضاً، ایضاً، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت۔
⇐ ایضاً، ایضاً (اردو)، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء۔
⇐ ایضاً، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۸۸ھ۔
⇐ طحاوی، ابو جعفر، شرح عقیدہ الطحاویہ فی العقیدہ السلفیہ، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۹۲ء۔
⇐ طنطاوی جوہری، الاستاذ الحکیم، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۱ء۔
⇐ طہٰ حسین، ڈاکٹر، نقوشِ سیرت، مترجم حافظ سید بشیر احمد نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی۔

ظ

⇐ ظفر علی خاں، دیوان، کاروان ہراس، لاہور۔

⇦ ظفر علی شاہ، محسن انسانیت، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد۔
⇦ ظفر، عبدالرؤف، پروفیسر ڈاکٹر، اسلامیات لازمی، وارن پبلشرز، بہاولپور۔
⇦ ایضاً، علوم الحدیث، نشریات لاہور، ۲۰۰۶ء۔

ع

⇦ عاصمہ فرحت، سیرت رسول ﷺ میں عورت کا کردار، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء۔
⇦ عباس محمود، العقاد المصری، علی بن ابی طالب، ترجمہ فرمان فتح پوری، نفیس اکیڈمی، لاہور۔
⇦ عبدالباقی، محمد فواد، مفتاح کنوز السنہ، مکتبہ الامدادیہ، مکہ مکرمہ۔
⇦ عبدالحیٔ، ڈاکٹر، اسوۂ رسول اکرم ﷺ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔
⇦ عبدالحیٔ، حسنی، نزھۃ الخواطر، دائرہ المعارف، حیدرآباد، بھارت۔
⇦ عبدالرزاق بن ہمام، المصنف، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۰ء۔
⇦ عبدالشکور، حافظ، رسول اللہ ﷺ کی مسکراہٹیں، مقبول بک سٹال، شیخوپورہ۔
⇦ عبدالصمد، ڈاکٹر، سیرت نبوی ﷺ اور سیرت نگاری کا خصوصی مطالعہ، یونیورسل پبلشرز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۱ء۔
⇦ عبدالعزیز عرفی، سیرت نگاری، گیلانی پبلشرز کراچی، ۱۹۹۰ء
⇦ عبدالجید، آخری نبی ﷺ اور ان کی تعلیمات، فضلی سنز، اردو بازار کراچی۔
⇦ عبدالحق، سٹینڈرڈ اردو ڈکشنری، انجمن اردو پریس دکن، ۱۹۷۳ء۔
⇦ عجلونی، اسماعیل بن محمد، کشف الخفاء، مؤسس الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء۔
⇦ عظیم آبادی، ابوالطیب شمس الحق، عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابہ للنسواں، مؤسسہ المجمع العلمی حدیث اکادمی کراچی، الطبعہ الاولی ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء۔
⇦ العقیقی، نجیب، الاسلام والمستشرقون، دارالمعارف مصر ۱۹۶۴ء
⇦ علوان، عبداللہ ناصح، تربیت الاولاد فی الاسلام (اردو ترجمہ) مکتبہ قدوسیہ لاہور۔
⇦ علوی، خالد، ڈاکٹر، انسان کامل، الفیصل ناشران وتاجران، لاہور۔
⇦ عمر فردخ، تاریخ الجاھلیہ، دار العلم بیروت، ۱۹۶۴ء۔

غ

⇦ غازی محمود احمد، محاضرات سیرت، ، الفیصل ناشران وتاجران، لاہور ۲۰۰۴ء۔
⇦ غزالی، ابوحامد محمد بن محمد، احیاء علوم الدین، مکتبہ مصر، ۱۹۳۹ء۔
⇦ الغزالی، محمد فقہ السیرۃ، دارالحدیث القاھرہ۔
⇦ غزنوی، سید ابوبکر، تعلیم وتزکیہ، مکتبہ غزنویہ، شیش محل روڈ لاہور۔
⇦ غزنوی، خالد، ڈاکٹر، علاج نبوی ﷺ اور جدید سائنس، الفیصل ناشران وتاجران، لاہور۔

ف

⇦ فاروق، عبدالغنی، ہم کیوں مسلمان ہوئے، مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۰ء۔

⇦ فاروقی، محمد طاہر، سیرۃ اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور ۱۹۷۸ء۔

⇦ فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، اقبال اور محبت رسول، اقبال اکادمی، پاکستان۔

⇦ فاروقی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ۔

⇦ فانی، مراد آبادی، ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، سلمان کمپنی، لاہور۔

⇦ الفاسی، محمد بن محمد، جمع الفوئد، المکتبہ الاسلامیہ سمندری فیصل آباد۔

⇦ فریوائی، عبدالرحمٰن بن عبدالجبار، الجھود المخلصہ فی خدمہ السنہ المطہرہ، جامعہ السلفیہ بنارس ہند ۱۹۸۴ء۔

⇦ فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، لائن آرٹ پریس، کراچی ۱۹۶۴ء۔

⇦ الفیروز آبادی، محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، دار المعرفۃ، بیروت۔

⇦ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنز لاہور ۱۹۵۶ء۔

ق

⇦ قاری، ملا علی، شرح فقہ الاکبر، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۵ء۔

⇦ ملا علی، قاری، شرح فقہ الاکبر، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۲۵ھ۔

⇦ قاری، صدیق احمد، آداب المتعلمین، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

⇦ قاسمی، اخلاق حسن، اخلاق رسول ﷺ، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی ادب منزل، پاکستان، چوک، کراچی۔

⇦ قاسمی جمال الدین، قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۷۹ء۔

⇦ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ ۱۳۹۷ھ۔

⇦ قاضی اطہر مبارک پوری فاتحین ہند حضرات عثمان وحکم اور مغیرہ بنو العاصی ثقفیؓ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، دہلی، ندوۃ المصنفین ۱۹۶۹ء۔

⇦ ایضاً، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عارفین، کراچی۔

⇦ قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق مصطفیٰ ﷺ، المکتب التجاری مصر۔

⇦ قتیل، دانا پوری، سید محمد قاسم نورانی، سید محمد عربی، برکاتی پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۷ء۔

⇦ قریشی، محمد اسماعیل، ناموس رسالت ﷺ اور قانون توہین رسالت، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور۔

⇦ قریشی، اشتیاق حسین، سلطنت دہلی کا نظم حکومت، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی۔

⇦ قریشی، محمد عبداللہ، روح مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء۔

ک

⇦ کاندھلوی، مولانا محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ، مکتبہ عثمانیہ لاہور ۱۹۸۵ء۔

⇦ کتانی، عبدالحی، علامہ، دور نبوی ﷺ کا نظام حکومت، ادارۃ القرآن وعلوم اسلامیہ، کراچی ۱۹۹۰ء۔

⇦ کنیز فاطمہ، اسلامی نظام عدل کی روشنی میں پاکستان کے عدالتی نظام کا تحقیقاتی مطالعہ (مقالہ) پی ایچ ڈی شعبہ علوم اسلامی، کراچی ۲۰۰۵ء۔

⇦ کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار، مکتبہ اسلام، وسن پورہ، لاہور۔

گ

⇦ گلزار احمد، بریگیڈیئر، غزوات رسول اللہ ﷺ، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۹۴ء۔

⇦ گیلانی، مناظر احسن، تدوین حدیث۔ مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۹۷ء۔

ل

⇦ لوئس معلوف، المنجد فی اللغۃ، المطبعۃ الکاثولیکیہ بیروت، ۱۹۳۷ء۔

⇦ لوتھر، ڈاکٹر، جدید دنیا اسلام، بحوالہ مقالات سیرت، نویں قومی کانفرنس، اسلام آباد۔

م

⇦ مالک، امام، موطا، دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، ۱۴۰۱ھ۔

⇦ ایضاً، ایضاً، دار احیا التراث بیروت ۱۹۹۴ء۔

⇦ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، (مترجم اردو سید محمد ابراہیم)، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۳۱ء۔

⇦ مبارک پوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المکتبہ السلفیہ لاہور۔

⇦ ایضاً، ایضاً، مکتبہ عرفات، الکویت ۱۹۹۶ء۔

⇦ مبارک پوری، مولانا اطہر، تدوین سیر والمغازی، کتاب سرائے لاہور۔

⇦ المتقی الہندی، علاء الدین علی، کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۵ء۔

⇦ محمد اسحاق، ڈاکٹر علم حدیث میں پاک وہند کا حصہ (ترجمہ شاہد حسین رزاقی)، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

⇦ محمد انور بن اختر، قرآن کے دنیا پر اثرات اور جدید سائنسی تحقیقات، ادارہ اشاعت اسلام، کراچی ۲۰۰۳ء۔

⇦ محمد بن محمود، العنایۃ شرح الھدایہ، مکتبہ التجاریہ الکبریٰ القاہرہ، س۔ن۔

⇦ محمد بن محمد، الفاسی، جمع الفوائد، المکتبۃ الاسلامیۃ، سمندری فیصل آباد۔

⇦ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، عہد نبوی ﷺ کا نظام حکمرانی، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن۔

⇦ ایضاً، ایضاً، اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۸۱ء۔

⇦ ایضاً، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دار الاشاعت اردو بازار، کراچی۔

⇦ ایضاً، الوثائق السیاسیہ للعھد النبوی والخلافۃ الراشدہ، دار الارشاد بیروت، ۱۹۶۹ء۔

⇦ محمد رفیق، ڈاکٹر، الامین ﷺ، دید وشنید پبلشرز، بیڈن روڈ، لاہور۔

⇦ محمد رضا، الخلفاء الراشدون، دار الکتب العربی بیروت۔

⇦ محمد سرور، تالیف زین العابدین، دراسات فی السیرۃ النبویہ، [illegible] ۱۹۸۶ء، لاہور۔

⇦ محمد مجاہد فاروق، پاکستان کی نظریاتی تاریخ، حکومت اور سیاست، نیو بک پیلس، لاہور۔

⇦ محمد غوثی، شطاری اذکار ابرار مترجم فضل احمد جیوری، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور ۱۳۹۵ھ۔
⇦ مسلم بن حجاج قشیری، الجامع الصحیح، نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی، ۱۹۵۶ء۔
⇦ ایضاً، ایضاً، دار السلام الریاض ۱۹۹۹ء۔
⇦ ایضاً، ایضاً، قدیمی کتب خانہ کراچی، طبع دوم ۱۹۵۶ء۔
⇦ مقدسی، شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد، احسن التقاسم فی معرفۃ الاقالیم، مکتبہ علمیہ بیروت۔
⇦ منصور پوری، محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین ﷺ، الفیصل ناشران وتاجران، اردو بازار، لاہور۔
⇦ ایضاً، ایضاً، غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۲ء۔
⇦ مودودی، ابوالاعلیٰ، سیرتِ سرورِ عالم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، طبع ششم، ۱۹۹۴ء۔
⇦ موسیٰ بن عقبہ، ابومحمد، المغازی، دراسات وتحقیق وجمع حسین مرادی نسب، الطبعۃ اولیٰ، کتاب خانہ ملی ایران، ۲۰۰۳ء۔
⇦ المکی ابن احمد، مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ الکائنۃ ۱۳۹۹ھ۔
⇦ مہندس، لطف اللہ، قصیدہ بانت سعادہ، مترجم فارسی مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۶۳ء۔
⇦ میر تقی میر، کلیات، سنگ میل پبلیکیشنز اردو بازار لاہور۔

ن

⇦ ناصر، نصیر احمد، ڈاکٹر، پیغمبر اعظم وآخر، فیروز سنز، لاہور۔
⇦ نثار احمد، ڈاکٹر، خطبہ حجۃ الوداع، انسٹیٹیوٹ آف سیرت سٹڈیز، کتاب سرائے، لاہور۔
⇦ ندوی، ابوالحسن علی، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام کے حاملین، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔
⇦ ایضاً، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔
⇦ ندوی، سید سلیمان، خطبات مدراس، کتب خانہ مجیدیہ، ملتان۔
⇦ ایضاً، ایضاً، مسجد اہل حدیث سانگلہ ہل، شیخوپورہ۔
⇦ ایضاً، عربوں کی جہاں بانی، اسلامک کلچر حیدر آباد دکن۔
⇦ ندوی، عبدالسلام، اسوۂ صحابہؓ، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔
⇦ نعیم صدیقی، عورت معرض کشمکش میں، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور ۱۹۹۳ء۔
⇦ ایضاً، محسن انسانیت، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور۔
⇦ النسائی، ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب، السنن، المکتبۃ السلفیہ لاہور، طبع دوم، ۱۹۷۹ء۔
⇦ ایضاً، ایضاً، دار السلام الریاض ۱۹۹۹ء۔
⇦ النسفی، ابوالبرکات، ابوعبداللہ احمد بن محمد، کنز الدقائق محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی
⇦ نوشہروی، امام ابویحییٰ خان، تراجم علمائے حدیث، مرکزی جمعیت اہل حدیث لائل پور۔
⇦ نصیر الدین حیدر، عظمت رسول ﷺ، مکتبہ القریش اردو بازار لاہور۔
⇦ نظامی، خلیق احمد، حیات، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔

و

⇦ وارثی، محمد عنایت اللہ، غزوات مقدس، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور۔
⇦ الواقدی، محمد بن عمر بن واقد، المغازی عالم الکتب سیرت ۱۹۶۵ء۔
⇦ وحید الدین، خان، مولانا، دین وشریعت، دار التذکیر، لاہور ۲۰۰۳ء۔
⇦ ایضاً، شاتم رسول ﷺ، دار التذکیر، لاہور۔
⇦ ایضاً، علم جدید کا چیلنج، دار التذکیر، لاہور۔
⇦ ایضاً، کتاب زندگی، دار التذکیر، اردو بازار لاہور۔

ہ

⇦ ہاشمی، حمید اللہ شاہ، پنجابی زبان وادب، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء۔
⇦ ہاشمی، شفیق الرحمن، پروفیسر، اقبال کا تصورِ دین، فیروزسنز لاہور۔
⇦ الہاشمی، محمد علی، ڈاکٹر، اسلامی طرز زندگی، دار الابلاغ، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۳ء۔
⇦ ہزاروی، فضل الرحمن، فضائل سید المرسلین، طابع تحریک اصلاح امت، گجرانوالہ۔
⇦ ہمام بن منبہ، الصحیفہ الصحیحہ تحقیق علی حسن علی، المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۷۸ء۔
⇦ الھندی، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین، کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء۔
⇦ الہیثمی، نور الدین علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد، مؤسس المعارف، بیروت، ۱۹۸۶ء۔
⇦ ھیکل، محمد حسین، حیاتِ محمد ﷺ، مترجم محمد مسعود عبدہ، مکتبہ الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور۔
⇦ یو آیف آرگل فارسی، برمتیاسی تالیف استوری، موسسہ مطالعات فرہنگی ۱۳۶۲ھ۔

ی

⇦ یوسف الدین، ڈاکٹر، اسلام کے معاشی نظریہ، حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء۔

⇨ Alfred Guallaume, The Life of Muhammad, Oxford University Press 2001.
⇨ D.S.Margoliouth,Mohammedanism and the Islamic world, (New Dehli 1988)P. 47-51.
⇨ Fayodor Dostoevsky, The Possessed, Kinlage,Glassicos,1995.
⇨ Hans Wehr A Dictionary of Modern written Arabic,Ed.j.k cowan,New york1961.
⇨ Henry stubbe,Rise and progress of Muhammad,Tr by Hafiz Muhammad khan shairani, Afzal chambers Macleod road Lahore.
⇨ J.J. Saunder, A History of Medievil Islam,Routledge and kegan paul London 1965.
⇨ Khan, Makhdom Ali "The Constitution of Republic of Pakistan 1973", Pakistan Law Book House,Karachi.
⇨ Marian Makins and Others, Collins English Dictionary, London, 1620.
⇨ Michel H. Heart, The Hundred, New York 1978.
⇨ P.K. Hitti History of Arabs, ST Martin's Press, London 1965.

⇨ Robson, James, Ibn Ishaq's use of Island, Bulletin of Rylands Library Mancheter, 1956 A.D U.K .

⇨ Tor. Andrae ,Muhammad the man and his faith,George Allen an unwin Ltd. London 1956.

⇨ The Encyclopedia of Islam, E.J Brill Leiden, 1993.

⇨ The Oxford Dictionary of English,the biological society,Oxford press Oxford

⇨ W. Montgomery Watt., Muhammad At Mecca,1987 ,U.K.

⇨ W. Montgomery Watt., Muhammad At Madina, Oxford university press karachi,1981.

⇨ W. Montgomery Watt., Muhammad prophet and statesman,Oxford University Press oxford1961.

⇨ Washington Irving,life of Mohamat ,Ep Dution co New york1988.

⇨ Williem Muir, Muhammad and Islam, Relegion Trackt Society, London.

مجلّات ورسائل

⇦ الاسلام والمستشرقین، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی ہند ۲۰۰۳ء۔

⇦ ''مقالات سیرت''، نویں قومی سیرت کانفرنس، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

⇦ ''مقالات سیرت''، دوسری بین الاقوامی سیرت کانفرنس، سیرت چیئر، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور ۲۰۰۵ء۔

⇦ ایضاً، الاستشراق مالہ...... وماعلیہ، الاستشراق والمستشرقون، عدد خاص مجلّۃ المنھل، اپریل ۱۹۸۹ء۔

⇦ ماہنامہ ''سوئے حرم''، اپریل ۲۰۰۰ء۔

⇦ ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک، جنوری، فروری ۲۰۰۶ء جون ۱۹۷۸ء۔

⇦ ماہنامہ ''ترجمان الحدیث''، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، اپریل ۲۰۰۶ء۔

⇦ ماہنامہ ''محدث''، مجلس التحقیق الاسلامی لاہور، اپریل، ۲۰۰۶ء۔

⇦ فکرونظر شمارہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اپریل ۱۹۷۶ء۔

⇦ حریری پروفیسر غلام احمد، غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ مقالہ مخزونہ انور محمود خالد۔

⇦ طفیل احمد، نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

⇦ فکرونظر اسلام آباد جولائی ۱۹۹۲ء۔

⇦ "Jelaind Postan"، ناروے، ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء۔

⇦ ہفت روزہ ''ضرب مومن''، کراچی، مارچ ۲۰۰۶ء۔

⇦ روزنامہ ''جنگ''، ملتان، ۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء۔

⇦ روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۲۹ جولائی ۲۰۰۱ء۔

⇨ The Daily Dawn,Karachi,3,March 1997.

حوالہ جاتی کتب

⇦ بائبل، (اردو) پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور

⇦ بائبل، مطبع المرسلین، بیروت ۱۹۸۷ء۔

⇦ اٹلس، سیرت النبی ﷺ، مکتبہ دارالسلام الریاض۔

⇦ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۸۰ء۔

⇦ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لاہور۔

⇦ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا (Willam Benton Buplisher, 1961)

New Lexicon Webester's Dictionary of English Language. 1038H.

❀❀❀❀

ہماری دیگر کتابیں

سیرتِ رحمتِ عالم ﷺ — ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری

دُروسِ سیرت — ڈاکٹر سعید رمضان البوطی

حیاتِ سرورِ کائناتؐ — ملا واحدی دہلوی

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
منظوم سیرت النبیؐ — خورشید ناظر

سیرت رسولؐ
قرآن کے آئینے میں — ڈاکٹر عبدالغفور راشد

علوم الحدیث
فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ — ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

حیاتِ طیبہؐ کا ایک دن — پروفیسر عبدالحمید ڈار

ڈسٹری بیوٹرز

نفی آ باد
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
پبلشرز' ڈسٹری بیوٹرز' مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار' لاہور۔ پاکستان
فون: 042-7320318' فیکس: 042-7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

Designed by: Naveed Ahmad 0321-8401998

ISBN: 978-969-8983-49-9